ہندوستانی تہذیب

"بوستان خیال" کے تناظر میں

ڈاکٹر ابنِ کنول

ہندوستانی تہذیب

بوستان خیال کے تناظر میں

ڈاکٹر ابنِ کنول

HINDUSTANI TAHZEEB

BOSTAN-E-KHAYAL KE TANAZUR MEIN

BY

DR. IBNE KANWAL

یہ کتاب اردو اکادمی دہلی کے مالی اشتراک سے شائع کی گئی

ہندوستانی تہذیب

"بوستان خیال" کے تناظر میں

ڈاکٹر ابنِ کنول

سالِ اشاعت : ۱۹۸۸ء

تعداد : ۶۰۰

کتابت : عبیدالرحمان ـــــ محمد یامین میرٹھی

قیمت : سو روپے

سرورق : محمد شریف فیضی

مطبع : سیما آفسیٹ پریس ۲۷۸۲ گلی مدرسہ والی، چوڑی والان، دہلی

تقسیم کار :۔

- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ (دہلی۔ علی گڑھ۔ بمبئی)
- انجمن ترقی اردو (ہند) راؤز ایونیو۔ نئی دہلی۔ ۲
- ایجوکیشنل بک ہاؤس۔ مسلم یونیورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ
- ماڈرن پبلشنگ ہاؤس۔ دریا گنج۔ نئی دہلی ۲
- انجمن تہذیبِ نو، ۲۷۲ چک، الہ آباد۔
- ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔ گلی عزیزالدین وکیل۔ کوچہ پنڈت۔ دہلی
- عماد پبلی کیشنز ۲۷۸۲ گلی مدرسہ والی، چوڑی والان، دہلی ۱۱۰۰۰۶

ملنے کے پتے :۔

- نیا سفر پبلی کیشنز ٹیلی فون : ۲۲۰۳۰۵۸
سی۔ ۱۶۶، وویک وہار۔ دہلی۔ ۳۲
- کنول پبلی کیشنز ٹیلی فون ۷۷۳۳۶۰
۹۰۲۷۔ رام باغ روڈ۔ آزاد مارکیٹ، دہلی ۶

انتسابُ

مشفق و محترم

پروفیسر قمر رئیس

کی نذر

فہرست

پروفیسر مونس رضا

وائس چانسلر

دھلی یونیورسٹی، دھلی

۲۴ر فروری ۱۹۸۸ء

پیش لفظ

ھندوستان صدیوں سے مختلف النوع عناصر اور اُن کی تھذیبوں کا مرکز و منبع رھا ھے۔ دراوڑ، آریہ، شک، ھُن، تُرک، مغل یہاں آباد ھوئے اور اس سماجی اکائی کا حصہ بن گئے۔ پھر انگریزی حکومت کا دور دورہ رھا۔ یہ سب اپنی تھذیبی اقدار اپنے ساتھ لائے اور یہاں کی تھذیب میں اسطرح ضم ھوئے کہ ایک نئی مشترکہ تھذیب اور طرزِ معاشرت نے جنم لیا جسے ھندوستان کی گنگا جمنی تھذیب کا رنگارنگ اور خوبصورت نام دیا گیا۔ یہ گنگا جمنی ھندوستانی تھذیب مختلف اقوام کے تھذیبی معاشرتی اختلاط کے نتیجے میں وجود میں آئی ھے، اِسی لئے اِسے کسی ایک قوم یا مذھب کی نمائندہ نہیں کہا جاسکتا۔ تاریخ شاھد ھے کہ ھر عھد کی تھذیب و معاشرت میں داخلی انقلابات کے سبب اور وقت کے تقاضوں کے مطابق تبدیلیاں رونما ھوتی رھی ھیں۔ غالباً یہی وجہ ھے کہ ھمیں ھندوستان کی بہت سی قدیم تھذیبیں اور اُن کی قدریں آج اجنبی معلوم ھوتی ھیں۔ ھر مُلک اور ھر عھد کی قدیم تھذیب کی داستانِ پارینہ کو پڑھنے اور سمجھنے کے لئے اُس عھد کا ادب ھی مشعلِ راہ بنتا ھے۔ ادب میں داستانوں کو اِس اعتبار سے اوّلیت حاصل ھے۔ داستانوں کی معاشرت اُس مُلک اور عھد کی زندہ معاشرت ھوتی ھے جس میں اُن کی تصنیف عمل میں آئی۔ اردو کی طویل ترین داستانیں "طلسم ھوشربا" اور "بوستانِ خیال" اِس کی نمایاں مثالیں ھیں۔ "طلسم ھوشربا" میں اگر زیادہ تر لکھنوی یا اَودھی تھذیب کی جھلک نظر آتی ھے تو "بوستان خیال" میں دھلوی

تہذیب کا عکس جھلکتا ہے۔ بڑی مسرت کی بات ہے کہ اِن دونوں داستانوں کا اِس نقطۂ نظر سے بھی مطالعہ کیا گیا ہے۔ "طلسم ہوشربا" کے معاشرتی مطالعہ پر ایک اہم کتاب شائع ہو چکی ہے اور "بوستان خیال" کا تہذیبی مطالعہ میرے پیشِ نظر ہے۔ ڈاکٹر ابنِ کنول نے بہت محنت، عرق ریزی اور تن دہی سے اِس ہفت خواں کو سر کیا ہے۔ انھوں نے "بوستان خیال" کے تناظر میں تمام تاریخی ماٰخذ کو سامنے رکھ کر گذشتہ ہندوستانی تہذیب و معاشرت کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ اِس کتاب کے مطالعہ سے ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کی معاشرت خصوصاً عہدِ مغلیہ کی تہذیبی قدریں واضح ہو جاتی ہیں اردو میں اِس نوعیت کا تحقیقی کام بہت کم ہوا ہے۔ اِس لئے اس سنجیدہ، وقیع اور اہم کام کی جتنی پذیرائی کی جائے کم ہے۔ میں ابنِ کنول کی تحقیقی کاوش پر انہیں مبارکباد پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ اہلِ نظر کے لئے یقیناً یہ ایک قابلِ قدر تصنیف ثابت ہوگی۔

سولہ رضا

ڈاکٹر تنویر احمد علوی
ریڈر، شعبۂ اردو
دہلی یونیورسٹی - دہلی

سخن در سخن

ادب و شعر کا تہذیبی مطالعہ نہ صرف یہ کہ زبان و ادب کی قدر شناسی میں معاون ہوتا ہے بلکہ اس کے پس منظر میں ان تاریخی و تہذیبی عوامل کو بھی سمجھا اور پرکھا جا سکتا ہے جن کے تحت کسی دور کا ادب یا کوئی خاص ادب پارہ وجود میں آتا ہے۔

جس طرح خیال بغیر مادہ کے جنم نہیں لیتا اسی طرح کوئی ادب پارہ بھی سماجی اور ثقافتی تناظر سے الگ اپنی کوئی شناخت نہیں رکھتا، تہذیبی نقوش و آثار ہی اس کے خد و خال کا تعین کرتے ہیں اور اس کی زندگی کی بے چہرگی کو حُسنِ امتیاز سے آراستہ کرنے میں فکری اور فنی اقدار کو سہارا دیتے ہیں۔

تہذیب کا ایک عینی پہلو ہوتا ہے اور ایک مادی روپ۔ کسی معاشرہ کی تہذیبی سوچ اس کی فکری اساس اور فنی محرکات کا سرچشمہ ہوتی ہے جس میں خارجی اشکال اور داخلی کوائف ایک زندہ و درخشندہ اکائی کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ یہی تہذیبی سوچ اپنے لئے اظہار و ابلاغ کے وسائل بھی وضع کرتی ہے اور ان کی پرکھ کے لئے پیمانے بھی جس میں مذہب و فلسفہ، عشق و عقیدت، فہم و وہم سبھی کچھ آجاتا ہے۔

ازمنۂ وسطیٰ میں انسانی ذہن کی عصری حیثیت ماضی و موجود سے اخذ کردہ کن ادارات کی تشکیل سے عبارت تھی انھیں ہم دربار، خانقاہ، بازار اور گھر آنگن سے تعبیر کر سکتے ہیں یا دوسرے لفظوں میں انھیں ہم اس کی مادی و روحانی زندگی کے حدودِ اربعہ کہہ سکتے ہیں۔

لیکن اس چار دیواری کے اندر جو زندگی گذاری جا رہی ہے کتنی رنگ در رنگ اور افسانہ در افسانہ ہے، کون جانے؟ اس کی کہانی آدمی کب سے سُنتا آ رہا ہے اور اس کے ذیل میں کیا

کچھ کہا جاتا رہا ہے اس کی داستان کا پھیلاؤ بھی مشکل ہی سے اپنے اندر سمیٹ سکتا ہے۔

داستان ہمارے حال و خیال کا سفر ہے شعور و لاشعور کی وہ اَن گنت پرچھائیاں ہیں جو فانوسِ خیال کی طرح ایک داستان کے پھیلتے بڑھتے دائروں میں رقص کرتی نظر آتی ہیں۔ داستان سرائی و داستان گوئی اسی لیے انسان کا محبوب مشغلہ رہی ہے۔ اردو میں داستان گوئی کا فن اپنے تخیلی و تمثیلی تنوع کے اعتبار سے ایک غیر معمولی ادبی فن رہا ہے جس کے تمول میں فارسی داستان اور سنسکرت گاتھاؤں کے ترجمے سے قابلِ تحسین اضافے عمل میں آتے رہے۔

ان داستانوں کا تہذیبی مطالعہ دور ماضی کی ادبی و تنقیدی بازیافت سے کم نہیں اور اس کی مدد سے تاریخی واقعات نہ سہی سماجی و ذہنی سطح پر بہت سی تاریخی سچائیوں کی دید و دریافت ممکن ہے۔ تاریخی واقعات کی جڑیں تاریخی و تہذیبی ماحول کی سرزمین میں پیوست ہوتی۔

بوستانِ خیال کا یہ ادبی و تہذیبی مطالعہ بھی اس اعتبار اپنے اندر ادبی و سماجی افادیت کے کئی پہلو رکھتا ہے اور ڈاکٹر ابنِ کنول ہماری تحسین کے مستحق ہیں کہ انھوں نے بڑے ادبی شوق و شغف کے ساتھ اِس کام کو انجام دیا ہے۔

نثار احمد علوی
۲۲
۲
۸۸

ابتدائیہ

صنعتی زندگی کی تیز رفتاری نے اگر ایک طرف ہماری زندگی کو بے شمار آسائشیں فراہم کی ہیں اور خلاؤں میں پرواز کرنا سکھا کر مختلف اقوام کے مکانی فاصلوں کو کم کر دیا ہے تو اسی کے ساتھ ساتھ زندگی کے سالوں، دنوں اور لمحوں کی آزادی چھین لی ہے۔ فرصت کے اوقات محدود کر دیئے ہیں اور اسی عدیم الفرصتی اور نئے معاشرے کے تقاضوں کے سبب ہم ماضی کے بہت سے فنون کو نظر انداز کرتے جا رہے ہیں۔ مثلاً داستان گوئی کا فن اب ناپید ہے۔ داستان گوئی ایک مخصوص تہذیب کی نمائندہ صنف رہی ہے اور جدید افسانوی ادب کی اصناف کی بنیادیں اسی کے سہارے بلند ہوئی ہیں۔ داستانیں افسانوی ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ ان کے مطالعے سے نہ صرف ہم ایک خاص عہد کی تہذیب سے واقفیت حاصل کر لیتے ہیں بلکہ ان میں ہماری زبان کا بڑا ذخیرہ موجود ہے داستانوں کی مدد سے اگر ایک طرف ماضی کی تہذیبی تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے تو دوسری طرف ہم الفاظ کی ایک ضخیم فرہنگ ترتیب دینے کے ساتھ ساتھ زبان کے ارتقا سے بھی واقف ہو سکتے ہیں۔

اردو میں جو داستانیں اپنی طوالت کے اعتبار سے یاد کی جاتی ہیں، ان میں "بوستان خیال" ایک اہم داستان ہے۔ "بوستان خیال" کا مصنف محمد تقی خیال مغل بادشاہ محمد شاہ کے عہد حکومت میں گجرات سے دہلی آیا اور یہاں رہ کر اس نے اس طویل داستان کی ابتدا کی۔ لیکن یہ داستان نواب سراج الدولہ کی زیر سرپرستی مرشد آباد میں مکمل ہوئی۔

"بوستان خیال" محض ایک داستان نہیں بلکہ اپنے عہد کی تہذیبی اقدار کی آئینہ دار ہے۔ راقم نے ماضی کی انھیں تہذیبی قدروں کو بوستان خیال کے تناظر میں ترتیب دینے کی کوشش کی ہے اور اس کے لیے اس عہد کے معاشرتی حالات اور ماحول کو پیش نظر رکھا ہے جس میں داستان لکھی جا رہی تھی۔ جگہ جگہ مثالیں دے کر اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ داستان میں موجود تہذیب ہندوستان کے عہد وسطیٰ خصوصاً مغل عہد کی تہذیب کا عکس ہے۔

کتاب کو موضوعات کے اعتبار سے دو حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، پہلا حصہ تحقیقی، تنقیدی اور تاریخی امور پر مشتمل ہے، اس حصہ میں سب سے پہلے داستان نگاری کے فن کا مختصراً جائزہ لیا گیا ہے، اس کے ساتھ ہی "بوستان خیال" اور اس کے مصنف سے متعلق ضروری تحقیقی نکات کو تفصیل سے پیش کیا گیا ہے۔ اسی حصہ میں "بوستانِ خیال" کے سیاسی پس منظر کی وضاحت بھی کی گئی ہے۔

کتاب کا دوسرا اور اہم حصہ تہذیبی اقدار پر مشتمل ہے، اس میں "بوستان خیال" اور تاریخ ماضیہ کے تہذیبی مرقعوں کو موازنہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے اور ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ "بوستان خیال" محض ایک تخیلی داستان نہیں بلکہ تہذیبی تاریخ ہے، اس حصہ میں اوّل "شکوہِ سلطنت" کے عنوان سے شاہی ادارے کا جائزہ لیا گیا ہے اس میں بادشاہ کی تخت نشینی سے لے کر درباری آداب "انتظامِ سلطنت" فوجی نظام اور شاہی حرم سرا تک کا تفصیلی بیان شامل ہے۔ "معاشرتی حالات" کا مطالعہ اسی باب کا حصہ ہے اس مطالعہ کو پانچ حصّوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے، اوّل ظاہری اشیا کا بیان یعنی لباس، زیورات و جواہرات، اشیائے خورد و نوش وغیرہ اسی میں آدابِ دسترخوان اور مختصراً معاشی حالات کا بھی جائزہ پیش کیا ہے، دوم میں اس عہد کے ذرائع تفریحات کی وضاحت کی گئی ہے۔ سوم میں اخلاقی اقدار کے عنوان سے اس عہد کے اخلاقی محاسن اور معائب کی نشاندہی کی ہے، اس میں نمک حلالی، مہمان نوازی، احسان مندی اور غیرت مندی کے ساتھ ساتھ اخلاقی پستی، شراب نوشی، طوائف پسندی اور امرد پرستی وغیرہ کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے، چہارم میں اعتقادات پر روشنی ڈالی گئی ہے جس میں توہمات یعنی نجومیوں، فقیروں اور مزارات سے عقیدت کے ساتھ مذہبی عقائد پر بھی بحث کی گئی ہے، پنجم میں ولادت سے لے کر وفات تک کی تمام رسومات کا تفصیلی بیان شامل ہے، اس باب کے آخر میں فنون لطیفہ اور تہذیب کے تعلق کو پیش نظر رکھتے ہوئے فنِ تعمیر، موسیقی، مصوری اور باغبانی پر بحث شامل ہے۔ فنون لطیفہ کے ذیل میں "باغبانی" کو بھی ایک فن مان کر شامل کر دیا ہے۔

کتاب کی طوالت کے پیش نظر بوستان خیال سے متعلق کئی قابلِ وضاحت موضوعات کو اس میں شامل نہیں کیا گیا ہے مثلاً داستان کا تنقیدی مطالعہ یعنی فنی قدر و قیمت جو خود ایک کتاب کا موضوع بن سکتا ہے یا داستان میں فوق الفطرت عناصر پر تفصیلی بحث کی جا سکتی ہے۔ فی الوقت صرف ہندوستان کی مغل تہذیب کے بیان پر ہی اکتفا کیا ہے۔ اور تمام تہذیبی اقدار کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ آئندہ دیگر موضوعات پر لکھنے کا حوصلہ ابھی دل میں موجود ہے۔

کتاب کی تیاری کے سلسلے میں استاد محترم ڈاکٹر تنویر احمد علوی کی مشفقانہ اعانت اور رہبری کا بالخصوص

شکر گزار ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب موصوف کے شفیقانہ اور عالمانہ مشوروں کے ساتھ ساتھ مستقل رہنمائی اور ہمت افزائی حاصل نہ ہوتی تو یہ کتاب نہ صرف بے آب نظر آتی بلکہ یہ موضوع مدت تک چیستاں بنا رہتا۔ شفیق اور خلیق استاد پروفیسر قمر رئیس کا شکریہ ادا کرنا میرے لیے مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ ان کی محبت اور شفقت نے مجھے دہلی میں رہنے کے لیے مجبور کیا۔ اور یہاں ان کے اخلاق حمیدہ اور خلوصِ بے جا نے غریب الوطنی کا احساس نہیں ہونے دیا میرے تحقیقی مقالہ کے لیے یہ موضوع انھوں نے نہ صرف تجویز کیا بلکہ قدم قدم پر رہنمائی فرمائی۔ الفاظ کی عدم موجودگی کے باوجود میں صمیم قلب سے اُن کا اس خُرد نوازی کے لیے ممنون و مشکور ہوں۔

ناسپاسی ہوگی اگر میں ادب نواز پروفیسر مونس رضا وائس چانسلر دہلی یونیورسٹی کا شکریہ ادا نہ کروں کہ انھوں نے اپنی انتہائی مصروفیت کے باوجود میری کاوش کو سراہا اور اپنی بیش قیمت رائے سے نوازا۔

اس کام کے سلسلے میں ابتدا ہی سے میرے تمام مشفق بزرگوں کے مفید اور نیک مشورے شریک رہے بالخصوص پروفیسر قاضی عبدالستار، پروفیسر سید محمد عقیل، پروفیسر عنوان چشتی، پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، پروفیسر فضل الحق، ڈاکٹر شریف احمد اور والد محترم جناب کنول ڈبائیوی۔ میں اُن سب کا ممنون و احسان مند ہوں۔

میں اپنے اُن تمام ساتھیوں خصوصاً مظفر حسین سیّد (مدیر حال ہند)، ڈاکٹر محمد اسلم حنیف اور ڈاکٹر جلال انجم کی دوستی پر فخر کرتا ہوں جنھوں نے کتاب کی اشاعت میں مدد فرمائی۔

جناب شریف الحسن نقوی سکریٹری اردو اکیڈمی دہلی، ڈاکٹر خلیق انجم سکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند) اور دیگر اراکین اکادمی کا بھی شکر گزار ہوں کہ ان کی توجہ کے باعث یہ کتاب زیورِ طباعت سے آراستہ ہو سکی۔

آخر میں میرے لیے ضروری ہے کہ میں اپنے برادران بزرگ جناب جاوید کمال، جناب زاہد کمال، جناب عابد کمال، اور جناب راشد کمال کا شکریہ ادا کروں کہ ان کی محبتوں نے زندگی کو اس قدر اطمینان بخشا کہ میں یہ کام بحسن و خوبی انجام دے سکا۔ عزیزی طارق مشتاق کے خوشگوار مستقبل کے لیے دعا گو ہوں کہ انھوں نے پروف ریڈنگ میں مدد کی۔ شریکِ حیات صبیحہ کنول کے تعاون کا شکریہ ادا کر کے میں اُن کے رشتہ کی توہین کرنا نہیں چاہتا۔

(ابنِ کنول)

شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی۔ دہلی ۷

داستان کا فن
اور
بوستانِ خیال

دیکھا یوں گیا ہے کہ آج کوئی عجیب و غریب حادثہ پیش آیا، کل اسے گلی کوچوں میں نئے نئے انداز سے بیان کیا جانے لگا، اگلے دن اس میں اور اضافے ہوئے، دہراتے دہراتے اصل واقعہ کہیں کھو گیا، اس میں مختلف شاخیں پھوٹ نکلیں، جتنے لوگوں کی زبان سے ادا ہوا اتنا ہی طویل ہوتا گیا، آہستہ آہستہ ایک چھوٹا سا واقعہ اچھی خاصی داستان بن گیا۔ شاہ نامہ کی داستان کو ہم اس کی ایک نمایاں مثال قرار دے سکتے ہیں رستم ایران کا ایک پہلوان تھا لیکن فردوسی کے زورِ بیان نے اُسے بہادری کی علامت بنا دیا اور اس کے گرد افسانوں کا جال بن دیا، قیس و فرہاد کی محبت کو قلم کی قوت نے دنیائے عشق کی مثالی کہانیوں میں بدل دیا۔

واقعہ عام طور پر مختصر ہوتا ہے لیکن اس کا بیان ہمیشہ طوالت اختیار کر جاتا ہے۔ دیکھے یا سنے ہوئے واقعات کو قوت متخیلہ کے سہارے بیان کرنے ہی کو فسانہ گوئی کہتے ہیں۔ اگرچہ فسانہ کے لغوی معنی جھوٹی اور فرضی کہانی کے ہیں لیکن یہ بات ہم سب ہی سمجھتے ہیں کہ افسانوں میں جو کہا جاتا ہے اس کی بنیاد انسانی زندگی میں پیش آنے والے کسی نہ کسی سانحہ یا واقعہ پر ہوتی ہے۔ ہر انسان کے اندر ایک ایسا فطری جذبہ بے قرار رہتا ہے جو اپنی انفرادیت اور برتری کو دوسروں پر ظاہر کرے۔ اسی جذبہ کی تسکین کے لیے کبھی وہ اپنے ماضی کو، کبھی اپنی زندگی کے کسی اہم حادثہ کو یا عجیب و غریب واقعات کو لوگوں کے سامنے دہراتا ہے۔ ایسے موقع پر سامعین کے چہروں پر نمایاں ہونے والے حیرت و استعجاب کے تاثرات اس کے لیے تسکین کا ذریعہ بنتے ہیں۔ ہر واقعہ بیان ہوتے ہوتے کہانی بن جاتا ہے۔

کہانی اصنافِ ادب کی کئی قسموں میں منقسم ہے۔ داستان، قصہ، حکایت، ناول، مختصر افسانہ سب کہانی کی ہی مختلف شکلیں ہیں ہر ایک کے اندر کوئی کہانی یا کوئی واقعہ ضرور ہوتا ہے۔ کہانی کی ایک قدیم صنف داستان ہے اور ارتقائی اصناف میں ناول اور مختصر افسانہ شامل ہیں۔ داستان، ناول اور افسانہ کا بنیادی فرق طوالت اور اختصار ہے۔ داستان کہانی کی طویل اور نسبتاً پیچیدہ صنف ہے، کہانی قصہ در قصہ ہو کر داستان بنتی ہے، بقول کلیم الدین احمد "داستان کہانی کی طویل اور پیچیدہ بھاری بھرکم صورت ہے[1]"، اس کے برعکس ناول اور مختصر افسانہ میں اقتصاد اور سلجھے پن کو ملحوظ

---

[1] فن داستان گوئی از کلیم الدین احمد ص ۱۴

رکھا جاتا ہے۔ اس میں کہانی کی نسبتاً سادہ اور غیر پیچیدہ صورت ہوتی ہے۔

داستان کی ابتدا بھی ان چھوٹی چھوٹی حکایتوں اور روایتوں سے ہوئی جن کا جنم انسانی تہذیب کے ساتھ ہوا۔ اس وقت آدمی کو لکھنا نہیں آتا تھا اس نے تصویر کا فن بھی شاید نہیں سیکھا تھا اُس وقت کا انسان جنگلوں اور غاروں میں زندگی گذارتا تھا، اُس کا شعور بھی نو عمر تھا۔ لیکن قصہ کہنے اور سننے کا شوق اس میں موجود تھا۔ اسی شوق کی تکمیل داستان کی ابتدا ہے۔ لیکن داستان فن کی حیثیت سے بقول ڈاکٹر اجمل اجملی "جاگیردارانہ عہد میں وجود میں آئی جب زندگی میں استحکام پیدا ہو چکا تھا انسان نے ایک مضبوط سیاسی اور سماجی تنظیم بنالی تھی۔ تہذیب کافی آگے بڑھ آئی تھی۔"[۱] ڈاکٹر اجملی کی یہ بات اس وجہ سے قابلِ قبول ہے کہ داستان کا فن فرصت کے اوقات چاہتا ہے اور فیوڈل ایج میں نہ صرف عیش پسندی کا تمام سامان مہیا تھا بلکہ بعض صورتوں میں داد عیش دینے کے لیے وقت اور اطمینان بھی نصیب تھا۔ داستان بھی تفریح اور دل بہلانے کا ذریعہ بن گئی۔ غالب نے حدائق انظار کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ:۔

"داستان طرازی منجملہ فنونِ سخن ہے، سچ یہ ہے کہ دل بہلانے کے لیے اچھا فن ہے۔"[۲]

انسان کی یہ فطری خواہش اور معاشرتی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ دنیا کے آلام و مصائب سے دور کسی فردوس میں رہ کر تمام شادمانیوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لے اور ڈاکٹر گیان چند کے الفاظ میں "زندگی میں جن آسائشوں اور لذتوں کا ارمان تھا افسانے میں وہ سب مہیا کریں۔"[۳]

دراصل داستان ایسی ذہنی آسودگی کا نام ہے جو پریشانیوں کے احساس کو ختم کر کے نیند کی پُرسکون وادی میں پہونچا کر حسین خوابوں کے جھروکے کھول دیتی ہے۔ خوابوں کے یہ جھروکے بالخصوص اُس جاگیردار طبقہ کے لیے تھے جن کے درمیان داستان کو زیادہ فروغ حاصل ہوا۔ اسی طبقہ نے اس صنفِ ادب کی سرپرستی کی۔ یہی سبب ہے داستانوں کا ہیرو ہمیشہ کوئی شاہزادہ ہوتا ہے۔ جس سے وابستہ ایک بڑی سلطنت اور ایک بڑی فوج ہوتی ہے۔ پوری کہانی اُسی کے گرد طواف کرتی ہے۔ دراصل یہ ہیرو وہ بادشاہ ہے جس نے داستان کی سرپرستی اپنے ذمہ لی اور اپنے لیے تفریح و تسکین کا سامان فراہم کیا۔ کیونکہ وہ خود داستان کا ہیرو ہے اس لیے ہیرو کی فتح پر اُسے اپنی فتح و کامرانی کا احساس ہوتا ہے۔

---

[۱] اُردو کے افسانوی ادب میں عوامی زندگی کی عکاسی از ڈاکٹر اجمل اجملی ص ۱۱۱ (قلمی) [۲] حدائق انظار ص ۲

[۳] اُردو کی نثری داستانیں از ڈاکٹر گیان چند جین کراچی ۱۹۶۹ء ص ۱۸

سننے والا ہیرو کی شکست برداشت نہیں کر سکتا۔ شکست داستان سے حاصل ہونے والے احساس برتری کو مجروح کرتی ہے ڈاکٹر گیان چند نے لکھا ہے کہ "داستان گو صرف وہی کچھ بیان کرتا تھا جو اس کے سرپرست کو خوش آئے"۔[1]

داستان کے فن کا بنیادی عنصر اس کی طوالت ہے، ہم پیشتر کہہ چکے ہیں کہ داستان اس ماحول کی پیداوار ہے جہاں لوگوں کے پاس فرصت اور اطمینان کی افراط تھی۔ غم روزگار سے بے نیاز تھے، فکر آخرت سے آزاد تھے ظاہر ہے ایسی صورت میں وقت گذارنے کے لیے عورت اور شراب کے علاوہ سب سے زیادہ دلچسپ مشغلہ داستان سننا ہو سکتا تھا جس کے سننے سے عورت کی ہم آغوشی کی لذت اور شراب کا نشہ دونوں بیک وقت حاصل ہو جاتی تھیں جس میں دو آتشہ کا مزہ ہو اس کی تمنا کون نہیں کرے گا اور زیادہ سے زیادہ وقت اس ماحول میں گذارنے کا خواہاں ہوگا۔ اسی لیے داستان گو ایک کہانی میں بہت سی کہانیاں شامل کر کے داستان کو طول دینے کی کوشش کرتا تھا لیکن ہر کہانی بنیادی قصہ کا حصہ ہوتی تھی داستان گو دوسری کہانی اس فنکارانہ حسن کے ساتھ شریکِ داستان کرتا تھا کہ وہ ایک ہی زنجیر کی کڑیاں معلوم ہوتی تھیں بات میں سے بات اس طرح پیدا کی جاتی تھی کہ سننے والے کو بے ربطی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔

داستان کی طوالت اور سامعین کے اشتیاق کا اندازہ اُن واقعات سے لگایا جا سکتا ہے جو لکھنؤ کی داستان گوئی کے بارے میں مشہور ہیں کہا جاتا ہے کہ لکھنؤ کے کسی امیر کے یہاں ایک داستان گو قصہ گوئی کے لیے ملازم تھا وہ ایک داستان بیان کر رہا تھا کہ جس میں کسی شاہزادے کی بارات کا ذکر تھا کہ بارات سسرال کے دروازے تک پہونچ چکی ہے اسی دوران داستان گو کو کسی اشد ضروری کام سے باہر جانا پڑ گیا امیر کے کہنے پر داستان گو داستان سنانے کے لیے اپنے شاگرد کو مقرر کر گیا اور اس سے کہہ گیا کہ میں جلد واپس آؤں گا تم داستان کو سنبھالے رکھنا۔ داستان گو پندرہ دن بعد جب لوٹ کر آیا تو معلوم ہوا کہ بارات ابھی وہیں کھڑی ہے جہاں وہ چھوڑ کر گیا تھا یعنی شاگرد نے پندرہ دن بارات کی شان و شوکت اور سسرال والوں کے خیر مقدمی کے انتظامات میں گذار دیئے شاگرد کے پندرہ دن کے بیان کے بعد استاد نے مزید پندرہ دن بارات کی آرائش و زیبائش کو بیان کر کے بارات کو دروازے پر کھڑا رکھا۔[2] اسی طرح کا ایک واقعہ ڈاکٹر گیان چند نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے[3] داستان میں اس طرح کی طوالت کو غیر ضروری نہیں

---

[1] اردو کی نثری داستانیں ص ۷۷

[2] اردو کے افسانوی ادب میں عوامی زندگی کی عکاسی از ڈاکٹر اجمل اجملی ص ۱۶

[3] اُردو کی نثری داستانیں ص ۵۶

کہا جاتا تھا کیوں کہ اس سے سامعین اکتاہٹ محسوس نہیں کرتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ داستان گو کے بیان میں تکرار نہیں ہوتی، وہ اپنی قوت متخیلہ سے نئے نئے مضامین پیدا کرتا ہے۔ داستان کے حسن کا انحصار ہی داستان گو کی قوت متخیلہ پر ہے۔ خواجہ امان نے داستان کے فن کا ذکر کرتے ہوئے اولیت طوالت ہی کو دی ہے لکھا ہے کہ:۔

"مطلب مطول و خوشنما جس کی بندش توارد مضمون اور تکرار بیان واقع نہ ہو اور مدت دراز تک اختتام کے سامعین مشتاق رہیں۔"[1]

امان نے طوالت کے علاوہ داستان گوئی کی دوسری خصوصیات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ مثلاً انھوں نے کہا ہے کہ "بجز مدعائے خوش ترکیب اور مطلب دلچسپ کوئی عبارت سامع خراش و نزل نہیں ہونی چاہیے۔" یہ خوبی داستان کے لیے لازمی بھی ہے کیونکہ سامعین کی دلچسپی اور اشتیاق کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ داستان میں کوئی ایسا مضمون یا ایسی عبارت بیان نہ کی جائے جسے سن کر اکتاہٹ محسوس ہو۔ ورنہ داستان جیسی طول طویل صنف قابلِ قبول نہیں ہوگی، دلچسپ مضامین کے ساتھ ساتھ امان نے لطافت بیان اور سریع الفہمی پر بھی زور دیا ہے۔ ساتھ ہی یہ بات بھی کہی ہے کہ قصہ کو اس طرح بیان کیا جائے کہ تواریخ گذشتہ کا لطف آئے، ڈاکٹر گیان چند نے اس بات کے کچھ اور معنی لیے ہیں اور کہا ہے کہ "یہ داستان کی خصوصیت نہیں، داستان اور تاریخ ایک دوسرے کی ضد ہیں"[2] جبکہ خواجہ امان کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ داستان میں اس قدر مبالغہ سے کام نہ لیا جائے کہ وہ حقیقت سے بالکل دور ہوجائے بلکہ ایسے مضامین بیان کرنے چاہئیں کہ ان پر حقیقت کا شائبہ ہو اور ایک اچھے فن پارے کی خوبی ہے کہ وہ کسی عہد کا عکاس معلوم ہو۔

داستان کی دنیا کو حقیقی دنیا ظاہر کرنے کے لیے داستان گو اپنے اور داستان کی دنیا کے عہد میں دوری پیدا کردیتا ہے، وہ نہ اپنے زمانہ کے افراد کو داستان کے کردار بناتا ہے اور نہ اپنے قرب وجوار میں آباد جانے پہچانے شہروں کو داستان میں شامل کرتا ہے، اپنے سامنے کی چیزیں بیان کرنے سے داستان کا حسن ختم ہوجاتا ہے۔ داستان میں موجود زندگی اگرچہ داستان گو کے عہد کی زندگی ہوتی ہے لیکن داستان گو کا اندازِ بیان یہ ظاہر کرتا ہے جیسے صدیوں پہلے کا کوئی قصہ بیان کیا جارہا ہے۔

---

[1] حدایق انظار ص۴ (بوستان خیال جلد ۲)۔

[2] اردو کی نثری داستانیں ص۵۷۔

داستان ہمیشہ اس طرح شروع کی جاتی ہے کہ بہت پہلے کی بات ہے فلاں ملک میں ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا، زماں ومکاں کا فاصلہ پیدا کرکے داستان گو سامعین کا اشتیاق بڑھاتا ہے۔ صدیوں پہلے کسی دور دیس میں کہہ کر داستان گو کو بہت کچھ کہنے کا موقع مل جاتا ہے وہ ہر ناقابلِ یقین بات کو زماں ومکاں کے فاصلے کی آڑ میں حقیقت کا روپ دے کر بیان کر سکتا ہے اور دادِ تحسین پا سکتا ہے کیونکہ اگر داستان گو نے یہ کہا کہ سو سال پہلے دہلی شہر میں ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا، اس کا دشمن ایک خونخوار دیو تھا کہ جس کا قد پانچ سو گز کا تھا یا دلی میں رہنے والے ایک شاہزادے کو پریاں اٹھا کر لے گئیں تو ایسی باتیں سن کر سامعین بجائے تحسین وآفریں کے داستان گو کا مذاق اڑائیں گے کہ کیا ہزل اور بے ہودہ بکتا ہے ہم نے تو کبھی کسی ایسے بادشاہ کے بارے میں نہیں سنا اس لیے داستان میں دور دراز ممالک کے نام لیے جاتے ہیں مثلاً ختن، چین، یمن، روم، دمشق، شام وغیرہ یہ علاقے اس زمانے میں جب داستانیں لکھی جا رہی تھیں بہت دور سمجھے جاتے تھے اور اس عہد کے لوگ آج کی طرح دوسرے ملکوں کے حالات سے واقف نہیں تھے۔ اس لیے دوسرے ملک کی ہر بات ان کے لیے قابلِ یقین ہوتی تھی اور یہ بات داستان کے فن کی خوبیوں میں ہے کہ فرضی اور بے بنیاد قصہ بھی حقیقت کا لطف دے۔

طوالت، بے ربطی اور پیچیدگی کی موجودگی میں داستان سے یہ توقع رکھنا کہ اس میں کوئی مربوط پلاٹ ہوگا عجیب سی بات لگتی ہے، پلاٹ کو دو قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے ایک سادہ اور دوسرا پیچیدہ، سادہ پلاٹ کا مطلب ہے کہ کہانی سیدھے، سادے انداز میں بیان کر دی جائے۔ یعنی کہانی کی ابتدا ہو، ایک درمیان، اور پھر اختتام لیکن پیچیدہ پلاٹ میں ابتدا اور اختتام تو ہوتا ہے لیکن درمیان میں کہانی ادھر اُدھر بھٹکتی رہتی ہے۔ بیشتر داستانوں کا پلاٹ پیچیدہ ہوتا ہے داستان گو ایک خاص طے شدہ آغاز وانجام کو سوچ کر داستان شروع کر دیتا ہے لیکن درمیان میں قصے پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں اور داستان ایک وسیع دائرہ میں پھیل جاتی ہے ایک کہانی میں کبھی کبھی سینکڑوں کہانیاں شامل ہو جاتی ہیں اور ہر کہانی کا تعلق داستان کی بنیادی کہانی سے ہوتا ہے "بوستان خیال" اس کی واضح مثال ہے کہ جس میں بے شمار ضمنی کہانیاں شامل ہیں۔

داستان میں پیچیدہ پلاٹ کی موجودگی اس میں فنی حسن پیدا کرتی ہے اگر داستان گو صرف اتنا بیان کر دے کہ ایک شاہزادہ تھا چودہ برس کی عمر میں اس نے خواب میں ایک شاہزادی کو دیکھا یا کسی شاہزادی کی تصویر دیکھی، عشق کا جذبہ بیدار ہوا، تلاشِ یار میں اپنے وطن سے نکل پڑا، کچھ دن کے سفر کے بعد شاہزادی مل گئی، شاہزادی نے جس گھڑی شاہزادے کو دیکھا بے اختیار عاشق ہو گئی دونوں مل گئے

داستان ختم ہوگئی۔ جس طرح انھیں وصال نصیب ہوا خدا سب کی امیدیں برلائے۔ اس میں بات تو پوری ہوجاتی ہے لیکن داستان نہیں بنتی، داستان مدت دراز کے بعد اختتام چاہتی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شاہزادے کے اوپر آفاتِ زمانہ نازل کی جاتی ہیں اسے راہِ عشق میں حیران و پریشان دکھلایا جاتا ہے اس صحرانوردی میں نئے نئے قصے جنم لیتے ہیں۔ جس سے داستان کے پلاٹ میں پیچیدگی پیدا ہوتی ہے۔ اور پیچیدگی داستان میں دلچسپی اور فنی حسن پیدا کرتی ہے۔ مختصر یہ کہا جا سکتا ہے کہ داستان میں ایک بے ترتیب اور بے قاعدہ پلاٹ ہوتا ہے جسے داستان گو کہانی کے ساتھ ساتھ مرتب کرتا چلا جاتا ہے، یہ داستان گو کی قوتِ متخیلہ پر منحصر ہے کہ وہ اسے کتنا محدود کر سکتا ہے اور کتنی وسعت دے سکتا ہے۔

داستان کے پلاٹ کی بے ربطی اس کے ماحول کی پیداوار ہے جس میں داستانیں لکھی گئیں۔ وہاں داستان گو کو یہ خیال نہیں ہوتا تھا کہ وقت کتنا گذر گیا، اور نہ سننے والوں کو وقت کی کمی اور اس کے گذر جانے کا احساس ہوتا تھا۔ یہاں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ داستان لکھنے یا پڑھنے سے زیادہ سنانے اور سننے کا فن تھا داستان گو قوتِ متخیلہ کی جس قدر جولانیاں کہنے میں دکھا سکتا تھا جتنے زبان و بیان کے نشیب و فراز زبانی بیان میں پیش کر سکتا تھا اس قدر لکھنے میں نہیں۔ رقم کرنے میں زبان کی پابندیاں عنانِ تخیل کو آزاد نہیں چھوڑتیں۔ پھر بھی داستان نگاروں نے اپنی قوتِ متخیلہ کے جو ہر صفحاتِ قرطاس پر دکھائے ہیں۔ اردو میں داستانِ امیر حمزہ اور بوستانِ خیال اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔

داستان کا بنیادی مقصد اگرچہ عشق کی داستان کا بیان ہوتا ہے لیکن داستان گو اس ایک رومانی قصے کے اردگرد دیگر واقعات اور کہانیاں شامل کر کے داستان کے ایک خاص فنی پہلو یعنی طوالت کو برقرار رکھتا ہے۔

داستان کو طول دینے کے لیے اس میں مافوق الفطرت عناصر کو بھی شامل کیا جاتا ہے۔ کہا گیا ہے کہ اگر داستانوں میں سے مافوق الفطرت عناصر کو نکال دیں تو داستانوں کی عمارت ہی ڈھے جائے گی۔ یہ بات بڑی حد تک صحیح ہے، فوق الفطرت عناصر کی موجودگی داستان میں صرف داستان کا حجم بڑھانے کے لیے ہی نہیں ہوتی بلکہ حیرت و استعجاب کی فضا پیدا کرتی ہے۔ اجنبی مخلوق کے بارے میں بیان کر کے سامعین کا اشتیاق بڑھایا جاتا ہے۔ آج کے مقابلہ میں پچھلی صدیوں کے لوگ نسبتاً زیادہ توہم پرست تھے، دیو، بھوت پریت اور پریوں پر بہت کچھ یقین تھا اور اس یقین کی وجہ مذہبی اور معاشرتی اعتقادات تھے۔ ہر مذہب

میں فوق الفطرت مخلوق کا تصور موجود ہے اس لیے ہر ملک کے ابتدائی ادب میں فوق الفطرت عناصر ملتے ہیں۔

داستانوں میں فوق الفطرت مضامین کی شمولیت بار گراں نہیں گزرتی۔ کیونکہ اس کے شامل کرنے میں داستان گو بیشتر اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ وہ اس خوبصورتی سے ایسے مضامین شامل کرتا ہے کہ غیر حقیقی ہونے کے باوجود حقیقت معلوم ہوتے ہیں، مبالغہ کا احساس نہیں ہوتا ہے۔ اور نہ داستان کے حسنِ بیان کو مجروح کرتا ہے بقول فرمان فتحپوری "مافوق سے داستانوں میں پھیکا پن نہیں بانکپن پیدا ہوتا ہے ایک طرف وہ انسان کے مادہ تجسس اور تخیل کے لیے تازیانے کا کام کرتا ہے دوسری طرف وہ داستان میں پیچیدگی، بوقلمونی اور دلچسپی کا سامان فراہم کرتا ہے"۔[۱]

داستانوں کے موضوعات محدود ہوتے ہیں، پوری داستان کا انحصار ایک شاہزادے اور ایک شاہزادی کے معاشقے پر ہوتا ہے لیکن انھیں دو کرداروں کے واسطے سے داستان نگار بے شمار مضامین پیدا کر لیتا ہے۔ یہاں تک کہ ہر سننے والے کے مذاق و دلچسپی کا سامان ایک ہی داستان میں فراہم ہو جاتا ہے۔

داستانوں کے فن کی تکنیک میں بنیادی عنصر قوت بیان ہے کیونکہ تمام داستانوں میں ایک ہی کہانی ہوتی ہے جسے بار بار ہر داستان گو دہراتا ہے لیکن یہ داستان گو کی قوتِ بیان پر منحصر ہے کہ وہ داستان میں کس قدر جدت و تنوع پیدا کر سکے، زور بیان ہی سے داستان کی چھوٹی سے چھوٹی کہانی وسعت پاتی ہے داستان کے فن کی مثال ایک پرانے برتن پر قلعی چڑھانے کے فن کی سی ہے برتن پرانا ہوتا ہے لیکن یہ قلعی کرنے والے کا کمال ہے کہ وہ اسے کتنا چمکاتا ہے، کتنا اس میں نیاپن پیدا کرتا ہے۔ داستان کا موضوع بھی پرانا اور روایتی ہوتا ہے اس کو تازگی بخشنا اور نئے حسن سے آراستہ کرنا داستان گو کے ہاتھ میں ہے۔ کوئی بھی موضوع پرانا یا مردہ نہیں ہوتا بلکہ ہر عہد میں نیا روپ اختیار کر کے سامنے آتا ہے۔ یہ فنکار کی فنی پرکھ ہوتی ہے کہ وہ اُس موضوع کو نئے سانچے میں ڈھال کر اس طرح پیش کرے کہ اس کے پرانے ہونے کا احساس ختم ہو جائے اور سننے والا اس کو بالکل نیا سمجھ کر سنے۔

جس طرح اردو کی دوسری اصناف ادب کا سلسلہ فارسی کی اصناف سے ملتا ہے اسی طرح داستان نگاری بھی فارسی روایت کے زیرِ اثر اردو میں آئی۔ اوّل ہندوستان ہی میں بڑی حد تک

---

[۱] اردو کی منظوم داستانیں از ڈاکٹر فرمان فتحپوری، کراچی ۱۹۷۱ء صفحہ ۱۰

فارسی کی بڑی بڑی داستانیں لکھی گئیں مثلاً "داستانِ امیر حمزہ" اور "بوستان خیال"۔ پھر انھیں کے تراجم اردو میں شائع ہوئے۔ تراجم کے ساتھ طبع زاد داستانیں بھی اردو میں لکھی جانے لگیں۔

اردو داستان نگاری کی ابتدا اٹھارہویں صدی میں ہوتی ہے اسی صدی میں فارسی کی بوستان خیال بھی لکھی گئی۔ جس زمانے میں "بوستانِ خیال" لکھی جارہی تھی تقریباً اسی وقت شمالی ہند میں اردو کی پہلی داستان "قصہ مہر افروز و دلبر" بھی قلم بند کی گئی۔ یہ داستان اردو کی سب سے قدیم نثری داستان تسلیم کی جاتی ہے اس کا زمانہ تحریر ۱۷۳۲ء اور ۱۷۵۹ء کے درمیان کا تصور کیا گیا ہے اور اس کا مصنف عیسوی خاں کو مانا جاتا ہے[۱]

اردو کی سب سے مشہور داستان جسے اردو کی پہلی شمالی ہند کی داستان کہا جاتا رہا ہے وہ عطا حسین تحسین کی "نو طرز مرصع" ہے۔ اسی کو فورٹ ولیم کالج کے زیر اہتمام "باغ و بہار" کے نام سے میر امن نے لکھا تھا اس میں چہار درویش کے قصہ کو پیش کیا گیا ہے، اس کا زمانہ ۱۷۷۵ء کے قریب مانا ہے۔ یہ داستان اگرچہ فارسی کے قصے چہار درویش کا لفظی ترجمہ نہیں ہے لیکن اس کے اسلوب پر فارسی کا اثر غالب ہے۔ اس کی نثر مقفع اور انداز بیان قدیم ہے۔ اسی صدی عیسوی میں شاہ عالم ثانی کی "عجائب القصص" بھی لکھی گئی اس کا شمار بھی اردو کی قدیم داستانوں میں کیا جاتا ہے۔

اردو داستان نگاری کو باقاعدہ فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد فروغ حاصل ہوا انگریزوں نے ہندوستان کی زبانیں جاننے اور یہاں کے رسم و رواج اور طور طریقوں سے واقف ہونے کے لیے فورٹ ولیم کالج قائم کیا۔ انگریزوں کے ہندوستانی زبانیں سیکھنے کے اس شوق نے اردو نثر کو بڑی ترقی بخشی۔ اس کالج کے اثر سے اردو میں نہ صرف باقاعدہ نثر اور نثری قصوں کا آغاز ہوا بلکہ ایک نیا اسلوب بھی ابھر کر سامنے آیا ہے، اس نئے اسلوب کی نمایاں مثال "باغ و بہار" ہے۔ فورٹ ولیم کالج کے قیام کے دوران یعنی ۱۸۰۰ء سے لے کر ۱۸۶۵ء تک بہت سی مختصر داستانیں اردو میں لکھی گئیں، ان میں میر امن کی "باغ و بہار" حیدر بخش حیدری کی "آرائش محفل" اور "طوطا کہانی" خلیل خاں اشک کی "داستان امیر حمزہ" نہال چند لاہوری کی "مذہب عشق" بہار علی حسینی کی "نثر بے نظر" مظہر علی ولا اور للو لال کی "بیتال پچیسی" وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اس کالج میں لکھی گئی داستانوں کے اثر سے دوسری جگہوں پر دلچسپی کے ساتھ داستانیں لکھی جانے لگیں۔ انیسویں صدی کے آخر تک بہت سی داستانیں اردو میں لکھی گئیں۔ ان میں رجب علی بیگ سرور کی

---

[۱] قصہ مہر افروز و دلبر مرتبہ پروفیسر مسعود حسین خاں

"فسانۂ عجائب"، محمد بخش مہجور کی "نورتن" اور "گلشنِ نوبہار"، نیم چند کھتری کی "گل صنوبر" خواجہ فخر الدین کی "سروشِ سخن" وغیرہ شامل ہیں۔ اس صدی کے نصف آخر میں اُردو کی دو اہم داستانیں سامنے آئیں۔ ایک "داستان امیر حمزہ" اور دوسری "بوستان خیال" لکھنؤ میں منشی احمد حسین قمر اور محمد حسین جاہ نے داستان امیر حمزہ کا اہم اور بڑا حصہ "طلسم ہوش رُبا" کے نام سے لکھا۔ دلّی میں غالب کے بھتیجے خواجہ امان دہلوی نے فارسی کی "بوستان خیال" کا اُردو ترجمہ کیا۔ یہ دونوں داستانیں اپنی طوالت کے اعتبار سے بھی اُردو کی اہم داستانیں ہیں۔

"بوستان خیال" محمد شاہ بادشاہ کے عہدِ حکومت میں قلم بند کی گئی۔ محمد شاہ مغل خاندان کا شہنشاہ اورنگ زیب کے بعد تخت نشین ہونے والے ان بادشاہوں میں تھا جس کو ایک لمبے عرصہ تک حکومت کرنے کا موقع ملا۔ یہ الگ بات ہے کہ بحیثیت مغل شہنشاہ وہ اکبر اور شاہ جہاں کا وارث تھا لیکن اس قوت و اقتدار سے محروم ہو چکا تھا جو عظیم مغل حکمرانوں کو بحیثیت حکمراں حاصل رہی تھی سیاسی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ یہ عہد تہذیبی تبدیلیوں کے اعتبار سے بھی قابلِ مطالعہ ہے دہلی یا شمالی ہند میں باقاعدہ اُردو شاعری کی تحریک اسی عہد میں شروع ہوئی۔ فنون لطیفہ کے بڑے بڑے ماہرین اس عہد میں موجود تھے اور ان کو شاہی سرپرستی حاصل تھی، مذہبی دنیا میں شاہ ولی اللہ اور اہل تصوف میں شاہ کلیم اللہ جہان آبادی اسی عہد کی شخصیتیں ہیں۔ جہاں تک ادبیات کا سوال ہے۔ اُردو شاعری کے بڑے شاعر میر، سودا اور درد اس زمانہ میں موجود تھے شمالی ہند میں اُردو داستان نگاری کی ابتدا اسی عہد میں ہوئی "میر اروئے سخن" "قصہ مہر افروز دلبر" کی طرف ہے۔ اُردو میں ترجمہ ہو کر شامل ہونے والی "بوستان خیال" کا بھی یہی عہد تھا۔

آخر الذکر کے مصنف میر تقی خیال احمد آباد گجرات کے رہنے والے تھے۔ ان کا پورا نام فارسی کے نسخوں میں "میر تقی الجعفری الحسینی" لکھا ہے۔ خیال تخلص تھا۔ یہ محمد افضل ثابت عالمگیری کے شاگرد تھے جوانی میں کسی ماہ رو سے عشق ہو گیا تھا یہ نازنیں قصے کہانیوں سے گہری دلچسپی رکھتی تھی اور ہر روز خیال سے ایک نئے قصے کی فرمائش کرتی تھی۔ خیال بھی ہر روز ایک نیا قصہ طبیعت سے گھڑ کر اُسے سنایا کرتے تھے۔ لیکن ابھی اس صحبت کو ایک سال بھی نہ گزرا تھا کہ وہ نازنیں جدا ہو گئی خیال نے اپنی اس وقت کی کیفیت کو "مہدی نامہ" کے دیباچہ میں لکھا ہے:۔

> "شہر گجرات جو میرا وطن تھا مجھ پر۔ یہودیوں کی قبر کی طرح تنگ ہو گیا اور
> میں دار الخلافہ کی طرف روانہ ہوا"۔ [1]

---

[1] بحوالہ "اردو" ماہ اپریل ۱۹۳۱ء

جس وقت یہ دہلی پہونچے، محمد شاہ کا سن جلوس سات (مطابق ۱۱۳۹ھ یا ۱۷۲۶ء) تھا۔ ۱۷۲۶ء سے ۱۷۳۰ء تک تلاشِ معاش میں سرگرداں رہے ۔۔۔۔ جس جگہ خیالؔ کا قیام تھا وہاں پر قریب ہی قہوہ خانہ تھا جہاں ایک داستان گو دوسروں کی تخلیقات اپنے نام سے سنایا کرتا تھا۔ خیالؔ بھی بخیال تفریح کبھی کبھی وہاں جا بیٹھتے تھے۔ ایک دن جب وہ کوئی قصہ سنا رہا تھا تو کسی نے ٹوک دیا کہ یہ قصہ تو میں نے فلاں جگہ سنا ہے۔ اس پر داستان گو نے بات کو گول مول کر کے کہا کہ "صاحب انسان حسبِ قدر اپنے علم و فضل میں دستگاہ حاصل کر سکتا ہے مگر فن قصہ گوئی ایسا دقیق اور مشکل ہے کہ بغیر مناسبت طبیعت ہرگز حاصل نہیں ہوتا" اہل مجلس نے اُس کی اس بات کی تائید کی لیکن خیالؔ کو یہ دعوی ناگوار گذرا اور انھیں گمان ہوا کہ داستان گو نے ان کی علمیت پر طنز کیا ہے۔ خاموشی سے مکان پر چلے آئے۔ روز فردا ایک داستان کے کچھ اجزا لکھ کر مجلس میں لے گئے اور اہل جلسہ کو سنائے، تمام سامعین نے بہت پسند کیا۔ اس طرح یہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہی داستان "بوستان خیال" کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ خیالؔ نے اپنی محبوبہ کو اُس زمانہ میں کچھ اور قصے سنائے ہوں گے۔ لیکن جہاں تک "بوستان خیال" کی باقاعدہ تالیف کا تعلق ہے یہ کام انھوں نے دہلی میں رہتے ہوئے شروع کیا اور ایک طور پر دہلی کا ادبی اور تہذیبی ماحول ان کے لیے تقاضائے سخن بن گیا۔ یہاں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ خیالؔ اچھے خاصے صاحب علم تھے اور یہ گمانِ غالب انھوں نے اہل جلسہ کے سامنے کوئی ایسی بات کہی ہوگی جو داستان گو کو بری لگی اور جس کے جواب میں اس نے خط کشیدہ جملے استعمال کئے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اس وقت فن داستان گوئی کو ایک بڑا مشکل اور دقیق فن سمجھتے تھے اور محض عام قصوں اور کہانیوں سے جو بھی گھروں میں سنی اور سنائی جاتی تھیں ممتاز خیال کرتے تھے اور ان کے نزدیک اس فن کے کچھ تقاضے تھے اور اس کی مہارت ہر کس و ناکس کے حصہ میں نہیں آسکتی تھی۔

ابھی دہلی میں خیالؔ کی داستان گوئی کا سلسلہ چلا ہی تھا کہ ان کی رسائی نواب رشید الدین خاں بہادر المسمی بہ مرزا محمد علی تک ہوئی وہ داستان سننے کے شائق تھے انھوں نے خیالؔ کی عزت افزائی کی اور داستان کو مکمل کرنے کی فرمائش کی۔ خیالؔ نے ان کے حکم اور فرمائش پر باقاعدہ "بوستان خیال" کو لکھنا شروع کیا اور اس کا نام بھی "فرمائش رشیدی" رکھا جس سے ۱۱۵۵ھ تاریخ نکلتی ہے۔ جب خیال کے قصہ کا ذکر رشید الدین خاں کے بڑے بھائی نواب محمد اسحاق خاں کو ہوا تو انھوں نے اس میں دلچسپی ظاہر کی۔ خیالؔ ان کی ملازمت میں رہ کر داستان لکھتے رہے تھے نواب اسحاق خاں نے ان کی داستان محمد شاہ بادشاہ کے دربار میں پیش کی۔ بادشاہ نے اسے پسند فرمایا اور خیالؔ کو شاہی کتب خانہ کی داروغگی کے عہدہ سے سرفراز کیا۔ بادشاہ نے داستان مکمل کرنے کا حکم دیا اور مدد کے لیے پندرہ کاتب زود نویس اور خوش خط مقرر کئے، ابھی "مہدی نامہ" اور

"اسماعیل نامہ" کی حد تک ہی داستان مکمل ہوئی تھی کہ محمد شاہ کا انتقال ہوگیا۔

محمد شاہ کے انتقال کے بعد خیالؔ مرشد آباد چلے گئے اور نواب سراج الدولہ کے دربار سے وابستہ ہوئے۔ محمد شاہ کا انتقال ۱۷۴۸ء میں ہوا اس لیے مرشد آباد کا سفر اسی کے آس پاس کا زمانہ رہا ہوگا۔ سراج الدولہ کے حکم پر انھوں نے داستان کو پندرہ جلدوں میں مکمل کیا[۱] اس داستان کی تکمیل میں چودہ برس کا عرصہ لگا[۲] داستان کے آخر میں سراج الدولہ کی مدح میں ایک قطعہ لکھا گیا ہے جس میں داستان کے اختتام کی تاریخ بھی لکھی ہے ؎

در ہزار یک صد و ہفتاد و ہجری ختم شد
یارب از سیرش بود خرم دل ہر شیخ و شاب

خیالؔ نے اس قطعہ میں اختتام کا سنہ ۱۱۷۰ھ لکھا ہے لیکن انڈیا آفس لائبریری اور خدا بخش لائبریری پٹنہ میں موجود فارسی قلمی نسخوں میں داستان کے اختتام کی تاریخ ۱۱۶۹ھ دی گئی ہے ڈاکٹر گیان چند نے خیالؔ کے قطعۂ تاریخ کے پیشِ نظر ۱۱۷۰ھ کو ہی صحیح تسلیم کیا ہے۔

۱۱۷۳ھ (بمطابق ۱۷۵۹-۱۷۶۰ء) میں خیالؔ کا انتقال ہوا۔

فارسی کی "بوستان خیال" زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہوئی اس کے قلمی نسخے مختلف لائبریریوں میں موجود ہیں۔ انڈیا آفس لائبریری میں اس کی چودہ جلدیں محفوظ ہیں۔ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں اس کی مکمل پندرہ جلدیں موجود ہیں[۳]

---

[۱] خواجہ قمر الدین نے جلد ہشتم کے دیباچہ میں اٹھارہ جلدیں لکھا ہے اٹھارہ جلدوں کا ذکر ہی لکھنوی ترجموں کے ناشر نے کیا ہے۔ خواجہ امان اور گیان چند جین نے فارسی نسخوں کے حوالے سے پندرہ جلدیں ہی لکھا ہے اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔

[۲] خواجہ امان نے "حدائق انظار" کے دیباچہ میں پچیس[۲۵] برس لکھا ہے لیکن انڈیا آفس لائبریری اتھدا بخش لائبریری پٹنہ اور رامپور میں موجود فارسی نسخوں سے ابتدا اور اختتام کی جو تاریخیں (۱۱۵۵ھ تا ۱۱۶۹ھ) ملتی ہیں ان سے چودہ سال کی مدت پتہ چلتی ہے اور خواجہ قمر الدین نے جلد ہشتم کے دیباچہ میں چودہ برس ہی لکھا ہے جب کہ خود میر تقی خیالؔ نے مہدی نامہ کے دیباچہ میں ۲۵ برس بتایا ہے ممکن ہے انھوں نے قہوہ خانہ کی ابتدا سے ۲۵ برس حساب لگایا ہو اور چودہ برس باقاعدہ لکھنے کی مدت ہو۔

[۳] **Catalogue of persian manuscripts in the library of INDIA OFFICE BY Hermann Ethe Vol.I 1903, pages No.536 to 541 (Khuda Baksh Library - Vol-8, Cat. No.749-65, H.L.No.707-723)**

اس کی کچھ جلدیں برٹش میوزیم، رامپور، علی گڈھ اور لاہور کی لائبریریوں میں بھی ہیں۔

فارسی کی "بوستان خیال" کی جلدوں کی تقسیم داستان کے پلاٹ سے بھی کہیں زیادہ پیچیدہ ہے اگرچہ راقم نے انڈیا آفس لائبریری اور دوسری لائبریریوں کی فہرستِ مخطوطات میں "بوستان خیال" کی جلدوں کی ترتیب کو دیکھا۔ لیکن ان کے مطالعہ سے بھی بات واضح نہیں ہوتی اس لیے راقم الحروف ڈاکٹر گیان چند جین کی ترتیب دیئے ہوئے جلدوں کے نقشے کو یہاں نقل کرنا بہتر سمجھتا ہے۔

مقدمہ کتاب یا مہدی نامہ
۱-
۲-
(۱-۲) بہار اول

معز نامہ
۳- بقیہ کتاب کا مقدمہ
۴- گلزار اول و گلزار دوم
(۳-۴) گلشن اول
۵- گلزار اول
۶ گلزار دوم
(۵-۶) گلشن دوم
(۳-۶) گلشن یا بہار دوم

خورشید نامہ
۷- جلد اول خورشید نامہ
۸- جلد دوم
۹- شطر اول
۱۰- شطر دوم
(۹-۱۰) ضمیمہ جلد دوم
۱۱- جلد سوم
۱۲- جلد چہارم
۱۳- جلد پنجم
۱۴- جلد ششم
۱۵- دو فصل و خاتمہ
(۷-۱۵) داستان دوم یا بہار سوم [1]

عرصہ دراز تک یہ داستان گمنام رہی، اس کا سبب یہ بھی تھا کہ یہ شائع نہ ہو سکی۔ مختلف لوگوں کے ذاتی کتب خانوں میں اس کے قلمی نسخے محفوظ رہے۔ یہاں ہم مہدی نامہ سے ایک فارسی اقتباس نقل کرتے ہیں جس سے کسی حد تک اس بات کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ خیال کا اندازِ نگارش کیا تھا اور وہ نثر کس درجہ

---

[1] اردو کی نثری داستانیں ص ۶۰۲

کی لکھتے تھے :-

"روایان اخبار پیش و ناقلان آثار مقرون بہ یقین بر صفحہ تاریخ چنیں ثبت کردہ اند کہ نسبت صاحبقران واجب التعظیم شاہزادہ معزالدین ابو تمیم بدہ واسطہ سید الصادقین حضرت ابوعبداللہ جعفر ابن محمد صادق علیہ و اعلیٰ ابایہ الصلوۃ والسلام می پیوند صاحب مراۃ الجنان حمداللہ مستوفی ذکر نسب شریف او از کتاب عیون التاریخ بدین موجب نقل کردہ کہ مہدی کہ جد کلاں صاحبقران بود۔ اول ازیں قبیلہ بر تخت نشست شروع کردہ محمد مہدی کہ محمد نام داشت پسر عبداللہ بود کہ راضی لقب داشت ..... و چوں حضرت امام زادہ راضی اللہ عنہ کہ پسر بزرگ حضرت سید الصادقین علیہ السلام بود در حین حیات پدر عالی مقدار خو بجوار رحمت ایزدی بپیوست و برادر محمد بن اسماعیل را ابو جعفر منصور روانقی بعد از شہادت بزرگوارش علیہ السلام کہ حضرات را بروایت صحیح بزہر شہید کردند ......" [۱]

انیسوی صدی عیسوی میں اردو والوں کی نظر اس طویل داستان پر پڑی اور کئی مقامات پر اس کا اردو میں ترجمہ کیا گیا۔ یہ صدی کئی اعتبار سے اہم رہی ہے ایک طرف مغل سلطنت کا چراغ اس صدی میں گل ہوا تو دوسری طرف اردو ادب کا زریں دور بھی یہی صدی تھا ہے۔ اردو کی بیشتر داستانیں اسی صدی میں لکھی گئیں، اس صدی میں پوری طرح سے لوگوں کا مزاج اردو کا بن گیا تھا۔

"بوستان خیال" کا سب سے پہلا ترجمہ اردو میں عالم علی نے "زبدۃ الخیال" کے نام سے ۱۸۴۰ء / ۱۲۵۷ھ میں کیا۔ اس کا ایک نسخہ کتب خانہ قادریہ خانقاہ اسلام پور میں موجود ہے۔ اس نسخہ میں ۳۳۰ صفحات ہیں۔ آخر کے کچھ صفحات غائب ہیں۔ اندازہ ہے کہ اس میں کل ۴۸۰ صفحات ہوں گے [۲] یہ ترجمہ پہلی بار بھاگلپور سے ۱۸۴۴ء میں شائع ہوا۔ [۳]

رامپور میں کئی درباری داستان گویوں نے "بوستان خیال" کی بعض جلدوں کو اردو میں منتقل کیا۔ [۴]

---

[۱] ماخذ رسالہ "اردو" اپریل ۱۹۳۱ء ص ۲۸۴ ۔ [۲] بہار میں اردو ادب کا ارتقاء از اختر اورینوی۔ پٹنہ ۱۹۵۷ء ص ۳۷۰ ، [۳] اردو کی نثری داستانیں ص ۶۰۳ ، [۴] رامپور کے ترجموں کے حوالے "اردو کی نثری داستانیں" سے اخذ کئے گئے ہیں۔

تفصیل حسب ذیل ہے:۔

۱۔ مہدی علی خاں ذکی مرادآبادی

نواب سعید خاں کے حکم سے ۱۸۴۲ء ۱۲۵۸ھ میں ترجمہ کا کام شروع کیا ان کے ترجمے اس طرح ہیں:۔

۱۔ طلسم سعید ۱۸۴۲ء　　۲۔ طلسم حکیم قطاس ۱۸۴۵ء

۲۔ طلسم حیرت کدۂ آصفی ۱۸۴۲ء　　۳۔ طلسم سبع سباع ۱۸۵۴ء

۲۔ شیخ علی بخش بیمار بریلوی

انھوں نے طلسم بیضا کو اُردو کا جامہ پہنایا۔ یہ بھی نواب سعید خاں کے عہد میں تھے، ان کے ترجمے کی کتابت ۱۸۵۴ء میں ہوئی۔

۳۔ مرزا کاظم حسین عرف محشر رامپوری المتوفی ۱۸۶۵ء

انھوں نے خورشید نامہ کو اُردو میں منتقل کیا محشر نواب کلب علی خاں کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔

۴۔ حیدر مرزا تصور

انھوں نے بھی خورشید نامہ کو اُردو میں پیش کیا جو ۱۸۷۲ء کا لکھا ہوا ہے۔

۵۔ اصغر علی خاں

ان کا ترجمہ طلسم ہفت کواکب کے نام سے ہے۔

• بوستان خیال" کے دلّی اور لکھنؤ کے ترجموں سے قبل مناسب ہوگا کہ اس کی دو اُردو تلخیصوں کا بھی ذکر کر دیا جائے۔

۱۔ فرزند احمد صفیر بلگرامی

صفیر نے "بوستانِ خیال" کا نو جلدوں میں انتخاب کیا ہے انھوں نے اپنے ترجمے کا نام "پرستان خیال" رکھا۔ ان نو جلدوں کے نام حسب ذیل ہیں:۔ ۱۔ صبح خنداں، ۲۔ چمنستان، ۳۔ صبح بہار، ۴۔ چشمہ خضر ۵۔ حباب رعنا، ۶۔ طلسم اعظم، ۷۔ فروغ نظر، ۸۔ ساغر لبریز، ۹۔ شام وصال۔

ان کے علاوہ "مہدی نامہ" اور "اسمعیل نامہ" کا ترجمہ "افق الخیال" کے نام سے کیا ہے، اس جلد کو شامل کرنے سے جلدوں کی تعداد دس ہو جاتی ہے۔ "پرستان خیال" کی صرف دو جلدیں ۶۵-۱۸۶۴ء میں مطبع عظیم المطابع عظیم آباد سے طبع ہوئی تھیں۔[1]

---

[1] غالب اور صفیر بلگرامی از مشفق خواجہ، کراچی، ۱۹۸۱ء ص ۳۵-۳۶

۲۔ سید نادر علی سیفی

ان کی تلخیص چھوٹے کتابی سائز کی اٹھارہ جلدوں پر مشتمل ہے" بوستان خیال" کا یہ خلاصہ قسط وار ان کے اخبار" رہبر ہند" میں شایع ہوتا رہا، اس کی ابتدا ۱۸۹۱ء سے ہوئی۔

"بوستان خیال" کا جو سب سے اہم ترجمہ ہے وہ دلی کے خواجہ امان دہلوی کا ہے اسی ترجمہ کے باعث "بوستان خیال" جیسی قابلِ قدر داستان اردو والوں تک پہونچی، ان سے پہلے جو ناقص ترجمے کئے گئے ان سے لوگ لاعلم نہ صرف آج ہیں بلکہ اُس زمانے میں بھی تھے۔

خواجہ امان خاص دلی کے رہنے والے تھے۔ ان کا پورا نام خواجہ بدرالدین خاں عرف خواجہ امان تھا، مرزا غالب اور ان کا خاندان ایک ہی ہے، تیسری پشت میں دونوں کا سلسلہ مل جاتا ہے اور یہ سلسلہ تورا بن فریدون تک چلا جاتا ہے بشرطکہ اس شجرے کو صحیح مان لیا جائے، خود مرزا غالب بھی اپنا رشتہ دار بتاتے ہیں۔ خواجہ غلام غوث خاں بے خبر کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"میرے ایک رشتہ دار کے بھتیجے نے بوستان خیال کا اُردو ترجمہ
کیا ہے میں نے اس کا دیباچہ لکھا ہے"[۱]

خواجہ امان کے والد خواجہ حاجی خان پوری شاہ عالم ثانی کے عہد میں بدخشاں سے دلی آئے، ۱۸۲۷ء میں ان کا انتقال ہوا۔

خواجہ امان ۱۸۱۷ء میں دلی میں پیدا ہوئے، یہیں تعلیم حاصل کی اُردو ان کی پسندیدہ زبان تھی، فارسی اور ترکی والدین سے سیکھی مرزا فرحت اللہ بیگ ان کی اردو کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"شرفائے دہلی کی صحبت میں رہ کر زبان اردو میں وہ صفائی اور پاکیزگی پیدا
کی کہ خود دہلی میں اُن کی تقریر اور تحریر کے سب قائل تھے"[۲]

خواجہ امان الور کے مہاراجہ شیو دان سنگھ کے یہاں ملازمت کرتے تھے انھیں کی فرمائش پر امان نے "بوستان خیال" کا ترجمہ شروع کیا۔

خواجہ امان جب تک زندہ رہے اس طویل داستان کا ترجمہ کرتے رہے لیکن موت کو کیا کہئے کہ اس نے خواجہ کی اس خواہش کو پورا نہ ہونے دیا کہ وہ مکمل "بوستان خیال" کو اُردو کی شکل میں دیکھ سکیں۔ ایک روز

---

[۱] خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر ص ۳۳۷

[۲] رسالہ "اردو" اپریل ۳۱ء

"بوستان خیال" کا ترجمہ کرنے میں مصروف تھے کہ معدہ میں درد اٹھا، لاکھ علاج کروایا لیکن جانبر نہ ہوسکے اور ۱۳ اگست ۱۸۷۹ء بمطابق شعبان ۱۲۹۶ھ کو ۷۲ سال کی عمر میں عالم ارواح کی سیر کے لیے رخصت ہوئے۔

خواجہ امان نے "بوستان خیال" کے ترجمے کا کام کب شروع کیا اس کے بارے میں کوئی یقینی بات نہیں کہی جا سکتی۔ خود ان کے بیٹے خواجہ قمرالدین راقم کے بیانات میں اختلاف ہے۔ "مصباح النہار" میں لکھتے ہیں کہ ۱۸۵۹ء یا ۱۸۶۰ء میں "بوستان خیال" کو جابجا سے منگا کر ترجمہ شروع کیا۔ جلد ہشتم "مرات الاضمار" میں لکھا ہے کہ ۱۸۴۲ء میں کل جلدیں جمع کیں اور ترجمہ شروع کیا خود خواجہ امان نے کسی سنِ آغاز کا ذکر نہیں کیا ہے البتہ پہلی جلد کے اختتام پر "حدائق انظار" کے مکمل ہونے کا یہ قطعہ تاریخ درج ہے ؎

"بچیدم گل بوستان خیال"

اس مصرع سے مادۂ تاریخ ۱۲۷۵ھ برآمد ہوتا ہے اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ۱۸۵۹ء یا ۱۸۶۰ء میں ہی شروع کیا ہوگا۔

مؤلفین تاریخ ادب اردو نے خواجہ امان کی ترجمہ شدہ جلدوں کی تعداد میں بڑی غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ "مؤلف داستان تاریخ اردو نے لکھا ہے کہ:-

"خواجہ امان دہلوی نے مہاراجہ شیو دان سنگھ والئی ریاست آلور کی فرمائش سے پانچ جلدوں کا ترجمہ کیا باقی کے لیے عمر فانی نے وفا نہ کی" [۱]

جب کہ وفات سے قبل خواجہ امان سات جلدوں کا ترجمہ کر چکے تھے یہی غلطی رام بابو سکسینہ نے بھی کی ہے لکھتے ہیں کہ:

"پانچ جلدوں کا ترجمہ اردو میں خواجہ بدرالدین معروف بہ خواجہ امان دہلوی نے کیا۔ دو جلدوں کا ترجمہ لکھنؤ میں چھوٹے نے کیا اور پوری کتاب پر نظر ثانی بھی کی" [۲]

جس لحاظ سے خواجہ امان کی پانچ جلدیں بتائی ہیں اگر دیکھا جائے تو چھوٹے آغا اردو کی صرف ایک جلد "مہدی نامہ" کے مترجم ہیں البتہ یہ ایک جلد فارسی کی دو جلدوں پر مشتمل ہے۔

یہی حال بقیہ مؤلفینِ تاریخ اردو ادب کا ہے۔ یہاں پر بات کو وضاحت سے بیان کر دینا مناسب ہوگا

---

[۱] داستان تاریخ ادب اردو از حامد حسن قادری ص ۲۲۶۔

[۲] تاریخِ ادب اردو از رام بابو سکسینہ ص ۱۰۰۔

جلد ہشتم کو چھوڑ کر بقیہ سات جلدیں خواجہ امان ہی کے قلم سے ترجمہ ہوئی ہیں۔ ابتدائی پانچ جلدیں خواجہ کی زندگی میں شائع ہو چکی تھیں۔ ترجمہ شدہ جلد ششم اور ہفتم کو نظرثانی کے بعد ان کے بیٹے خواجہ قمرالدین خاں نے شائع کیا، اور جلد ہشتم کا ترجمہ خود کر کے "بوستان خیال" کے آخری حصہ کو بھی مکمل کیا۔ یہاں یہ بات دھیان میں رہے کہ انھوں نے ترجمہ اصل داستان "معزالدین نامہ" سے شروع کیا تھا ابتدائی دو جلدیں "مہدی نامہ"، "اسمعیل نامہ" کو جن میں معزالدین کے اجداد کا ذکر کیا گیا ہے نظرانداز کر دیا تھا۔ اس لیے خواجہ امان کے ترجمے کی پہلی جلد فارسی کی تیسری جلد "معز نامہ" ہے خواجہ امان اور خواجہ قمرالدین کے ترجموں کی تفصیل اس طرح ہے:-

شمار جلد	نام اردو	نام فارسی	سال طباعت	تعداد صفحات
اول	حدائق انظار	معزالدین نامہ	۱۲۸۲ھ/۱۸۶۶ء	۵۵۴
دوم	ریاض الابصار	معزالدین نامہ	۱۲۸۴ھ/۱۸۶۷ء	۵۲۷
سوم	شمس الانوار	خورشید نامہ	۱۲۸۷ھ/۱۸۷۱ء	۷۲۷
چہارم	بدرالآثار	"	۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء	۶۴۳
پنجم	نجم الاسرار	"	۱۲۹۶ھ/۱۸۷۹ء	۷۳۶
ششم	مصباح النہار	"	۱۲۹۸ھ/۱۸۸۱ء	
ہفتم	ضیاء الانوار	"	۱۳۰۰ھ/۱۸۸۳ء	
ہشتم	مرات الاضمار	معزالدین نامہ	۱۳۰۰ھ/ ۱۸۸۳ء	

پیشتر ذکر کیا جا چکا ہے کہ آخرالذکر تین جلدیں خواجہ قمرالدین خاں راقم خلف خواجہ امان کی نگرانی میں طبع ہوئیں، "مصباح النہار" اور "ضیاالانوار" پر موصوف نے نظرثانی کی اور "مرات الاضمار" کا خود ترجمہ کیا۔ اول الذکر تین جلدیں مہاراجہ شیو دان سنگھ والئی الور کے نام، جلد چہارم راجہ مہندر سنگھ بہادر فرمانروائے ریاست پٹیالہ کے نام اور آخری چار جلدیں احتشام الدولہ نواب محمد اسمعیل خاں بہادر فرمانروائے گلشن آباد کے نام پیش کی گئی ہیں۔

خواجہ امان کے ترجمہ کی پہلی جلد اکمل المطابع دہلی میں طبع ہوئی۔ جلد دوم مطبع یوسفی دہلی سے شائع ہوئی۔ اسی دوران خواجہ امان نے اپنا پریس قائم کیا۔ بقیہ تین جلدیں انھوں نے اپنے پریس جس کا نام مطبع بدرالدجی تھا میں طبع کرائیں جو جلدیں خواجہ قمرالدین نے طبع کرائیں وہ میرٹھ کے مطبع دارالعلوم اور مطبع جماعت تجارت میں چھپیں۔

خواجہ امان کے انتقال کے بعد ان کے غیر مطبوعہ ترجمے کے ساتھ جو حادثہ گذرا اس کا ذکر بھی یہاں لازمی ہے۔ خواجہ قمرالدین نے جلد ششم "مصباح النہار" کے دیباچہ میں اس کا تفصیل سے ذکر کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ خواجہ امان کے انتقال کے کچھ عرصہ بعد ایک صاحب حکیم محمد مقرب حسین خاں غنی میرٹھ سے خواجہ قمرالدین کے پاس تشریف لائے اور خواجہ مرحوم سے دوستی کا دعویٰ کیا اور کہا کہ تم کو اتنی فرصت کہاں کہ اسے چھپواؤ، میں نے خواجہ مرحوم سے وعدہ بھی کیا تھا کہ میں انھیں طبع کرا دوں گا۔ خواجہ قمرالدین نے ان کی باتوں پر یقین کیا اور مسودہ ان کے حوالے کیا۔ حکیم صاحب نے مسودات کو کچھ ردّ و بدل کر کے اپنے نام سے شائع کرا دیا۔ جب خواجہ قمرالدین نے اس سلسلے میں ان سے بات کی تو انھوں نے دروغ گوئی سے کام لیا۔ بالآخر قمرالدین نے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا، حکیم مقرب حسین نے عدالت میں کہا کہ خواجہ امان نے جلد ششم کا ترجمہ ناقص کیا تھا اور ہفتم کا نامکمل تھا میں نے قمرالدین سے دونوں ترجمے پانچ سو روپے کو خرید لئے اور یہ میری لیاقت و مقدرت ذاتی کا اظہار ہے، ثبوت میں انھوں نے اپنی کئی تصانیف عدالت میں پیش کیں۔ فیصلہ نامکمل تھا کہ مقدمہ عدالت سے پنچایت کے سپرد ہوا اور وہاں پنچوں نے یہ فیصلہ کیا کہ خواجہ قمرالدین کو (۷۰) جلدیں مطبوعہ دلوائیں اور آئندہ مقرب حسین کو طبع کرنے ممانعت کر دی۔ بعد میں خواجہ قمرالدین نے ان پر نظر ثانی کر کے شائع کروایا۔ جلد ہشتم کے دیباچہ میں خواجہ قمرالدین لکھتے ہیں:-

> "اس دعاگو کی آرزو ہے کہ مثل جلد ہائے گذشتہ اس ناقص زبان کی
> ہرزہ سرائی کو بھی سخنوران عالم قبول فرمائیں اور نکتہ چینی سے چشم پوشی رکھیں
> اور ہمیشہ دعائے خیر سے اس گنہگار کو یاد فرماتے رہیں۔ مجھ پر فرض تھا کہ
> اپنے پدر مرحوم و مغفور کی یادگار کو جو ناتمام رہی تھی پورا کروں اور خدمات
> پدری کو ادا کروں۔ شکر صد شکر کہ میری تمنائے دلی آرزوئے اصلی بر آئی۔
> یعنی حسب منشائے خاطر یہ افسانہ تکمیل کو پہونچا"[۱]

حکیم مقرب حسین خاں غنی رئیس میرٹھ کی شائع کردہ جلدوں کے نام حسب ذیل ہیں:-

جلد ششم مصباح النہار[۲]

---

[۱] مرأت الاضمار جلد ۸ [۲] مقرب حسین کی مصباح النہار مل نہیں سکی اس لیے اس کا سن طبع معلوم نہ ہو سکا لیکن یہ بات یقینی ہے کہ وہ ۱۲۹۸ھ سے قبل ہی شائع ہوئی کیونکہ ۱۲۹۲ھ میں خواجہ قمرالدین نے اپنی نگرانی میں طبع کرائی تھی۔

جلد ہفتم کاشف الاسرار خورشید نامہ ۱۳۰۰ھ/ ۱۸۸۳ء

جلد ہشتم خاتم الاسمار معز الدین نامہ ۱۳۰۴ھ/۱۸۸۷ء

مقرب حسین نے اپنی پہلی دو جلدیں سلطان واجد علی شاہ کے نام سے منسوب کی ہیں اور آخری جلد راجہ بلونت راؤ بہادر سندھیا کے نام پیش کی ہے، ان کی طباعت مطبع دار العلوم میرٹھ میں ہوئی۔

"بوستان خیال" کی مقبولیت دلی تک ہی محدود نہ رہی بلکہ دوسرے مقامات پر بھی اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جا رہا تھا۔ دلی کے بعد لکھنؤ اردو کا بڑا مرکز رہا ہے۔ وہاں بھی "بوستان خیال" کے گلہائے رنگین و خوشبودار خوشبو بکھیر رہے تھے۔ لکھنؤ میں "بوستان خیال" کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ رجب علی بیگ سرور جیسے صاحب طرز نے اس کے اردو ترجمے کا ارادہ کیا تھا۔ ڈاکٹر نیر مسعود لکھتے ہیں :۔

> "ایک ادیب کی حیثیت سے ان کی (سرور) حوصلہ مندی میں کوئی فرق نہ آیا تھا اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے میر تقی خیال کی ضخیم فارسی داستان "بوستان خیال" کے ترجمے کا عزم کیا "بوستان خیال" کا حجم سرور کی تمام تالیفوں کے حجم سے بھی کہیں زیادہ ہے سرور نے مرزا احمد سے "بوستان خیال" کی جلدیں منگائی تھیں مگر انھوں نے غلطی سے فقیر محمد گویا کی "بستان حکمت" بھیج دی"۔[1]

اگر سرور کے ہاتھوں یہ ترجمہ ہو جاتا تو دبستان لکھنؤ کے کارناموں کا ایک اہم کارنامہ ہوتا۔

اس سے پیشتر ذکر کیا جا چکا ہے کہ خواجہ امان نے "بوستان خیال" کی ابتدائی جلدوں یعنی مہدی نامہ اور اسمعیل نامہ کا ترجمہ نہیں کیا تھا لکھنؤ کے مرزا محمد عسکری عرف چھوٹے آغا نے ڈاکٹر میر ناصر علی کی فرمائش پر ان دونوں جلدوں کا ترجمہ کیا جو "مہدی نامہ" کے نام سے ایک جلد میں شائع ہوا۔ یہ منشی نولکشور پریس میں چھپا۔ "بوستان خیال" کی یہ مقبولیت دیکھ کر منشی نولکشور نے خواجہ قمر الدین سے "بوستان خیال" کے طبع کرنے کے حقوق مانگے لیکن قمر الدین نے کسی سبب سے اجازت نہیں دی۔ نولکشور نے اس کا ترجمہ اپنے طور پر کرانے کا ارادہ کیا اسی دوران انھیں اردو "بوستان خیال" کے وہ مسودات حاصل ہو گئے جو محسن علی خاں عرف آغا جو نے ترجمہ کئے تھے لیکن حیات مستعار کے ساتھ نہ دینے کی وجہ سے نظر ثانی ممکن نہ ہو سکی اور نہ آخری حصہ مکمل کیا جا سکا۔ منشی جی نے یہ مسودات مرزا عسکری اور پیارے مرزا کے سپرد کئے ان لوگوں نے بڑی دل سوزی اور عرق ریزی کے ساتھ نظر ثانی کر کے اسے مکمل کیا۔ اس کام میں

---

[1] رجب علی بیگ سرور از ڈاکٹر نیر مسعود ص ۱۱۵

مرزا علی خاں بھی شامل تھے، آخری جلد "تفریح الاحرار" کا نامکمل ترجمہ پیارے مرزا اور مرزا علی خاں نے مکمل کیا۔
"مہدی نامہ" کو شامل کر کے کل ۹ "بوستان خیال" نو جلدوں میں ہے، تفصیل اس طرح ہے:۔
(جن جلدوں کے آگے نامکمل لکھا ہے وہ آغا جو نے نامکمل چھوڑی تھیں بعد کو پورا کیا گیا، آخری جلد کے ترجمہ کے بارے میں شبہ ہے کہ آغا جو نے کیا تھا یا نہیں)

شمار جلد	نام اردو	سال طباعت پہلا ایڈیشن	دوسرا ایڈیشن	تعداد صفحات
اوّل	مہدی نامہ	۱۸۸۲ء	۱۸۸۶ء	۶۶۴
دوم	دوحۃ الابصار	۱۸۹۰ء		
سوم	ضیاالابصار	۱۸۹۰ء	۱۸۹۹ء	۴۳۷
چہارم	شمس الانوار	۱۸۹۰ء		
پنجم	مطلع الانوار	۱۸۹۰ء	۱۹۰۸ء	۹۸۸
ششم	خزینۃ الاسرار	۱۸۹۰ء	۱۹۱۵ء	۱۱۴۸
ہفتم	نورالانوار	۱۸۹۰ء	۱۹۰۷ء	۸۵۶
ہشتم	مشرق الآثار (نامکمل)	۱۸۹۱ء	۱۹۰۷ء	۷۰۶
نہم	تفریح الاحرار (")	۱۸۹۱ء	۱۹۱۲ء	۷۱۲

جلد ہشتم کے سرورق پر لکھا ہے:۔

"بخیال تفریح اہل عالم افصح الصفی ابلغ البلغا ..... جناب منشی پیارے مرزا صاحب نے اردو میں ترجمہ فرمایا"۔[1]

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ "مشرق الآثار" کا مکمل ترجمہ پیارے مرزا نے کیا ہوگا لیکن ناشر نے خاتمہ میں اس بات کی وضاحت کر دی ہے:۔

"اس حصہ کو ابتدا سرو سرکردہ اقلیم سخن گستری و سرخیل ارباب معنی پرور حسان ہندوستان سحبان زماں جناب مرزا محسن علی خاں عرف آغا جو

---

[1] مشرق الآثار جلد ۸ دوسرا ایڈیشن۔

متخلص بہ مہدی فردوس مکان نے بعبارت سلیس اردو باسلوب پسندیدہ
ترجمہ فرمایا تھا مگر مرحوم کی عمر نے بسبب اتفاق قضا و قدر اس قدر وفا نہ کی کہ یہ حصہ
اور نیز اس کے قبل و بعد کے حصص کی تکمیل ترجمہ کے لیے کافی ہوسکتی ......
مرزا عسکری عرف چھوٹے آغا صاحب مترجم جلد اول بوستان خیال مسمی مہدی نامہ
خود آغا صاحب موصوف ہی کو اس کی نظر ثانی اور ترتیب کی تکلیف دی اور
اجزائے گمشدہ وغیرہ مرتب کی تکمیل و ترتیب باادائے معاوضہ معتد بہ بہ شیوا
زبان سخن پیرا منشی پیارے مرزا صاحب سے کرا کر ماہ اپریل ۱۸۹۱ء مطابق
شعبان المعظم ۱۳۰۸ھ میں بار اول ہدیہ شائقین والا گہر فرمایا۔" [1]

اسی طرح کی عبارت دوسری جلدوں میں بھی لکھی ہوئی ہے اس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ نواب محسن علی خاں نے "مہدی نامہ" کو چھوڑ کر تمام "بوستان خیال" کا ترجمہ کیا تھا، طباعت کی نوبت نہ آئی تھی کہ انھوں نے انتقال کیا اور بعد وفات ترجمے کے کچھ حصے گم ہو گئے جن کو وقتِ اشاعت پیارے مرزا اور مرزا علی خاں نے مل کر پورا کیا۔

"بوستان خیال" کے چند ترجموں کا یہاں ذکر کیا گیا ہے ان کی عبارت کے چند نمونے پیش کیے جاتے ہیں۔

مہدی علی خاں ذکی مرادآبادی کی "طلسم سعید" کی عبارت کا نمونہ :۔

"شہزادی ...... حاصل کلام یہ کہ مطلب آپ کا کیا ہے یعنی حصول مطلب پر جی دوڑتا ہے، خیر ہے صاحب، ہوش کی خبر رکھیے ایسے ہم گئے گذرے نہیں کہ آسودہ دفعتاً ہو جائیں اور آپ کا کیا اعتبار کل سبز پوش پر طبیعت کا لگاؤ تھا اور آج بنفشہ پوش پر کل کو شاید اور کوئی زیب نگار جو ہم سے بہتر نظر آئے پس دلِ حضور ادھر لگ جائے اور یہ مقام طلسم جمشید انجام ہے۔ یہاں ایک سے ایک نگارت گر ہوش دل آرام ہے پس ایسی جا دل کیوں پھنسائیے"۔ [2]

---

[1] مشرق الآثار جلد ۸ ص ۶۰۶

[2] ماخذ از اردو کی نثری داستانیں ص ۴۰۴

بیان میں جو برجستگی اور بے ساختگی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ذکی کو روزمرہ پر قدرت حاصل تھی۔ مقفع نثر سے پہلو بچایا گیا ہے۔

شیخ علی بیمار بریلوی کی عبارت ملاحظہ ہو:۔

"معزالدین پھر تلوار کھینچ کر اس درخت کی طرف چلا اس مرغ نے پکار کر کہا اے شہریار آپ کی عقل کہاں گئی رنگ افروز لاقوت شیطان پرست کی بیٹی کے کہنے سے گناہ پر کمر باندھی ہے رنگ افروز نے غصہ ہو کر کہا او ملعون، بے حیا، تیری موت تو نہیں آئی بھلا طلسم کشا تیرے بہکانے کا ہے وہ بولا مثل مشہور ہے جھوٹے کے آگے سچا رو دے، رنگ افروز اس کی تقریر سن کر یاقوت سے بولی۔ چچا جان یہ جانور شیطان بچہ ہے آپ صاحبقران سے عرض کریں یہ وسواس کے دل پر تیر ماریں" [1]

مندرجہ بالا دونوں ترجمے رامپور میں کئے گئے۔ ان کے اسلوب نگارش کا مختصر اقتباس سے کوئی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔

سید نادر علی سیفی نے جو "بوستان خیال" کی تلخیص کی ہے اس کے لیے انھوں نے خواجہ امان کے ترجمے کو بنیاد بنایا ہے سیفی کی تلخیص مختصر ہونے کے باوجود بھی خاصی طویل ہو گئی ہے۔ جس کی وجہ اس کی اٹھارہ جلدیں ہیں ذیل میں ان کی جلد چہارم کا ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے:۔

"اس اثنا میں شام ہو گئی ناگاہ چند کنیزیں بہ لباس تکلف باغ میں آئیں۔ انھوں نے بالاتفاق کہا اے شہریار آفریں ہے تم کو کہ تم کسی کنیز خواص سے مختلط نہ ہوئے، ہر گاہ تمہارا استقلال مزاج ہماری ملکہ نے سنا دل و جان سے تم پر عاشق ہو گئی اور خود تمہاری ملاقات کے واسطے یہاں تشریف لاتی ہے ان کے کلام ختم کرنے کے بعد ایک نازنیں مہ جبیں چند خواصان زریں پوش کے ہمراہ اس شکل و صورت کی باغ میں آئی کہ اگر فرشتہ بھی ایک نظر دیکھتا قوت ملکوتی سلب ہو جاتی، شہزادے نے جو وہ صورت نرم و گرم دیکھی بے قرار ہو گیا لیکن اس مکان سراپا فساد کے خوف سے کچھ دم نہ مارا اور جلد جلد اسم اعظم

---

[1] اردو کی نثری داستانیں ص ۶۰۴

کا اوراد کرنے لگا" (۲۲۵) [51]

یہ عبارت "معزالدین نامہ" کا حصہ ہے جو خواجہ امان کے ترجمہ کی پہلی جلد ہے سیفی نے خواجہ امان کے ترجمے کو تقریباً من وعن مندرجہ بالا عبارت میں نقل کر دیا ہے۔ درمیان میں کچھ جملے حذف بھی کر دیئے ہیں بہرکیف سیفی نے جتنا بھی مختصر کرنے کی کوشش کی ہے وہی ان کی کامیابی ہے جب مصنف ہی ایجاز واختصار کو کام میں لائے تو تلخیص کرنے والے کو سوچنا پڑتا ہے کہ کس حصّے کو شامل کرے اور کون سا حصہ حذف کرے۔ میر تقی خیالؔ نے خود ہی اختصار کو پیش نظر رکھا ہے۔

"بوستان خیال" کے دہلوی اور لکھنوی ترجمے قابل ذکر اور مکمل ہیں یہ بات تو واضح ہو چکی ہے کہ خواجہ امانؔ دہلوی نے سب سے پہلے اس کا باقاعدہ اُردو ترجمہ کیا اور جو ۱۸۸۳ء تک طبع ہو کر منظر عام پر آگیا۔ لکھنوی ترجمے اس کے کافی بعد شائع ہوئے محسن علی خاں اور خواجہ امانؔ کے ترجموں کا موازنہ کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ محسن علی خاں عرف آغا تجّو نے خواجہ امان کے ترجمے سے استفادہ کیا ہے خواجہ امان نے غالباً فارسی نثر کا لفظ بہ لفظ ترجمہ کر دیا ہے دیباچہ میں اس کا سبب یوں بیان کرتے ہیں:۔

"اگر احیاناً یا تصرفاً اس کے ترجمے میں سوائے بیان مصنف کے کچھ جودت طبع کی جاتی حسن قصہ ہرگز باقی نہ رہتا اور وہی مزا ملتا کہ جیسے ان حضرات نے گلستان شیخ سعدی کو یا شاہنامۂ فردوسی کو اُردو کیا ہے غرض کہ اسی نظر سے اس خاکسار نے ترجیع بیان اور درازیٔ زبان سے قطع نظر کی" [52]

یہاں حکیم مقرب حسین خاں کے ترجمے کا ذکر کرنا بھی لازمی ہے، مقرب حسین اگرچہ خواجہ امان کی ترجمہ کی ہوئی جلد ششم اور ہفتم خواجہ قمرالدین سے برائے اشاعت لے گئے تھے لیکن اپنے نام سے چھپوانے سے قبل انھوں نے اس ترجمے میں اچھی خاصی تبدیلی کی، اس میں شبہ نہیں کہ حکیم صاحب اچھے زباں داں تھے۔ لفظیات کا بے شمار خزانہ ان کے پاس تھا میرٹھ وطن ہونے کے علاوہ اودھ سے فیض حاصل کیا تھا، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے مقفّٰی و مسجّع نثر لکھی ہے اگرچہ "فسانہ عجائب" کا اسلوب کم استعمال کیا جانے لگا تھا تاہم وہ فضا ابھی موجود تھی جس میں "فسانہ عجائب" کی تالیف ہوئی تھی۔ مقرب حسین نے ایسی ہی نثر لکھی ہے، نہ صرف یہ بلکہ انھوں نے مضامین کے بیان میں بھی اختصار سے کام لیا ہے۔ بقول مرزا فرحت اللہ بیگ جو

---

[51] ایضاً ص ۶۱۴

[52] از دیباچہ حدایق انظار ص ۲

مضمون خواجہ امان کے ترجمہ میں ۲۲ صفحات پر لکھا ہے حکیم صاحب کے ترجمے میں وہ ۱۳ صفحات میں ہی سما گیا ہے اور وہی مضمون آغا تجو کے یہاں ۲۴ صفحات میں پھیلا دیا گیا ہے[۱] مقرب حسین کی مقفیٰ اور مرصع نثر کا اندازہ ان کے اس اقتباس سے واضح ہو جائے گا:۔

"میں اس کتاب کو ایک ایسے رئیق دوراں کے پیشکش کرتا ہوں جو خود بھی صاحب تصنیف و تالیف ہیں اور جن کی اخلاق عمیم اور لیاقت مجسم کا شہرہ اکناف عالم میں آفتاب کی طرح روشن ہے اعنی مبدعٔ قوانین کشورستانی، مخترع قواعد جہانبانی، غرہ ناصیہ صبح ہدایت قرہ باصرہ آفتاب ولایت، گرامی سازہ گوہر آدم درخشاں تر از نیر اعظم، لب لباب امتزاج لیالی و ایام زبدہ نتائج عناصر و اجرام، فرزندہ گوہر بختیاری، فرازندۂ پایہ تخت تاجداری قدردان جوہر خردمندان، قیمت ستائش گوہر ہمت بلنداں، گرہ کشای کار فروبستگان، مرہم بند ناسور دل خستگاں صاحب دل روشن رائے جہان بخش جہاں پیرائے عارف اطوار سبل، کامیاب صلح کل، زود رس دیر گیر، بسیار بخش اندک پذیر، دقیقہ شناس حفظ مراتب، موی شگاف تقسیم روایت، برباد گراں سنگ، صاحب فرعالی فرہنگ، فرخندہ رای خجستہ منظر، فرخ طالع بلند اختر، عالی حشم، والاخدم، محامد انتساب سرو نمنت رلیہ بلونت راؤ بہادر سیندھیا خلف اکبر مہاراجہ جیاجی راؤ سیندھیا عالی جاہ بہادر کنار نگ گوالیار صاعف اجلالہ واقبالہ اور مجکو امید ہے کہ جناب ممدوح اون نکات کی بخوبی داد دیں گے جو ہنگام تالیف اس طوفان خیز کتاب کے مرعی خاطر رہے ہیں"۔[۲]

اس مثال سے ناظرین یہ نہ سمجھیں کہ حکیم مقرب حسین نے تمام تر ترجمہ اسی انداز سے کیا ہے اول تو اتنی طویل داستان میں یہ اسلوب برقرار رکھنا جوئے شیر لانے سے بھی مشکل کام ہے دوم اگر کر بھی لیا جاتا تو آگے چل کر شاید تمام جلدیں مترجم کے گھر پر ہی رکھی رہتیں، کیونکہ اس کے سمجھنے میں دماغ سوزی

---

[۱] رسالہ اردو اپریل ۱۹۳۱ء۔

[۲] خاتم الاسمار، جلد ۸، ص ۲۔

کون کہتا ہے حکیم صاحب نے اپنے ترجمے میں پرشکوہ اور باوزن الفاظ کے استعمال کی حتی الامکان کوشش کی ہے انصاف کی بات تو یہ ہے کہ مقرب حسین نے خوبصورت زبان استعمال کی ہے یہ اور بات ہے کہ انھوں نے عبارت میں کمی کر دی ہے ان کے اختصار کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔ سلطنت قاف کا بیان آغا مجو نے یوں کیا ہے:۔

"حلاوت یابان طعام مختلف الالوان سخن و ذائقہ یابان حلوائے شیریں ہنر دفن شہد مضامین ہذا میں اس طرح رطب اللسان ہوئے ہیں کہ ہفت قلۂ قاف باعتبار عرض دو طرح سے تقسیم کیا گیا ہے ایک حصہ شمالی اور دوسرا حصہ جنوبی اور ان دونوں حصوں میں حضرت سلیمان نبینا و علیہ السلام اور آصف بن برخیا کی نسل سے دو زنان پریزاد باحتشام و شان مالا کلام حکمران ہیں لیکن یہ واضح رہے کہ یہ دونوں زناں حکمران اطراف جنوبی و شمالی پردۂ قاف باعتبار پدران معظم خواتین نوع انسان سے ہیں اور باعتبار مادران معظم سلاطین نوع پریزاد سے ہیں اور ان اطراف مذکورہ بالا میں عہد سلطنت و نبوت حضرت سلیمان علیہ السلام سے یہ قاعدہ ضابطہ مقرر ہے کہ سوائے گروہ اناث کے فرقہ ذکور حکمرانی نہیں کر سکتا ہے اور یہی انتظام تا ہنوز باقی ہے" [۱]

اسی پوری عبارت کو مقرب حسین نے اس طرح مختصر کر کے پیش کیا ہے:۔

"بیا ساقیا ہمدم رازداں ۔ کہ باز آمدم بر سر داستان مخفی نہ رہے کہ ہفت قلہ قاف عرضا دو منقسم ہیں ایک طرف جنوبی دوم طرف شمالی اور ان دونوں جانب پریزادان باعز و جاہ حضرت سلیمان علیہ السلام و حضرت آصف بن برخیا کی اولاد سے جن کے باپ والا قدر انسان اور ماں نوع پریزاد سے ہیں بادشاہ ہوتے آئے ہیں بلکہ عہد حضرت سلیمان سے ہمیشہ سلطان وقت جنس اناث سے رہا ہے اور اب بھی ایسا ہی ضابطہ ہے" [۲]

---

[۱] مشرق الآثار جلد ۸ ص ۴۔

[۲] کاشف الاسرار جلد ۷ ص ۱۔

مقرب حسین نے اختصار میں بالکل وہی انداز اختیار کیا ہے جو سیفی نے "بوستان خیال" کی تلخیص میں اپنایا ہے لیکن سیفی کے مقابلہ میں حکیم صاحب کا اسلوب بیان پُرشکوہ ہے اوپر دو مثالیں اُن کی نثر سے پیش کی گئی ہیں، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لکھنؤ کی پُرتکلف اور پُرتصنع زبان کو زیادہ از حد پسند فرماتے ہیں. قیاساً یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ مقرب حسین نے آخری جلد میں بھی خواجہ قمرالدین کے ترجمہ سے مدد لی ہو گی کیونکہ فارسی "بوستان خیال" کم یاب تھی کچھ ریاستوں میں اس کے قلمی نسخے موجود تھے جن تک ہر ایک کی رسائی مشکل تھی یہ قیاس اس بات سے اور بھی تقویت پاتا ہے کہ خواجہ قمرالدین آخری جلد ۱۸۸۳ء میں چھپوا چکے تھے اور مقرب حسین نے جلد ہشتم یا جلد آخر ۱۸۸۷ء میں شائع کرائی بات خواجہ امان کے ترجموں سے مستفید ہونے کی چلی ہے تو یہ بات بھی ذہن میں ابھرتی ہے کہ آغا جوّ نے صرف سات جلدوں کا ترجمہ کیا "مہدی نامہ" کو انھوں نے بھی کسی سبب سے قابلِ ترجمہ نہیں گردانا، اور آخری جلد کا ترجمہ کرنے سے قبل ان کا انتقال ہو گیا بالکل یہی صورتِ حال خواجہ امان کی ہے انھوں نے "مہدی نامہ" کو خارج از ترجمہ رکھا اور جلد آخر کے ترجمہ کرنے سے قبل ہی وفات پائی۔ ایسا کیوں ہے؟ محض اتفاق ہے ممکن ہے اتفاق ہی ہو لیکن یہ خیال بھی گذرتا ہے کہ آغا جوّ نے بھی خواجہ امان کے ترجموں کو سامنے رکھ کر اپنا ترجمہ پیش کیا ہے اور ساتھ ہی اس میں کچھ اضافے اور لکھنؤ کے مخصوص اندازِ نگارش کی رنگ آمیزیوں سے بھی کام لیا ہے اس گمان کو یقین میں منتقل کرنے کے لیے دونوں ترجموں کا تقابلی مطالعہ کیا جا سکتا ہے یہ امر قطعاً ناممکن ہے کہ دو اشخاص الگ الگ مقامات پر کسی عبارت کا ترجمہ کریں اور وہ ترجمہ جملوں کی ساخت کے اعتبار سے بھی یکساں ہو لیکن خواجہ امان دہلوی اور آغا جوّ لکھنوی کے ترجموں میں لفظی مماثلت باعثِ حیرت بنتی ہے اس کے لیے مکمل جلد "ریاض الابصار" پیش کی جا سکتی ہے یہاں پر ابتدا، درمیان اور آخر کے تین حصّوں کو بطور موازنہ پیش کیا جاتا ہے۔ خواجہ امان جلد دوم کی ابتدا اس طرح کرتے ہیں:۔

> "صرافانِ اجناسِ سخنوری اور تاجرانِ متاعِ نکتہ پروری بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص محمد نام سلاطین فرغانہ کی اولاد سے دارالسلام بغداد میں رہتا تھا جب محمد سنِ تمیز کو پہونچا اس کو وفورِ دانش اور تندی شعور کے باعث المقتدر باللہ العباسی نے شہر دمشق کی حکومت دی محمد نے چند ہی روز میں حسن تدبیر اور انتظام ملکی سے اس قدر مرتبہ بہم پہونچایا کہ خلیفہ وقت نے اس کو اخشید خطاب دیا جس وقت مقتدر نے عالم فانی سے رحلت کی، بجائے مقتدر قاہر عباسی مسند خلافت اور تخت فرمانروائی پر متمکن ہوا، محمد کو حکومت دمشق کے علاوہ ملک مصر کا بھی حاکم کیا محمد کی

سرکار میں بیشتر کنیزان پیکر اور غلامان نیکو سیر تھے"۔ [1]

آغا جوؔ نے اسی عبارت کو یوں بیان کیا ہے:۔

"صرافان دار العیار سخن دانی و جوہریان رستہ بازار معانی اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص محمد نام سلاطین فرغانہ کی اولاد سے دار السلام بغداد میں رہتا تھا جب محمد سن تمیز کو پہونچا چند روز میں حسن تدبیر اور شعور کثیر کے باعث المقتدر باللہ العباسی نے شہر دمشق کی حکومت دی چند ہی روز میں اپنی مدبری اور انتظام ملکی سے اس قدر مرتبہ بہم پہونچایا کہ خلیفہ وقت سے اُس کو اخشید کا خطاب ملا جس وقت مقتدر بحکم قضا و قدر عالم فانی سے جاودانی میں منزل گزیں ہوا، بجائے مقتدر کے قاہر عباسی مسند خلافت پر متمکن ہوا قاہر نے محمد کو حکومت دمشق کے علاوہ ملک مصر کا بھی حاکم گردانا حالانکہ محمد کی سرکار میں کنیزان ماہ پیکر اور غلامان رشک قمر بکثرت تھے"۔ [2]

ان دونوں عبارتوں میں بہت کم لفظی فرق نظر آتا ہے لیکن کچھ صفحات کے بعد یہ فرق بھی ختم ہو جاتا ہے ایک اور عبارت دیکھئے:۔

خواجہ امان کا ترجمہ:۔

"راوی کہتا ہے کہ سعدان بن سعید شہر موصل کا ایک مرد مسلمان پاک اعتقاد غلامان اہل بیت سے تھا جس وقت اس نے جمشید کے وارد ہونے کی خبر سنی حسب قدر اپنے نزل و علوفہ بھیجا اور ایک عرضی باین مضمون لکھی اے بادشاہ جو خرابی اور بربادی تم کو اہل حلب کی تمہارے لشکر سے وقوع میں آئی میں نے مفصل سنی اگر میری اطاعت و فرمانبرداری تم کو ملحوظ خاطر ہے میں حاضر ہوں بلکہ اسی نظر سے میں نے نزل و علوفہ تمہاری خدمت میں بھیجا"۔ [3]

---

[1] ریاض الابصار جلد دوم۔

[2] ضیاء الابصار جلد سوم۔

[3] ریاض الابصار دوم ص۲۰۔

آغا جوؔ کے ترجمہ کی عبارت یہاں نقل کرنے کی ضرورت نہیں، اس پوری عبارت میں اور "ضیا الابصار" کی عبارت میں بس اتنا ہی فرق ہے کہ "نزل و علوفہ" کی جگہ "پیشکش" لکھ دیا ہے۔

اسی جلد کے خاتمہ کی عبارت بھی ملاحظہ ہو خواجہ امان کا ترجمہ :۔

"راوی التماس کرتا ہے کہ صاحبقران کی جشن کتخدائی کو ایک سال کامل کا طول ہوگا اور اس عرصہ میں گاہے صاحبقران اکبر اور سلاطین مخالف میں باہم میدانداری و معرکہ آرائی کی نوبت پہونچے گی اور ہر روز مجالس کتاب خوانی گرم ہوگی اور اکثر اوقات صاحبقران قصر اخضر میں ملکہ شمسہ تاجدار اور ملکہ نوبہار و ناطقہ روشن بیان شاہزادیوں سے صحبت ہائے عیش و نشاط میں مشغول ہوگا اور ہر ایک سے باختلاط و گرم جوشی پیش آوے گا"[1]

آغا جوؔ کے ترجمہ کا اختتامیہ حصہ اس طرح ہے:۔

"التماس راوی صدق اساس آں کہ صاحبقران اکبر یعنی معزالدین والا گوہر کی جشن کتخدائی کو ایک سال کامل کا طول ہوگا اور اس عرصہ میں گاہے گاہے صاحبقران اکبر اور سلاطین مخالف سے باہم میدانداری و معرکہ آرائی کی بھی نوبت پہونچے گی اور ہر روز مجلس کتاب خوانی گرم ہوگی اور اکثر اوقات صاحبقران اکبر قصر اخضر میں شمسہ تاجدار اور ملکہ نوبہار اور ناطقہ روشن بیان وغیرہ شاہزادیوں سے صحبت ہائے عیش و نشاط میں مشغول ہوں گے اور ہر ایک سے باالتفات و اختلاط و گرم جوشی پیش آویں گے"[2]

ان چند مثالوں ہی سے دونوں ترجموں کی مماثلت واضح ہوجاتی ہے یہی حال دوسری جلدوں میں ہے۔ راقم الحروف کا مقصد آغا جوؔ پر یہ الزام چسپاں کرنا نہیں ہے کہ انھوں نے خواجہ امان کے ترجمہ کی نقل کی ہے لیکن یہ سوال بہرحال اہمیت رکھتا ہے کہ دونوں ترجموں میں اس حد تک مماثلت کیوں ہے؟ اور اس کا یہی جواب ہوسکتا ہے کہ موخرالذکر نے اپنے پیش رو ترجمہ کو سامنے رکھا ہے۔

لکھنؤ میں "بوستان خیال" کے ترجمہ کی ابتدا مرزا عسکری کے ترجمہ سے ہوتی ہے اس لیے یہ ضروری معلوم

---

[1] ریاض الابصار جلد دوم ص ۵۲۴

[2] ضیاء الابصار جلد سوم

ہوتا ہے کہ یہاں ان کے ترجمہ پر بھی ایک نظر ڈالی جائے، مرزا عسکری اپنے زمانہ میں لکھنؤ کے نثر نگاروں کی آبرو خیال کیے جاتے تھے ان کا ترجمہ "مہدی نامہ" کی شکل میں ہے۔ "مہدی نامہ" دو حصوں پر مشتمل ہے، یہ پہلا حصہ یعنی "مہدی نامہ" ص ۱۲۴ پر ختم ہو جاتا ہے صفحہ ۱۳۴ سے فارسی کی دوسری جلد اسمعیل نامہ کا آغاز ہوتا ہے۔ "مہدی نامہ" کے ترجمے میں مرزا عسکری نے کافی کانٹ چھانٹ سے کام لیا ہے، بعض حصوں کو حذف کر دیا ہے بہرحال انھوں نے جو بھی سلوک ترجمہ کے ساتھ کیا ہو اس سے غرض نہیں، بلکہ ان کا یہ اقدام قابلِ ستائش ہے کہ انھوں نے "بوستان خیال" کے قارئین کو اس گلستاں کی سیر کرائی جس کو خواجہ امان اور آغا حجو نے نظر انداز کر دیا تھا۔

باعتبار اسلوب مرزا عسکری کامیاب نظر نہیں آتے، لکھنؤ کے اسلوبِ نگارش سے وابستگی کے سبب وہ زبان و بیان کو پُر تکلف بنانا چاہتے ہیں اور اس کوشش میں سادگی اسلوب کی عنان ان کے ہاتھ سے چھوٹ جاتی ہے اور مرکبِ بیان اسپِ آوارہ کی طرح اِدھر اُدھر بے ترتیب چھلانگیں لگاتا ہوا نظر آتا ہے، اسی باعث ان کے اسلوب میں نہ لکھنؤ کی رنگینی نظر آتی ہے اور نہ دہلی کی روانی۔ بیان میں ایک الجھاؤ سا پیدا ہو گیا ہے۔ ان کی عبارت میں 'کہ' کی تکرار بہت زیادہ ملتی ہے۔ ذیل میں ان کے ترجمہ ایک نمونہ پیش کیا جاتا ہے اگرچہ اس چھوٹے سے اقتباس سے ان کے طرزِ بیان کا مکمل نقش ابھر کر سامنے نہیں آتا تاہم اس سے کچھ اندازہ ضرور ہوتا ہے:۔

> "راوی کہتا ہے کہ عماد جنی لشکر اسلام کی طرف روانہ ہوا، بسبب جانے فجاد کے وہ سدّ آب برطرف ہوئی تھی کوئی چیز عماد کی سدّ راہ نہ ہوئی، یہاں تک کہ لشکر میں داخل ہوا، سیّد عبدالرحیم کو اپنے حال میں دیکھا لیکن امرائے دیگر مثل عرب شجاع وغیرہ دلاوروں کو عجب ہیئت سے دیکھا چونکہ جنی تھا اور اہل طلسم سے تھا کہ حال ان کا کچھ اور ہے تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ عماد بہ صورت بشری سیّد عبدالرحیم کی بارگاہ میں داخل ہوا۔ سیّد کو بارگاہ میں نہ پایا ...... حیران ہو کے درگہ سالار سے پوچھا کہ یہ قاعدہ اہل اسلام کا نہیں ہے کہ اس وقت بے سبب دربار نہ کریں اس نے بالضرورت کہا کہ میں جنی ہوں چونکہ عماد سے سب لوگ واقف تھے اُس کے آنے سے خوش ہوئے" [1]

---

[1] مہدی نامہ ص ۸۸ دوسرا ایڈیشن

اس کے برعکس آغا جوؔ کی زبان شستہ و برجستہ مگر پُر تکلف ہے لیکن مرزا عسکری کی شخصیت کو اس لیے بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے آغا جوؔ کے ترجموں کی اشاعت میں بھی مدد فرمائی۔

بوستانِ خیال

کا

سیاسی پس منظر

ہندوستان نہ کسی ایک قوم کا نام ہے اور نہ ہندوستانی تہذیب کسی ایک قوم کی دی ہوئی تہذیب ہے۔ یہاں ہر زمانے میں دور دراز ممالک سے قومیں آئیں۔ قرنوں اور صدیوں یہاں رہیں اور رفتہ رفتہ اسی سرزمین کو اپنا وطن بنالیا دراوڑ اور اسٹرک قبائل کے بعد آریا قوم یہاں آئی۔ ان کی اپنی تہذیب تھی، اپنی زبان تھی لیکن ان کے ہندوستان میں داخل ہونے کے بعد یہاں کے قدیم باشندوں سے مل جل کر ایک نئی تہذیب ابھری، ایک نئی زبان بنی۔ بعد ازاں شک اور ہُن جیسے وسط ایشیائی قبیلوں نے اس سرزمین پر جارحانہ قدم رکھا اور یہاں کی صدیوں کی تہذیب اور مذہبی زندگی میں ایک ہلچل پیدا کر دی پھر مسلمانوں نے ہندوستان کا رُخ کیا۔ یعنی عرب، ایرانی، ترک، افغانی یہاں آکر بسے۔ بلکہ قریب قریب ایک ہزار سال یہاں حکومت کی اور اس طرح ایک اور تہذیب اپنے امتیازی خدوخال کے ساتھ نمود پذیر ہوئی ڈاکٹر تاراچند لکھتے ہیں :۔

> "ہندوستان میں آگے چل کر یہ کشش پیدا ہوگئی کہ بہت سی نسلیں یکے بعد دیگرے کھنچ کر یہاں آئیں اور یہیں بس گئیں یہ اپنی زبانیں، اپنے رسم و رواج اپنا تہذیب و تمدّن اپنے ساتھ لائیں اور ہر نسل اپنی پیش رو نسلوں اور ملک کے اصل باشندوں کے ساتھ مل جل کر شیر و شکر ہوگئی۔
> ان کا یہ باہمی اختلاط اور آمیزش جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے قدیم ترین زمانے میں شروع ہوکر موجودہ عہد میں تکمیل کو پہونچتی ہے اور ہندوستان کی تاریخ درحقیقت ان مختلف نسلوں اور مختلف تہذیبوں کے امتزاج کی تاریخ ہے۔"[۱]

ہندوستان کے مسلم حکمرانوں میں ایک اور خاندان جس کا پہلا حکمراں اور فاتح بابر تھا۔ مغل خاندان کے نام سے برسرِ اقتدار آیا۔ مغلوں نے قریب تین سو برس ہندوستان میں حکومت کی۔ اس میں ڈیڑھ سو برس عروج کا زمانہ رہا اور آخر کے ڈیڑھ سو برس میں یہ پُرجلال اور پُرشکوہ حکومت رفتہ رفتہ زوال کی انتہا کو پہنچ گئی۔

---

[۱] اہلِ ہند کی مختصر تاریخ صفحہ ۴

گجرات سے محمد تقی خیال نے تلاشِ معاش میں جس دلی کا سفر کیا تھا وہ شاہ جہاں کی دلی نہ تھی بلکہ بادشاہ گروں کی دلی تھی۔ بادشاہ گل دان کے پھولوں کی طرح بدلے جا رہے تھے۔ جس طرح اورنگ زیب نے اپنے بھائیوں کو شکست دے کر حکومت حاصل کی تھی اسی طرح اورنگ زیب کی وفات کے بعد اس کے بیٹوں میں تخت و تاج کے جنگیں ہوئیں۔ اورنگ زیب نے اپنی زندگی ہی میں پورے ملک کو اپنے بیٹوں میں تقسیم کر دینا چاہا تھا۔ سب سے بڑے بیٹے شہزادہ محمد معظم کو شمالی ہند اور کابل کی صوبے داری دے رکھی تھی۔ وسط ہند اور گجرات میں محمد اعظم اور جنوبی ہند میں کام بخش کو مقرر کیا تھا۔ یہ تینوں آپس میں ٹکرائے۔ بالآخر سب سے بڑے بیٹے محمد معظم نے فتح حاصل کی اور اورنگ زیب کے بعد شاہ عالم بہادر شاہ (اوّل) کے لقب سے ہندوستان کا شہنشاہ بنا۔ بہادر شاہ کے زمانے میں کچھ بغاوتیں ابھریں۔ مثلاً: راج پوتوں اور سکھوں نے بغاوت کی لیکن بہادر شاہ نے ان پر قابو پا لیا۔ مرہٹوں نے صلح کر لی۔ ۱۷۱۲ء میں پانچ برس حکومت کرنے کے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ وہی پھر مسئلہ پیش آیا۔ بھائیوں میں تخت و تاج کے لیے لڑائی ہوئی۔ سب سے بڑا بیٹا جہاندار شاہ (۱۷۱۲ء تا ۱۷۱۳ء) کامیاب ہوا۔ اور تختِ دہلی پر جلوس فرما ہوا۔ بقول ڈاکٹر تارا چند: "یہ بادشاہ بالکل نالائق تھا" اور اسے عیاشی اور رنگ رلیوں کے سوا کسی اور چیز سے سروکار نہ تھا۔[1] بادشاہ کا اثر تمام ارکان اور امرائے دولت پر بھی ہوا، پھر اس سے گویا پوری سلطنت متاثر ہوئی۔ ہر طرف بدامنی اور بدانتظامی پھیل گئی۔

جہاندار شاہ کی زندگی میں ایک ادنا درجے کی عورت لال کنور بھی داخل تھی۔ چونکہ خود بادشاہ لہو و لعب میں غرق رہتا تھا، اس لیے یہ عورت سلطنت کے معاملات میں شریک ہونے لگی، اور اس نے اپنے رشتہ داروں کو دربار میں بڑے بڑے عہدے دلوائے۔ ولیم اردن نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ جس طرح جہانگیر کے عہد میں نور جہاں کا سکہ جاری ہوا تھا، جہاندار شاہ کے عہد میں لال کنور کے نام کا سکہ جاری ہوا۔

ادھر یہ عیش و نشاط میں مصروف تھا۔ دوسری طرف تخت و تاج کے دوسرے حق دار اس کوشش میں تھے کہ اپنا حق چھین لیں۔ بہادر شاہ کا بیٹا اور جہاندار شاہ کا بھائی عظیم الشان جو بہادر شاہ کے ساتھ جنگ کرتے ہوئے مارا گیا۔ اپنے باپ کی موت کی خبر سن کر اس کے بیٹے فرخ سیر نے بہار و بنگال میں خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ شاہ عالم بہادر شاہ کی تخت نشینی کے وقت سید بھائیوں میں سے تین بھائی اس کے معاون ہوئے تھے۔ جن میں ایک تو انھیں معرکوں میں مارا گیا، بقیہ دو سید حسن علی عبداللہ اور حسین علی کو

---

[1] اہلِ ہند کی مختصر تاریخ ص ۲۴۶

بہار اور الہ آباد کی صوبیداری سونپ دی گئی تھی۔ یہی سیّد بھائی اب فرخ سیر کے مددگار بنے۔ ان کی مدد سے فرخ سیر نے دہلی کی طرف جہاندار شاہ کے مقابلے کے لیے کوچ کیا۔ ۱۷۱۳ء میں آگرے کے قریب دونوں میں مقابلہ ہوا۔ جہاندار شاہ شکست کھا کر دہلی کی طرف بھاگا۔ لیکن وہاں بھی محفوظ نہیں رہ سکا اور فرخ سیر کے سپاہیوں کے ہاتھوں قتل ہوا۔

اب فرخ سیر بادشاہ ہوا۔ (۱۷۱۳ء تا ۱۷۱۹ء) لیکن حکومت کی باگ ڈور اور انتظامات سیّد بھائیوں کے ہاتھوں میں رہے، کیونکہ انھیں کی مدد سے تختِ دہلی حاصل کیا گیا تھا۔ فرخ سیر نے حسن علی کو وزیر اعظم اور حسین علی خاں کو سپہ سالار مقرر کیا تھا۔ فرخ سیر کے زمانے میں بغاوتوں نے سر اٹھایا لیکن ان سب کو شکست ہوئی۔

اگرچہ بیرونی حالات پر قابو پالیا گیا لیکن دربار میں جو سیاسی اکھاڑہ بنا ہوا تھا، اس پر قابو نہ پایا جا سکا۔ بادشاہ سید بھائیوں کے احسان سے دبا ہوا تھا۔ اس لیے سید بھائیوں کا اقتدار روز بروز بڑھتا گیا۔ اور اس بڑھتے ہوئے اقتدار کو دیکھ کر دوسرے امرا اور سرداروں میں بے چینی پھیل گئی۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے خود بادشاہ بھی ان کا مخالف ہوا لیکن یہ لوگ اس وقت تک کافی قوت حاصل کر چکے تھے۔ چنانچہ بادشاہ کی مخالفت دیکھ کر حسین علی خاں مرہٹوں کی فوج لے کر دہلی پر چڑھ آیا۔ اور بآسانی قلعہ اور شاہی محل پر قبضہ کر لیا۔ فرخ سیر کو حکومت سے برطرف کر کے بالآخر قتل کرا دیا۔ (۱۷۱۹ء) اس کے بعد سید بھائیوں نے جہاندار شاہ کے بھائی رفیع الشان کے بیٹے رفیع الدرجات کو بادشاہ بنایا۔ (۱۷۱۹ء) لیکن وہ ایک ہی سال میں مر گیا اور اسی سال اس کے بڑے بھائی رفیع الدولہ کو تخت پر بٹھایا گیا۔ وہ بھی زیادہ دن نہ جی سکا (۱۷۱۹ء) اس کے مرنے کے بعد تیموری خاندان کے ایک اور شہزادے روشن اختر کے سر پر تاجِ شاہی رکھا گیا۔ اس بادشاہ نے ناصر الدین محمد شاہ کا لقب اختیار کیا۔ محمد شاہ کے وقت تک امرا اور عوام کے دلوں میں ساداتِ بارہہ کے لیے نفرت اور بیزاری کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ اور آخر کار ۱۷۲۰ء میں سید بھائیوں کا خاتمہ ہو گیا۔

محمد شاہ کی تخت نشینی کے سلسلے میں محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ :

> "روشن اختر شاہزادہ اگرچہ قید خانے میں تھا، لیکن دنیا کی آفتوں سے محفوظ ماں کے پہلو میں بجنت بیٹھا تھا۔ دفعتاً ستارہ اقبال اوج پر آیا۔ چند امیروں نے آ کر مجرا کیا اور دست بستہ عرض کی کہ تخت حاضر ہے چل کر اپنے قدم سے رونق دیجیے۔

شاہزادہ تو لڑکا تھا اور برسوں سے قید خانے میں آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ مگر
ماں دیکھ رہی تھی کہ جو بادشاہ ہوتا ہے۔ وہی تخت کی قربانی ہوتا ہے اس لیے
ہاتھ جوڑتی پردے سے باہر نکل آئی کہ برائے خدا مجھے تاج نہیں چاہیے۔ اس یتیم
کا سر سلامت رہنے دو اور سلطنت سے معاف رکھو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شاہزادہ یا تو
قید خانے کی کوٹھری میں پڑا تھا یا دفعتاً تمام ہندوستان کا شہنشاہ ہو گیا۔
اکبری اور جہانگیری دربار میں سارے امیروں، وزیروں کو سامنے ہاتھ باندھے
دیکھا، آنکھیں کھل گئیں۔ مگر دل میں حیران تھا کہ یہ عجب بادشاہت ہے محل
سے نکلنا ہے، تخت پر آ بیٹھنا ہے۔ تخت سے اٹھنا ہے، اندر چلا جانا ہے!
معلوم نہیں کہ دربار کیا ہے، اور ملک میں کیا ہو رہا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وزیر اور
سپہ سالار دربار کے مالک تھے جو چاہتے سو کرتے تھے اور انھیں کے بھائی
بند سارے کاروبار میں پھیلے تھے۔ باقی سب امیر برائے نام تھے۔"[1]

اس اقتباس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ خود شاہزادے بھی بادشاہ بننے سے گھبرانے لگے کیونکہ پچھلے تین چار بادشاہوں کا انجام ان کے سامنے تھا۔ محمد شاہ نے تخت سلطنت پر بیٹھنے کے بعد یہی بہتر سمجھا کہ اگر کچھ دن زندہ رہنا ہے تو سلطنت کے کاروبار کو وزرا و امرا کے ہاتھوں میں چھوڑ دیا جائے اور خود محل میں چین اور سکون کی زندگی بسر کی جائے۔

ظاہر ہے جب اختیارات وزیروں اور امیروں کے ہاتھوں میں آ جائیں گے تو ہر وزیر اور امیر اپنی ترقی کی فکر میں رہے گا اور دوسرے کو حسد کی نگاہ دیکھے گا اور یہی ہوا۔

جب سید بھائیوں کا خاتمہ ہو گیا تو محمد شاہ نے نظام الملک کو وزیر اعظم مقرر کیا۔ نظام الملک تجربہ کار اور دور اندیش آدمی تھا۔ اس نے اورنگ زیب کا زمانہ دیکھا تھا، اور اب مغلیہ سلطنت کا شیرازہ بکھرتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح سے مغل سلطنت پھر وہی جلال حاصل کرلے۔ لیکن وہ اپنی کوششوں میں ناکام رہا کیونکہ بادشاہ نے تو غرق مے ناب ہو کر امور سلطنت سے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ امیر اور سردار بھی آرام طلب اور عیش پسند ہوتے جا رہے تھے۔ علاوہ بریں آپسی جھگڑوں میں مبتلا تھے۔
میں مبتلا تھے۔

جب سلطنت کی بہبودی و استحکام کی کوئی توقع باقی نہ رہی تو نظام الملک دکن چلا گیا۔ اور وہاں پہنچ کر

---

[1] قصص ہند صہ ۱۶۳

بہت حد تک اپنی خود مختار حکومت قائم کرلی۔ اسی طرح علی وردی خاں نے بنگال میں، روہیلوں نے روہیل کھنڈ میں، برہان الملک نے اودھ میں، بنگش خاندان نے فرخ آباد کے علاقے میں خود مختاری کا اعلان کر دیا۔

غرض سلطنت بکھرتی رہی اور بادشاہ کچھ بھی نہ کرسکا تاریخ چغتائیہ کا مصنف محمد شفیع طہرانی لکھتا ہے :

"ادھر چند برسوں سے دربار شاہی کا یہ دستور سا ہوگیا ہے کہ جب کبھی دکن یا گجرات یا مالوا کے افسر مرہٹوں کی دست درازی کی اطلاع دیتے ہیں اور اس خبر سے بادشاہ کے دل میں جو زخم پہونچتا ہے اسے مندمل کرنے کے لیے وہ باغات میں چلا جاتا ہے یا شکار کے لیے جنگل میں نکل جاتا ہے۔ اسی طرح اس کا وزیر قمرالدین خاں باغات میں جاکر تالاب میں کھلے ہوئے کنول کے پھولوں کو دیکھ کر اپنا دل بہلاتا ہے، یا ندی سے مچھلیاں پکڑتا ہے یا جنگل میں ہرن کا شکار کرتا ہے، نہ تو بادشاہ کو انتظام سلطنت، لگان کی وصولی اور فوج کی ضروریات کا کچھ خیال ہے اور نہ وزیر کو کسی افسر کسی آدمی کو سلطنت کی حفاظت اور رعایا کی نگہبانی کا خیال نہیں اور حالات روز بروز بد سے بدتر ہوتے جارہے ہیں۔" [۱]

بات یہیں تک ہوتی تو اچھے یا بُرے نتائج کے ساتھ گزر جاتی لیکن مغلیہ سلطنت کا زوال تو مقدر بن چکا تھا۔ ہندوستان کی مغلیہ سلطنت شراب کے پیالے میں اٹھے جھاگ کی طرح تیر رہی تھی کہ بہادر اور جنگجو نادر شاہ نے ادھر کا رُخ کیا۔ جس وقت ۱۷۳۶ء میں نادر شاہ ایران سے افغانوں کو نکال کر بادشاہ ہوا تھا، تو بہت سے افغان ہندوستان چلے آئے تھے۔ ۱۷۳۸ء میں قندھار پر قبضہ کرنے کے بعد نادر شاہ نے محمد شاہ کو لکھا کہ اس کے دشمن واپس کر دیئے جائیں۔ لیکن اکبر و اورنگ زیب کے جانشین نے اس درخواست کی مطلق پروانہ کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نادر شاہ ہندوستان کی سرحد میں داخل ہوا۔ اسے کوئی روکنے والا نہ تھا، اور وہ کابل اور پشاور فتح کرتا ہوا لاہور تک پہونچ گیا۔ مغل بادشاہ نے اس وقت تک بھی دارالسلطنت سے حرکت نہیں کی۔ نظام الملک نے جو وزیر اعظم ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب عقل و فہم بھی تھا۔ بادشاہ کو صلاح دی کہ وہ خود فوج کے ساتھ مقابلے کے لیے نکلیں۔ لیکن نظام الملک کے رقیبوں نے بادشاہ کو اس عمل سے باز رکھا۔ نادر شاہ کی فوجوں کو اتنے قریب آتے ہوئے دیکھ کر محمد شاہ کو خود ہوش آیا اور اس نے

---

[۱] بحوالہ مرزا مظہر جان جاناں اور ان کا کلام از رزاق قریشی ص ۷

مغل فوج کے ساتھ کوچ کیا اور کرنال تک جا پہونچا، نادر شاہ جس کے قریب پہونچ چکا تھا۔

دونوں لشکروں میں جنگ ہوئی۔ قبل ازیں کہ کوئی فیصلہ ہو۔ ان شرائط پر صلح ہوگئی کہ دریائے سندھ کے پار کا علاقہ اور دو کروڑ روپے لے کر نادر شاہ واپس چلا جائے۔ لیکن وزیروں کی آپسی رقابت نے نادر شاہ کو بلا لیا۔ اس وقت دہلی پر بہت بُرا وقت آیا۔ ہوا یہ کہ جس وقت نادر شاہ قلعہ معلیٰ میں مہمان تھا کچھ بدمعاشوں نے موقع پاکر کچھ ایرانیوں کو قتل کر ڈالا۔ نادر شاہ یہ سُن کر غضبناک ہوا اور قتل عام کا حکم دیا۔ یہ ظالمانہ قتل جس میں مَرد و زن، جوان و پیر، تندرست و بیمار، بچہ و معصوم کسی کی رعایت نہیں کی گئی۔ کامل دوپہر یعنی آٹھ نو گھنٹے تک جاری رہا اور اس میں کام آنے والوں کا کم سے کم اندازہ تیس ہزار نفوس کیا گیا ہے[1] صرف انسانی جانیں ہی نہیں لی گئیں بلکہ دلی کو لوٹا گیا۔ جتنا مال و زر جس کے ہاتھ لگا اس نے لوٹ لیا۔ قریب ۵۸ دن نادر شاہ دہلی میں رہا اور جب واپس ہوا تو بے شمار دولت اونٹوں پر لاد کر یہاں سے لے گیا۔ (۱۷۳۹ء) اسی سامان میں تخت طاؤس، کوہ نور ہیرا، تین سو ہاتھی، دس ہزار گھوڑے اور اتنے ہی اونٹ بھی شامل تھے۔ غرض جتنا مال و متاع وہ لے جا سکتا تھا لے گیا اور دلی اس کے حملے کے بعد ویران ہوگئی۔ گھر کے گھر آدمیوں سے خالی ہوگئے۔ چاروں طرف جلے ہوئے مکانوں کے ملبے کا ڈھیر نظر آتا تھا۔ اتنی تباہی اور بربادی کے باوجود بھی درباریوں کا آپسی بغض و حسد ختم نہیں ہوا۔ تورانی اور ایرانی گروہ بنتے رہے اور انھیں گروہ بندیوں کے سبب دوسرے صوبے خود مختار ہوتے رہے۔

نادر شاہ کے واپس چلے جانے کے بعد بادشاہ نے امورِ سلطنت کی طرف دھیان دیا۔ نظام الملک، قمرالدین اور اسحاق خان کو اپنا مددگار بنایا۔ اسحاق خاں کچھ عرصہ پہلے ہی بادشاہ کی ملازمت میں آیا تھا۔ نادر شاہ کے ساتھ معرکے میں اس نے بادشاہ سے خوب دادِ شجاعت حاصل کی تھی۔ نادر شاہ نے بھی اس کی تعریف کی تھی اور کہا کہ جب اسحاق موجود تھا تو تم نے قمرالدین کو وزیر کیوں مقرر کیا۔ بادشاہ نے اس کو مؤتمن الدولہ کے خطاب سے نوازا۔ یہی وہ اسحاق خاں ہیں جن کے یہاں تقی خیالؔ نے ملازمت اختیار کی تھی اور یہیں سے بوستانِ خیال کی ابتدا ہوئی تھی۔ انھیں کے توسط سے خیالؔ محمد شاہ کے دربار تک پہونچے۔ ۸ اپریل ۱۷۴۵ء کو اسحاق خاں کا انتقال ہوا۔

ادھر ایران میں ۱۷۴۷ء میں نادر شاہ کو قتل کر دیا گیا اور احمد شاہ ابدالی اس کا جانشیں ہوا۔ احمد شاہ ابدالی نے بھی تخت سلطنت پر متمکن ہونے کے بعد نادر شاہ کی طرح ارادہ کیا کہ ہندوستان پر حملہ کیا جائے۔

---

[1] بحوالہ تاریخ ہند از ہاشمی صہ ۲۰۴

اور وہاں کا مال و دولت لوٹا جائے۔ اس ارادے کی تکمیل کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۸ رجنوری ۱۷۴۸ء کو وہ لاہور کے قریب تک آگیا۔ محمد شاہ نے وزیر قمرالدین کی کمان میں شاہی فوج کو ابدالی کے مقابلے کے لیے روانہ کیا۔ جب تک یہ فوج ابدالی کی فوج کے قریب پہونچی ابدالی نے لاہور کو فتح کر لیا تھا۔ لڑائی ہونے سے قبل قمرالدین کے خیمہ پر ایک گولہ آکر گرا جس سے قمرالدین جاں بحق ہوا۔ لیکن شاہزادہ احمد شاہ اور قمرالدین کے بیٹے معین الملک نے مقابلہ کیا اور فتح پائی۔ یہ مغلوں کی آخری فتح تھی جو اتفاقیہ بھی تھی۔ فتح کے بعد یہ قافلہ واپس آرہا تھا کہ محمد شاہ کی وفات کی اطلاع ملی (۱۷۴۸ء) محمد شاہ کے بعد اس کا اکلوتا بیٹا احمد شاہ تخت نشیں ہوا۔ یہ بالکل ہی نااہل اور ناکارہ ثابت ہوا۔ محمد شاہ نے اس کی تعلیم و تربیت پر بھی توجہ نہیں کی تھی۔ ایک طرف بادشاہ نااہل، دوسری طرف کوئی دانش مند وزیر بھی نہ رہا تھا۔ قمرالدین اور آصف جاہ نظام الملک مر ہی چکے تھے۔ اب سلطنت کے معاملات اس کی ماں ادھم بائی اور جاوید خاں خواجہ سرا کے ہاتھوں میں تھے۔ یہ جیسا چاہتے ویسا کرتے جاوید خاں سلطنت کی ترقی کے لیے تو کچھ نہ کرسکا۔ البتہ بادشاہ کی مے نوشی اور شاہد پرستی کو خوب ہوا دی محل کے آس پاس بھی خوبصورت عورتوں کا ہجوم لگا دیا۔ ظاہر ہے ان حالات میں نتیجہ سلطنت کی بربادی ہی نکلنا چاہیے — وہی ہوا۔ سلطنت کے حالات پہلے ہی کہاں ٹھیک تھے۔ احمد شاہ نے اپنے عہد حکومت میں خرابیٔ حالات اور تباہیٔ سلطنت میں اور اضافہ کیا۔ مولوی ذکاء اللہ لکھتے ہیں:۔

"گویا بادشاہی کے یہی معنی ہوگئے تھے کہ سارے دن مے نوشی ہو اور عورتوں سے صحبت ہو۔ رات دن طبلہ سارنگی کھڑکا کرے۔ ڈوم دھاریوں اور گویّوں بنچویوں کی دھوم مچا کرے اور دنیا سے خبر نہ ہو کہ کیا ہو رہا ہے ان رنگیلے بادشاہ کی سلطنت کے بڑے ہنگامے یہی ہیں کہ دو صوبے پنجاب اور رُہیل کھنڈ کی لڑائیوں کے خون سے رنگیں ہوں۔"[1]

خواجہ امان نے لکھا ہے کہ خیال محمد شاہ کی رحلت کے بعد بنگال چلے گئے۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ خیال ۱۷۴۸ء تک دہلی میں رہے۔

محمد شاہ کے مرنے کے بعد ایک بار پھر وہی دور لوٹ آیا جو اس کے بادشاہ ہونے سے پہلے تھا۔ یعنی وزیروں نے بادشاہ گری شروع کی۔ اب تورانیوں کا سردار عماد الملک ثالث تھا۔ یہ نظام الملک کا پوتا تھا۔ ایرانیوں کی سرپرستی صفدر جنگ کر رہا تھا۔ اس وقت عماد الملک کے ہاتھوں میں حکومت کے اختیارات تھے۔

---

[1] تاریخ ہند صفحہ ۲۸۶

اس نے بادشاہ کو معزول کیا۔ (۱۷۵۴ء) اور اس کی آنکھیں نکلوا کر قید کر دیا۔ جہاں کچھ عرصہ بعد وہ مرگیا۔ احمد شاہ کے بعد جہاندار شاہ کے بیٹے عالم گیر ثانی کو تخت پر بٹھایا۔ اس اثنا میں احمد شاہ ابدالی کے حملوں کا سلسلہ پھر شروع ہوا۔ یہ حملے کافی عرصے تک ہوتے رہے۔ ابدالی نے نو بار ہندوستان پر حملہ کیا اور سوائے پہلے معرکے کے کسی میں شکست نہیں کھائی۔ ہر مرتبہ مال و زر کی لوٹ اپنے ہمراہ لے گیا۔ کچھ برسوں کے بعد عالم گیر ثانی کو بھی دھوکے سے قتل کر دیا گیا (۲۹ر نومبر ۱۷۵۹ء) اور ایک شاہزادے شاہ جہاں ثانی کو بادشاہ بنایا۔ لیکن چند مہینوں بعد ہی عالم گیر ثانی کے بیٹے شاہ عالم نے جو اس وقت دہلی میں نہیں تھا۔ یہاں آکر حکومت حاصل کی' اور بادشاہ بنا۔ اگرچہ شاہ عالم کچھ لائق اور تجربہ کار تھا لیکن سلطنت کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ اس لیے اس کی حوصلہ مندی اور تجربہ کاری زیادہ کام نہ آسکی۔ وہ بھی پچھلے بادشاہوں کی طرح صرف نام کا بادشاہ بنا رہا۔ اسی کے زمانے میں کسی نے کہا تھا: "سلطنت شاہ عالم از دلی تا پالم"۔ غرض دور زوال کے مغلیہ بادشاہوں کا سلسلہ تو ۱۸۵۷ء میں بہادر شاہ ظفر پر آکر ختم ہوتا ہے۔ لیکن اس ذکر کو یہیں ختم کرتے ہیں کیونکہ محمد شاہ کے انتقال کے بعد تقی خیال بنگال چلے گئے۔ اور ۱۷۵۵ء ۱۱۶۹ھ میں "بوستان خیال" بھی مکمل ہو گئی۔

غیر ضروری نہ ہوگا اگر ہم مختصراً بنگال کے اس عہد کے سیاسی حالات کو بیان کر دیں جن میں خیال وہاں پہونچے اور وہاں رہ کر "بوستان خیال" کو مکمل کیا۔

اورنگ زیب کی زندگی میں اس کے بڑے بیٹے معظم شاہ کا بیٹا عظیم الشان بنگالے کا صوبے دار تھا۔ لیکن اورنگ زیب کی بیماری کی خبر سن کر ہی اس نے صوبے داری مرشد قلی خاں کے سپرد کی اور اکبر آباد کی طرف روانہ ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ مرشد قلی خاں ایک برہمن کا لڑکا تھا، جس کی یتیمی کو دیکھ کر حاجی صوفی اصفہانی نے اسے اپنے پاس رکھ لیا اور اس کی پرورش کی۔ بڑے ہو کر خود ہی اس نے مذہب اسلام اختیار کیا۔ اور محمد ہادی اس کا نام رکھا گیا۔ رفتہ رفتہ اس کی دیانت داری اور ذہانت کی شہرت عالم گیر تک پہونچی۔ عالم گیر نے اسے دکن میں دیوان مقرر کیا۔ ۱۷۰۱ء میں بنگالہ کے دیوان کا عہدہ ملا۔ عظیم الشان کے جانے کے بعد اسے دربار سے مرشد قلی خاں کا خطاب عطا کیا۔ کچھ دن بعد بنگالہ کی صوبے داری کا فرمان اس کے نام پہونچا۔ اسی نے مقصود آباد کا نام بدل کر مرشد آباد رکھا۔ اس نے پوری کوشش کی کہ انگریز یہاں ٹکنے نہ پائیں۔ اس کے عہد حکومت میں بنگالی عوام بھی بڑے خوش حال رہے۔

اولاد میں اس کے صرف ایک لڑکی تھی جس کے شوہر شجاع الدین خاں کو اس نے اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔ اپنی زندگی میں اسے اڑیسہ کا صوبے دار بنایا تاکہ اس کی تربیت ہو سکے۔ اسی کے زمانے میں شاہ جہاں آباد سے ملازمت کی تلاش میں ایک ترک مرزا محمد شجاع کے پاس آیا۔ شجاع نے اسے بڑی

عزت دی۔ اس کے ساتھ اس کا بیٹا مرزا محمد علی بھی آگیا جو بہت ذہین، خوش اخلاق، اور بہادر تھا۔ کچھ عرصے میں وہ شجاع کے بہت قریب ہوگیا۔ شجاع نے دہلی سے اس کو علی وردی خاں کا خطاب دلوایا۔

مرشد علی خاں کی وفات کے بعد شجاع صوبے دار ہو کر مرشد آباد آگیا۔ علی وردی خاں بھی اس کے ساتھ آیا اور جب فرخ الدولہ عظیم آباد کی صوبہ داری سے معزول ہوا اور یہ صوبہ بھی شجاع کو ملا تو اس نے علی وردی خاں کو عظیم آباد کا صوبے دار مقرر کیا۔ علی وردی خاں نے وہاں کا بڑا اچھا انتظام کیا اور صوبے کی ایک فوج بھی اکٹھی کی۔

۱۷۳۹ء میں شجاع کا انتقال ہوا۔ اس نے اپنا جانشین اپنے بیٹے سرفراز خاں کو مقرر کیا تھا۔ جو اس کی وفات کے بعد صوبے دار ہوا۔ علی وردی خاں، سرفراز خاں سے خوش نہیں تھا، اب وہ خود بنگالہ کا صوبے دار بننے کے بارے میں سوچنے لگا۔ اسی خیال سے اس نے دہلی کے ایک امیر موتمن الدولہ اسحاق خاں کو خط لکھا کہ وہ محمد شاہ سے جس کے وہ منہ لگا تھا، تین صوبوں کی صوبے داری کی سند اس کے حق میں جاری کرائے۔ میں دربار میں ایک کروڑ روپے نذرانہ، سرفراز خاں کا مال و دولت علاوہ سالانہ خراج کے پیش کروں گا نیز سرفراز خاں پر حملہ کرنے کی اجازت مانگی[۱] دہلی سے جب اسے اجازت مل گئی تو اس نے سرفراز خاں کا مقابلہ کیا۔ سرفراز لڑائی میں مارا گیا۔ اور علی وردی خاں بنگالہ کا صوبے دار بنا۔ (۱۷۴۰ء) اس کے زمانے میں مرہٹوں کے بنگال پر حملہ کیا، لیکن علی وردی خاں کے ہاتھوں شکست کھائی۔ بہت سی بغاوتیں ہوئیں، جن پر اس نے قابو پایا۔ ۱۷۵۶ء میں اس نے وفات پائی۔

علی وردی خاں کے کوئی لڑکا نہیں تھا، اس نے اپنے نواسے سراج الدولہ کو لے کر پال لیا تھا۔ ہر طرح سے اس کی تربیت کی تھی، مرنے سے قبل (۱۷۵۶ء) اس کو اپنا جانشیں مقرر کیا۔ سراج الدولہ ۱۷۴۸ء میں عظیم آباد کا صوبے دار تھا۔ ۱۷۵۶ء میں علی وردی خاں کے مرنے کے بعد وہ بنگال، اڑیسہ اور بہار تینوں اضلاع کا صوبے دار ہوا۔ اس وقت تک انگریزوں نے ملکی معاملات میں مداخلت شروع کر دی تھی۔ سراج الدولہ نے ان کی مخالفت کی۔ اوّل اس نے کلکتہ پر فوج کشی کی اور انگریزوں کے قلعہ کو فتح کیا۔ لیکن اس کے کچھ بعد ہی ایک دوسری فیصلہ کن جنگ ہوئی جو جنگ پلاسی کے نام سے مشہور ہے۔

اس جنگ کا سبب تھا کہ سراج الدولہ کے کچھ سرداروں نے اس کے ساتھ فریب کیا۔ عین وقت پر انگریزوں سے مل کر اسے دھوکا دیا۔ جن میں میر جعفر کا نام اہم ہے۔ جس وقت سراج الدولہ انگریزوں کے مقابلے پر نکلا۔ سپہ سالار میر جعفر کھڑا تماشا دیکھتا اور غلط مشورے دیتا رہا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سراج الدولہ کو شکست ہوئی اور وہ محل

---

[۱] سراج الدولہ ص ۶۸

کی طرف بھاگ گیا۔ وہاں سے بھاگ کر ایک باغ میں پہونچا ہی تھا کہ دشمنوں نے اسے گرفتار کر لیا اور بڑی بے دردی سے اسے قتل کر دیا۔ (۱۷۵۷ء)، سراج الدولہ کے بعد میر جعفر بنگال کا نواب ہوا۔ ۱۷۶۰ء میں اس نے وفات پائی۔

یہ تھا وہ تاریخی پس منظر جس میں "بوستانِ خیال" کا مصنف رہا اور "بوستان خیال" لکھی گئی تھی۔ تقی خیال کے دہلی آنے اور بنگال جانے کے بارے میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے لیکن بعض امور کو یہاں دہرانا لازمی ہے۔

تقی خیال ۱۷۲۶ء میں دہلی آئے۔ یہاں انھوں نے نواب اسحاق خاں کی ملازمت کی اور "بوستان خیال" لکھی۔ اس کے تاریخی نام "فرمایشِ رشیدی" سے اس کی تاریخ ۱۷۴۲ء (۱۱۵۵ھ) حاصل ہوتی ہے۔ فارسی مخطوطے کے خاتمے پر لکھا ہے کہ خیال حملۂ نادری کے بعد مرشدآباد چلے گئے۔ نادر شاہ کا حملہ ۱۷۳۹ء میں ہوا۔ اگر ان کا حملہ کے فوراً بعد جانا مان لیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ۱۷۴۰ء تک مرشد آباد چلے گئے لیکن اس بات کو اس لیے تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ "بوستان خیال" کی ابتدا کی تاریخ ۱۷۴۲ء ملتی ہے۔ اور یہ بات اس لیے بھی قابل قبول نہیں معلوم ہوتی کہ سراج الدولہ ۱۷۲۷ء میں پیدا ہوا اور حملہ نادری کے وقت اس کی عمر گیارہ یا بارہ سال رہی ہوگی۔ اس لیے خواجہ امان دہلوی کے دیباچے میں لکھی ہوئی یہ بات صحیح ہے کہ خیال محمد شاہ کے انتقال کے بعد (۱۷۴۸ء) مرشد آباد گئے اور سراج الدولہ کی ملازمت اختیار کی ۱۷۴۸ء میں ہی علی وردی خاں نے سراج الدولہ کو عظیم آباد کی صوبے داری کے لیے مقرر کیا تھا۔

تہذیبی اقدار

"ہماری تمام تخلیقات جو قوّتِ متخیّلہ سے تعلق رکھتی ہیں ایک ایسی دُنیا کا عکس ہیں جس میں ہم زندگی بسر کرتے ہیں یہ اپنی دنیا سے ہمارے تعلقات، ہماری محبت، ہماری نفرت اور جو کچھ تاثرات ہم اِس دُنیا سے حاصل کرتے ہیں، ان کا نتیجہ ہیں، یہ آب ورنگ، یہ شکل وشباہت، یہ ہوا کے جھونکے، یہ زندگی کی خوشبوئیں، انسانی زندگی کی حیاتی خوبصورتی اور بدصورتی، یہ انسان، عورت ومرد کے یہ خواب وخیالات، فکر وعمل جن سے ہمارا ابھی تعلق ہے، یہ ساری چیزیں ادب اور فن کا مواد فراہم کرتی ہیں۔"

(أ)

شکوہِ سلطنت

تخت نشینی جشنِ تخت نشینی۔ آراستگیِ دربار اور اُس کے آداب

دربار میں سفرار کی آمد۔ شاہی سواری۔ جھروکہ درشن۔

بادشاہ کے شب و روز۔ درباری شعرار۔ درباری قصہ خواں

شاہی اطبار۔ درباری علمار۔ انتظامِ سلطنت۔

درباری عہدیدار۔ عدالت۔ فوجی نظام اور شاہی

حرم سرا

ہر شخص کے دل میں فطری طور پر اقتدار حاصل کرنے کی خواہش ہوتی ہے خواہ اس کی نوعیت کچھ بھی ہو، اس کی وسعت ایک گھر کی چہار دیواری بھی ہو سکتی ہے، ایک گاؤں کی حدود ہو سکتی ہیں، شہر، اور شہر سے بڑھ کر ملک کی سرحدوں تک پھیل سکتی ہے، اقتدار پسندی انسان کی جبلی خواہشوں کا حصہ ہے اس میں چھوٹے بڑے، بوڑھے اور جوان، مرد اور عورتیں سبھی اپنی اپنی حدود میں رہتے ہوئے اپنے اقتدار تسلط یا بالادستی کے خواہش مند رہتے ہیں، بالادستی یا حصولِ اقتدار کا انحصار قوت بازو پر بھی ہوتا ہے، جد وجہد کی صلاحیت پر بھی، خاندانی حالات اور وراثت پر بھی اور گاہ گاہ علم و دانش بھی اس میں غیر معمولی معاون ہوتے ہیں حکومت کے حصول میں قوت بازو کو ایک مؤثر اور کارگر حربہ کے طور پر جماعت کی تائید کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ قوتِ بازو سے کوئی ایک شخص حاکم بن جاتا ہے اور باقی افراد اس کی حاکمیت کو تسلیم کر لیتے ہیں۔

دنیا میں اسی طرح بادشاہت کی ابتدا ہوئی، کوئی ایک شخص سردار کہلانے لگا اور سب اس کے فرمانبردار ہو گئے، یہ فرمانبرداری اس وقت جاں نثاری بھی بن گئی جب اس ایک شخص نے محکوم افراد کے پیچیدہ مسائل کو سلجھایا، ان کی حفاظت اپنے ذمہ لی، انھیں ذمہ داریوں کے سبب بادشاہ دنیا کا ایک لازمی حصہ بن گیا، حاکم و محکوم کا قالب و جان کا سا تعلق ہو گیا اور کہا گیا کہ دنیا میں بادشاہ کا وجود خدا کے مانند ہے[1] بادشاہ نہ ہوں تو طاقتور کمزور افراد کو اس طرح ختم کر دیں جیسے بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو ختم کر دیتی ہیں[2] غریب اور کمزور افراد کے خون بہہ جائیں[3]۔ اسی لیے بادشاہ کو خدا کا بھیجا ہوا نور کہا گیا جو سارے عالم کو اپنے احاطہ میں لیے ہوئے ہے[4]۔

اس فلسفہ کے دلوں میں گھر کر جانے کے بعد بادشاہ کے لیے جاں نثاری اور تختِ سلطنت کے لیے وفاداری کو عوام نے اپنے نظام اور فرائضِ زندگی کا ایک حصہ سمجھ لیا، جاں نثاری اور وفاداری کا جذبہ اگر ایک طرف بعض مذہبی عقائد یا معاشرتی فلسفوں کا رہ آورد ہوتا تھا تو دوسری طرف حکمراں کی جانب سے عدل و انصاف رعایا کے امن و آسائش، انتظام و انصرام کی خوبی اور داد و دہش کی نمایاں مثالوں سے بھی ہم اس کو وابستہ کر سکتے ہیں جس کے باعث رعایا میں اپنے تحفظ کا احساس بڑھتا تھا اور وہ بادشاہ کے وجود کو اپنے لیے باعث برکت و رحمت تصور کرتے تھے اور اسے اللہ کا سایہ یعنی ظلِ سبحانی، ظل اللہ کہہ کر پکارتے تھے۔

---

[1] ٹامس اکوائنس ماخوذ از مغل تہذیب ص ۱۴۲

[2] شانتی پران۔ ایضاً ص ۱۴۸ [3] منوسمرتی۔ ایضاً ص ۱۴۴، [4] ابوالفضل۔ ایضاً ص ۱۴۸۔

داستانیں بھی اس سے متاثر ہوئیں خود "بوستان خیال" میں بادشاہ کے ساتھ وفاداری اور جاں نثاری سے متعلق یہ روایت ملتی ہے :۔

"بادشاہ کی جان کے ساتھ عوام الناس کی کس قدر جانیں ہم وزن ہوتی ہیں یعنی اگر بادشاہ کی جان کو کوئی صدمہ سخت پہونچے اور وہ چند عوام کی ہلاکت سے دفع ہو آیا ان کا قتل کروانا بابِ سلطنت میں جائز ہے یا نہیں"

داستان نگار اس کے جواب میں لکھتا ہے :۔

"ایک جہان بھی بادشاہ کی جان سے ہموزن نہیں ہو سکتا..... بادشاہ کی سلامتی جان کے واسطے ایک عالم کا خون کرنا جائز ہے"[۱]

عوام کے اس جذبہ کا بادشاہوں نے احترام کیا اور وہ بھی خدمتِ خلقِ خدا کو اپنا فرض اولین سمجھنے لگے انھوں نے محسوس کیا کہ ہم لوگوں کی خلقت محض عیش کے واسطے نہیں[۲] بلکہ رعایا کی خدمت کے واسطے ہے ۔ اور "خوشنودی رعایا و حاجت روائی خلق خدا خاص خوشنودی رب العالمین ہے"[۳] اس سے پتہ چلتا ہے کہ بادشاہوں میں ایسے بھی صاحبان فکر و فہم موجود تھے جو خلق اللہ کی حفاظت کو اپنا ایک مذہبی اور انسانی فریضہ تصور کرتے تھے اور یہ خیال کرتے تھے کہ اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو اپنے فرائض منصبی اور انسانی ذمہ داریوں میں کوتاہیوں کے مرتکب ہوتے ہیں اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ سیاسی حالات، رعایا کی سرکشی کا خوف دشمنوں کی ریشہ دوانیاں، ذاتی انانیت اور رعونت پسندی اپنی ذات میں نظر آتا تھا وہ ان کو جبر و تشدد، سخت گیری اور استبداد پر بھی آمادہ کر دیتا تھا اور گناہ گاروں کو سزا دینے کے ساتھ ساتھ بہت سے بے گناہ بھی ان کے ہاتھوں سے سزا پاتے اور موت کی گھاٹ اترتے تھے، اس جبر و تشدد کے پیچھے یہ احساس ہوتا تھا :۔

"میں حاکم ہوں کسی کی مجال نہیں کہ کوئی کلمۂ بد میری نسبت زبان سے نکال سکے"[۴]

اس احساس نے بادشاہوں کو غیر ضروری سطح پر دولت و ثروت اور طاقت و قوت کی نمائش پر آمادہ کیا۔ دربار کی شان و شوکت اور شکوہِ سلطنت کے رعب و داب کو قائم رکھنے اور امرا و رعایا کے لوگوں کو اطاعت گزاری اور وفاداری پر آمادہ کرنے کے لیے جلال و جبروت کی اس نمود کو شکوہِ سلطنت کا حصہ اور

---

[۱] ۳۹۵ ج ۳، [۲] ۳۰۰ ج ۱، [۳] ۲۷ ج ۳۔

[۴] ۲۹ ج ۹ م۔

منجملہ لوازماتِ بادشاہت تصور کیا جانے لگا۔ دنیا کے ہر ملک میں ہر بادشاہ اپنے کرّوفر کے اظہار کے لیے کوشاں رہتا تھا تاریخ میں ایران کے دربار کی آرائش و آراستگی مشہور ہے، ہندوستان کے مسلمان بادشاہ بھی ایرانی بادشاہوں کے نقشِ قدم پر چلے، جب کہ اسلام میں دربار اور اُس کی آراستگی کا کوئی تصور نہیں تھا لیکن خلفار راشدین کے بعد مسلمانوں نے بھی غیر عرب بادشاہوں کے طور طریقے اختیار کیے۔ "بوستان" میں ایک مقام پر جب ایک مسلمان شاہزادہ اپنے اوقات کو علمِ فقہ و حدیث کے مطالعہ میں صرف کرتا ہے تو ملکہ کہتی ہے:۔

"تم بادشاہزادے ہوالا بادشاہوں کو فی الجملہ رنگینی طبع بھی درکار ہے اور اس قدر زہد خشک بھی لازم نہیں" [1]

شاہزادہ اس کا جواب اس طرح دیتا ہے:۔

"رنگینی طبع ظاہرا سلاطین ہند و عجم کو چاہیے اور میں عرب ہوں، ایسی چیزوں سے بہرہ نہیں رکھتا" [2]

لیکن اس طرح کے زہد و تقویٰ والا شاہزادہ داستان میں مشکل سے ہی ملتا ہے یا کسی مقام پر اس کا اسلامی جذبہ اس طرح کی بات کہلوا دیتا ہے ورنہ تمام بادشاہ اور شاہزادے ہندوستان اور ایران کے نظر آتے ہیں جن کے سروں پر سونے کے تاج ہیں جن کے لباس ریشم اور زربفت کے بنے ہوئے ہیں جن کے دربار کی چمک سے آنکھوں کی روشنی چلی جاتی ہے جن کے دربار میں جب کوئی آتا ہے تو سجدہ کرتا ہے اور نگاہیں نیچے کر کے دست بستہ ایستادہ ہوتا ہے نگاہ اٹھانے پر قتل کر دیا جاتا ہے۔ یہ جلال و جبروت، رعب و دبدبہ، سطوت و حشمت، ہندوستان کے ہی بادشاہوں کے پس منظر میں دیکھ سکتے ہیں، چندر گپت موریہ سے لے کر اورنگ زیب تک پہونچتے پہونچتے ہندوستان کی سلطنت ایک ایسی عظیم سلطنت بن گئی تھی جس کا مقابلہ اس وقت دنیا کی کم سلطنتیں کر سکتی تھیں۔ اس کا اندازہ غیر ملکی سیاحوں کے سفرناموں سے ہوتا ہے ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ محمد بن تغلق کی تخت نشینی کے وقت دربار کی سجاوٹ اور لباسوں پر ہیرے جواہرات اس کثرت سے استعمال کئے گئے تھے کہ ان کی چمک دمک سے محمد بن تغلق کی ماں کی آنکھوں کی روشنی جاتی رہی تھی [3] بلبن سے متعلق خلیق احمد نظامی نے فرزدنی استرآبادی کا بیان نقل کیا ہے کہ تاج کے کونے سے داڑھی کے کونے تک ایک گز کی لمبائی تھی [4] یہ شان و شوکت عرب کے ابتدائی مسلم حکمرانوں کی تو نہیں ہو سکتی بلکہ اس میں

---

[1] ۵۲۳ ج ۱۔

[2] ۵۲۳ ج ۱، [3] سفرنامہ ابن بطوطہ، قسط ۳ صہ ۱۴۱، [4] اوراق مصور صہ ۳۱

صاف ہندوستان کے راجاؤں اور ایران کے شہنشاہوں کا عکس دکھائی دیتا ہے جہاں دربار کی شان و شکوہ کے ساتھ ساتھ اس کے آداب بھی تھے ۔ بادشاہ تک پہونچنے کے لیے اس کی اجازت ضروری ہوتی تھی :۔

"اس اثنا میں یساول نے آکر عرض کی کہ اے شہریار جس فوج میں سبز نشان تھا

.....وہ بارگاہ پر حاضر ہے بار چاہتا ہے شاہزادہ نے فرمایا آنے دو" [۱]

بغیر اجازت کسی دوسرے ملک کا سلطان بھی اس کے روبرو نہیں جا سکتا :۔

"سلطان نے فرمایا پس اس کے پاس چلو سودانہ نے کہا وہ بادشاہ ہے

جب تک خود طلب نہ کرے ہم نہیں جا سکتے" [۲]

اجازت ملنے کے بعد بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو سکتے تھے لیکن ضروری ہوتا تھا کہ لباس وغیرہ سب قاعدہ سے درست ہو، برہنہ سر جانا بے ادبی میں شامل تھا :۔

"جب اس نے سرزدہ مجلس تخلیہ میں جانے کا ارادہ کیا ملازم مانع ہوا اور

پوچھا او مرد ضعیف بے ادب کہاں جاتا ہے" [۳]

اگر کوئی شخص پہلی بار دربار میں آتا تو دربار میں داخلے سے قبل ہی اسے تمام درباری آداب بتا دیئے جاتے تھے تاکہ وہ بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق سلام کرے اور دربار میں کھڑا ہو، دربار میں ایک خاص جگہ سے بادشاہ کو سلام و مجرا یا کورنش کرنی ہوتی تھی جسے سلام گاہ کہتے تھے :۔

"پادری سلام گاہ پر سے آداب و مجرا بجا لایا صاحبقران نے دست راست

سے پادری کا سلام لیا" [۴]

ابوالفضل نے دربار اکبری کا طریقہ سلام تحریر کیا ہے جو بعد تک رائج رہا :۔

"جہاں پناہ کا حکم ہے کہ حاضرین دربار دست راست کی ہتھیلی کو پیشانی پر رکھ کر

اپنے سر کو جھکائیں اس طریقے کو عرف عام میں کورنش کہتے ہیں" [۵]

کورنش یا تسلیم کا مقصد یہ تھا کہ ہم اپنی فرمانبرداری کا اظہار کرتے ہیں اور جاں نثاری کے لیے حاضر ہیں۔ "بوستان" کے درباروں میں بھی کورنش اور مجرے کا رواج ہے یہ صرف مسلمان بادشاہوں کے دربار ہی کا قاعدہ نہیں بلکہ غیر مسلم بھی اپنے درباروں میں اس کو لازمی سمجھتے ہیں، جمشید خود پرست کے دربار میں جب

---

[۱] ۶۳۸ ج ۱ ۲۷۲ ج ۴، [۲] ۶۶۹ ج ۱، [۳] ۹۰ ج ۶ ـ

[۴] ۱۸۰ ج ۳، [۵] آئین اکبری جلد اول ص ۲۹۹ ـ

حارث دیلمی بے سلام و مجرے کے پہونچا تو جمشید کو ناگوار گذرا :۔

"حارث دیلمی کندہ ناتراشش نے بے سلام و مجرا اشبوط کا نامہ جمشید کے ہاتھ میں دیا جمشید اس بے وقوف کی حرکت ناشائستہ پر دل میں بہت رنجیدہ ہوا الا بنظر رسالت کچھ نہ کہا" [۱]

اس اقتباس سے دو امر اور واضح ہوتے ہیں ایک یہ کہ نامہ بادشاہ کے ہاتھ میں نہیں دیا جاتا بلکہ کوئی دوسرا اسے لیتا ہے، بادشاہ بہت کم کسی کا نامہ اپنے ہاتھ سے لیتا ہے برنیر نے اپنے سفر نامہ میں کئی جگہ اس کا ذکر کیا ہے کہ اورنگ زیب نے خریطہ اپنے ہاتھ سے نہیں لیا[۲] دوسری بات یہ کہ بادشاہ کے نزدیک جانے کی اجازت نہیں ہوتی بلکہ دور ہی سے تمام رسومات اور آداب ادا کئے جاتے ہیں تخت طاؤس کا ذکر کرتے ہوئے برنیر لکھتا ہے :۔

"مگر میں ان کی تعداد اور قیمت بیان نہیں کر سکتا کیونکہ کسی کو اس قدر نزدیک جانے کی اجازت نہیں کہ ان کا شمار اور آب و تاب کا اندازہ کر سکے" [۳]

"بوستان" میں بھی اس کی وضاحت نظر آتی ہے :۔

"یہ کہہ کر امیر زادہ نے پیش قدمی کی اہل دربار نے بالاتفاق کہا او جوان بے ادب بادشاہوں کے قریب نہیں جاتے دور سے عرض و معروض کرتے ہیں مگر تو کیا گستاخ آدمی ہے سر پر چڑھا جاتا ہے" [۴]

آداب بجالانے کے بعد جو جگہ اس کے لیے متعین کی جاتی تھی اسی جگہ کھڑا ہو جاتا تھا جب تک بادشاہ دربار میں موجود تھا کوئی ادھر ادھر نہیں دیکھ سکتا تھا نہ اُسے دیکھنے کی اجازت ہوتی ہر شخص کی نگاہیں جھکی رہتی تھیں یا بادشاہ کی طرف متوجہ ہوتے تھے، نگاہوں کو ادھر اُدھر گھمانا آداب کے خلاف تھا :۔

"وہ بلہون بے تمیز اجل رسیدہ بارگاہ کی رونق و آرائش دیکھنے لگا صاحبقران نے انگشت سبابہ بلہون کے پہلو میں ماری اور فرمایا او بے حیوان طبیعت بے ادب دربار سلطانی میں بجز بادشاہوں کے کسی طرف متوجہ نہیں ہوتے" [۵]

دربار کے ان آداب کا لحاظ مغل بادشاہوں کے یہاں بڑی سختی کے ساتھ کیا جاتا ہے اور وہ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عروج کا دور بھی تھا دور دراز ممالک کے لوگ اس کی شہرت سُن کر ادھر آرہے تھے، اسی دور میں

---

[۱] ۱۳۱ ج ۵ ۔ [۲] برنیر ص ۱۹۱، [۳] ایضاً ص ۵۷۶ ۔ [۴] ۵۰۳ ج ۴ ۔ [۵] ۳۵۸ ج ۲ ۔

"بوستان خیال" لکھی گئی۔ انھیں بادشاہوں کا دربار مصنف کی نگاہوں میں تھا خیالؔ نے اگرچہ اکبر و شاہ جہاں کا جلال اور جمال نہیں دیکھا تھا لیکن اس نے محمد شاہ کا وہ "رنگیلا" دربار دیکھا تھا جس میں جلالِ اکبری نہ سہی جمالِ شاہ جہانی تو اپنی بہار دکھا رہا تھا۔ بادشاہ نااہل و ناکارہ سہی اپنے اجداد کی روایت کو نہیں بھولے تھے مہم جوئی اور جنگ آزمائی کی صلاحیتیں اب فی الجملہ مفقود ہوگئی تھیں لیکن مغل سلطنت کے ان وارثوں کے یہاں ان کے آبا و اجداد کی سلطنت کی آراستگی کی خواہش اور اس کے آداب کی پاسداری تو بہر حال باقی تھی۔ اورنگ زیب کے بعد سے بہادر شاہ ظفر تک وہی آدابِ دربار باقی رہے جو عروج کے زمانہ میں تھے۔ اگرچہ ان کی چمک دمک اور حقیقی معنویت ختم ہوتے ہوتے مغلوں کے آفتاب کا محض سایہ بن کر رہ گئی تھی۔ نصیر حسین خیالؔ نے اکبر شاہ ثانی کے دربار کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:۔

"اس خاندان کے یہاں اور آداب تھے وہاں دربار کا داب بھی مشہور تھا اور وہ بڑے قاعدوں سے برتا جاتا تھا، بادشاہ تخت پر جلوہ گر ہیں، اس کے نیچے اپنے اپنے عہدے اور منصب کے مطابق وزیر و امیر دو رویہ ہاتھ باندھے بت بنے کھڑے ہیں داہنی طرف امیروں کی قطار ہے اور بائیں طرف شاہزادوں اور مرشدزادوں کی صف، درباری گھنٹوں اسی طرح کھڑے رہتے اور ہل نہیں سکتے تھے، تخلیہ اور خاص صحبتوں میں وزیروں اور اونچے امیروں کو البتہ بیٹھنے کی اجازت ملتی اور یہ بڑی عزت سمجھی جاتی مگر بادشاہ کے سوا بیچوان کسی کے آگے نہ لگتا ...... اکبر ثانی نے اپنے بزرگوں کے اس داب کو برقرار اور اس شاہانہ طریقہ کو برابر قائم رکھا اس لیے اس کا دربار مشہور تھا اور اس میں حاضری کی بڑے بڑوں کو ہوس رہتی تھی۔"[1]

کہا جاتا ہے کہ اس وقت کا گورنر لارڈ ہیسٹنگ بھی جب دربار میں آیا اسے ان آداب کا لحاظ کرنا پڑا۔ جب کہ بادشاہ اُنہی کا وظیفہ خوار تھا، اور سلطنت کی حدود کا وہ آخری دور بھی ختم ہوگیا تھا جس کے لیے یہ مثل مشہور تھی۔

سلطنت شاہ عالم　　　از دہلی تا پالم

"بوستان" کے مصنف نے داستان کے دربار کی آراستگی تو ضرور اکبر اور شاہ جہاں کے عہد کی سی کی ہے لیکن اسے یہ بھی احساس ہے کہ وہ جس دور سے وابستہ ہے جو بادشاہ تختِ سلطنت پر جلوہ افروز ہے

---

[1] مغل اور اردو صفحہ ۱۲۸۔

وہ بادشاہ ضرور ہے لیکن بادشاہت کا اہل نہیں۔ بلکہ بادشاہت اُسے اپنے بزرگوں کی بدولت مل گئی ہے:۔

"فی الواقع اگرچہ تم کو دماغ سلطنت نہیں ہے لیکن جب تمہاری گردن ہی سے بندھ گئی تو ناچاری ہے" ؎۱

گردن سے بندھنے والی یہ بات مغلوں کے عہد زوال میں تخت نشینی کا کھیل کھیلنے والے سبھی بادشاہوں پر صادق آتی ہے۔ محمد شاہ تخت پر بیٹھنے سے پہلے قیدی شاہزادہ تھا اور جب اس نے اچانک اپنے آپ کو ہندوستان کا بادشاہ پایا تو حواس باختہ ہوگیا اور قید خانہ کی کلفتوں کو عیش و عشرت میں بدلنے لگا، صاحبقران اکبر کا یہ جملہ ایسا لگتا ہے جیسے محمد شاہ نے اپنی زبان سے ادا کیا ہو:۔

"اپنے بزرگوں کے سبب سے مجھ کو اس قدر عیش و عشرت نصیب ہوئی ہے اور کچھ اندیشہ امروز و فردا کا نہیں ورنہ میں اور ایسا عیش کہ جو بادشاہان ہفت کشور کو بھی شاید اس بے فکری اور اطمینان خاطر سے ممکن نہ ہوا ہوگا" ؎۲

محمد شاہ کے ہاتھ غیر متوقع طور پر ہی حکومت لگی تھی اور وہ بے فکری اور اطمینان خاطر سے ایک مدت تک لذّتِ سلطنت میں ڈوبا رہا تھا، داستان کا یہ اقتباس بھی محمد شاہ کی یاد دلاتا ہے:۔

"اب چند روز میرا معترض احوال نہ ہو اور مجھ کو میرے حال پر چھوڑ دے چند روز تخت پر آرام کروں اور لذت سلطنت چکھوں، یہ ایسی لذّت نہیں کہ یکایک فراموش ہو جائے" ؎۳

مغلوں کے زوال آمادہ عہد کے بادشاہوں کی طفلانہ حرکتیں بھی مشہور ہیں کوئی شراب کے نشہ میں رتھ میں سویا ہوا ملتا ہے کوئی طفلِ نوخیز کو صوبیداری کا عہدہ بخشتا ہے "بوستان" میں یہ بات اس طرح کہی گئی ہے جو اس عہد پر بھرپور طنز ہے:۔

"زریں تاج نے کہا تم کو خبر ہے کہ جس دن سے تم بادشاہ ہوئی عجب طرح کے کلمات طفلانہ زبان سے فرماتی ہو" ؎۴

تخت نشینی

جب یہ بات واضح ہوگئی کہ بادشاہت اپنی بالادستی کو تسلیم کرانے، امتیازی حیثیت حاصل کرنے اور

؎۱ ۲۰۱ ج ۱، ؎۲ ۱۸۲ ج ۹ م۔ ؎۳ ۷۷ ج ۱۔ ؎۴ ۱۴۲ ج ۵۔

ہوسِ اقتدار کو تسکین دینے کا ذریعہ تھی تو یہ بات غیر شعوری طور پر لازم ہو جاتی ہے کہ جو شخص قوتِ بازو یا مکر و فریب سے تخت تک پہونچے گا اس کی خواہش ہو گی کہ یہ مقبوضہ تخت شاہی اُسی کے خاندان سے وابستہ رہے۔ نسل در نسل اُس کے خاندان کے افراد حکومت کرتے رہیں دوسرے ممالک کی تاریخ سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اگر ہم صرف ہندوستان ہی کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو خاندانی حکومتوں کا ایک طویل سلسلہ نظر آئے گا وہ خواہ ہندو راجاؤں کا عہد ہو یا مسلمان بادشاہوں کا۔

ہندوستان کی قدیم تاریخ میں رامائن اور مہابھارت کو چھوڑ کر اگر ہم دیکھیں تو نند خاندان، موریہ خاندان جن کے دو مشہور راجہ چندر گپت اور اشوک گذرے ہیں، شنگ خاندان، گپت خاندان، دکشناپتھ خاندان، وغیرہ کے راجاؤں نے برسوں حکومت کی۔ سلاطین کے عہد میں ایک دور تو غلاموں کا رہا، لیکن پھر تغلق خاندان، خلجی خاندان، بہمنی خاندان وغیرہ مدت تک تخت سلطنت پر چھائے رہے۔ آخری خاندانی اور شخصی حکومت مغل خاندان کی تھی جس نے بڑی شان و شکوہ کے ساتھ کئی صدیوں تک ہندوستان پر حکومت کی۔ مغل خاندان کی حکومت کا سلسلہ بڑا طویل ہے سلطان امیر تیمور سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک پھیلا ہوا ہے۔ "بوستان" میں بھی ایسی ہی خاندانی اور شخصی حکومت ہے۔ باپ کے بعد بیٹا اور اس کے بعد اس کا بیٹا بادشاہ ہوتا چلا جاتا ہے اور پھر "بوستان" میں تو ایک ہی خاندان کی حکومت کو داستان کا بنیادی تھیم بنایا ہے۔ فاطمی خاندان کے ان سلاطین کو مغل خاندان بھی کہا جا سکتا ہے "بوستان" سلطان مہدی کی تخت نشینی سے شروع ہوتی ہے اور قایم، اسمعیل، معز الدین اور اس کے جانشینوں پر آ کر ختم ہو جاتی ہے۔

خاندانی اور شخصی حکومت میں شاہی خاندان کے ہر فرد کے دل میں تخت پر بیٹھنے کی خواہش ہوتی ہے اگر ایک بادشاہ کے چار بیٹے ہیں تو وہ چاروں ہی تخت شاہی پر بیٹھنے کی خواہش رکھتے ہیں اور جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آپس میں جنگیں ہوتی ہیں۔ جو سب پر غالب آ جاتا ہے وہی سریر سلطنت پر متمکن ہوتا ہے مذکورہ تمام خاندانوں میں تخت نشینی کے لیے آپس میں خونریز جنگیں ہوئیں، مہابھارت جیسی عظیم جنگ کا سبب بھی یہی تھا۔

"بوستان" میں اگرچہ معز الدین کے خاندان میں اس طرح کے واقعات پیش نہیں آتے بلکہ بڑے بیٹے کو جانشین تسلیم کر لیا جاتا ہے اور شاہی خاندان کے بقیہ افراد اس کی فرمانبرداری قبول کر لیتے ہیں۔ لیکن داستان کی دوسری حکومتوں میں تخت حاصل کرنے کے روایتی طریقے کو یاد رکھا گیا ہے۔ ابو عامر اور ابو حاکم دو سگے بھائی ہیں جو جنگ کرتے ہیں[1] تاریخ میں بھائیوں کے مابین تخت نشینی کی

---

[1] جلد نہم۔

کش مکش کی نمایاں مثالیں مغل خاندان ہی میں مل جاتی ہیں۔ ہمایوں ہو یا شاہ جہاں یا اورنگ زیب یا اس کے جانشین سب یہی خونی کھیل کھیلتے رہے۔ "بوستان" میں باپ کو ہٹا کر بادشاہ ہونے کی تمنا نہ صرف شاہزادوں میں موجود ہے بلکہ شاہزادیاں بھی یہ ارادہ رکھتی ہیں :۔

"ملکہ نے کہا اے شہریار میری تو یہ صلاح ہے کہ اپنے پدر کو زہر دے کر تخت پر بیٹھوں۔"[۱]

اسی طرح ایک اور شاہزادی باپ کو نظر بند کر کے بادشاہ ہو جاتی ہے[۲] شاہزادیوں کا تخت نشین ہونا کوئی غیر حقیقی بات نہیں، طلسم کی دنیا میں تو اکثر عورتیں ہی فرمانروائی کرتی ہیں مرد ان کے محکوم ہوتے ہیں لیکن طلسم سے باہر بھی شاہزادیاں حکومت کرتی ہوئی نظر آتی ہیں ملکہ خاتون بنت سلطان رکن الملک اس کی واضح مثال ہے۔ تاریخ میں رضیہ سلطان کی مثال موجود ہے، سلطان التمش نے جب یہ محسوس کیا کہ اس کے لڑکوں میں کوئی اس لائق نہیں کہ حکومت کر سکے تو اس نے اپنا جانشین اپنی بیٹی ملکہ رضیہ سلطان کو مقرر کیا، "بوستان" میں یوں بھی ہوا ہے اور جس کے پس منظر میں رضیہ سلطان، نور جہاں اور حضرت محل نظر آتی ہیں :۔

"جب نامہ منصور کی والدہ کی نظر سے گذرا اور اس عفیفہ نے اپنے فرزند بدگہر کا حال سنا کہ وہ راندۂ درگاہ مرتد ہو گیا ناچار خود نقاب افگندہ مسند ریاست پر متمکن ہوئی۔"[۳]

اکثر یوں بھی ہوا ہے امراء و وزراء نہ صرف بادشاہ بننے کی خواہش رکھتے ہیں بلکہ تخت تک پہونچنے کی کوشش بھی کرتے ہیں اور پہونچ جاتے ہیں۔ جلال الدین خلجی نے معز الدین کیقباد کو معزول کر کے تخت حاصل کیا، سلطان قطب الدین خلجی کا ایک امیر خسرو خاں بادشاہ کو قتل کر کے سلطان بنا، اس طرح کی بہت سی مثالیں موجود ہیں، مغلوں کے عہد زوال میں تو بادشاہ امراکے ہاتھوں کا کھلونا بن گیا تھا۔ "بوستان" میں ایسی مثالیں بھی موجود ہیں ملک ساوق نے لشکر اکٹھا کر کے اپنے بادشاہ کے خلاف بغاوت کی اور اسے قتل کر کے تخت نشین ہوا[۴] افریقیہ کے حاکم عبدالعزیز کو اس کے وزیر شمران نے قید کیا اور تخت پر بیٹھا[۵] قید کرنے کے واقعات شاہ جہاں کی نظر بندی اور اورنگ زیب کی تخت نشینی کی یاد دلاتے ہیں۔

مغلوں کے آخری عہد میں بادشاہ کو کمزور دیکھ کر تمام صوبیدار خود مختار ہو گئے تھے "بوستان" میں

۱؎ ص ۲۲۵ ج ۱، ۲؎ ص ۲۴۴ ج ۱ ۳؎ ص ۱۸ ج ۱، ۴؎ ص ۲۷ ج ۵، ۵؎ ص ۳۰ ج ۱۔

ملک سلطع افغان کو صوبیدار بناتا ہے لیکن کچھ دن بعد ہی وہ سکہ و خطبہ میں اپنا نام شامل کر کے خود مختاری کا اعلان کر دیتا ہے [۱] اور اگر اتفاق سے تخت کا کوئی حقیقی وارث نہ ہو تب تو ہر سردار تخت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے [۲]

مغلوں کی تاریخ کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک افغان شیر خاں نے تخت حاصل کرنے کے لیے ہمایوں کو اس قدر مجبور کیا کہ وہ بے یار و مددگار ایران پہونچا اور پھر دوبارہ شاہ ایران کی مدد سے ہندوستان کی سلطنت حاصل کی، ہمایوں کی اس پریشاں حالی کو گلبدن بیگم نے اس طرح بیان کیا ہے :۔

"ایندھن ڈھونڈ کر لائے اور ایک خود میں تھوڑا سا گوشت اُبالا کچھ انگاروں پر بھونا، اور سب طرف آگ سلگا کر بیٹھ گئے، حضرت بادشاہ نے اپنے ہاتھ سے گوشت بھون کر نوش کیا" [۳]

"بوستان" میں ایک بادشاہ کی کہانی ہمایوں کی کہانی معلوم ہوتی ہے :۔

"یہاں تک نوبت پہونچی کہ حصاری ہوا، شہر کے ایک طرف دریا بھی تھا۔ جب میں نے دیکھا کہ کسی طرح مخلصی ممکن نہیں ہے زن و دختر کو اور کچھ مال اس وقت اضطراب میں اٹھ سکا لیکے دو کشتیوں میں سوار ہوا" [۴]

یہ تباہ حال بادشاہ سلطان اسمٰعیل کے دربار میں پہونچتا ہے جس کی مدد سے اُسے دوبارہ تختِ سلطنت حاصل ہوتا ہے۔

بادشاہت کے دور میں ایک عجیب بات یہ بھی تھی کہ بعض فرمانبردار امرا اور تمام فوج سلطنت اور حکومت کرنے کا حقدار صرف شاہی خاندان کے افراد ہی کو سمجھتی تھی، اگر بادشاہ کی وفات کے وقت شاہزادے کی عمر کم ہوتی تب بھی اسی کو تخت پر بٹھایا جاتا تھا، وزرا میں سے کوئی اس کا نائب مقرر کر دیا جاتا [۵] شاہی خاندان کے افراد کا خود کو حقدار سمجھنا تو فطری بات تھی، "بوستان" میں ایک شاہزادہ ایسا بھی ہے جو یہ اعلان کرتا ہے کہ میں شاہی خاندان سے ہوں اور حکمرانِ وقت کو لکھتا ہے کہ حکومت کرنا میرا حق ہے تم اس سے دست بردار ہو [۶]

ہندوستانی اساطیر کا ایک مشہور واقعہ ہے کہ جب رام بن باس کے لیے گئے اور راجہ دشرت کا انتقال ہوا، تو وہ بیٹا جو شہر میں موجود تھا یعنی بھرت تخت نشین ہوا لیکن بھرت نے تخت نشینی کو اپنے

---

[۱] ۷۷ ج ۱، [۲] ۲۵ ج ۱ - [۳] ہمایوں نامہ ص ۴۳ - [۴] ۵۲۲ ج ۱ - [۵] ۳۱۷ ج ۲ - [۶] ۹۱ - ۲۹۰ ج ۱ -

بڑے بھائی رام کا حق سمجھا، اور ان کی غیر موجودگی میں تخت کو خالی رکھا بلکہ علامتی طور پر رام کے حق کو ظاہر کرنے کے لیے ان کے کھڑاؤں وہاں رکھ دیئے۔ "بوستان" میں خیال آئنے یہ کیا ہے کہ بادشاہ کی غیر موجودگی میں یا بادشاہ کا فیصلہ نہ ہونے پر تخت کو غاشیہ پوش کر دیا ہے اس کی کئی مثالیں داستان میں موجود ہیں۔[1]

سلطان اسمعیل کو اس کے جد و پدر نے اپنی زندگی ہی میں تخت افریقیہ پر بٹھایا اور سکہ و خطبہ میں بھی اس کا نام شامل کیا[2] اور خود کو اس کی رعیت سمجھا:۔

"سلطان نے اس مقام کا اختیار شاہزادہ کو دیا تھا اور فرمایا تھا کہ ہم سب اپنے فرزند اسمعیل کی رعیت ہیں اور وہ ہمارا بادشاہ ہے۔"[3]

اس طرح کی مثالیں تاریخ میں کم ہی ملتی ہیں مثلاً جس وقت سلطان بلبن کا انتقال ہوا تو اس کا بیٹا ناصر الدین بغرا خاں بنگال میں تھا اس لیے بغرا خاں کی بجائے اس کے بیٹے معز الدین کیقباد کو تخت نشین کیا گیا بغرا خاں کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو اس نے کہا میری زندگی میں میرا بیٹا تخت نشین کیسے ہو سکتا ہے، فوج لے کر دہلی کی طرف کوچ کیا لیکن پھر یہ سوچ کر کہ معز الدین میرا فرزند ہی تو ہے اور بعد میں اسے ہی بادشاہ بننا ہے، اپنا خیال بدل دیا، اور اُسے ہی بادشاہ تسلیم کر لیا ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ "باپ اسے تخت پر بٹھا کر کھڑا ہوا پھر واپس بنگال چلا گیا"[4] یا دوسری مثال بابر کی ہے جس نے اپنی زندگی میں اپنے بیٹے کو تخت نشین تو نہیں کیا البتہ مرتے وقت ہمایوں کو اپنا جانشین مقرر کرتے ہوئے کہا تھا:۔

"مدت سے یہ بات میرے دل میں تھی کہ اپنی بادشاہی ہمایوں مرزا کے سپرد کر دوں اور خود باغ زرافشاں میں گوشہ نشین ہو جاؤں خدا کی مہربانی سے سب نعمتیں میسر ہوئیں مگر یہ نہ ہوا کہ تندرستی کی حالت میں یہ کرتا۔"[5]

کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ بادشاہ کی طرح امرا اور وزرا میں بھی عہدہ نسل در نسل چلا ہے حق خانہ زادگی ایک بڑا حق اور لائق فخر اعزاز تھا اسی لیے بادشاہ جن لوگوں کو خانہ زاد لکھتا تھا وہ بطور خاص اپنی حیثیت پر فخر کرتے تھے البتہ یہ ضروری نہیں تھا کہ کسی امیر کے بیٹے یا وارث کو دربار شاہی میں وہی درجہ یا اعزاز دے دیا جائے جس پر اس کا باپ سرفراز تھا، ہندوستان کی تاریخ میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ مغلیہ حکومت میں اکثر عہدے بعض خاندانوں کو مسلسل ملتے رہے ہیں۔

---

[1] ص ۲۱۵ ج ۵، ص ۵۸۷ ج ۴، [2] ص ۲۵۱ ج ۱، [3] ص ۶۷۸ ج ۱، [4] سفرنامہ ابن بطوطہ قسط: ۲ ص ۱۲۲

[5] ہمایوں نامہ ص ۲۹۔

جشنِ تخت نشینی

بادشاہ کے فیصلے کے بعد رسم تخت نشینی کو منانے کی نوبت آتی ہے اس موقع پر نہ صرف دربار کو بلکہ
پورے شہر کو آئینہ بند کیا جاتا قلعۂ شاہی کے اندر اور باہر چراغاں ہوتا آتش بازیاں چھوٹتیں، فقرا و مساکین کو
مال و زر تقسیم کیا جاتا۔ کہا جاتا ہے کہ جب علاء الدین خلجی اپنے چچا جلال الدین کو قتل کر کے تخت پر قابض
ہوا اور پایۂ تخت کی طرف گیا تو اثنائے راہ میں بے شمار اشرفیوں کی تھیلیاں تقسیم کرتا ہوا گیا، اس داد و دہش
کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ نیا بادشاہ خواص و عوام کے دلوں میں اپنا گھر بنا سکے، سلطنت کی رعایا برایا اسے
چاہنے لگے۔

"بوستان" میں کسی جگہ تخت نشینی کے جشن کا تفصیلی ذکر نہیں کیا گیا صاحبقران اکبر کے اجداد کی داستان
میں مصنف نے اس پر ہی اکتفا کیا ہے کہ سلطان مہدی تخت پر بیٹھے اور سکہ و خطبہ اپنے نام کا جاری کیا اسی
طرح قائم اور اسمٰعیل کا ذکر کیا گیا ہے۔ شاہزادہ اسمٰعیل کو تو کم عمری ہی میں بادشاہ نامزد کر کے ملک افریقیہ
کی جانب روانہ کر دیا جاتا ہے اور جب سلطان اسمٰعیل کی وفات ہوتی ہے تو داستان نگار اتنا ہی کہنا کافی سمجھتا
ہے:۔

> "آخر بعد دفن کرنے سلطان اسمٰعیل کے تخت پر جلوس کیا وزرا اور امرا وغیرہ نے
> نذریں پیش کیں۔ صاحبقران نے بعد تخت نشینی کے سکہ و خطبہ میں اپنا خطاب المعز الدین
> باللہ جاری کیا"[1]

ان دو تین جملوں میں صاحبقران اکبر کی تخت نشینی کی رسم ادا ہو جاتی ہے جب کہ یہ رسم سلاطین اور خصوصاً
مغلوں میں بڑی شان و شوکت کے ساتھ منائی جاتی تھی۔ محمد بن تغلق کی تاجپوشی کا جشن مشہور ہے دربار کو
اس حد تک سجایا گیا تھا کہ اس کی ماں کی آنکھوں کی روشنی جواہرات کی چمک سے چلی گئی تھی۔ بابر، ہمایوں اور
اکبر کو اگرچہ جنگوں کی وجہ سے اس جشن کو پورے شان و شکوہ کے ساتھ منانے کی مہلت نہ ملی لیکن جہانگیر
شاہ جہاں، عالم گیر اور اس کے بعد کے بادشاہوں نے یہاں تک کہ بہادر شاہ ظفر کی تخت نشینی کے وقت بڑے

---

[1] ص ۱۴۴ ج ۹ م۔

پیمانے پر تزئین و آرائش کا اہتمام کیا گیا ۔۔۔ اورنگ زیب نے جب اپنے بھائیوں پر فتح پالی اور شاہ جہاں کو نظر بند کر دیا تو باضابطہ دہلی میں جشن تاجپوشی منایا، صباح الدین، عبدالرحمن نے عالم گیر نامہ کے حوالے سے اس جشن کا حال نقل کیا ہے :۔

"اورنگ زیب دیوان عام میں ایک پردے کے پیچھے سے نمودار ہوا، اور تخت پر جلوہ افروز ہو گیا، یکایک نقارہ کی صدا بلند ہوئی، شادیانے بجنے لگے، طنبورہ قانون، ارغنون، چنگ، زمزمے اور ترانے کی آواز فضا میں گونجنے لگی، اہل نشاط نے رقص بھی کیا، امرائے بڑھ کر سیم و زر نچھاور کرنے شروع کر دیئے، تخت کے پاس چاندی سونے اور جواہرات کا انبار لگ گیا اور جس نے جو چاہا اٹھا لیا خطیب نے خطبہ پڑھا خطبہ میں اورنگ زیب کے خاندانی فرمانرواؤں کے نام بھی لیے گئے اور ہر نام پر خطیب کو خلعت عطا کیا گیا اور جب خود عالم گیر کا نام آیا تو خطیب کو سب سے زیادہ بیش قیمت خلعت دیا گیا پھر امرائے نے بڑھ کر اظہار تعظیم کیا، اور ان میں سے ہر ایک کو رنگارنگ خلعت دیئے گئے دربار کی فضا بخور، ارگجہ، عنبر اور عود کے دھوئیں سے معطر کی جا رہی تھی۔ مشک برابر چھڑکے جا رہے تھے، اسی روز عالم گیر کے نام سے سکہ جاری ہوا"۔[1]

اس طرح کی آرائش و زیبائش اور داد و دہش کا منظر رسم تاجپوشی کے وقت "بوستان" میں نظر نہیں آتا۔ اس کا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ داستان میں ایسے مواقع کم ہی آتے ہیں جب کوئی نیا بادشاہ تخت نشین ہوا ہو۔ عام طور پر ایک ہی بادشاہ حکومت کرتا رہتا ہے اور داستان اختتام تک پہنچ جاتی ہے یا پھر کسی ایک بادشاہ نے دوسرے بادشاہ پر فتح پائی اور اس کے تخت پر بیٹھا، اس حالت میں تخت نشینی کا ذکر کرنا ضروری بھی نہیں، کیونکہ فاتح خود بادشاہ ہے پھر بھی بعض جگہوں پر تخت نشینی کی رسم کو مختصراً بیان کیا گیا ہے مثلاً :۔

"بعد ازاں تخت رفعت جلال پر قدم رکھا بمجرد رکھنے قدم صاحبقران کے چار طرف سے نقار خانہائے شادمانی نمانہ سلیمانی کی صدا بلند ہوئی، بلکہ اس وقت ہر گوشہ مجلس سے نصر من اللہ و فتح قریب کی متواتر ندا

---

[1] ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے ص ۱۸۲ ۔

آئی تھی اور ایک عالم مسرت و حالت انبساط میں ہر فرد و بشر کی زبان پر شعر جاری تھا

؎ شکستی توبہ زاہد خمار مے پرستان ہم
رقص ایجام از شادی مے پرستان ہم"[1]

تخت پر بیٹھنے یا قبضہ ہو جانے کے بعد بادشاہ سب سے پہلے اپنا نام سکے اور خطبہ میں شامل کراتا تھا یہ اس کے خود مختار حاکم ہونے کا اعلان ہوتا تھا، مغلوں کے آخری عہد میں بادشاہ کو کمزور دیکھ کر صوبیداروں نے خود مختاری کا اعلان کیا اور سکہ و خطبہ اپنے نام کا جاری کر دیا۔ "بوستان" کے بادشاہ بھی اس امر کو ضروری سمجھتے ہیں :-

"تخت فرمانروائی پر اجلاس فرما کر سکہ و خطبہ اپنے نام کا جاری فرمایا"[2]

یوں تو داستان کے مرکزی کردار مسلمان ہیں لیکن ان کا اسلام ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں جیسا ہی ہے بعض جگہ یہ زہد و تقویٰ اور شرع کے پابند بھی نظر آتے ہیں۔ مثلاً ایک شاہزادہ جب تخت پر جلوس کرتا ہے :-

"بعد ازاں بزرگان دین ارواح پر فاتحہ پڑھ کے اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہہ کے تخت مذکور پر قدم رکھا، اپنے کو عجب شان و شوکت سے دیکھا شکر الٰہی بجالایا"[3]

کوہ قاف ہو یا عالم اسباب تہذیبی اقدار سب کی ایک ہی ہیں قاف میں بادشاہ کے مرنے کے بعد حقدار اولاد ہی ہوتی ہے۔ بادشاہ کے وفات پانے پر تخت نشینی کی رسم ادا ہوتی ہے مثلاً :-

"ملکہ روشن جبیں پری بعد ادائے رسوم تعزیت ارکین سلطنت و اعیان مملکت کے مشورے سے تاج فرماندہی سر پر رکھا اور سریر جہانبانی قلعہ پنجم قاف کو اپنے جلوس سے زیب و زینت بخشی، طاؤس بالی پری وزیر سلطنت اور المع پریزاد سپہ سالار لشکر اور بلاق اور طرطوس جنی وغیرہ سرداران جلیل نے باتفاق جلوس تخت کی نذریں گذرانیں"[4]

مذکورہ اقتباسات میں یہ ذکر آیا کہ امرا نے نذریں گذرانیں، اس لیے مناسب ہوگا نذریں گذراننے کی رسم کو بھی واضح کر دیا جائے، دربار کے آداب میں شامل تھا کہ جب دربار عام آراستہ ہوتا تو امرار اور سردار بادشاہ کو اپنی حیثیت کے مطابق نذریں پیش کرتے، خصوصاً جب کوئی شخص پہلی مرتبہ بادشاہ

---

[1] ج ۴، [2] ۱۳۵ ج ۹م۔ [3] ۴۵۵ ج ۱، [4] ۱۴۱ ج ۵۔

کے روبرو حاضر ہوتا تو نذر کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور اپنے ساتھ لاتا تھا اور سلام و مجرے کے بعد بادشاہ کو پیش کرتا، بادشاہ اسے قبول کر کے اپنی جانب سے نذر پیش کرنے والے کو انعامات سے نوازتا تھا جو نذر کیے ہوئے سامان سے زیادہ قیمتی ہوتے تھے، نذر پیش کر کے بادشاہ کے لیے اپنی اطاعت اور فرمبرداری کو ظاہر کرنا بھی تھا۔ نذر میں کچھ بھی پیش کیا جا سکتا تھا، مہرے، جواہرات، ہتھیار، ہاتھی، گھوڑے، روپے وغیرہ، علما اور فقرا قرآن شریف، مصلےٰ، یا مسواک نذر کے طور پر پیش کرتے تھے۔

گوالیار کے راجہ بکرماجیت کے خاندان نے ہمایوں کو مشہور کوہ نور ہیرا پیش کیا تھا۔[۱] جہانگیر جب اکبر کے روبرو گیا تو اس نے بارہ ہزار اشرفیاں، اور نو سو ستر نر و مادہ ہاتھی نذر کیے بادشاہ نے تین سو چون [۳۵۴] قبول فرمائے اور باقی جہانگیر کو بخش دیئے۔[۲] شاہ جہاں نے دکن کو فتح کرنے کے بعد جہانگیر کو جو تحائف نذر کیے ان کی فہرست طویل ہے سو عرب و عراقی گھوڑے، ڈیڑھ سو ہاتھی مع سونے چاندی کی صنع کاٹھیوں کے، ایک ساڑھے نو ٹنکہ وزن کا عقیق جس کی قیمت دو لاکھ روپے تھی۔ ایک چھ ٹنکہ وزن کا نیلم، اور ہزاروں لاکھوں روپے کے جواہرات نذر کیے۔[۳] دربار کی اس رسم کو شاہ عالم بادشاہ نے اس طرح نظم کیا ہے ؎

"آج تخت پر بیٹھے جشن کر شاہ عالم نذر سبھی کی لینی
چلو سب سکھی سہیلی آنند سیتی مل جلوس کی مبارکی دینی"[۴]

"بوستان" میں جب شاہزادہ تخت پر بیٹھتا ہے تو سب اُمرا نذریں پیش کرتے ہیں:۔

"تمام حاضرین دربار نے اول صفوان نے جلوسِ تخت کی مبارکباد دی۔ بعد ازاں سرداران لشکر و عمائد شہر نے علی قدر مراتب و مناسب اشرفی و جواہر نذر گذرانا"[۵]

صاحبقران اعظم خورشید تاج بخش جن کا زمانہ صاحبقران اکبر سے کئی صدیاں پہلے کا ہے ان کے دربار میں بھی نذریں پیش کی جاتی ہیں:۔

"صاحبقران .... بارگاہ میں تشریف لائے، تخت دولت و کامرانی پر جلوس فرمایا سب سے نذریں قبول کیں، خلعت سے رفقا و ملازمین کو حسب مراتب مخلع کیا"[۶]

---

[۱] ہندوستانی معاشرہ عہد وسطیٰ میں ص ۱۰۱، [۲] تزک جہانگیری ص ۲۷، [۳] تاریخ جہانگیر ص ۲۷۸
[۴] نادرات شاہی ص ۸۳، [۵] ص ۱۳۱ ج ۳، [۶] ص ۶۲۳ ج ۸ م،

ابوالحسن جوہر جو معزالدین کا دودھ شریک بھائی ہے جب سلطان اسمعیل پدر معزالدین کے دربار میں پہونچا تو نذر پیش کی :۔

"ابوالحسن اوّل بصد ادب آداب بجالایا اور بعد دعا و ثنا کے ایک لعل بے بہا جو طلسم سے دستیاب ہوا تھا اور رنگ اور سنگ میں بے مثل و بے نظیر تھا سلطان اسمعیل کو نذر کیا"[۱]

اسی موقع پر ابوالحسن کا ایک جفت مروارید بیش قیمت ملکہ عالیہ خاتون زوجہ سلطان اسمعیل کو پیش کرنا[۲] شاہ جہاں کی وہ نذر یاد دلاتا ہے جو اس نے دکن کی فتح سے لوٹ کر نورجہاں کو پیش کی، یہ دو لاکھ کا ایک ہیرا تھا۔[۳]

جب فتح کا جشن منایا جاتا تھا تب بھی امرا نذریں پیش کرتے تھے اور بادشاہ انھیں خلعتیں عطا کرتے تھے[۴]

برنیر نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ امرا بادشاہ کو عمدہ موتی، بیش قیمت ہیرے، زمرد، یاقوت، اشرفیاں وغیرہ پیش کرتے ہیں لیکن اس قدیم دستور کو امرا پسند نہیں کرتے بلکہ انھیں زبردستی دینی پڑتی ہے[۵] برنیر کیونکہ مغربی دنیا سے آیا تھا اس لیے اس کی نظر میں اس رسم کی قدر و قیمت وہ نہ تھی جو مشرقی آداب و روایات سے وابستگی رکھنے والوں میں تھی ممکن ہے کہ بعض امرا نذر گذراننے کو پسند نہ کرتے ہوں خاص طور پر اس لیے کہ یہ سب کے لیے لازمی تھی اور کسی کو اس سے مفر نہ تھا شاہی ادارے کے لئے حاضر دربار ہونے کے موقع پر نذر پیش کرنا ایک ضروری امر تھا، اس لیے کہ بہادر شاہ ظفر سے لارڈ ایلن برا نے یہ خواہش کی تھی کہ اسے نذر پیش کرنے سے معاف رکھا جائے تو بادشاہ نے اُسے قبول نہیں کیا تھا، بات صاف تھی کہ اس سے شاہی آداب و رسوم میں فرق آتا تھا جو نذر پیش کی جاتی تھی اس کے سلسلے میں اکثر ایسا ہوتا تھا کہ بادشاہ اس سے زیادہ قیمت کی کسی شئے، خلعت یا انعام سے نذر دینے والا کو سرفراز کرتا تھا، بقول شخصے نذر پیش کرکے بادشاہ سے عطیہ حاصل کرنے کی روایت سلطان محمد بن تغلق کے زمانہ میں اس حد تک مقبول ہو چکی تھی کہ لوگوں نے اس کو کاروبار بنا لیا اور اس سے نفع کمانے لگے لوگ ان افراد کو جو بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے بڑی بڑی رقمیں تحائف خریدنے کے لیے دینے لگے اور سلطان سے بدلے میں

---

[۱] ۳۸۳ ج ۹ م، [۲] ۳۸۴ ج ۹ م، [۳] تاریخ جہانگیر ص ۳۷، [۴] ۴۲۳ ج ۳،
[۵] سفرنامہ برنیر ص ۵۷۹۔

ملنے والے عطیے سے جو نفع ہوتا تھا اس میں حصہ دار بننے لگے۔[1]

بادشاہ کی طرف سے بخشے گئے انعام میں بیشتر ایک خاص چیز بھی شامل ہوتی تھی جسے خلعت کہا جاتا تھا، خلعت کا پانا بڑے اعزاز و افتخار کی بات سمجھی جاتی تھی، خلعت کے معنی ہیں کہ وہ جوڑا یا لباس جو بادشاہ کسی کو بطور انعام عطا کرے۔ یہ سونے کے تاروں سے مرصع سراپا یا گاؤن کی شکل کا ہوتا تھا۔ اسی کو برنیر نے سر سے پاؤں تک کا لباس کہا ہے[2] سلطان محمد تغلق نے ایک کارخانہ لگوایا تھا۔ جہاں خلعت اور شاہی خاندان کے پہننے کا ریشمی کپڑا تیار ہوتا تھا، شیخ مبارک کا بیان ہے کہ بادشاہ ہر سال پورے لاکھ جوڑے تقسیم کرتا تھا۔[3] خلعت کی اس وقت اور عزت بڑھ جاتی تھی اور جسے بڑی عزت سمجھا جاتا تھا جب بادشاہ اپنا پہنا ہوا لباس کسی کو عطا کرتا۔ "مقامات ناصری" میں تحریر کیا ہے کہ:۔

"خلعت جامہ باشد کہ از تن کشیدہ بر دیگرے دہند"

اسی کتاب میں آگے چل کر اخبارِ قلعہ معلی سراج الاخبار کا ایک اقتباس نقل کیا گیا ہے:۔

"فرزند ارجمند معظم الدولہ بہادر صاحب رزیڈنٹ دہلی معہ سکتر صاحب بہ آبا ستان بوسی فائز شدہ کہ صیقل آئینہ انداز و رنگ چہرہ امتیاز گردیدہ بعرض رسانید کہ فدوی ارادہ روانگی کوہ سملہ برسم دورہ دارد ... چون معمول ایں خاندان رفیع الشان است کہ ہنگام رجعتِ امرا بعطائے خلعت میگردند صاحب بہادر موصوف بعنایت دوشالہ ملبوس خاص ممتاز گردیدہ نذر تہنیت گذرانید"[4]

عموماً جب کوئی شخص پہلی بار بادشاہ کے روبرو آتا تو بادشاہ اُسے خلعت دیتا تھا۔ کوئی شاہزادہ یا سردار جنگ جیتنے کے بعد بادشاہ کے سامنے حاضر ہوتا تو بادشاہ اُسے خلعت پیش کرتا۔ جب کسی کو کوئی جاگیر عطا کی جاتی تو بادشاہ اسے خلعت دے کر رخصت کرتے، ولادت کی تقریب، شادی کے جشن، اور دوسری خوشی کے موقعوں پر بھی شاہزادوں اور امرا کو خلعت سے نوازا جاتا تھا کسی ملک کا حاکم یا سفیر جب دربار میں حاضری دیتا تو بادشاہ اسے انعامات میں خلعت بھی دیتا۔ تخت نشینی کے وقت جب امرا نذریں گذرانتے تھے تو بادشاہ جاگیریں منصب اور خلعتیں بخشتا تھا،

---

[1] ہندوستانی معاشرہ عہد وسطیٰ میں ص ۱۱، [2] برنیر ص ۱۹۱، [3] محمد شاہ بن تغلق ص ۲۳۶

[4] مقامات ناصری ص ۵۵۵۔

خلعت دینے کی مثالیں تاریخ ماضیہ اور "بوستان" میں بے شمار موجود ہیں۔ مثلاً خانِ خاناں جب دکن کی مہم پر روانہ ہوا تو جہانگیر نے ایک مرصع خنجر، ہاتھی اور گھوڑے کے ساتھ ایک اعلیٰ درجہ کی خلعت بھی اسے عطا کی[1]۔ میواڑ کے رانا نے جب شاہ جہاں سے صلاح کی اور شاہزادہ کرن جب دربار میں حاضر ہوا تو شاہزادہ خرم (شاہ جہاں[2]) نے ایک غیر معمولی خلعت اور جواہرات وغیرہ سے اسے سرفراز فرمایا[3]۔ اورنگ زیب کا جشنِ تاجپوشی کئی ہفتہ تک چلا، شاہزادے اور امرا برابر نذریں پیش کرتے رہے اور ان کو حسب مراتب خلعت، مناصب اور انعامات ملتے رہے[3]۔ عالمگیر ہی کے عہد میں جب ایران کا سفیر بوداق بیگ ہندوستان آیا جس وقت وہ ملتان پہونچا عالم گیر نے ایک مقرب خاص کو بھیج کر خلعت عطا کیا۔ اسی طرح ہر منزل پر، اور جب وہ دربار میں پہونچا تو اسے اور اس کے ساتھیوں کو خلعت عطا کی گئی[4]۔ جس طرح تاریخ کی کتابوں میں خلعت دہی اور دیگر انعامات کے واقعات درج ہیں "بوستان" میں ہو بہو انھیں کی نقل نظر آتی ہے، ایک شاہزادے نے جب ایک مہم کو فتح کیا، امرا نے مبارکبادیں دیں اور نذریں پیش کیں تو شاہزادے نے بھی انھیں انعامات سے نوازا:۔

"فتح کے بعد سب نے شاہزادے کو مبارکباد دی اور ہر سردار اور افسر لشکر نے حسب قدر ولیاقت شاہزادے کو نذریں دیں، شاہزادے نے بھی ہر سردار و امیر کو خلعت ہائے فاخرہ اور مناسب عمدہ سے سرفراز فرمایا[5]"

جنگ کے لیے روانگی کے وقت صاحبقران اکبر خلعت سے نوازتا ہے:۔

"صاحبقران اکبر نے ایک خلعت گراں بہا مع جیغہ و سرپیچ مرصع نگار اور اسپ عربی خاص اپنی سواری کا سماج اژدر کو عطا کیا[6]"

"صاحبقران نے اسے ایک خلعت گراں بہا مع شمشیر و خنجر و خیمہ و خرگاہ مرحمت فرمایا[7]"

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ جب کسی کو دربار کی طرف سے خلعت یا کوئی اور انعام عطا ہوتا ہے تو وہ اس سرفرازی اور اعزاز کی خوشی میں اپنے ملازموں کو بھی انعامات اور خلعت سے نوازتا ہے:۔

"جس شخص کو سرکار بادشاہی یا کسی امرا کے یہاں سے خلعت یا انعام ملتا ہے تو وہ حسب قدر اپنی ملازموں کو ضرور انعام دیتا ہے[8]"

---

[1] تاریخ جہانگیر ص ۲۶۳، [2] تاریخ شاہ جہاں ص ۱۵، [3] ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے ص ۴۲
[4] ایضاً ص ۴۶، [5] ص ۶-۷ ج ۴، [6] ص ۹۸ ج ۴، [7] ص ۸۹ ج ۶، [8] ص ۳۲۱ ج ۴ ۔

غرض کہ نذریں پیش کرنے اور خلعت بخشنے کی بہت سی مثالیں داستان میں موجود ہیں عموماً میدانِ جنگ میں جانے سے پیشتر پہلوانوں اور دربار میں آنے والے سفراء کو خلعتیں دی گئی ہیں حتی کہ اگر کوئی شخص خوشخبری بھی بادشاہ کو سنائے تو وہ اُسے خلعت بخشتا ہے، مثلاً جب نصفور نے انصاق شاہ کو یہ خوشخبری دی کہ رستم گیہان اس کی مدد کو آرہا ہے تو انصاق شاہ نے اسے خلعت سے سرفراز فرمایا۔[1] خلعت اور انعام پانے کے بعد وہ شخص بادشاہ کو شکریہ اور عزت افزائی کے عوض تین بار تسلیم بجالاتا تھا، تسلیم کا طریقہ یہ تھا کہ سلام کرنے والا پہلے دائیں ہاتھ کی پشت زمین پر رکھتا پھر اس کو آہستہ آہستہ اٹھاکر سیدھا کھڑا ہو جاتا اور اپنی ہتھیلی کو اپنے تالو پر رکھ لیتا۔ جس سے یہ اظہار مقصود تھا کہ میں اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہوں[2] بعض لوگوں کو یہ بھی اجازت ہوتی کہ پایۂ تخت کو بوسہ دے لیں :۔

"سہیل نے بعد ادائے آداب و تسلیم پایہ تخت کو بوسہ دیا"[3]

آراستگی دربار اور اس کے آداب

بادشاہ کا انتخاب ہو گیا، تخت نشینی کی رسم بھی ادا ہو گئی، نذریں بھی گذرانی جا چکیں، بادشاہ انعامات اور جاگیروں سے بھی امراء اور حاضرینِ دربار کو نواز چکا، اب دیکھیں کہ دربار کس شان سے آراستہ کیا جاتا ہے۔ دربار کے آداب کا ذکر مختصراً اس سے پیشتر کیا جا چکا ہے۔

شخصی حکومت میں حکمرانِ وقت کا مقصد ہی دوسروں سے اپنے آپ کو ممتاز رکھنا ہوتا ہے اور اس امتیاز کو تادیر رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ خواص و عوام کے دلوں پر ایسا رعب و دبدبہ قائم کیا جائے کہ جب بادشاہ ان کے روبرو ہو تو بے اختیار سب کی نگاہیں جھک جائیں، پہلی نظر میں سب مرعوب ہو جائیں۔ بادشاہ کی طرف نگاہ اٹھانے کی کسی کو جرأت نہ ہو، بلبن کہا کرتا تھا کہ جو بادشاہ دربار کی آرائش، شاہانہ سواری کے مراسم اور سلطنت کے آداب کا لحاظ نہیں کرتا اس کا رعب و داب رعیت کے دلوں میں قائم نہیں رہتا اور نہ دیکھنے والوں پر اس کو حشمت و جلالت کا کچھ اثر ہوتا ہے ایسے بادشاہ کے دشمن دلیر ہو جاتے ہیں اور اس کی حکومت میں خلل پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بادشاہ کا پُر ہیبت اور پُر جلال نہ ہونا رعایا کی سرکشی اور بغاوت کا باعث ہوتا ہے[4] ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کو

---

[1] ۶۵۳ ج ۴ ، [2] آئین اکبری جلد اول ص ۲۹۹ ، [3] ص ۱۸۷ ج ۳

[4] ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے ص ۶

دربار کی شان وشوکت ایران کے شہنشاہوں اور ہندوستان کے راجاؤں سے ورثہ میں ملی تھی اسی انداز پر سلاطین اور مغل بادشاہ اپنا دربار منعقد کرتے تھے۔

دربار میں بادشاہ کا تخت سب سے اونچی جگہ پر ہوتا تھا۔[1] تاکہ وہ سب سے نمایاں رہے اور سب اُسے دیکھ سکیں اور خود بادشاہ کی نگاہ سب تک پہونچ سکے، بادشاہ جس تخت پر جلوس فرماتا تھا وہ ہیرے جواہرات سے مرصع ہوتا تھا اس پر دائیں بائیں اور پشت کی طرف گاؤ تکیے رکھے ہوتے ہوتے تھے۔ "بوستان" کے بیشتر شاہی تخت ایسے ہیں جن کا تصور شاہ جہاں کے تختِ طاؤس سے ماخذ معلوم ہوتا ہے یوں بھی مصنف کے سامنے مثال تخت طاؤس ہی کی تھی۔ بعض تفصیلات اس سے مختلف بھی ہیں، ملاحظہ ہو "بوستان" کے ایک تخت کا مختصر بیان:۔

"شہزادے کو تخت کے پاس لائے، غاشیہ تخت سے اٹھایا ...... بارہ گز مدور
تھا اور بارہ برجوں کی شکل اس کے گرد بنی تھی اور ہر صورت پر نقش کندہ کئے تھے،
حکمانے یہ تخت جمشید کے واسطے بنایا تھا"[2]

یہاں بارہ برجوں کا تصور اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اس طرح کے تخت علم نجوم کے تصورات کو سامنے رکھ کر بنائے جاتے تھے۔ بارہ برجوں کے درمیان مسند سلطنت پر بادشاہ کی نشست سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہوتا تھا کہ بادشاہ کی شخصیت آفتاب کی مثال ہے بارہ برج جس کے نظام کا حصہ ہیں۔

بعض درباروں میں سنگ مرمر کی صندلیاں یعنی کرسیاں بھی ہوتی تھیں، ان کا استعمال دوران غرض دربار آراستہ کرنے میں بھی کیا جاتا تھا۔

دربار میں خوبصورت قالین اور فرش بچھتے تھے۔ ریشم اور زربفت وغیرہ کے چمکتے ہوئے پردے لٹکائے جاتے تھے، بادشاہ کے علاوہ دربار میں بہت کم افراد کو بیٹھنے کی اجازت ہوتی تھی، ولی عہد، شاہزادے یا اعلیٰ منصبدار ہی بادشاہ کی موجودگی میں بیٹھ سکتے تھے ان کے لیے بادشاہ سے کچھ فاصلے پر دائیں بائیں صندلیاں رکھی ہوتی تھیں۔ بلبن کے دربار میں پندرہ کے قریب شاہزادے پناہ گزیں تھے لیکن ان میں سے صرف دو کو جن کا تعلق بنی عباس کے خاندان سے تھا بیٹھنے کی اجازت تھی، بقیہ شاہزادے اور حاضرین دربار دست بستہ ایستادہ رہتے تھے، کھڑے ہونے والے افراد قطار در قطار تخت کے دونوں جانب درمیان میں جگہ چھوڑ کر کھڑے ہوتے تھے، اکبر کے دربار میں استادہ و نشست کے آداب اس طرح تھے کہ شاہزادہ سلیم جب دربار میں کھڑا ہوتا تو اس کا فاصلہ بادشاہ سے کم سے کم ایک گز اور زیادہ سے زیادہ چار گز ہوتا تھا جب بیٹھتا تو اس کا فاصلہ دو گز اور آٹھ کے درمیان رہتا شاہزادہ مراد ڈیڑھ گز سے زیادہ قریب اور چھ گز سے

---

[1] ہ ۲۴۴ ج ۱۔

زیادہ دور نہیں کھڑا ہوتا۔ بیٹھنے کی حالت میں یہ فاصلہ تین گز سے آگے اور بارہ گز پیچھے رہتا،اسی طرح شاہزادہ سویم یعنی دانیال کی استاد ونشست کا فاصلہ بھی مقرر تھا[1]

امراء کے بھی مختلف طبقے تھے،اوّل، دوم اور سوم، اپنے اپنے مرتبہ کے لحاظ سے وہ فاصلے پر کھڑے ہوتے یا بیٹھتے تھے۔"بوستان" میں بھی اسی طرح دربار میں استاد و نشست کے آداب مقرر ہیں۔چاہے وہ طلسم کا دربار ہو یا عالمِ اسباب کا:۔

"غرض کہ جب سلطان مجلس میں داخل ہوئے،پریزادین چار جانب سے دوڑیں نیم تخت اور کرسیاں علیحدہ کر کے تخت عالی مرصع بجواہر بیچ میں بچھایا اور ایک طرف شاہزادہ قائم الملک کا نیم تخت اور دوسری طرف رکن الملک کا نیم تخت اور قایم الملک کے پہلو میں شاہزادہ حیدر کا نیم تخت بچھایا،اور اسی طرح ترتیب سے دلاوروں کی کرسیاں بچھائیں"[2]

دربار میں امرا اور جنگجو پہلوانوں کی کرسیاں ان کے مرتبے سے پڑتی ہیں[3] یہ قاعدہ بھی ملتا ہے کہ اگر کسی کرسی کے لایق کوئی سردار نہیں ملتا تو وہ غاشیہ پوشش کر دی جاتی ہے[4] جس طرح بادشاہ کی غیر موجودگی میں تخت کو غاشیہ پوشش کر دیا جاتا تھا،جب کسی سردار کو کرسی پر بیٹھنے کی اجازت ملتی تو وہ اسی طرح تسلیم و آداب بجالاتا جیسے انعام ملنے پر کیا جاتا ہے:۔

"سلطان نے ایک کرسی نقرئی اپنے تخت کے روبرو توفیق کے واسطے بچھوادی، توفیق آداب بجالایا اور سلطان رکن الدین کے روبرو کرسی پر بیٹھ گیا"[5]

"بعد ازاں فرمایا اے عزیز القدر فلاں کرسی زرنگار پر ہمارے روبرو بیٹھ جاؤ شاہزادہ مہران بار دِگر آداب و تسلیم بجالایا"[6]

کسی خاص جشن یا تہوار یا کسی سفیر کی آمد کے علاوہ بھی دربار منعقد ہوتا تھا، جس میں امراء کے ساتھ بیٹھ کر ملکی مسائل طے کئے جاتے تھے۔اس کی نوعیت دو طرح کی تھی ایک دربارِ عام جس میں تمام امراء اور سرداروں کے علاوہ عوام بھی شریک ہوتے تھے،جہاں یہ منعقد ہوتا اسے دیوانِ عام کہتے تھے،اس جگہ بادشاہ کے تخت اور امرا کے کھڑے ہونے کی جگہ کے علاوہ ایسا بڑا میدان بھی ہوتا جہاں زیادہ تعداد میں لوگ آسکیں

---

[1] آئین اکبری جلد اوّل ص ۳۰۲ ، [2] ص ۴۰۶ ج ۱، [3] ص ۵۱۳ ج ۳، [4] ص ۶۱ ج ۵ –
[5] ص ۲۹۴ ج ۴، [6] ص ۳۴۳ ج ۵ –

اس جگہ بڑے بڑے شامیانے لگائے جاتے تھے، پردے آویزاں ہوتے تھے۔ فرش بچھائے جاتے تھے۔

دربار عام بعض بادشاہ روزانہ کیا کرتے تھے بعض ہفتے میں صرف ایک بار۔ محمد بن تغلق ہر منگل کو دربار عام منعقد کرتا تھا۔ شاہ جہاں روزانہ صبح کو دیوانِ عام میں آیا کرتا تھا۔ "بوستان" میں ایسا کوئی قاعدہ مقرر نہیں ہے۔ عموماً روز ہی دربار ہوتا ہے اور سب حاضر ہوتے ہیں۔ اگر صاحبقران میدان جنگ یا حرم میں نہیں ہے۔ یوں داستان میں کوئی ایسا موقع آیا بھی نہیں ہے کہ صاحبقران نے کسی ایک مقام پر بیٹھ کر حکومت کی ہو بلکہ داستان کی ابتدا ہی وہاں سے ہوئی ہے جب صاحبقران اپنے ملک سے کوچ کرتے ہیں۔ چاہے وہ صاحبقران اکبر ہوں یا صاحبقران اعظم واصغر ۔۔۔ یہ لوگ راہ عشق کے مسافر ہیں راستے میں جو ممالک آتے ہیں انھیں فتح کرتے ہوئے منزلِ جاناں تک پہونچتے ہیں۔ اور جب سکون کے لمحے نصیب ہوتے ہیں تو داستان ختم ہو جاتی ہے۔ خیموں میں ہی دربار لگتا ہے وہیں پر دربار کے تمام رسوم وآداب ادا کئے جاتے ہیں۔ بادشاہوں کے ساتھ حالتِ سفر میں بھی وہ تمام سامان اور متعلقہ اسباب ساتھ چلتا تھا جو راستے میں دربار آراستہ کرنے یا شاہی محفل سجانے کے کام آتا تھا۔ مغلوں کے لیے تو کہا جاتا ہے کہ خود ان کا لشکر بھی ایک متحرک شہر ہوتا تھا۔ پڑاؤ کے دنوں میں "بوستان" کے بادشاہ تقریباً روز ہی دربار عام کرتے ہیں، ملکہ گلشن افروز کی فرنروائی طلسم اجرام واجام میں ہے اور وہ کئی ممالک پر حکومت کرتی ہے اس کے یہاں دربارِ عام ہفتہ میں ایک بار ہوتا ہے[1]

ملکہ نوبہار کی طرح بادشاہ لہراسپیہ بھی ہفتے میں ایک بار دیوانِ عام کرتا ہے[2]

دربار کی دوسری نوعیت دربارِ خاص کی ہے۔ دیوان عام بڑے میدان میں ہوتا تھا لیکن دیوانِ خاص کے لیے ایک الگ بڑے ہال کی سی عمارت بنی ہوتی تھی۔ یہاں بھی تخت مرصع کار رکھا جاتا۔ امراء اور شاہزادوں کے لیے صندلیاں ہوتیں۔ دیوانِ خاص میں ہر امیا در وزیر نہیں آسکتا تھا بلکہ چند امراء اور وزیر جن کے مرتبے سلطنت میں بلند ہوں بار یاب ہو سکتے ہیں، یہاں پر وہ امورِ سلطنت انجام پاتے تھے جو دربارِ عام میں نہیں ہو سکتے تھے کیونکہ یہاں صرف معتبر اور معتمد امراء ہی آسکتے تھے، اس لیے ہر معاملہ میں مشورہ کیا جاتا تھا اہم فیصلے اسی جگہ ہوتے تھے، یہاں پر بھی نذر گذراننے اور خلعت دینے کی دلداری رسمیں ادا کی جاتی تھیں کوئی خاص مہمان یا کسی بڑے ملک کا سفیر آتا تو بادشاہ اسے دیوانِ خاص میں باریابی کی اجازت دیتا تھا اور اس سے ملاقات کرتا تھا اس دربار میں بھی تمام امراء کو نشست کی عزت نصیب نہیں ہوتی تھی۔

---

[1] ۳۸۰ ج ۲ ۔ [2] ۳۵ ج ۹

اور نہ بہت قریب بیٹھ سکتے تھے۔

دربارِ خاص عموماً روز ہی صبح و شام منعقد ہوتا تھا۔ شاہ جہاں دیوانِ عام میں پیش ہونے والے مسائل کو سننے اور ان پر فیصلہ دینے کے بعد دیوانِ خاص میں آیا کرتا تھا، تختِ طاؤس دیوانِ خاص ہی میں رکھا ہوا تھا اسی طرح صاحبقران اکبر بھی تقریباً روز ہی دربارِ خاص آراستہ کرواتا ہے۔ جس میں تمام ذی عزت امیر اور پہلوان شریک ہوتے ہیں۔ ان سے مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی ہے۔ صاحبقران کے دربارِ خاص میں جو امیر شرکت کرتے ہیں تقریباً سبھی کے لیے کرسیاں پڑی ہوئی نظر آتی ہیں یہ لوگ صبح و شام حاضر ہوتے ہیں :-

"شہاموت دانا وغیرہ صبح و شام دو وقت سلام و مجرے کے واسطے حاضر ہوتے تھے"[1]

دیوانِ خاص میں دیوانِ عام کا سا تکلف نہیں ہوتا بلکہ بادشاہ درباری آداب کی پابندی میں کچھ آزاد ہوتا ہے یہاں رقص و نغمہ کی محفل بھی منعقد ہوتی ہے :-

"درویش مغربی دیوانِ خاص میں لایا اور کہا یہ مقام حضور کی اقامت گزینی کے واسطے معین ہے پریزادان زہرہ طلعت کا نغمہ دلکش سنئے اور بادۂ نشاط افزا کا شغل فرمایئے"[2]

دربارِ عام کے سلسلے میں کہا گیا ہے کہ کیونکہ صاحبقران کا قصہ سفر کی ابتدا پر شروع ہوتا ہے اور منزل پر پہونچ جانے کے بعد ختم ہو جاتا ہے ایسی صورت میں دیوانِ عام کا موقع ہی نہیں ملتا لیکن دورانِ سفر خیام مرفوعات میں جو دربار آراستہ ہوتا ہے اُسے دربارِ خاص ہی کہا جا سکتا ہے کیونکہ اس میں تمام لشکری شریک نہیں ہوتے۔

دربار میں سفراء کی آمد

دربار کی آراستگی اور آرائش پر اس وقت زیادہ دھیان دیا جاتا تھا جب کسی ملک کا سفیر دربار میں آتا۔ یہ بات پھر دہرائی جاتی ہے کہ شخصی حکومت میں شان و شوکت پر خاص توجہ دی جاتی تھی، سفیر کی آمد پر شان و شوکت اور جلال و جبروت کے اظہار کا یہ مقصد ہوتا تھا کہ یہ شخص جب اپنے ملک لوٹے گا تو اپنے بادشاہ سے دربار کے رعب و دبدبہ کو بیان کرے گا جس سے دوسرا بادشاہ مرعوب ہوگا۔ تاریخ میں

---

[1] ۳۵ ج ۴، [2] ۵۸۸ ج ۵۔

اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں ناصر الدین محمود کے زمانہ میں منگولوں کے ایلچی دربار میں آئے تو قصر سبز کی آرائش اس طرح کی گئی تھی کہ بقول منہاج ؎

زترتیب نہار ورسم وآئین ونشاط او
تو گفتی عرصہ، دہلی بہشت ہشتمیں گشتہ

زمین پر انواع واقسام کے قیمتی فرش، دیواروں پر زر وجواہر سے لدے ہوئے پردے، ترکان زریں کمر کی کثرت نے ان سفیروں کا یہ حال کر دیا کہ ہیبت سے بے ہوش ہونے لگے۔ منہاج نے اپنا مشہور قصیدہ پڑھا جس کا ایک مصرعہ تھا ؎

کزیں ترتیب ہندوستان بے خوشتر زچیں گشتہ[1]

مغلوں کے دربار میں بھی سفیر کی آمد پر شان وشوکت کا یہی حال تھا جس کا عکس "بوستان" میں نظر آتا ہے:۔

"سلطان مہدیہ سے نکلے اور حکم دیا کہ بارگاہ جباری نہایت زینت سے استادہ کر دو اور امرار ولشکر کو بھی لباس فاخرہ کا حکم دیا، اس امر سے سلطان کو یہ منظور تھا کہ ایلچی کو شان وشوکت سلطان کی معلوم ہو"[2]

جس طرح یہ بادشاہ ایلچی کو مرعوب کرنے کے لیے اپنے رعب ودبدبہ اور شان وشوکت کی نمائش کرتا ہے اسی طرح جب بعض بادشاہ اپنے ایلچی کو بھیجتے ہیں تو اس آن بان کے ساتھ کہ دیکھنے والوں کے دلوں پر اس کا یہ اثر ہوتا ہے کہ جب ایلچی کے جلوس کے جلال وجبروت کا یہ حال ہے تو خود اس کا بادشاہ کس قدر شان کا مالک ہوگا بقول صاحبقران اکبر:۔

"بادشاہان رفیع القدر با عز وشان کا عظمت وجلال فقط ایلچی کے تجمل و شوکت سے ظاہر ہوتا ہے اور سلاطین اطراف میں بلند نامی کی صورت ہے"[3]

صاحبقران اکبر نے جب ابو المکارم کو ابو عامر کے دربار میں بھیجا تو اس تزک واحتشام کا اہتمام کیا کہ ناظرین انگشت بدنداں رہ گئے، ابو المکارم تخت پر سوار تھا اس کی ہمراہی میں بہت ساری فوج تھی

---

[1] اوراق مصور ص ۱۳۱، [2] ص ۳۴۳ ج ۱، [3] ص ۳۴ ج ۳۔

تمام راستے خلایق کو زر و جواہر تقسیم کرتا جاتا تھا اس کے پہونچنے سے پہلے شہر فردوسیہ میں اس کی سخاوت اور پرشکوہ جلوس کی شہرت پہونچ گئی[1] اسی طرح صاحبقران اصغر بدر منیر نے بادشاہ آفاقیہ آفاق شاہ کے دربار میں اپنا سفیر بھیجا تو ایسی ہی شان و شوکت کی نمائش کی:۔

"میری زبان سے اس کی صفات حمیدہ کا ایک شمہ بیان نہیں ہو سکتا چنانچہ اس عالی قدر کی بخشش و کرم کی داستانیں اقصائے عالم میں بیان ہوتی ہیں ظاہر ہے کہ شہر اخلاقیہ سے دارالسلطنت آفاقیہ تک لا اقل چار ماہ کامل میں پہونچا ہوگا الا کوئی تاریخ ایسی نہیں کہ اس نے ہر منزل پر تیس چالیس تمن بطریق سلوک و انعام خلایق کو نہ دیئے ہوں تمام اہل لشکر ادنیٰ و اعلیٰ دونوں وقت اسی عالی ہمت کے باورچی خانہ سے کھانا کھاتے ہیں کسی فرد بشر کے ہاں دیگدان تک گرم نہیں ہوتا، ورای ازیں بارہ ہزار مرکبان عربی و عراقی اور شتران نجدی زریں نعل ہمراہ رکاب ہیں اگر کسی مرکب پری پیکر کا نعل زریں گر پڑتا ہے کیا مجال اہل لشکر کی کہ نعل افتادہ کو زمین سے اٹھائیں۔ فقرا و مساکین لے لیتے ہیں اور اسی وقت دوسرا بندھ جاتا ہے"[2]

جب اس شان و شوکت کے ساتھ سفیر آتا ہے تو کوشش کی جاتی ہے کہ اس سے زیادہ اعلیٰ پیمانے پر اس کا استقبال کیا جائے۔ ناصر الدین محمود نے ہلاکو خاں کے سفیر کے استقبال کے لیے دو لاکھ پیادے اور پچاس ہزار سوار زرق برق لباس پہنے، ہتھیاروں سے آراستہ دہلی کے باہر کھڑے کئے تھے[3] اسی طرح صاحبقران اکبر کے ایلچی کے استقبال کے لیے بادشاہ ابو عامر خود شہر سے باہر آیا[4] صاحبقران اصغر نے ایک سفیر کے استقبال کے لیے شاہزادہ فرخ زور کو بھیجا[5] جب ابو عامر کی طرف سے پادری ایڈروس صاحبقران اکبر کے دربار میں آیا تو صاحبقران نے اس کی پیشوائی کے لیے امیر معظم اور ابو المکارم کو روانہ کیا اور کمال اعزاز و اکرام سے دربار میں بلایا[6] جاموں کے استقبال کے لیے لہراسب شاہ خود گیا[7] سفیر کا اس کے شایان شان استقبال کرنا شاہی آداب میں شامل تھا، اکثر امرا اور اعلیٰ مرتبت شاہزادے استقبال کے لیے شہر سے باہر بھیجے جاتے تھے۔ کبھی کبھی خود بادشاہ بھی بنفس نفیس کسی خاص ایلچی کے لیے شہر سے باہر جاتا تھا۔

---

[1] ابو المکارم کے جلوس اور داد و دہش کا بیان کافی تفصیل سے کیا ہے۔ ۴۳ تا ۵۸ ج ۲، [2] ۲۲-۲۳ ج ۴، [3] ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے ص ۴۳، [4] ۵۸ ج ۲، [5] ۲۵ ج ۴، [6] ۱۸۰ ج ۳، [7] ۱۸۷ ج ۱۔

دربار کے قریب پہونچ کر ضروری تھا کہ ایلچی پیادہ پا ہوجائے[۱] دربار میں آجانے کے بعد وہ سلام گاہ سے مجرا پیش کرتا تھا، کبھی اسی دربار کے طریقے سے اور کبھی اپنے ملک میں رائج درباری آداب کے مطابق۔ اس کے بعد بادشاہ کو بادشاہ کا خط پیش کیا جاتا، خط لینے سے قبل یہ قاعدہ مقرر تھا کہ خط پر سے زر و جواہر نثار کیا جائے[۲] اگر ایسا نہیں ہوتا تو نامہ بر خط نہیں دیتا۔[۳] سفیر کے ہاتھ سے بادشاہ خود خط نہیں لیتا تھا، بلکہ اس خدمت کے لیے ایک شخص مقرر ہوتا تھا جسے میر منشی کہا جاتا تھا[۴] منشی ہی ایلچی سے خط لیتا اور پڑھ کر سناتا۔[۵] جب بادشاہ جواب لکھواتا تو یہی شخص جواب لکھتا[۶] برنیر نے ایک سے زیادہ موقعوں پر ایلچیوں کی آمد کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ بادشاہ اگر چاہتا تو نامہ اپنے ہاتھ سے لے سکتا تھا[۷] بعض حالات میں بادشاہ خود اپنے ہاتھ سے نامہ لیتا تھا جیسے کسی بڑے بادشاہ کا خط ہو مثلاً اورنگ زیب نے شہنشاہ ایران کے ایلچی سے نامہ اپنے ہاتھ سے لیا[۸] اگر کسی بڑے بادشاہ کا نامہ کسی وجہ سے بادشاہ خود نہیں لیتا تو سفیر نامہ دینے سے انکار کر دیتا کیونکہ اس میں اس کے بادشاہ کی توہین ہوتی تھی، صاحبقران اکبر کے سفیر ابوالمکارم نے تو اس وقت تک نامہ ابو عامر بادشاہ کو نہیں دیا جب تک ابو عامر نے نامہ کی تعظیم میں تخت سے قدم نہ اتارا:۔

> "ابو عامر نے کہا۔۔۔۔۔ اب تم نامہ شاہزادہ کا ہمیں دو، ابوالمکارم نے کہا بے تعظیم کس طرح نامہ دیا جائے ابو عامر نے پادری کی صلاح سے تعظیماً زیر تخت قدم رکھا اور ابوالمکارم کے ہاتھ سے نامہ لیا"[۹]

بعض جگہ یہ قاعدہ ہے کہ بادشاہ کا نامہ خود بادشاہ ہی پڑھتا ہے اور بادشاہ ہی بدستِ خود اس کا جواب تحریر کرتا ہے چنانچہ بادشاہِ فرنگ کا نامہ جب سلطان اسمٰعیل کے پاس آیا تو نامہ بر نے یہ شرط رکھی کہ:۔

> "ہمارے یہاں قدیم الایام سے یہ دستور العمل جاری ہے کہ بادشاہوں کے نامہ کا جواب خود بادشاہ لکھتے ہیں اور خود نامہ کو ملاحظہ فرماتے ہیں۔ چنانچہ یہ نامہ حضور کو ہمارے بادشاہ نے بدستِ خاص اپنے لکھا ہے اس صورت میں حضور کو خود یہ نامہ ملاحظہ فرمانا لازم ہے"[۱۰]

---

[۱] ۲۰۳ ج ۴، [۲] ۲۸۵ ج ۱، ۹۲۹ ج ۴، [۳] ۲۹۱ ج ۱، [۴] ۲۸۵ ج ۱، [۵] ۵۵۷ ج ۱، [۶] ۳۲۲ ج ۱، [۷] برنیر ص ۱۹۱، [۸] ایضاً ص ۲۱۸
[۹] ۵۸ ج ۳، [۱۰] ۷ ج ۲۔

کبھی کبھی ایسے حالات بھی پیش آجاتے تھے کہ کوئی بادشاہ اپنے خط میں گستاخانہ باتیں لکھ دیتا۔ اس وقت میر منشی ادب وخوف کی وجہ سے خط پڑھنے سے معذور رہتا اس سے الفاظ ادا نہیں ہوتے :۔

"قصاب نے کہا اے منشی اس مرتبہ تجھ کو کیا ہوگیا کہ خط نہیں پڑھتا اس نے کہا
اے شاہ خونخوار میرا مقدور نہیں ہے کہ میں اس کو پڑھ سکوں دوسرے کو حکم دو"[۱]

سفیر نامہ کے ساتھ اپنے بادشاہ کی طرف سے بھیجے ہوئے تحائف وغیرہ بھی بادشاہ کو نذر کرتا تھا۔ بادشاہ اسے قبول کرتا اور سفیر کو خلعت وغیرہ سے سرفراز فرماتا، شاہ عباس والئی ایران کا ایلچی یادگار علی سلطان جب جہانگیر کے دربار میں آیا تو جہانگیر نے اس کو خلعت فاخرہ اور تیس ہزار روپے عنایت کیے[۲] اسی طرح "بوستان" میں جب پادری ایدرکس اور ابو شیر دانا نے ابو عامر کے بھیجے ہوئے تحایف نذر گذرانے تو صاحبقران اکبر نے ان دونوں کو خلعت ہائے فاخرہ سے سرفراز فرمایا[۳] خلعت کے ساتھ شمشیر مرصع کار بھی شاہزادے نے ان کو عطا کی[۴]

اس ضمن میں ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ سفیر کا بڑا اکرام واحترام ہوتا تھا اگر وہ گستاخی بھی کرتا تو ایلچی سمجھ کر اسے نظرانداز کر دیا جاتا، اس کا قتل کروانا بادشاہوں کی بدنامی کا موجب ہوتا تھا[۵] بلکہ ایلچی کو قتل کرانے کا ارادہ بھی بُرا سمجھا جاتا تھا[۶] اور کہا جاتا کہ :۔

"آج تک کسی نے ایلچی پر دست درازی نہیں کی"[۷]

ایلچی کو یا اس کے بادشاہ کو اس کے روبرو کچھ بُرا بھلا بھی کہا جاتا تو ایلچی ہونے کے ناطے وہ بھی ضروری نہیں سمجھتا کہ ہر بات کا جواب دے[۸] سفیر اکثر کئی روز تک شہر میں بادشاہ کے مہمان رہتے تھے اور ہر روز دربار میں حاضری کی انھیں اجازت ہوتی تھی، بادشاہ جب سفیر کو جواب لکھ کر دیتا تو پہلے امرا اور وزرا سے مشورہ کرتا تھا[۹] متفقہ رائے ہو جانے پر میر منشی جواب لکھتا۔ ایلچی کی واپسی کے وقت بھی اسے خلعت اور زر دیا جاتا۔ اس کے علاوہ بادشاہ کے لیے تحایف بھیجے جاتے تھے۔

شاہی سواری

بادشاہ کا تجمل وجلال اس وقت بھی قابل دید ہوتا تھا جب اس کی شاہانہ سواری شہر سے گذرتی تھی،

۱؎ ۵۵۷ ج ۱، ۲؎ تزک جہانگیری ص ۱۳۴، ۳؎ ۸۰ ج ۳، ۴؎ ۲۵۶ ج ۱، ۵؎ ۶۴۲ ج ۴، ۶؎ ۵۶ ج ۱، ۷؎ ۴۴۳ ج ۱، ۸؎ ۵۷۹ ج ۴، ۹؎ ۶۲۹ ج ۴۔

دربار عام میں تمام خلائق شہر جمع نہیں ہوتی تھی اور نہ ہو سکتی تھی لیکن شاہی جلوس جب راستوں سے گذرتا تو اس وقت ہر چھوٹا بڑا مرد عورت اور بچے جلوس کو دیکھنے کے لیے راستوں پر جمع ہوجاتے تھے ظاہر ہے ایسی صورت میں یہ لازمی ہے کہ جلوس جہاں سے گذرے وہاں کے لوگوں کے دلوں پر شاہی سواری کی شان و شکوہ اور رعب و جلال چھا جائے، راجاؤں سے لے کر سلاطین تک اور سلاطین سے مغل بادشاہوں تک شاہی سواری کی شان و شوکت میں کمی نہیں آئی بلکہ اضافہ ہوا۔

ہندوستان کے قدیم راجاؤں کی سواری کے لیے عام طور پر رتھ یا ہاتھی استعمال ہوتا تھا مسلمان سلاطین تختِ رواں اور گھوڑا تو اپنے ساتھ لائے ہی تھے ہندوستان آکر پُر جلال اور پُر شکوہ ہاتھی کی سواری دیکھی تو اپنی سواری کے لیے اسے پسند کیا، گھوڑے اور تخت رواں بھی ساتھ رہے، کبھی ہاتھی پر سواری کی اور کبھی تخت اور گھوڑا استعمال کیا، مغل بادشاہ اور شاہزادے جب کسی دوسرے مقام پر تفریح یا ہوا خوری کے لیے جاتے تھے تو عموماً ہاتھی پر سوار ہوتے۔ جلوس کی بھی کئی نوعیتیں ہوتی تھیں مثلاً کبھی بادشاہ جنگ کے لیے جاتا تھا، کبھی شکار پر، کبھی تفریحاً۔ اس لیے ہر جلوس کچھ نہ کچھ مختلف ہوتا تھا شیخ مبارک کا بیان ہے کہ جب سلطان محمد بن تغلق سوار ہوتا ہے تو اس کے سر پر شاہی چتر لگایا جاتا ہے اور جب جنگ کی غرض سے نکلتا ہے یا دور دراز کا سفر کرتا ہے تو اس کے سر پر سات چتر لگائے جاتے ہیں ان میں سے دو چتر زر و جواہر سے جڑے ہوئے ایسے ہیں جن کی کوئی قیمت نہیں ہو سکتی، ہزاروں غلام اور خواجہ سرا سجے سجائے گھوڑوں پر سوار اس کی سواری کے اِدھر اُدھر چلتے ہیں[1] دراصل اس سے بہتر موقع اپنی عظمت و شان کی نمائش کا ہو بھی نہیں سکتا تھا۔

شاہی جلوس جب چلتا تھا تو سب سے آگے نقارہ نواز باجے بجاتے ہوئے جاتے تھے۔ ساتھ میں ہزاروں کی تعداد میں فوج ہوتی تھی جن میں سے بعض کے ہاتھوں میں علم شاہی ہوتے تھے جن پر بانات کے غلاف ہوتے تھے۔ ہر پلٹن یا رسالہ کا علم الگ الگ رنگ کا ہوتا تھا۔

علم اور نقارے بجنے کی مثالیں "بوستان" میں بھی موجود ہیں:-

> "صاحبقران اکبر تخت رواں پر سوار ہوئے اور سیم گوں تخت کی داہنی طرف اور بائیں طرف آبشار جنی باقی افسر پایہ کو تھامے ہوئے اور آگے آگے تمام فوج سقے علموں کے کھلے ہوئے، باجے بجتے ہوئے قدم بہ قدم نہایت جاہ و حشم سے سوار چلے۔"[2]

---

[1] ماخوذ از محمد شاہ تغلق ص ۲۳۱، ۲ ۔ ۴۳ ج ۹ م ۔
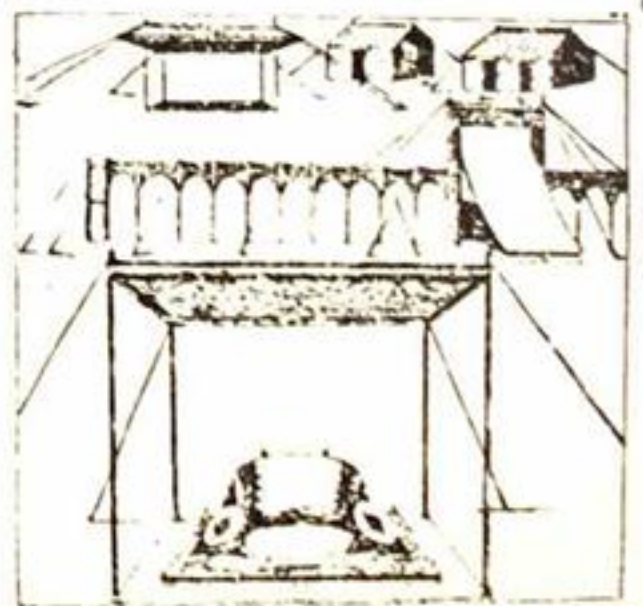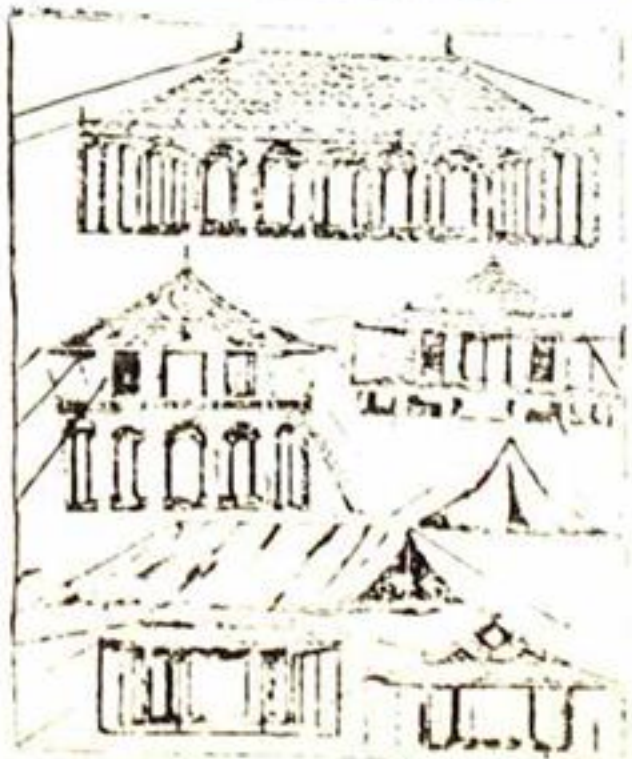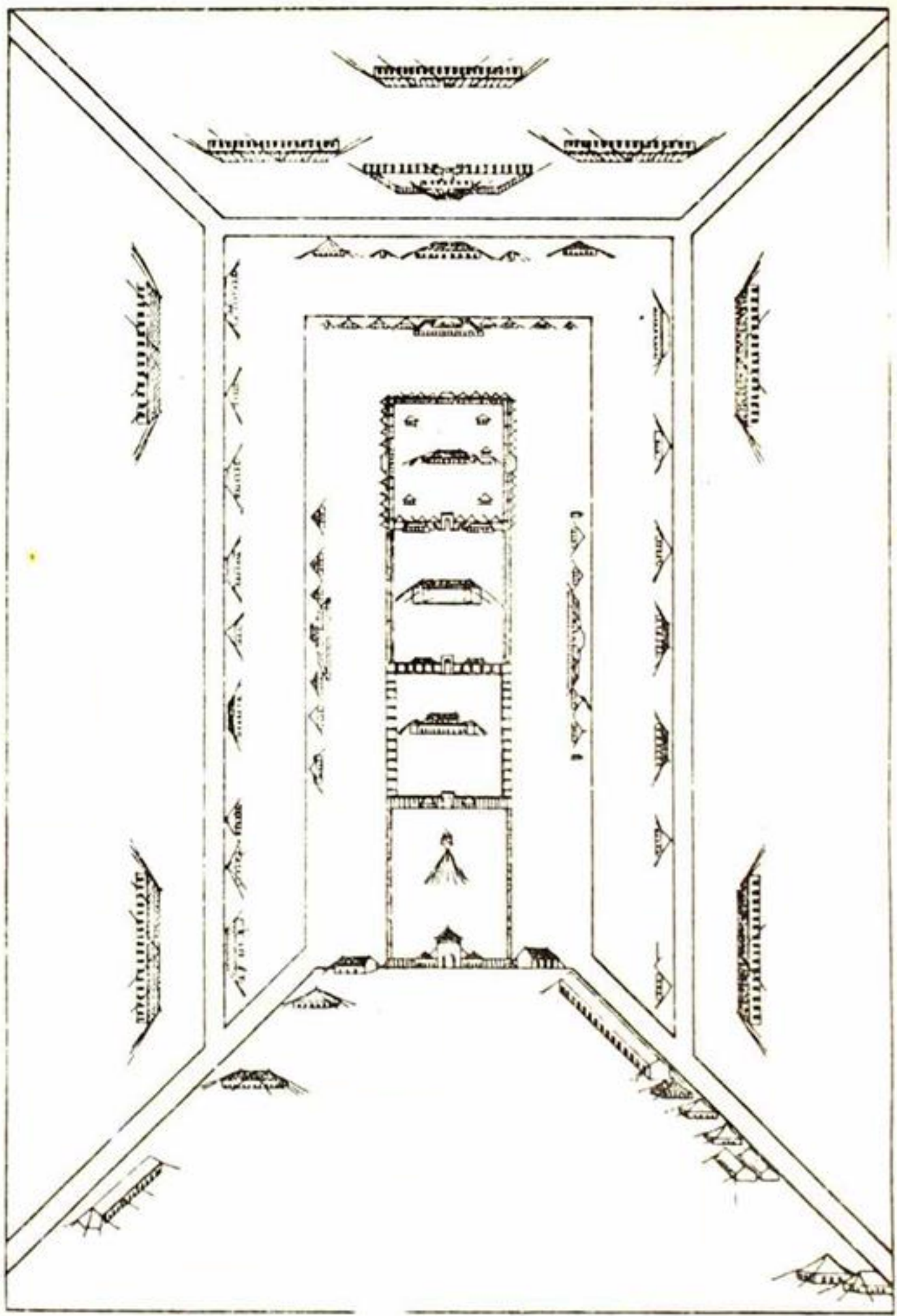
شاہی خیموں کی ترتیب و آراستگی

بادشاہ کی سواری کے آگے باجے بجانے والوں کے علاوہ طوائفیں بھی ہوتی تھیں دائیں بائیں بڑے بڑے امیر اور وزیر گھوڑوں پر سوار ہوتے تھے اور پیچھے اگر حرم ساتھ ہوتا تو ان کی سواریاں ہوتیں۔ سفر کے سامان کی گاڑیاں ہوتیں۔ خیموں وغیرہ سے لدے ہوئے اونٹ، ہاتھی، خچر اور بیل گاڑیاں پہلے ہی روانہ کر دی جاتی تھیں تاکہ بادشاہ کے منزل تک پہونچنے سے قبل ہی خیمے وغیرہ لگ کر تیار ہو جائیں[1] سب سے پہلے اور سب سے بڑا خیمہ بادشاہ کا لگتا تھا اس کے بعد بقیہ خیمہ لگائے جاتے تھے۔ بادشاہ کا خیمہ تمام خیموں کے بیچ میں ہوتا تھا برنیر نے خیام شاہی کی عظمت و شان کے بارے میں لکھا ہے کہ "ایک بڑی سپاہ کے بیچ میں قرب و جوار کی کسی بلندی سے دکھائی دیتا ہے تو دل پر اس کی شان و عظمت کا ایک عجیب اثر ہوتا ہے[2] دل پر عظمت و جلال کا اثر کرنے والا خیمہ صاحبقران اکبر کے لیے اس وقت لگوایا گیا جب وہ جبل اعلیٰ پر قیام کے لیے پہونچے۔ اس خیمہ میں اس قدر وسعت ہے کہ "شاہنامہ خورشید" سننے کے لیے تمام سلاطین مع ــــــــــــــ ملازم و خدمت گار اور اہل شہر اس میں جمع ہوتے ہیں پھر بھی ــــــــــــــ اسی قدر خلایق کی گنجائش رہتی ہے[3] ان خیموں میں سراچہ بھی ہیں[4] اور سائبان بھی[5] خیمے جب لگ جاتے تھے تو ویرانہ بھی شہر معلوم ہونے لگتا تھا۔

غرض کہ ہم دیکھتے ہیں کہ شاہی سواری کی جو شان سلاطین یا مغل بادشاہوں کی تھی وہی "بوستان" کے بادشاہوں کی ہے اگر محمد بن تغلق کے جلوس میں دس ہزار خواجہ سرا، ایک ہزار چوبدار، ایک ہزار نشقدار، دو لاکھ غلام رہتے تھے[6] اور اورنگ زیب کی ہمراہی میں پینتیس[35] ہزار سوار ہمیشہ ساتھ رہتے تھے[7] تو صاحبقران اکبر کے جلوس میں سواروں کی تعداد لاکھوں ہے۔ ملاحظہ ہو جلوس کا ایک منظر:-

> "لاکھوں وہ فیلان کوہ پیکر کہ جن کی جھولیں زرتار ہیں اور ہودج ان پر زریں و جواہر نگار ہیں ان میں سلاطین ذیوقار اور شاہزادگان نامدار بیٹھے ہیں اور ہزارہا ہمراہی گھوڑے عربی، ترکی، تازی، عراقی، باساز نقرئی و طلائی کہ جن پر اکثر امرائے ذیعزت اور سردار ان عالی مرتب بیٹھے ہیں اور کثرت سواران زرہ پوش، چار آئینہ بند کی اس درجہ تھی کہ جو شمار سے باہر ہے اور

---

[1] ۲۲۴ ج ۲، [2] برنیر ص۳۹۶، (برنیر نے اورنگ زیب کے کشمیر جانے کا حال تفصیل سے لکھا ہے ص۳۸۳) [3] ۲۱ ج ۴، [4] ۳۵۹ ج ۱، [5] ۳۳۳ ج ۱، [6] محمد شاہ بن تغلق ص۲۳۱، [7] برنیر ص۲۸۴۔

مردم لشکری جو پیادہ ہیں وہ تو مثل مور و ملخ کے ہیں۔ وردیاں زیبِ تن کئے
ہوئے آلاتِ حرب و ضرب تن پر آراستہ ہیں دریائے آہن میں غرق ہیں
ہر ایک جوان بے مثال ہے صاحبِ حسن و جمال ہے ہزار در ہزار باجے انواع واقسام کے
ہیں ان کی صدائیں مختلف ایسی بلند ہیں کہ گوش ساکنان فلک کر ہوئے جاتے
ہیں، گاؤ زمین کثرت بارِ مردم وغیرہ سے تھراتی ہے، صدائے نوبت و نقارہ شادی
گنبد فلک تک جاتی ہے، سرِ صاحبقران پر چتر بال ہمہ گردش میں ہے، زر و جواہر
فرقِ صاحبقران اکبر پر اثنائے راہ میں بے شمار نثار ہوتا ہے جس صحرا میں صاحبقران
اکبر قیام فرماتے ہیں وہ صحرا کثرتِ مردم سے رشک شہر آباد ہو جاتا ہے۔"[1]

سواری کے لیے تختِ رواں بھی استعمال کیا جاتا تھا یہ تخت ایک طرح کا مختصر سا بالاخانہ ہوتا تھا، اطراف میں شیشہ کی کھڑکیاں لگی ہوتی تھیں جنھیں بارش یا ہوا کے وقت بند بھی کیا جا سکتا تھا۔ اس کے چاروں ڈنڈوں پر کمخواب یا بانات چڑھی ہوتی تھی، زرتار اور ریشم کی جھالریں لٹکی ہوتی تھیں ان ڈنڈوں کو بیک وقت آٹھ کہار اٹھاتے تھے، ہر ڈنڈے پر دو کہار ہوتے تھے عام طور پر حبشی پہلوان یہ خدمت انجام دیتے تھے۔ یہ کہار بھی خوش پوشاک ہوتے تھے۔ تخت پر صرف بادشاہ یا شاہزادے ہی بیٹھتے تھے، امرا گھوڑوں پر ہی سوار ہوتے تھے۔ ان آداب کا "بوستان" میں بھی لحاظ رکھا گیا ہے:۔

"تخت ہائے رواں پر سلطان اور شاہزادوں کو سوار کیا اور پہلوانوں اور عیاروں
کو مرکبوں پر سوار کر کے روانہ ہوئے۔"[2]

بادشاہ کا جلوس جب گذرتا تھا تو اس پر سے بطور صدقہ زر و جواہر نچھاور کیا جاتا تھا، دولت غربا میں تقسیم کی جاتی تھی:۔

تخت کے برابر اور ایک جوان . . . فیل کوہ پیکر پر سوار مشت مشت زر مسکوک
یعنی اشرفی و روپیہ لشکر کے فقرا و مساکین کو دیتا تھا۔"[3]

بادشاہ جب کسی شہر میں پہونچتا تو وہاں کا حاکم اس کے استقبال کے لیے شہر سے باہر آتا، تمام شہر کو سجایا جاتا تھا، دکانوں اور راستوں کو آراستہ کیا جاتا، اہلِ شہر اور دکاندار لباس ہائے فاخرہ پہن کر باہر نکلتے، "بوستان" میں اس کی مثال اس طرح ملتی ہے:۔

---

[1] ۱۶ج ۴م، [2] ۷۰ج ۱، [3] ۷۵ج ۴ ج ۳۔

"جب محلِ خاص کے در دولت پر سواری پہونچی، عمارات شاہی کے سامنے جو میدان تھا اس میں کئی لاکھ روپے کی نہایت خوبی و صنعت کی آتش بازی نصب تھی ایکبارگی آتشبازوں نے آگ دی اور چرخیاں اور چکر وغیرہ چھوٹنے لگے اور توپیں سلامی کی سر ہونے لگیں زیر آسمان ایک اور آسمان دھوئیں کا چھا گیا زمین صدائے اتواپ سے لرز گئی۔۔۔۔ گلی کوچے میں ہر دکان کے سامنے نمگیرے کار چوبی نصب تھے جس کی چوبیں گنگا جمنا تھیں بادلے کی جھالر تھی"[1]

مندرجہ بالا اقتباس اس کی طرف اشارہ ہے کہ بادشاہ کی آمد پر اُسے توپوں کی سلامی بھی دی جاتی تھی ایک اور مثال ملاحظہ ہو:۔

"صاحبقران کشورستان اس فیل مست پر سوار ہوئے اور مع سمراج دلاور د فوج ظفر موج تازہ مسلمان داخلِ قلعہ ہوا تو نقارخانوں میں سلامی سر ہوئی"[2]

بادشاہ کے شہر میں داخل ہوتے وقت اہل شہر اور اہل لشکر ادنیٰ و اعلیٰ سلام و مجرے کے لیے دو رویہ استادہ ہو جاتے تھے، بادشاہ سب کا سلام و مجرا لیتا ہوا وہاں سے گذرتا تھا[3]

کسی مہمان کی آمد پر استقبال کے لیے کچھ دور تک جانا آداب میں شامل ہے۔ بلکہ استقبال کے لیے اگر کوئی نہ پہونچے تو آنے والا اپنی توہین اور ناقدری سمجھتا ہے، پچھلی صدیوں میں ایسے مواقع پر بہت اہتمام کیا جاتا تھا، آنے والے بادشاہ کے استقبال کے لیے کئی منزل دور تک امراء و وزراء کو بھیجا جاتا تھا، حاکم بدخشاں جب اکبر کے عہد میں ہندوستان آیا تھا تو دریائے سندھ کے ساحل پر امیر آقا نماں اس کے استقبال کے لیے پہونچا، عدو دینلاب میں راجہ بھگوان داس اپنے لشکر کے ساتھ اس کا منتظر تھا، لاہور میں مرزا سلیمان نے اس کا خیر مقدم کیا، متھرا پہونچ کر ترسوں محمد خاں اور قاضی نظام بدخشی اس کی پذیرائی کے لیے آئے، فتح پور سیکری کے نزدیک جب پہونچا تو خود اکبر ہاتھیوں اور گھوڑوں وغیرہ کے جلوس کے ساتھ اسے خوش آمدید کہنے کے لیے آیا، دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر گھوڑوں سے اتر پڑے[4] اس عہد کی یہی تہذیبی قدریں "بوستان" میں بکھری ہوئی ہیں صاحبقران بھی خود بعض اوقات استقبال کے لیے جاتا ہے:۔

"صاحبقران گیتی ستاں نظر بہ ایں کہ ملک شر فنوس جنی ایک بادشاہ عظیم الجاہ ہے ملکہ رضیہ سلطان کا پدر بزرگوار ہے تا کنار لشکر استقبال کے واسطے

---

[1] ۱۰۳ ج ۹ م، [2] ۱۲۷ ج ۹ م، [3] ۳۴۰ ج ۴۔ [4] ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے ص ۴۵

گیا اور نہایت احترام سے بارگاہ میں لایا"[1]

ایک دوسرے کو دیکھ کر احتراماً پیادہ پا بھی ہو جاتے ہیں :۔

"شاہزادہ ..... چند قدم استقبال کے واسطے گیا انصاق شاہ ..... تخت رواں سے اترا، شاہزادہ طاقان نوجوان نے بنظر بزرگی سلام میں سبقت کی"[2]

بادشاہ کے استقبال کے لیے اوّل امراء کو خیر مقدم کے واسطے روانہ کیا جاتا ہے :۔

"صاحبقران اکبر نے اسی وقت امیران لشکر اور سرداران عالی وقار سے امیر مجاہد الدین و امیر معظم الدین و امیر جلال الدین کو سلطان گیتی ستان یعنی سلطان اسمعیل کی خدمت فیضدرجت میں روانہ کیا اس واسطے کہ امرائے نامدار ذی وقار سلطان والاشان کا استقبال بصد تکریم و تعظیم بجا لائیں چنانچہ سرداران مذکور و امیران مسطور قصر احمر تک آئے"[3]

پھر اس کو بڑے احترام سے شہر میں لاتے ہیں :۔

"(صاحبقران کو) باعزاز تمام و احترام مالا کلام شہر میں لائے یہاں اوّل ہی تمام شہر کی دکاکین و بازار آئین بند آب و جاروب سے مصفا و پاکیزہ ہو رہے تھے"[4]

راستوں پر زربفت و مخمل کاشانی کے فرش بچھائے جاتے تھے، دو راستہ روشنی کی جاتی تھی۔ جس وقت بارگاہ میں پہونچتا تھا تو تواضع و مہمانی کی دوسری رسوم ادا کی جاتی تھیں۔ گراں بہا نذریں پیش کی جاتی تھیں[5]۔ غرض کہ شاہی جلوس کی شان و شوکت شاہی جلال و جبروت کا نشان دیتی تھی۔ بادشاہ کی قوت و زور رعب و دبدبے کا اندازہ بادشاہ کی سواری سے بھی ہوتا تھا اور رسوم استقبال ادا کرنے سے بھی۔

بادشاہ کے شب و روز

جب کسی شخص کے پاس کچھ ذمہ داریاں آجاتی ہیں تو اس کی اپنی مرضی کی زندگی تقریباً ختم ہو جاتی ہے ذمہ داریوں کا احاطہ جتنا وسیع ہو گا آزادی کی زندگی اتنی ہی تنگ ہوتی چلی جائے گی۔ ایک آدمی اگر کہیں

---

[1] ۲۷، ج ۲، [2] ۱۷، ج ۴، [3] ۳۸۸ ج ۹م، [4] ۵۰۸ ج ۵، [5] ۱۱۷ ج ۲۔

نوکری بھی کرتا ہے تو اس کے اوقات میں پابندی آجاتی ہے۔ بادشاہ کے اوپر تو پورے ملک کی ذمہ داریاں ہوتی ہیں اور پھر شخصی حکومت میں معزول اور قتل ہونے کا خوف بھی غالب رہتا ہے بقول شخصے بادشاہ کے سر پر ہمیشہ تلوار لٹکی رہتی ہے۔ اس ذمہ داری اور خوف کے باوجود بادشاہ کی زندگی میں بھی ایک ترتیب ہوتی تھی۔ صبح تا شام اُسے اپنا وقت کس طرح صرف کرنا ہے سب کچھ طے ہوتا تھا۔

بادشاہ جب صبح کو اٹھتا تو شراب صبوحی حاضر کی جاتی تھی[۱]۔

"صبح روشن گھرنے بھی دفع خمار کے واسطے ایک جام بادہ رومانی کا صاحبقران اکبر کو پلایا"[۲]

پھر ضروریات سے فارغ ہونے کے بعد جھروکہ درشن کے لیے جاتا تھا جہاں رعایا اس کا دیدار کرتی تھی[۳]۔ مغل بادشاہوں میں یہ ایک رسم رائج تھی جسے جھروکہ درشن کہا جاتا تھا۔ درشن سے مراد تھی کہ بادشاہ عموماً صبح کے وقت غرفہ میں آکر بیٹھ جاتا تھا خلایق شہر وہاں جوق در جوق آتی تھی اور اپنے بادشاہ کا دیدار کرکے خوش ہوتی تھی۔ یہ رسم اکبر کے زمانہ سے مسلمان حکمرانوں میں شروع ہوئی اکبر کا ہندو راجاؤں سے بڑا گہرا اور گھریلو تعلق تھا اس لیے اس نے اُن کی بہت سی رسمیں اختیار کرلی تھیں۔ جس طرح مسلمان اپنے بادشاہوں کو ظل الٰہی[۴] یا نائب خدا سمجھتے تھے اسی طرح ہندو اپنے راجا کو "اَن داتا" مانتے تھے۔ اس کے درشن کو پوجا کا سا درجہ حاصل تھا۔ یہی حال اکبر کی ہندو رعایا کا تھا روزانہ صبح کو آفتاب کی پرستش کے وقت جھروکے کے نیچے جمع ہوجاتے تھے اور اس وقت تک مسواک بھی نہ کرتے جب تک اکبر کا درشن نہ کرلیتے تھے بادشاہ کا چہرہ دیکھی گویا آفتاب ہی کی طرح مقدس و مبارک تھا اور اس کا دیکھنا خوش بختی خیال کیا جاتا تھا۔ اکبر کے بعد بھی یہ رسم جاری رہی لیکن اورنگ زیب نے اپنے زمانہ میں اسے ختم کردیا۔

"بوستان" میں بھی بعض جگہ اس رسم کی مثالیں ملتی ہیں:۔

"بیشتر اوقات قصر کے کسی غرفہ میں سے سپاہ و رعایائے شہر کو اپنے جمال آفتاب مثال کا جلوہ دکھاتا تھا"[۵]

اسی طرح ایک جگہ صاحبقران اعظم کے دیدار کے لیے باقاعدہ جلوس کا اہتمام کیا جاتا ہے اور عوام اس کو دیکھ کر اپنی آنکھوں کو پُرنور کرتے ہیں[۶]۔

جھروکے سے فرصت پانے کے بعد بادشاہ دیوانِ عام میں چلا جاتا تھا دربار عام کے برخاست ہونے پر

۱؎ ج ۴ ص ۲۴۷، ۲؎ ج ۵ ص ۶۳۶، ۳؎ ج ۵ ص ۲۶۳، ۴؎ ج ۵ ص ۱۳۶، ۵؎ ج ۵ ص ۲۷، ۶؎ ج ۴ -

دیوانِ خاص میں آتا تھا یہاں دیوانِ عام کے مقابلے میں کچھ بے تکلف نشست ہوتی تھی، اعلیٰ منصب امرار اور شہزادوں سے مشورہ کرتا تھا۔ دو پہر کے کھانے کے بعد قیلولہ کرتا تھا[۱] سہ پہر کو پھر دربار آراستہ ہوتا تھا امرار اکٹھے ہوتے تھے، دربار کے بعد رقص و نغمہ کا اہتمام کیا جاتا تھا اور پھر طعام کے بعد خواب گاہ میں جانے کا وقت آجاتا تھا:۔

"بعد انفراغ طعام استراحت کے واسطے خواب گاہ خاص میں گیا دو خواصیں موافق معمول کے کفِ پا سہلانے لگیں"[۲]

شہنشاہ جہانگیر صرف دو تین گھنٹے سویا کرتا تھا تزک جہانگیری میں لکھا ہے:۔

"خدا کے فضل و کرم سے میری کچھ اس قسم کی عادت ہوگئی ہے کہ رات و دن میں صرف دو تین گھنٹے سوتا ہوں اور اپنا زیادہ وقت خوابِ غفلت میں ضائع نہیں کرتا اس شب بیداری میں دو فائدے مضمر ہیں اوّل تو ملکی معاملات سے باخبری اور دوم یادِ حق سے دل کی بیداری ہوتی ہے"[۳]

"بوستان" کے شاہزادے جو بادشاہ کی سی حیثیت رکھتے ہیں عموماً حرم یا جنگ میں ہی الجھے رہتے ہیں اس لیے استراحت کا وقت انھیں کم ہی میسر آتا ہے کافی رات تک شغل بغلگیری اور مے نوشی میں مصروف رہتے ہیں، اٹھ کر غسل کر کے نماز بھی پڑھ لیتے ہیں بعض اوقات تمام شب سامانِ عیش مہیا رہتا ہے اور سونے کی نوبت ہی نہیں آتی:۔

"القصہ تمام شب صاحبقران والاقدر نے جام یاقوت میں شراب پی اور طناز و راحت ناز وغیرہ نازنینوں سے بے غل و غش نوبت بنوبت مباشرت کی"[۴]

دراصل "بوستان" میں ان بادشاہوں کے معمولات کا ذکر ہے جو اورنگ زیب کے بعد تخت پر بیٹھے جن کا وقت ملکی مسائل میں کم حرم میں زیادہ گذرتا تھا اور ان بادشاہوں کے لیے حرم میں جانے کا وقت مقرر نہیں تھا عموماً دن اور رات کا یہی محبوب مشغلہ تھا صاحبقران اکبر بھی اکثر انھیں کی نمائندگی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں:۔

"صاحبقران اکبر عالی قدر وقت چاشت سے ظہر تک انھیں تینوں نازنینوں کی صحبت اختلاط و عیش و نشاط میں مشغول رہتے ہیں اور جس وقت گرسنگی غلبہ کرتی ہے تو کچھ میوہ نوش فرماتے ہیں اور بعد فراغ اکل و شراب بسترِ خواب پر استراحت فرماتے ہیں"[۵]

---

[۱] ۲۵ ج ۴، [۲] ۳۱۶ ج ۴، [۳] تزک جہانگیری ص ۲۷، [۴] ۳۴۹ ج ۵، [۵] ۱۵۸ ج ۹ م۔

مغل بادشاہ جمعہ کے دن شاہی مسجد میں نماز کے لیے جایا کرتے تھے، عیسائی یکشنبہ کو مقدس دن مانتے ہیں، خورشید نامہ کے بادشاہ عیسائی ہونے کی وجہ سے یکشنبہ کو عبادت گاہ میں جاتے ہیں:۔

"آج یوم یکشنبہ ہے حسب معمول بادشاہ عبادتِ معینہ کے واسطے عبادت گاہ میں تشریف لے جاتے ہیں۔"[1]

اس روز بادشاہ اہلِ شہر کے ساتھ نماز پڑھتا تھا، وعظ سنتا تھا، بادشاہوں کی طرح شاہزادوں کے بھی صرف اوقات کی ترتیب ہوتی ہے شاہزادہ بدر منیر کے معمولات اس طرح ہیں:۔

"صبح سے تا وقت چاشت درس و تدریس علمی اور ورزش فنونِ سپہ گری میں مشغول رہتا ہے اور بعد نوشش فرمانے حاضری کے دو چار لمحے بطریق قیلولہ غنودہ ہوتا ہے اور خدمت گاروں کو حکم ناطق ہے کہ وقت ظہر ہمیں بیدار کر دینا۔"[2]

شکار اور دوسری تفریحات وغیرہ کیونکہ روزانہ کے معمولات میں شامل نہیں اس لیے یہاں اُن کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔

یہ بات ہم کئی بار کہہ چکے ہیں کہ شخصی حکومت صرف ایک شخص کے اقتدار اور اختیار کا نظام تھا، تمام چھوٹے بڑے اختیارات بادشاہ ہی کے ہاتھ میں ہوتے تھے، بادشاہ کو اپنی ذات کے علاوہ کسی پر اعتبار نہیں ہوتا تھا ہر شخص کو وہ شبہ کی نگاہ سے دیکھتا تھا، وہ اپنی اولاد اور امراء سے مصلحتاً محبت اور خلوص سے پیش آتا تھا، رعایا سے اس کی ہمدردی اور محبت سیاسی ہوا کرتی تھی۔ وہ اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کے لیے رعایا کی ہمدردی اور تعاون کو حاصل کرنے کی پوری کوشش کرتا تھا تاکہ کوئی شخص علمِ بغاوت بلند نہ کر سکے اور اس کی حکومت میں کوئی خلل پیدا نہ ہو، بہت کم بادشاہ ایسے گذرے ہیں جنہیں رعایا سے دلی محبت تھی۔ "بوستان" کے بادشاہوں کے بارے میں بھی مجموعی رائے یہی ہے:۔

"بادشاہوں کی ذات سے مروت اور آشنائی کی نظر رکھنی کمال بے عقلی کی بات ہے۔"[3]

اور یہ صحیح بھی ہے کہ باب ریاست اور امور سلطنت میں سلسلہ دوستی و قرابت کو کچھ دخل نہیں ہوتا، سلطنت وہ معاملہ ہے کہ دو برادر حقیقی اور پدر و پسر باہم دشمن جانی ہو جاتے ہیں اور دوسرے کے قتل و ہلاکت کے درپے ہوتے ہیں[4] تاریخ ماضیہ میں یہی ہوتا آیا ہے کہ بھائی کو، باپ کو، چچا کو قتل کر کے سریر سلطنت کو حاصل کیا، جو شخص اپنے خونی رشتوں کی محبت کا لحاظ نہیں رکھتا وہ رعایا سے کیا سچی محبت کرے گا۔

---

[1] ۱۷۷ ج ۵، [2] ۲۵ ج ۴، [3] ۳۹۶ ج ۳، [4] ۳۹۵ ج ۳۔

ہمایوں نے اپنے بھائیوں سے محبت کی تو پریشان و سرگرداں رہا، مجبوراً تمام امراء اور رعایا نے ہمایوں سے کہا کہ حکومت اور بادشاہی میں رسم برادری نہیں نبھ سکتی اگر آپ کو بھائی کی خاطر منظور ہے تو بادشاہی چھوڑ دیں اور اگر بادشاہ رہنا ہی چاہتے ہیں تو ترک برادری کر دیں[1]۔ یقیناً سادہ لوحی بادشاہوں کے لیے ادبار و پریشاں حالی کا باعث ہوتی ہے[2]۔ جلال الدین خلجی کی سادہ لوحی تھی کہ اپنے بھتیجے علاء الدین کے ہاتھوں قتل ہوا۔ بادشاہ نہ رعایا کا اپنا ہوتا ہے اور نہ وزراء کا جو ہر وقت اس کے شریکِ حال رہتے ہیں۔ وہ وزیر کی غلطی پر بھی اس کی گردن اتروا دیتا ہے[3]۔ بادشاہ تمام ملک اور اس کی اشیا کو اپنی جاگیر سمجھتا تھا، ہر شے کو اپنی ملکِ خاص گردانتا تھا، رعایا میں اگر کسی کے پاس کوئی نایاب شے ہوتی اور بادشاہ کو معلوم ہو جاتا تو بادشاہ فوراً منگوا لیتا اکلیل الملک کو سمندر سے ایک شمشیر ملی بادشاہ کو پتہ چلا تو اس نے کہلا بھیجا:

"اسی وقت اپنے متبنی یعنی اس جوان فرزند کو ساتھ لے کر مع صدف مروارید و شمشیرِ دریائی دربار میں حاضر ہو، ورنہ موردِ عتابِ شاہی ہوگا، بادشاہ کے پیام سے بہرام کا خون خشک ہو گیا"[4]۔

جزیرہ قارونیہ کا حاکم تو ہر لُٹتے ہوئے قافلے کا مال و اسباب چھین لیتا ہے[5]۔

بادشاہ کا یہی جبر رعایا اور امراء کو اس کا ادب و لحاظ کرنے کے لیے مجبور کر دیتا تھا اور وہ بادشاہ کا ہر حکم ماننے کے لیے دل سے کم، جان سے زیادہ حاضر رہتے تھے۔ بوستان میں ایک جگہ صاحبقران گھوڑے پر سوار ہے لیکن ہمراہی پیدل ہی دوڑ رہا ہے:۔

"صاحبقران اشہب تیز گام پر سوار ہو کر روانہ ہوا توفیق پیادہ پا ساتھ ہو لیا ہر گاہ پانچ دن برابر مسافت راہ طے کی"[6]۔

کتنا ہی طویل سفر ہو، کڑی دھوپ یا برسات ہو لیکن وہ اپنی جاں نثاری کا ثبوت دیتے تھے۔ اپنی فرمانبرداری میں کمی نہیں لاتے۔ بادشاہ کے سامنے سوار ہونے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے:۔

"سرداروں نے صاحبقران اکبر گردوں حشم کو دیکھا یکبارگی اپنے گھوڑوں سے کود پڑے اور ہر ایک سردار نے صاحبقران اکبر کی پابوسی کی"[7]۔

بعض امرا کی نمک خواری کا یہ حال ہے کہ جب کوئی بادشاہ بہ سبب اولاد نہ ہونے کے گوشہ نشینی اختیار کر لیتا ہے تو امراء آپس میں مشورہ کرتے ہیں اور وزیر اعظم سے کہتے ہیں کہ تم تختِ سلطنت پر جلوس فرماؤ جس پر

---

[1] ہمایوں نامہ ص ۸۷، [2] ص ۸۴، ج ۴، [3] ص ۹۳، ج ۴، [4] ص ۷، ج ۶، [5] ص ۱۱۸، ج ۵، [6] ص ۳۳، ج ۴، [7] ص ۲۰، ج ۹م،

وزیر تنبیہہ کرتا ہے کہ :۔

"آئندہ ایسی بے ہودہ بات نہ کہنا ہم اس خاندان کے نمک خوار ہیں ہم سے کسی حال میں نمک حرامی نہیں ہوگی، انشاءاللہ جلد ہی بادشاہ اپنے خیال سے درگذرے گا"[۱]

اسی دوران وزیراعظم کے یہاں فرزند تولّد ہوا لیکن اس نے اس لیے خوشی نہیں منائی کہ اس کا بادشاہ اولاد نہ ہونے کے رنج میں مبتلا ہے[۲]

عام طور پر سردار اور امرا تنے ہی وفادار ہوتے تھے، یہ وفاداری خواہ تلوار کے ڈر سے ہو یا بادشاہ کی عنایات کے عوض۔ بہر حال وہ بادشاہ کے لیے خود جان دینا پسند کرتے تھے اس کی واضح مثال میدانِ جنگ میں ان کی جاں بازی اور بہادری کے مظاہرے ہیں۔

شاہی خاندان کی گرفتاری کے وقت اُن کی شاہزادگی کا لحاظ رکھا جاتا تھا ایک شاہزادی کے گرفتار ہونے پر ایک سردار دوسرے سے کہتا ہے :۔

"خبردار کسی نوع کی اذیّت نہ پہونچانا اس کی شاہزادگی کا لحاظ رکھنا"[۳]

خلایقِ شہر کی محبت کا یہ حال ہے کہ اگر بادشاہ بیمار بھی ہو جاتا تو وہ پریشان ہو جاتے اور اس کی صحت کے لیے دعا کرتے تھے[۴] امرا، بادشاہ کو اپنا مرشد سمجھتے تھے کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ "بادشاہوں کی خالی نظر بھی دولت دنیا سے بہتر ہوتی ہے"[۵] اگرچہ بادشاہ کسی پر اعتماد نہیں کرتا تھا لیکن اس فرمانبرداری اور جاں نثاری کے عوض امرا، اور سرداروں اور رعایا کو انعامات سے نوازتا رہتا تھا، فتح کے بعد لوٹ کا مال بھی امرا اور سرداروں میں تقسیم کر دیتا تھا :۔

"شاہزادے نے وہ اسباب ملاحظہ کرکے ایک ایک سلاح کچھ زر و جواہر محمود وغیرہ کو عنایت کیا اور امرائے دیگر کو بھی کسی قدر دیا"[۶]

لیکن یہ بات مسلّم ہے کہ امرا یا رعایا سے بادشاہ کی ہمدردی اور محبت سیاسی ہوا کرتی تھی۔

---

[۱] ج ۴، ۱۰ [۲] ایضاً، [۳] ج ۴، ۳۲۴ [۴] ۱۴۲۴، ۱۵۰، ج ۴، [۵] ۲۲۳ ج ۴، [۶] ۶۲۳ ج ۱

اس میں شک نہیں کہ حاکم وقت کی خاک نظر ہی دولت دنیا سے بہتر ہوتی ہے، اس لیے ہرادنیٰ و اعلیٰ اس کے قریب ہونے کی کوشش کرتا ہے، تاکہ حاکم کو اپنی فرمانبرداری کا یقین دلا کر انعام اور ترقی پاسکیں، شخصی حکومت کے عہد میں کسی بھی حیثیت سے دربار سے وابستگی کو انتہائی فخر و عزت کی بات سمجھا جاتا تھا۔ امرا اور وزرار کے علاوہ مختلف فنون کے ماہرین اپنے فن کا مظاہرہ کرکے بادشاہ کی عنایت حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے مصور خوبصورت تصویروں کے اعلیٰ نمونے پیش کرکے انعام کا خواہاں ہوتا تھا، موسیقار اپنی موسیقی کی بادشاہ سے داد چاہتا تھا، اسی طرح شاعر، قصہ خواں، سنگتراش اور دوسرے استادانِ فن بادشاہ کے روبرو اپنی صلاحیتوں کا اظہار کرکے انعامات سے سرفراز ہوتے تھے، اس طرح کے فنکاروں کو باقاعدہ دربار میں ملازم رکھا جاتا تھا اور جس وقت بادشاہ یاد کرتا تھا یہ اپنے فن کے ساتھ حاضر ہوتے تھے۔ فنون لطیفہ کی ترقی میں بادشاہوں کی سرپرستی کا بڑا اہم حصہ رہا ہے، جب تک دہلی کا مغل دربار آباد رہا یہاں بے شمار فنکاروں نے داد و انعام حاصل کیا، اس دربار پر جب زوال آیا تو یہ ماہرینِ فن صوبوں میں تقسیم ہو گئے۔ جسے جہاں آسرا ملا اس نے وہاں پناہ لی۔ خصوصاً اردو کے شاعر دہلی اجڑنے پر فیض آباد اور لکھنؤ کے دربار میں پہونچے۔ جو مائل بہ زوال ہونے کے باوجود خوش حال تھا۔

درباری شعرار

دربار سے شاعروں کی وابستگی کی روایت بہت قدیم ہے، قدیم ہندوستان میں راجاؤں کے دربار میں کوی ہوا کرتے تھے اور انھیں بڑی عزت حاصل ہوتی تھی، دوسرے ممالک کے درباروں سے بھی شاعر وابستہ رہے۔ ہندوستان میں مسلم حکومت قائم ہونے کے بعد ایران کے بہت سے فارسی گو شعرا ہندوستان آگئے کیونکہ یہاں کی درباری زبان بھی فارسی تھی۔ یہ شعرار دربار سے وظیفہ پایا کرتے تھے، جب کوئی جشن ہوتا یا کوئی اہم تقریب منعقد ہوتی تو یہ بادشاہِ وقت کی مدح میں قصیدے کہتے اور بادشاہ انھیں انعامات سے نوازتا۔

تاریخ کے مطالعہ سے علم ہوتا ہے کہ تقریباً سبھی بادشاہوں کے درباروں میں شاعر موجود تھے۔ عہدِ وسطیٰ

میں امیر خسروؔ کئی سلاطین کے دربار سے وابستہ رہے جلال الدین خلجی کے دربار میں ان کے علاوہ تاج الدین عراقی، خواجہ حسن، اختیار الدین وغیرہ شاعر بھی موجود رہتے تھے۔ قصائد کا مشہور شاعر بدر چاچ محمد تغلق کے دربار میں تھا۔ مغلوں کا دور کیونکہ ہندوستان کی مسلم حکومت کی تاریخ کا زریں دور رہا ہے، اس عہد میں جہاں دوسرے فنونِ لطیفہ کو ترقی حاصل ہوئی وہاں فنِ شاعری بھی منتہا کو پہونچا۔ بابر خود فارسی اور ترکی زبانوں کا اچھا شاعر تھا۔ اکبر کے دربار میں فیضی اور رحیم خانِ خاناں کے علاوہ عرفی، اور خواجہ حسین ہروی بھی موجود رہے جہانگیر کے دربار سے فارسی کے بڑے بڑے شاعر وابستہ تھے جن میں ملا نظیری نیشاپوری، طالب آملی، جمال الدین عرفی شیرازی، باباطالب اصفہانی، ملاحیاتی گیلانی، میر معصوم کاشی، ملا محمد صوفی مازندرانی، سعیدائے گیلانی وغیرہ شامل ہیں۔ جہانگیر نے لکھا ہے:۔

"نظیری نیشاپوری جو گجرات میں تجارت کرکے اپنی زندگی بسر کرتا تھا میری مدح میں کچھ اشعار لکھ کر میری خدمت میں حاضر ہوا میں نے اس مدح کے صلے میں ایک ہزار روپیہ گھوڑا اور خلعت سے سرفراز کیا"[1]

"جمعرات ۱۴ ماہ شہریور کو اس قصیدے کے صلے میں میں نے سعیدائے زرگر باشی کو اشرفیوں میں تلوایا"[2]

جشن نوروز کے موقع پر شاہ جہاں کے دربار میں قدسی نے ایک قصیدہ سنایا تو اُسے روپیوں میں تلوایا گیا۔ ابو طالب کلیم نے بارہا شاہ جہاں سے انعام پایا، یہ تو مغل سلطنت کے عروج کا زمانہ تھا آخری نام نہاد بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے دربار سے بھی ذوق اور غالب وظیفہ پاتے تھے۔

"بوستان" کے بادشاہوں کے دربار میں بھی شاعر رہتے ہیں اور اکثر موقعوں پر قصیدے پیش کرتے ہیں۔ ایک شاعر کے قصیدہ سنانے کا حال ملاحظہ ہو:۔

"اس اثنا میں درگہ سالار نے عرض کیا کہ لبیب الدین نام کا ایک شاعر شہر فردوس کا متوطن بارگاہ کے دروازہ پر حاضر ہے اور ملازمت عالی حاصل کیا چاہتا ہے۔ ابوالمکارم نے کہا آنے دو کوئی مزاحم نہ ہو، لبیب الدین سلام گاہ پر سے آداب ومجرا بجالایا .... لبیب الدین نے قصیدہ شروع کیا ابیات .... ابوالمکارم نے کہا بس موقوف رکھو ہم یہی دو شعر قصیدے کے

---

[1] تزک جہانگیری ص ۱۲۳، [2] ایضاً ص ۲۸۲۔

سن کر کمال مسرور ہوئے ہمیں قصیدے کا صلہ دینے کا مقدور نہیں .... ابوالمکارم
نے لباس تازہ پہنا اور ملبوس خاص اپنا مع خنجر یاقوت نگار اور جیغہ وغیرہ جواہر جو
اُس وقت جسم پر تھا لبیب الدین کو انعام میں دے دیا۔"[1]

یہ اقتباس محمد تغلق کی یاد دلاتا ہے۔ مولانا عبدالمجید سالک نے "ریاض الطاہرین" کے حوالے سے لکھا ہے کہ جب مشہور مزاحی شاعر عبید زاکانی دہلی آیا اور سلطان محمد تغلق کے سامنے اپنے قصیدے کا پہلا شعر پڑھا۔ تو سلطان نے چلا کر کہا بس آگے نہ پڑھنا کیونکہ تمہارے سارے اشعار کا صلہ دینے کے لیے شاید خزانۂ شاہی میں کافی روپیہ نہ ہو۔[2]

درباری قصّہ خواں

ارباب تفریح میں بادشاہوں کے دربار سے قصّہ خواں بھی وابستہ رہتے تھے، بادشاہ وقتِ خواب قصہ سنا کرتا تھا، مغل بادشاہوں کے دربار میں بھی قصہ خواں موجود تھے۔ جہانگیر کا قصہ سننے کا شوق اِس کے اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے :-

"انھیں ایام میں میر غازی کے ملازموں میں سے ملا اسد قصہ خواں ٹھٹھ سے آکر
میری خدمت میں حاضر ہوا، اس کی قصہ خوانی سے میں از حد محظوظ ہوا اس لیے میں
نے اسے محظوظ خاں کا خطاب عنایت کرکے ایک ہزار روپیہ، خلعت، گھوڑا، ہاتھی
اور ایک پالکی عنایت کی اور بیس سوار کے منصب پر سرفراز کیا اور حکم دیا کہ وہ ہر
تفریحی محفل میں حاضر رہا کرے"[3]

اس بیان سے قصہ گو کی دربار میں اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ قصّہ خواں بادشاہ کے روبرو قصہ میں رزم، بزم، حسن و عشق اور عیاری کے واقعات پیش کرتا تھا، بادشاہ اس کے بیان سے محظوظ ہوتا تھا خود "بوستان خیال" کی ابتدا محمد شاہ بادشاہ کے دربار میں ہوئی۔ محمد شاہ نے خیال کو اپنے دربار میں قصہ خوانی کی خدمت کے لیے مقرر کیا تھا۔ خیال نے قصہ گوئی کے سلسلے میں نواب سراج الدولہ کے دربار میں بھی ملازمت کی۔

"بوستان" کے شاہزادے بھی اپنے دربار میں قصہ خواں ملازم رکھتے ہیں۔ ان میں خواتین بھی شامل ہیں۔ م

---

[1] ص ٥٠ ج ٣

[2] ریاض الطاہرین ص ٦ بحوالہ مسلم ثقافت ہندوستان میں ص ٢٣٠ [3] تزک جہانگیری ص ٢١٩

> "ایک زن ضعیفہ شہر نظرستان کی باشندہ واسطہ بانو نام خدمت افسانہ گوئی پر میری سرکار میں نوکر تھی اور میں گاہے گاہے قصہ اس سے سنتا تھا"[1]

خواتین کو خدمتِ قصہ گوئی پر مامور کرنے کی یہ وجہ بھی تھی کہ بادشاہ یا شاہزادے وقتِ شب قصہ سنا کرتے تھے جب وہ اپنی خواب گاہ میں پہونچ جاتے تھے ایسی صورت میں شاہی خاندان کی خواتین کے پردے کا بھی لحاظ رکھنا ضروری تھا قصہ گو خواتین محل میں آ جا سکتی تھیں اور جن کی قصہ خوانی سے محل کی خواتین بھی محظوظ ہو سکتی تھیں۔ "بوستان" میں بادشاہوں اور شاہزادوں کو قصہ سننے کی فرصت کم ہی ملتی ہے۔ عموماً خواتینِ محل قصہ سنتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں اور اسی لیے قصہ گو عورتوں کو ملازم رکھا جاتا ہے۔

> "اگر اجازت دو راشدہ خاتون کو اپنے محل میں لے جاؤں اور وقتِ خواب اس کی زبان سے کوئی افسانہ دلچسپ سنوں شاید دل بہلے"[2]

وقتِ شب قصہ سننے کا مقصد تو خواب بھی ہوتا تھا۔

> "ملکہ نے سمن آرا کی طرف پہلو بدلا اور فرمایا اے سمن آرا میرے پانو سہلا اور کوئی افسانہ سنا کہ نیند آ جائے"[3]

فارسی اور اردو کی بڑی داستانیں بادشاہوں کی ہی سرپرستی میں لکھی گئیں۔

درباری اطبّاء

درباروں میں اطبار بھی ملازم رکھے جاتے تھے جو شاہی خاندان کے بیمار ہونے پر اُن کا علاج کرتے تھے بادشاہ اگر کہیں سفر پر جاتا تو یہ بھی اس کے ہمراہ جاتے تھے خصوصاً میدانِ جنگ میں بادشاہ کے ساتھ جانا بے حد ضروری تھا تاکہ زخمی ہونے کی حالت میں اس کی دیکھ بھال کر سکے مغل بادشاہوں کے دربار میں دور دراز ممالک سے آئے ہوئے لائقِ احترام اطبار موجود تھے۔ اکبر کے دربار میں حکیم لطف اللہ گیلانی، حکیم عین الملک، حکیم ابوالفتح گیلانی اور حکیم مسیح الملک وغیرہ حکمار علاج و معالجے کے واسطے مقرر تھے۔ شاہ جہاں کے زمانہ میں حکیم علیم الدین وزیر خان درباری طبیب تھے ان کے علاوہ حکیم مومنائے شیرازی، حکیم فتح اللہ شیرازی، حکیم ابوالقاسم اور رکنائے کاشی اس کے عہد کے مشہور حکمار تھے۔ مسیح الزماں خاں بہادر اور مرزا محمد ہاشم اورنگزیب کے دربار کے مشہور طبیب تھے۔

---

[1] ص ۲۹۳ ج ۱، [2] ص ۲۰ ج ۴۰۰، [3] ص ۴۹۲ ج ۳۔

"بوستان" کے حکماء یا اطباء کی نوعیت کچھ دوسری ہے اگرچہ ہر صاحبقران کے ساتھ کئی کئی حکیم موجود ہیں۔ لیکن وہ صرف طبیب نہیں بلکہ حکیم ہیں اور حکیم کا مطلب ہے تمام علوم پر دسترس رکھنے والا۔ "بوستان" کے حکیم مذہبیات کے بھی عالم ہیں، علم فلکیات، علم رمل، علم جفر، علم ہیئت وغیرہ میں بھی اپنا ثانی نہیں رکھتے اور علم طب پر بھی قدرت حاصل ہے مثلاً صاحبقران اکبر کے ساتھ حکیم قسطاس الحکمت، حکیم ابوالمحاسن، حکیم اخشی جان وغیرہ موجود ہیں۔ صاحبقران اعظم اور صاحبقران اصغر کی معاونت کے لیے حکیم اسقلینوس، حکیم آذرنوس، حکیم زرطوس، حکیم بوریائی وغیرہ حاضر رہتے ہیں۔ لیکن ان کی خدمات علاج ومعالجہ میں کم ہی حاصل کی جاتی ہیں بلکہ طلسم کشائی میں ہر مقام پر شاہزادوں کی مدد کرتے ہیں دراصل ان کے علم طب کی ضرورت اس لیے بھی کم پڑتی ہے کہ داستان کے بادشاہ یا شاہزادے بہت کم ہی بیمار پڑتے ہیں رزم وبزم سے اتنی مہلت ہی نہیں ملتی کہ ان کے بیمار ہونے کی نوبت آئے البتہ ایک مرتبہ صاحبقران اعظم خورشید تاج بخش بیمار ہوئے تو تمام درباری اور غیر درباری اطباء صاحبقران کے علاج کے لیے آئے [1] اسی طرح ایک اور جگہ صاحبقران اکبر معزالدین بیمار ہوجاتے ہیں تب طبیبوں کی ضرورت پڑتی ہے:۔

"حکیم مسیح الملک اور دیاطوس طبیب عیسائی کوئی وقت بالینِ صاحبقران اکبر
سے جدا نہیں ہوتے تھے ہر وقت موجود رہتے تھے" [2]

مسیح الملک اکبر کے درباری طبیب کا نام تھا۔ شاہجہاں کے دربار سے عیسائی طبیب بھی وابستہ تھے۔ "بوستان" میں اور بھی عیسائی طبیب موجود ہیں۔ مثلاً ملکِ اسم کے دربار میں درباری طبیب جاروس ہے [3] دربار میں عیسائی طبیبوں کی موجودگی شاہجہاں اور اورنگ زیب وغیرہ کے درباروں سے عیسائی اطباء کی وابستگی کی طرف اشارہ ہے۔ مشہور سیاح برنیر کا تعلق بحیثیت طبیب مغل بادشاہ کے دربار سے تھا۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی مثالیں تاریخ میں موجود ہیں۔ جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کے لوگ یونانی اور آیورویدک کے علاوہ مغربی طریقہ علاج سے بھی متاثر ہونے لگے تھے۔

درباری علماء

اگرچہ "بوستان" کے بادشاہوں کو اتنی فرصت ہی نہیں نصیب ہوتی کہ علماء کے بیچ بیٹھ کر علمی یا دینی مسائل پر گفتگو کریں، لیکن اگر کبھی ایسا موقع آتا ہے تو مذکورہ بالا حکماء ہی بحیثیت علماء نظر آتے

---

[1] ص ۱۳۵ ج ۵، [2] ص ۲۹۹ ج ۹ م، [3] ص ۴۵۸ ج ۵۔

ہیں انھیں سے مسائلِ دینوی اور دنیاوی پر گفت و شنید ہوتی ہے۔ یہ لوگ بادشاہ کو فرائض دینوی کا احساس دلاتے ہیں لیکن یہاں ان کی وہ حیثیت نہیں جو سلاطینِ ماضیہ کے درباروں سے وابستہ علمار کی تھی۔ وہاں بڑے بڑے علمار اکٹھے ہوتے تھے، بادشاہ اُن کی باتیں سنتا تھا ان سے مشورے لیتا تھا سلطان التمش ہفتہ میں تین دن علمار کی مجلس منعقد کرتا تھا۔ سلطان بلبن اس وقت تک کھانا نہیں کھاتا جب تک دسترخوان پر علمار نہیں آجاتے تھے[۱]۔ شیخ الاسلام روزانہ ایک مقررہ وقت پر فیروز شاہ تغلق سے ملاقات کرنے کے لیے تشریف لاتے تھے[۲]۔ بابر اور ہمایوں کے دربار میں بھی بڑے بڑے علمار موجود رہتے تھے۔ اکبر نے فتح پور سیکری میں عبادت خانہ اسی مقصد کے لیے بنوایا تھا۔ وہاں علمار کو بلا کر ان سے مذہبی مسائل پر گفتگو کرتا تھا، شیخ مبارک ناگوری، ملا عبدالنبی، مولانا عبداللہ سلطانپوری، شیخ نظام نارنولی، رکن الدین شیخ عبدالعزیز، ملا عبدالقادر بدایونی وغیرہ اس کے دربار کے مشہور عالم تھے۔ جہاں گیر حضرت مجدد الف ثانی کا بڑا قدر داں تھا۔ شاہ جہاں ملا عبدالحکیم سیالکوٹی، ملا محمد فاضل بدخشانی، قاضی محمد اسلم، ملا عبداللطیف وغیرہ سے مذہبی مشورہ کیا کرتا تھا، عالم گیر کا مذہب کی طرف جھکاؤ مشہور ہے۔ شیخ نظام برہانپوری سے بڑی عقیدت رکھتا تھا۔

"بوستان" کے پہلے سلطان اور معز الدین کے جدِ اعلیٰ مہدی خود امام ہیں لیکن ان کے دربار میں دوسرے عالم بھی موجود ہیں جن سے وقتِ ضرورت وہ مشورہ کرتے ہیں۔ ابوالخیار[۳]، درویش آگاہ[۴]، عبدالحکیم[۵] عبدالخیر[۶]، اور عبدالروف[۷] وغیرہ۔ صاحبقران اکبر سے تعلق رکھنے والے علمار کے نام اطبار کے ذیل میں لیے جا چکے ہیں۔ صاحبقران کے مسائل دنیاوی یا دینوی عموماً عالم واقعہ میں حل ہو جاتے ہیں۔ اس لیے علمار کی ضرورت کم ہی پڑتی ہے لیکن بعض جگہ دینوی مسئلہ کے سلسلے میں غور بھی کیا جاتا ہے مثلاً جب صاحبقران اکبر کو طلسم سبع سیاع میں ملکہ روشن گہر سے عشق ہوتا ہے تو مسئلہ یہ سامنے آتا ہے کہ ملکۂ مذکور کو حبالۂ عقد میں کیسے لایا جائے کیونکہ صاحبقران کے لیے اوّل ہی چار ملکائیں مقرر ہو چکی ہیں اور پانچویں عورت نکاح میں لانا شرعاً ناجائز ہے۔ اس صورت میں طریقۂ متعہ کی طرف نظر جاتی ہے جو پہلے رائج تھا پھر متروک ہو گیا، متعہ کو جائز قرار دینے کے لیے علمار بیٹھتے ہیں۔ ملاحظہ ہو اس مباحثہ کا ایک منظر:-

"اگر صیغۂ متعہ کو بمصلحتِ وقت جائز کر دیا جائے کوئی فتور و قصور عائد نہیں

---

[۱] ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے ص ۲۳ [۲] تاریخ فیروز شاہی ص ۲۵۳۔

[۳] ج ا، [۴] ۹۴ ج ا، [۵] ۸۷ ج ا، [۶] ۱۴۳ ج ا، [۷] ۶۵۵ ج ا۔

ہوگا حکیم بزرگ نے ارشاد فرمایا اے حکیم دانشور جو کچھ تم کہتے ہو یہ سب درست اور مسلّم اور کسی طرح کا اس میں خلل نہیں ہے مگر انصاف سے نظر کی جاوے تو واقعی بنا بر حدیث نبوی صلے اللہ علیہ وسلم کے ہے ہم تو کسی طرح کی مخالفت نہیں کر سکتے گو خلیفہ دوم امام زادہ نہیں تھے لیکن خلیفہ تو ہیں تمام اہل اسلام علی الخصوص فرقہ اہل سنت وجماعت نفرین کریں گے۔ ہم کو جان بچانی مشکل ہوجائے گی"[1]

یہ علمی مباحثہ خاصہ دلچسپ اور تفصیل سے پیش کیا گیا ہے، اسی طرح داستان کے اختتام پر حکیم قسطاس الحکمت نے عشق حقیقی اور مجازی کا فرق صاحبقران اکبر کے روبرو بیان کیا ہے[2] صاحبقران علماء کی بڑی عزت کرتے ہیں، علماء کو دربار میں بلاکر دینی مسائل پر گفتگو کرتے ہیں[3] دربار میں ان کے آنے پر استقبال کے لیے مسند سے اٹھتے ہیں۔ سروقد تعظیم دیتے ہیں، قریب بٹھاتے ہیں۔ "بوستان" میں اگر کہیں کسی معاملہ میں فتویٰ لینے کی ضرورت پڑتی ہے تو سلاطینِ داستان شیخ عرب سے مشورہ کرتے ہیں یعنی عرب کے عالم کو مستند مانتے ہیں۔ مثلاً

"سلطان جم حشم بموجب فتوائے شیخ عرب و شیخ رکن الدین عرب چند جام مئے گلفام دستِ ساقیانِ سیمیں ساق سے لے کر نوش فرمائے"[4]

ایک عالم شیخ عبد العظیم بغدادی ہیں جن سے بزم کتخدائی کے وقت امیر جمیل الدین شراب خوری کے جائز اور ناجائز ہونے کا مسئلہ کو دریافت کرتا ہے[5] شاہزادوں کے نکاح کے وقت بھی عرب کے یہی عالم آتے ہیں صاحبقران اکبر اور ملکہ شمسہ تاج دار کا عقد شیخ احمد عرب نے پڑھایا[6] ابو عامر پدر ملکہ شمسہ تاجدار کے دربار میں پادری ایدرکس کی حیثیت مذہبی پیشوا کی ہے ابو عامر ہر معاملہ میں اس سے صلاح لیتا ہے۔

---

[1] ۱۸۹ ج ۹م، [2] ۲۸۸ ج ۹ م، [3] ۳۸۴ ج ۴، [4] ۳۹۰ ج ۹م —
[5] ۲۰۴ ج ۹م، [6] ۶۳۴ ج ۹ م۔

انتظامِ سلطنت

شخصی حکومت میں بادشاہ ہی سب کچھ ہوتا ہے، بادشاہت حاصل کرنے کا مقصد ہی یہ تھا کہ تمام سلطنت پر حکمرانی کی جائے، لیکن ایک بڑی سلطنت کا تنہا انتظام کرنا ناممکن کام ہے اس لیے بادشاہ کے ساتھ ایک مجلس بھی کام کرتی تھی اگرچہ آخری فیصلہ بادشاہ ہی کا ہوتا تھا لیکن فیصلے سے قبل فیصلہ طلب مسائل پر مجلس کے لوگوں سے مشورہ کیا جاتا تھا۔

ہر بڑی سلطنت صوبوں میں تقسیم کردی جاتی ہے تاکہ پورے ملک کا انتظام آسانی سے کیا جا سکے۔ مرکز اور صوبوں کا انتظام مختلف شعبوں میں منقسم ہوتا ہے اور ہر شعبہ کی ذمہ داریاں الگ الگ افراد میں بانٹ دی جاتی ہیں سلطنت کا کوئی بھی مسئلہ انھیں افراد کے پاس پہونچتا ہے، پھر بادشاہ کے دربار میں پیش کیا جاتا ہے اور بادشاہ اپنا آخری فیصلہ دیتا ہے، سلطان محمد تغلق کے بارے میں ایک مورخ لکھتا ہے کہ "سلطان محمد تغلق سلطنت کے کام خود ہی کیا کرتا تھا یوں تو بہتیرے سردار تھے اور ہر محکمہ کے اہل کار تھے، افسر تھے، وزیر تھے، سپہ سالار تھے مگر سلطان محمد خود ہی اپنا وزیر تھا، خود ہی سپہ سالار تھا، امن کے دنوں میں وزیر کا کام کرتا اور جنگ کے وقت سپہ سالار بنتا ہے"[1]

داستانوں کے بادشاہ بھی ایسے ہی ہیں، ہر معاملہ میں خود مختار ہوتے ہیں۔ داستانوں میں حکومت زیادہ تر شاہزادوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے کیونکہ شاہزادے ہی داستان میں مرکزی کردار ادا کرتے ہیں۔ بادشاہوں کی حیثیت عموماً شطرنج کے مہروں کی سی ہے تمام سلطنت کی باگ ڈور سنبھالتے ہیں، اور یوں شاہزادوں کو بھی عشق اور معاملات عشق کو سلجھانے سے ہی اتنی مہلت نہیں ملتی کہ ان کی توجہ نظم سلطنت کی طرف جائے۔ ڈاکٹر راہی معصوم رضا نے صحیح لکھا ہے کہ "انتظامیہ کے بارے میں داستان گویوں سے زیادہ اطلاع نہیں ملتی۔ یہ بات تعجب خیز بھی نہیں ہے کیونکہ یہ داستان ایک بڑی لڑائی کی کہانی ہے"[2] یہ بات درست ہے کیونکہ شاہزادہ منزل مقصود تک پہونچنے سے پہلے صرف دو ہی کام انجام دیتا ہے

---

[1] محمد شاہ بن تغلق ص ۱۹۷، [2] طلسم ہوشربا ایک مطالعہ ص ۱۱۶۔

جنگ کرتا ہے یا جنگ سے فرصت ملتی ہے تو طلسم میں غرقِ مے ناب اور زلفہائے دراز و پے چیدہ میں اسیر رہتا ہے۔ پھر بھی سیکڑوں بادشاہوں پر مشتمل اس طویل داستان میں کہیں کہیں انتظامِ سلطنت کی جھلکیاں بھی دکھائی دیتی ہیں اور عہدے داروں کا ذکر بھی آجاتا ہے جو بادشاہ کی طرف سے انتظامِ سلطنت کے لیے مقرر کیے جاتے تھے۔

صوبیدار[1] مسلمان حکمرانوں کے عہد حکومت میں ہندوستان جیسا وسیع ملک ایک بادشاہ کی حکومت میں آگیا تھا ان سے قبل ہندوستان چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم تھا ہر ریاست میں الگ الگ راجاؤں کی حکومت تھی لیکن جب یہ پورا ملک ایک مرکز کی زیر حکمرانی آیا تو انتظامِ سلطنت میں آسانی کے لیے صوبے بانٹ دیئے گئے، ہر صوبے کا ایک صوبیدار متعین کر دیا گیا۔ جو وہاں کا چھوٹا سا بادشاہ ہوتا تھا لیکن اسے خود مختار ہونے کا حق حاصل نہیں تھا کوئی کام کرنے سے پہلے بادشاہ کا مشورہ لینا اس کے لیے لازمی تھا۔ جن بادشاہوں کے کئی شاہزادے ہوتے تھے وہ صوبیداری کے عہدے سے انھیں کو سرفراز فرماتا تھا تاکہ شاہزادوں کو نہ صرف انتظامِ سلطنت کا تجربہ حاصل ہو بلکہ اُن کی حکومت کرنے کی خواہش بھی کسی حد تک پوری ہو جائے ۔ شاہزادوں کی غیر موجودگی میں معتمد اور باصلاحیت امیروں کو صوبیداری کا عہدہ بخشا جاتا تھا۔

مغلوں کے عہد میں عموماً بڑے صوبے شاہزادوں ہی کے پاس تھے۔ بابر نے اپنی سلطنت کے صوبوں کو ہمایوں، ہندال، کامران، اور حکیم میں تقسیم کر دیا تھا، اکبر نے سلیم، دانیال اور مراد کو مختلف صوبوں میں بھیج دیا تھا۔ جہانگیر اور شاہ جہاں نے بھی سلطنت کے صوبوں کی صوبیداری شاہزادوں ہی کے سپرد کی تھی — بعض علاقوں میں امرا بھی تھے۔

"بوستان" میں سلطان مہدی نے بھی اپنی حکومت کو شاہزادوں میں تقسیم کر دیا ہے، کچھ علاقہ شاہزادہ قایم الملک کے پاس ہے اور کچھ شاہزادہ اسمٰعیل کی نگرانی میں — طلسمات میں اسی طرح سلطنت کو شاہزادوں یا شاہزادیوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔

صوبیدار کو کافی اختیارات حاصل ہوتے تھے وہ اپنی فوج رکھتا تھا، کسی بغاوت یا فساد کو دبانے کے لیے بغیر بادشاہ کی اجازت کے فوج کو استعمال کر سکتا تھا۔ بادشاہ ضرورت کے وقت اپنی فوج سے اُس کی مدد کرتا تھا، جس طرح بادشاہ کے دربار میں عہدے دار ہوتے تھے صوبیدار بھی اپنے یہاں رکھتا تھا لیکن ان میں سے بیشتر کا تقرر بادشاہ کی مرضی سے ہوتا تھا۔ کم رتبہ والوں کو صوبیدار خود بھی رکھ سکتا تھا، اگر صوبیدار

---

[1] ۲۸۴، ۳۵۹ ج ۴ ۔

شاہزادہ ہوتا تو اُسے اتنا بھی اختیار دیا جاتا تھا کہ مہمانوں یا امیروں کو خلعت و انعام بھی دے سکتا ہے۔ لیکن صوبوں میں سکہ و خطبہ بادشاہ ہی کے نام کا جاری رہتا تھا، تمام ضروری احکامات بھی بادشاہ کی طرف سے بھیجے جاتے تھے اس کے باوجود بھی کبھی کبھی فوج کی موجودگی صوبیدار کو بغاوت کے لیے آمادہ کرتی تھی۔ مرزا کامران ہمیشہ ہمایوں کے ساتھ بغاوت کرتا رہا۔ سلیم نے اکبر کے سامنے علم بغاوت بلند کیا۔ شاہزادہ خرم یعنی شاہ جہاں نے بھی ایام شاہزادگی میں بغاوت کا داغ اپنی پیشانی پر لگایا۔ اورنگ زیب کے بعد کے عہد میں زیادہ تر صوبے داروں نے بغاوت کر کے خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا۔ "بوستان" میں کہیں کہیں ایسی بغاوت نظر آتی ہے مثلاً طلحہ شیر زور نامی ایک سردار باغی ہو کر خود مختاری کا اعلان کر دیتا ہے[۱]

"بوستان" میں جن ممالک کو صاحبقران فتح کرتا ہے یا جو قلعے اُس کے قبضے میں آتے ہیں اگر مفتوح بادشاہ مسلمان ہو جاتا ہے تو صاحبقران اپنے نام کا سکہ و خطبہ جاری کروا کے ملک یا قلعہ اسی کے سپرد کر جاتا ہے بصورت دیگر اپنے کسی صوبیدار کو وہاں کا صوبیدار مقرر کرتا ہے۔

بنیادی اور اہم نظام دارالخلافہ کا ہوتا ہے جہاں بادشاہ رہتا ہے اور جہاں سے روانہ کئے ہوئے احکامات پوری سلطنت میں نافذ کئے جاتے ہیں مرکز کے عہدے داروں کا مرتبہ اور اہمیت صوبے کے عہدے داروں سے زیادہ ہوتی ہے۔

وزیر اعظم دربار میں بادشاہ کے بعد سب سے زیادہ با اختیار شخص یہی ہوتا تھا۔ بادشاہ کی قربت بھی سب سے زیادہ اسی کو حاصل ہوتی تھی۔ بادشاہ ہر معاملہ میں اس سے مشورہ لیتا تھا۔ بلکہ یہ خود بادشاہ کو سلطنت کی ترقی اور افزائش کے سلسلے میں مشورے دیتا تھا۔ بادشاہ دارالسلطنت سے اپنی غیر حاضری میں اسے نائب بھی مقرر کر جاتا تھا۔ کبھی کبھی بعض وزیر اپنے ان اختیارات سے ناجائز فائدہ بھی اٹھاتے تھے۔ اورنگ زیب کے بعد جو بادشاہ تخت نشین ہوئے۔ ان میں سے بیشتر اپنے وزیروں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے "بوستان" میں بھی بعض حکومتیں وزیر اعظم کے زیر اثر دکھائی دیتی ہیں مثلاً

> "اختر شناس نے کہا اے محمود اگر چاہتے ہو کہ جینے تخت پر بیٹھو تو ایسی باتوں سے دست بردار ہو والا تم کو عزل کروں گا اے شہریار چونکہ سلطنت وزیر کے اختیار میں تھی میں خاموش رہا"[۲]

صاحبقران اکبر کے دربار میں یہ عہدہ ابوالحسن جوہر کو عطا کیا گیا ہے وزیر اعظم کو وکیل[۳] یا مدار المہام[۴] بھی کہتے تھے۔

---

[۱] ۵۵۲ ج ۴، [۲] ۵۸۹ ج ۱، [۳] ۳۶۰ ج ۲ [۴] ۳۱۰ ج ۲۔

سپہ سالار[۱]

یوں تو بادشاہ دوسرے محکمات کی طرح فوج کا انتظام بھی خود ہی کرتا تھا، خود ہی میدانِ جنگ میں فوج کے ساتھ جاتا تھا لیکن شاہی فوج کی تمام دیکھ بھال اور ذمہ داری ایک افسر کے سپرد کی جاتی تھی جسے سپہ سالار کہتے تھے۔ تمام فوج سپہ سالار کا حکم مانتی تھی۔ فوج کے سبھی عہدے دار سپہ سالار کے تابع ہوتے تھے، اس عہدے پر بڑا معتبر اور تجربہ کار سردار متعین کیا جاتا تھا کیونکہ فتح و شکست کا انحصار اسی کے تجربے اور لیاقت پر ہوتا تھا۔ بادشاہ اگر خود میدانِ جنگ میں نہیں جاتا تو اسی کی ماتحتی میں شاہی فوج کو مقابلے کے لیے روانہ کرتا تھا۔

داروغہ قورخانہ[۲]

قورخانہ یا سلاح خانہ وہ جگہ ہوتی تھی جہاں تمام ہتھیار رکھے جاتے تھے اس کی حفاظت کے لیے جو سردار متعین ہوتا تھا اُسے داروغہ قورخانہ یا قور بیگی[۳] کہتے تھے۔

تحویلدار[۴]

یہ بادشاہ کے خزانہ کا نگراں ہوتا تھا اس کی نگرانی میں جواہر خانہ اور شاہی خزانہ رہتا تھا۔ اسے امیر مال[۵] بھی کہتے تھے۔

میر آخور[۶]

شاہی اصطبل کا نگراں میر آخور کہلاتا تھا اس کی ماتحتی میں گھوڑوں کی دیکھ بھال کے لیے سائیس[۷] بھی ہوتے تھے۔

میر منشی[۸]

سفراء کی آمد کے سلسلے اس کا ذکر کیا جا چکا ہے، تمام شاہی مراسلات لکھنے اور پڑھنے کی ذمہ داری اسی کی ہوتی تھی۔ شاہی احکامات بھی یہی نقل کرتا تھا۔

میر بحر[۹]

اس سردار کے ذمہ دریائی راستوں کا انتظام ہوتا تھا بندرگاہوں کی نگرانی اسی کے سپرد ہوتی۔ جب کبھی بادشاہ یا فوج کو دریا کا سفر پیش آتا تھا تو یہ کشتیوں کا انتظام کرتا تھا۔ بعض اوقات دلّی کے بادشاہ آگرہ کشتیوں کے ذریعہ ہی جایا کرتے تھے۔ "بوستان" میں تو دریاؤں کا جال بچھا ہوا ہے۔

قلم دار[۱۰]

اہم واقعات اور احکامات کو یہ قلم بند کرتا تھا۔ سرکاری کاغذات کی دیکھ بھال بھی اسی کے ذمہ ہوتی تھی۔

۱؎ ۱۲۴ ج ۹م، ۲؎ ۲۸۰ ج ۲، ۳؎ تاریخ شاہ جہاں ص ۲۳۷
۴؎ ۲۲۵ ج ۲، ۵؎ تاریخ شاہ جہاں ص ۲۳۷، ۶؎ ۲۵۷ ج ۵، ۷؎ ۲۸۵ ج ۱،
۸؎ ۲۷۸ ج ۳، ۹؎ ۳۵۲ ج ۲، ۱۰؎ ۴۴۶، ۵۳۸ ج ۲،

متصدی[1] اسے میر عرض[2] بھی کہا جاتا تھا۔ مختلف سرداروں یا دوسرے افراد کی عرضیاں بادشاہ کے سامنے پیش کرنے کی خدمت اس کے سپرد ہوتی تھی۔

داروغۂ فراش خانہ[3] وہ جگہ جہاں شاہی ڈیرے، خیمے، شامیانے اور فرش وغیرہ رکھے جاتے تھے فراش خانہ کہلاتی تھی اور اس کے نگراں کو داروغۂ فراش خانہ یا میر منزل[4] کہتے تھے۔ دربار عام کے وقت اسی کی نگرانی میں شامیانے اور قناتیں وغیرہ لگائی جاتی تھیں۔ دورانِ سفر قیام کے وقت یہ اپنی موجودگی میں خیمہ استادہ کرواتا تھا۔

داروغۂ ارباب نشاط اس کے ذمہ بادشاہ کی تفریح کے لیے رقص وسرود کا انتظام کرنا ہوتا تھا جب بادشاہ دربار یا محل میں ہوتا یا کوئی مہمان آتا تو یہ رقاصانِ خوش گلو و خوش آہنگ کو بادشاہ کے حضور میں پیش کرتا۔ ملک دینار کے یہاں جب صاحبقران اکبر بطور مہمان پہونچے۔

"داروغۂ ارباب نشاط کو حکم دیا کہ ہم نے صاحبقران اکبر روزگار کی دعوت کی ہے
..... جس قدر رقاصان خوش آہنگ اور خوش گلو ہوں حاضر ہو کے
اپنا فن وہنر دکھائیں[5]"

داروغۂ آبدار خانہ بادشاہ اور شاہی خاندان کے افراد کے لئے پانی وغیرہ کے انتظام کے لیے ایک الگ شعبہ ہوتا تھا جہاں پانی کو گھڑوں کے ذریعہ صاف وشیریں کیا جاتا تھا۔ اس کا منتظم داروغۂ آبدار خانہ کہلاتا تھا۔ بادشاہ کے لیے سامانِ مے نوشی کی فراہمی بھی اسی کے سپرد ہوتی تھی۔

"داروغہ آبدار خانہ کو بلایا اور فرمایا کہ کشتیاں مے نوشی کی مع صراحی وجام
یاقوت نگار اور ساقیٔ سیم تن جلد حاضر کرو[6]"

خبردار یا جاسوس[7] سلطنت کی چھوٹی چھوٹی باتوں کی خبر بادشاہ تک پہونچانے کے لیے پورے ملک میں جاسوس پھیلے ہوئے تھے ہر واقعہ کی اور ہر مسافر کی نقل وحرکت کے بارے میں یہ بادشاہ تک خبر پہونچاتے تھے۔ جنگ کے وقت حریف کی فوج میں جاکر اس کی قوت کا اندازہ کرتے تھے۔ حریف کے ارادوں سے باخبر کرتے تھے۔ جاسوسی کے کام پر عورتیں بھی متعین ہوتی تھیں۔

---

[1] ۴۴۴، ۴۸ ج ۲، [2] تاریخ شاہ جہاں ص۲۳۷، [3] ۵۶ ج ۲، [4] تاریخ شاہ جہاں، ۲۳۷،
[5] ۱۱۲ ج ۹ م، [6] ایضاً، [7] ۸۶ ج ۴۔

یہ عورتیں عموماً امراء و وزراء کے گھروں میں رہتی تھیں۔ "بوستان" میں ایک جگہ لکھا ہے کہ:۔

"قاعدہ کلیہ ہے کہ بادشاہوں کی طرف سے ہر ایک امیر و سردار کے گھر میں ایک ایک خفیہ نویس مقرر ہوتی تھی"[1]

یہ عورتیں امراء کے تمام حالات سے بادشاہ کو باخبر کرتی تھیں۔ ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ ہر چھوٹے بڑے امیر کے پاس بادشاہ کا ایک غلام رہتا ہے جو اس امیر کی ذرا ذرا سی بات بادشاہ تک پہونچاتا رہتا ہے اسی طرح ہر امیر کے گھر میں کچھ لونڈیوں کو رکھا جاتا ہے جو امیر کے سب واقعات بھنگنوں سے کہہ دیتی ہیں اور بھنگنیں اس قسم کی خبریں مخبروں کو پہونچا دیتی ہیں[2]

قاضی[3] اس کی حیثیت عدالت کے جج کی ہوتی تھی۔ مختلف شہروں میں الگ الگ قاضی مقرر کئے جاتے تھے۔ اپنے اپنے علاقے کے جھگڑوں وغیرہ کا فیصلہ کرتے تھے۔ قاضی کے لیے ضروری تھا کہ قانون سے واقفیت رکھتا ہو اور جو فیصلہ کرے اس میں شرع کی پابندی کی گئی ہو۔

قاضی القضاۃ یا قاضی الملک[4] یہ شعبۂ عدل کا افسر اعلیٰ ہوتا تھا اس کے اختیارات خاصے وسیع تھے اگر کوئی بادشاہ پر بھی نالش کرتا تو یہ عدالت میں بادشاہ کو بلا سکتا تھا۔ "بوستان" ہی میں ایک جگہ اس کی وضاحت کر دی ہے:۔

"اگر کوئی ملازم و رعایا میں بادشاہ پر بھی نالشی ہو، قاضی شہر بادشاہ اور صاحبِ دعوی کو ایک جگہ استادہ کر دیتا ہے"[5]

بادشاہ بھی بعض امور میں اس سے مشورہ کیا کرتا تھا۔

کوتوال[6] "بوستان" میں کوتوال کا کئی جگہ ذکر آیا ہے۔ دارالخلافہ کے علاوہ خاص خاص شہروں میں امن و امان قایم رکھنے، برائیوں کو روکنے اور غلط کاریوں کو ختم کرانے کے لیے ایک الگ شعبہ کا افسر کوتوال کہلاتا تھا۔ شہر میں چوری، ڈاکہ، فساد وغیرہ جیسی برائیوں کی روک تھام کرنے کی ذمہ داری اسی کی ہوتی تھی۔ اس کی حیثیت موجودہ دور کے سپرنٹنڈینٹ پولس کی سی تھی۔

قلعدار[7] دارالسلطنت میں موجود قلعہ کے علاوہ بھی ملک میں بہت سے قلعے ہوتے تھے کچھ بادشاہ کے فتح کئے ہوئے اور کچھ اس کے اجداد کے بنوائے۔ مثلاً آگرہ کا قلعہ موجود تھا لیکن شاہ جہاں نے دہلی میں لال قلعہ تعمیر کر دایا۔ جس قلعہ میں بادشاہ نہیں رہتا تھا اس میں شاہی خاندان کے دوسرے افراد

---

[1] ۶۳۴ ج ۴، [2] محمد شاہ بن تغلق ص ۲۴۲، [3] ۲۶۸ ج ۲، [4] ۱۳۳ ج ۲، [5] ۳۸۶ ج ۲
[6] ۱۷۶ ج ۵، ۶۷ ج ۳، ۳۱۷ ج ۱، [7] ۶۷ ج ۳، ۲۸ ج ۹ م

رہتے تھے۔ اس کی دیکھ بھال کے لیے ایک سردار مقرر ہوتا تھا جسے قلعدار کہتے تھے۔ قلعہ دار کے پاس فوج بھی ہوتی تھی جو قلعہ کی حفاظت میں کام آتی تھی۔

سرحد دار[1] ملک کی محافظت کے لیے کچھ فوج کے ساتھ ایک سردار سرحد پر تعینات رہتا تھا جسے سرحد دار کہتے تھے۔

ان کے علاوہ اور بھی عہدے دار بادشاہ کی خدمت کے لیے متعین ہوتے تھے مثلاً درگہ سالار[2]، پاسبان یا پاسدار[3]۔ یہ لوگ دربار کی نگہبانی کرتے تھے۔ چوبدار[4]، عصابردار[5] اور حاجب[6] کی حیثیت بھی پہرے دار کی ہوتی تھی۔ یہ لوگ کسی کو اندر نہیں آنے دیتے تھے۔ ہر نئے آنے والے کی اطلاع بادشاہ کو کرتے تھے۔ جب بادشاہ کی جانب سے اجازت حاصل ہو جاتی۔ ملاقاتی کو اندر جانے کا راستہ دیتے۔ بادشاہ کی اجازت کے بغیر شاہی خاندان کے فرد کو بھی باہر روک دیتے تھے۔ محمد تغلق کے بہنوئی امیر سیف الدین کے ساتھ پیش آنے والے حادثے کا ذکر حرم سرا کے سلسلے میں کیا گیا ہے۔ "بوستان" میں اس کی مثال یوں ملتی ہے:۔

"قریب شام قصر کے دروازے پر پہونچا عجب ہنگامہ دیکھا کہ چوبدار اور خدمتگار دروازے پر بیٹھے ہیں۔ شاہزادے نے جاکے سلام علیک ادا کی سب نے جواب سلام دے کے تعظیم کی اور بیٹھنے کے واسطے جگہ خالی کر دی شاہزادے نے فرمایا یہ جگہ میرے بیٹھنے کی نہیں ہے میں اندر جاتا ہوں۔ انھوں نے کہا اے شہریار اگر ایسا ارادہ ہے پس اوّل ہم سب کو قتل کر دو بعد ازاں اندر تشریف لے جاؤ۔ شاہزادے نے فرمایا اس کے کیا معنی۔ انھوں نے کہا اے شہریار تم خود انصاف کرو کہ اگر تم اپنے ملازموں کو حکم دو کہ کسی شخص کو اندر نہ آنے دینا اور اگر پھر کوئی شخص اندر چلا جائے پھر تم اس وقت ان لوگوں کو زندہ رکھو گے یا قتل کرو گے شاہزادے نے تامل کرکے کہا تم سچ کہتے ہو، انھوں نے کہا ہمارے آقا نے ہم کو منع کیا ہے اور خصوصاً وہ عورت ہے اگر مرد اجنبی کو اپنے قصر میں دیکھے گی۔ ہم کو زندہ نہ رکھے گی۔ شاہزادے نے کہا تم مجھ کو نہیں جانتے میں طلسم کشا ہوں اور یہاں سب جگہ میرا مہمان خانہ ہے۔ میری ممانعت نہیں۔ میری خاکِ قدم کو طوطیا کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا یہ مسلم بلکہ اگر مرضیٔ شریف ہو تو ہم بھی قدرے خاک پائے مبارک لے کر

---

[1] ۳۴۲ ج ۱، [2] ۲۸۴ ج ۲، [3] ۱۸۵ ج ۲، [4] ۳۸۵ ج ۲، [5] ۴۹۴ ج ۱، [6] ۳۰۷ ج ۲، [7] ۱۲۶ ج ۲۔

آنکھوں میں بجائے سرمہ لگائیں لیکن اس جگہ ہمارے پاس بیٹھو، ہم خدمت
کریں گے۔[1]

اس اقتباس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو اپنی ذمہ داریوں کا کس قدر پاس تھا "بوستان" میں عموماً چھوٹے بڑے تمام فیصلے بادشاہ کے دربار ہی میں ہوتے ہیں۔ خود ہی بادشاہ شکایتیں سنتا ہے اور خود ہی سزا سناتا ہے تمام قیدی بادشاہ ہی کے روبرو پیش کئے جاتے ہیں۔ مثلاً صاحبقران کے سامنے جب قحفان اور غیلان کو پیش کیا گیا تو صاحبقران اکبر نے خود سزائے موت کا انھیں حکم دیا۔[2] لیکن کہیں کہیں کوتوال اور قاضی کی عدالت بھی نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک دوکاندار اپنے مسئلہ کو لے کر داروغۂ بازار کے پاس جاتا ہے، داروغۂ بازار کوتوالِ شہر کے سامنے لے جاتا ہے لیکن یہاں بھی آخری فیصلہ بادشاہ ہی کے دربار میں جاکر ہوتا ہے۔[3] ایک اور مقام پر قاضی کی عدالت دکھائی دیتی ہے جب شاہزادہ معزالدین فریادی بن کر قاضی کی عدالت میں پہونچتا ہے کہ کیوس خاں نام کے ایک شخص نے میری سلاح چرا لی ہے۔[4] اگرچہ "بوستان" میں بادشاہ کی عدالت سے ہٹ کر عدالتیں کم ہی ہیں اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ یہاں پر روزانہ کی زندگی میں پیش آنے والے مقدمے نہیں ہیں۔ بعض مقامات پر ضرورتاً داستان نگار نے قاضی اور کوتوال کی عدالتوں کا ذکر بھی کر دیا ہے، جس سے تھوڑا بہت ان عدالتوں کی نوعیت اور ان کے عہدے داروں کی حیثیت کا اندازہ ہوجاتا ہے۔

گذشتہ صدیوں میں آج کے مقابلے میں سزائیں زیادہ سخت تھیں اس کا سبب یہ بھی تھا کہ بادشاہ اپنی حکومت کے خلاف عناصر کو پرورش پانے کی مہلت نہیں دیتا تھا۔ اسی لیے باغیوں اور اسی طرح کے دوسرے مجرموں کو موت کی سزا دینا اس زمانہ میں کوئی عجیب سی بات نہیں تھی۔ مسلمانوں کے عہد میں یوں بھی اسلامی قانون کے مطابق سزائیں سخت تھیں اور کسی کے لیے اس میں رعایت اور نرمی نہیں برتی جاتی تھی۔ تاریخ میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ بادشاہوں نے اپنے خاندانوں کے افراد کو قتل کا حکم دیا یا آنکھوں میں سلائیاں پھروا دیں۔ "بوستان" میں بھی مجرموں کو دی جانے والی سزاؤں کی بہت سی مثالیں مل جاتی ہیں۔ سزائیں کئی طرح کی ہیں قید بھی کیا جاتا ہے، جلاوطنی کا حکم بھی ہوتا ہے۔ دار پر بھی کھینچا جاتا ہے دست و پا بھی کاٹ دیئے جاتے ہیں۔

جلاوطن کرنے کی سزا اکثر داستانوں میں ملتی ہے، داستانوں میں ہی نہیں بلکہ تاریخ میں بھی اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ محمد تغلق نے اپنے بہنوئی امیر سیف الدین سے ناراض ہوکر شہر سے نکل جانے کا

---

[1] ۳۹۴ ج ۱، [2] ۱۹۶ ج ۹م، [3] ۷۷۔۱۷۶ ج ۵، [4] ۲۶۷ ج ۲۔

حکم دیا تھا۔ "بوستان" میں بھی اس کی مثال موجود ہے:۔

"اس کے واسطے یہی تعذیر کافی ہے کہ ممالک محروسہ سے نکلوا دو۔"[1]

یہ سزا اگرچہ رعایتاً دی جاتی تھی لیکن اس سے مجرم کو بڑی ذہنی اذیت پہونچتی تھی۔

موت کی سزا کے دو طریقے عام طور پر استعمال کئے جاتے تھے ایک تو یہ کہ کسی مجرم کو بادشاہ نے سزائے موت دی اور جلاد نے اسی وقت قتل گاہ میں لے جاکر اسے ہلاک کیا یا کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ پہلے پورے شہر میں منادی کرادی جاتی۔ پھر چارسو بازار میں دار ایستادہ کی جاتی، وقت مقررہ پر خلایق شہر وہاں جمع ہوتی اور سب کے روبرو مجرم کو موت کی آغوش میں پہونچا دیا جاتا۔[2] سر بازار پھانسی دینے کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ دیکھنے والے عبرت حاصل کریں۔

"بوستان" میں جلانے کی سزا دینے سے پہلے دست و پا قطع کردینے کی سخت سزا بھی ہے۔ جرزئیل نے اپنے حاکم کو زہر دینے کا منصوبہ بنایا لیکن جب اس کا یہ ارادہ حاکم وقت پر ظاہر ہوگیا تو اس نے حکم دیا کہ اس کے دست و پا اور زبان قطع کردو، پھر آگ میں جلا دو۔[3]

مارنے سے قبل اس کی آخری خواہش بھی معلوم کی جاتی تھی:۔

"او جوان نامراد جو حسرت و آرزو دل میں رکھتا ہو ——— بیان کر، ہم موجود کردیں گے
ہمارے طریق میں حسرت زدہ کسی مجرم کو قتل کرنا جائز نہیں۔"[4]

کبھی کبھی خود بادشاہ اپنے ہاتھ سے مجرم پر تیر چلاتا تھا۔[5]

قتل کے جرم میں قصاص کے بجائے مقتول کے خویش و اقارب کو خون بہا بھی دیا جاسکتا تھا۔[6] شاہی خاندان کے افراد عام طور پر خون بہا دے کر ہی رہائی حاصل کرلیتے تھے۔ شاہزادہ مہران مہر طلعت کے ہاتھ سے طلسم اشراق میں کئی آدمی قتل ہوگئے جب یہ بات دربار میں پہونچی تو بادشاہ نے اس کی شاہزادگی کا لحاظ رکھتے ہوئے اسے قصاص کے بجائے خون بہا دینے کی سزا سنائی اور کہا کہ تو اپنا سلاح دیدے، اسے فروخت کرنے کے بعد جو زر حاصل ہوگا مقتولین کے وارثوں میں تقسیم کردیا جائے گا۔[7] مال و زر دے کر کسی قیدی کو رہا بھی کرایا جاسکتا تھا۔[8]

مجرم، باغی یا حریف کو گرفتار کرنے پر بادشاہ انعامات سے بھی سرفراز فرماتا تھا، انعام کے بدلے میں

۱؎ ۳۰۵ ج ۴۔ ۲؎ ۲۷۹ ج ۱، ۲۸۳ ج ۳، ۳؎ ۱۶۰ ج ۵، ۴؎ ۳۶۸ ج ۴، ۵؎ ۴۴۳ ج ۵، ۶؎ ۵۵۸ ج ۴، ۷؎ ۶۴۲ ج ۵، ۸؎ ۱۱۵ ج ۷ م۔

لوگ ایسے افراد کو گرفتار کرنے کے لیے کوشاں رہتے تھے، نہنگ مصری عیار امیر محمد کو اس لیے گرفتار کر کے لایا کہ جمشید اسے انعام دے گا[1] ابوالذرع نے جب امیر یوسف کو گرفتار کر کے اشبوط دیلمی کے حوالے کیا تو اشبوط نے اسے ایک صوبہ کی صوبے داری بخشی[2] اسی طرح اور بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ اگر تم فلاں کام انجام دو تو ایک دیہہ جاگیر میں نسلاً بعد نسلاً دیا جائے گا[3] یا اگر کوئی شخص مہتر توفیق کو گرفتار کرے تو انعام کثیر اور منصب پائے گا[4]

برنیر نے ایک جگہ لکھا ہے کہ جب کوئی امیر مرجاتا ہے تو اس کی تمام جاگیر اور دولت اور خزانہ شاہی میں شامل کر لی جاتی ہے[5] اس کی وجہ یہ تھی کہ جو امیر مر گیا اس کی جگہ کو پُر کرنے کے لیے یقیناً دوسرا رکھا جائے گا اور پھر اسے جاگیر اور دوسرے لوازمات کی ضرورت پڑے گی۔ ایسی حالت میں مرنے والے کا سامان ہی اُسے دے دیا جاتا تھا "بوستان" میں اس کی مثال تو نہیں ملتی البتہ ایسے شخص کا مکان وغیرہ جس کا کوئی وارث نہ ہو، نزول شاہی میں داخل ہو جاتا ہے[6] یا کوئی مال کہیں پایا جائے اور اس کا کوئی وارث نہ ہو تو شاہی ملکیت ہو جاتا ہے۔ مثلاً چند ماہی گیر ایک صندوق اٹھا کر لائے اثنائے راہ چار آدمی اور آدمی مل گئے، وہ بھی اس مال میں اپنا حصہ مانگنے لگے۔ اسی طرح اور آدمی آ گئے، جھگڑا ہوا، سرکاری پیادے آئے۔ صندوق دربار میں لے جایا گیا کیونکہ اس کا کوئی وارثِ حقیقی نہیں تھا اس لیے بادشاہ کی ملک ہو گیا[7]

بادشاہ کے تمام فیصلے اور فرمان قلم بند ہوتے تھے۔ خصوصاً مغلوں کے عہد کو کاغذ کا عہد کہا گیا، کسی بھی حکم کو اس وقت تک معتبر نہیں مانا جا سکتا جب تک اس کا تحریری ثبوت نہ ہو۔ کامران مرزا نے اپنی بہن گلبدن بیگم کو لاہور اپنے ساتھ لے جانے کے لیے ہمایوں بادشاہ سے فرمان لکھوایا، جب گلبدن بیگم کو فرمان دکھایا گیا تب وہ اس کے ہمراہ گئیں[8] فرمان کی اہم چیز بادشاہ کی مُہر ہوتی تھی۔ بغیر مُہر کے کوئی بھی حکم ناقابلِ عمل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ شاہی مُہر بڑی حفاظت سے اور معتمد شخص کے پاس رکھی جاتی تھی، مُہر کو بادشاہ کے روبرو کھولا جاتا تھا اور کام ختم ہو جانے کے بعد پھر بند کر دیا جاتا تھا۔ بادشاہ کی غیر موجودگی میں کسی کو مُہر نکالنے کی اجازت نہیں تھی۔ "بوستان" میں جگہ جگہ اقرار نامے لکھوانے کے سلسلے میں مُہر کا ذکر آیا ہے ملکہ رضیہ سلطان بھی جب صاحبقرانِ اصغر سے اپنی شادی کے معاملہ میں اقرار نامہ لکھواتی ہے تو اُس پر صاحبقران کی مُہر لگواتی ہے[9] یا ایک اور مثال ملاحظہ ہو:۔

---

[1] ۳۵۱ ج ۴، [2] ۳۵۹ ج ۴، [3] ۵۳۱ ج ۴، [4] ۶۸۶ ج ۴، [5] برنیر ص ۶۲۵، [6] ۱۱۲ ج ۴، [7] ۴۴۳ ج ۴، [8] ہمایوں نامہ ص ۴۶، [9] ۳۱۵ ج ۴۔

"ملک ساطع نے کہا تم کس مزد کے خواستگار ہو انھوں نے کہا ابھی ہم ظاہر نہیں کرتے لیکن تم ایک عہد نامہ اس مضمون کا لکھ کے اور اس پر اپنی مُہر کر کے ہم کو دو کہ بعد قتل ان دونوں اسیران طلسم کے جو کچھ ہم تم سے طلب کریں بلا عذر و حیلہ ہم کو دو گے[1]۔

بادشاہ کے کسی بھی خط یا فرمان کو بغیر اس کی مہر کے قابلِ یقین نہیں سمجھا جاتا تھا۔ یہ بات ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ کسی بھی خط یا فرمان کے لکھنے یا پڑھنے کی خدمت میر منشی انجام دیتا تھا۔

نظامِ سلطنت کے سلسلے میں "بوستان" میں اِس سے زیادہ کوئی اشارہ نہیں ملتا، البتہ فوجی نظام کو سمجھنے میں "بوستان" سے خاصی مدد ملتی ہے۔

---

[1] ۶۶۴ ج ۱۔

فوجی نظام

ادب میں رزمیہ نثر اگر کہیں نظر آتی ہے تو وہ صرف داستانوں میں، اس لئے داستانوں کا ایک نام رزمیہ بھی ہے، مورخ واقعات کے بیان میں بالخصوص جنگ و جدل کے سلسلے میں پیش آنے والے واقعات کی تفصیلات میں جزئی جزئی باتوں کو نظر انداز بھی کر دیتا ہے اور کبھی کبھی تو وہ کسی محاربہ یا معرکہ کی طرف محض چند اشارے کرتا ہوا گذر جاتا ہے، لیکن داستان گو داستان کی فنی دلچسپیوں کو بڑھانے اور بسا اوقات اس کے حجم میں اضافہ کرنے کے لئے واقعات کو تفصیلات اور تفصیلات کو جزئیات کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ ہومر کی ایلڈ ہو یا بالمیکی کی رامائن یا دید دیاس کی مہابھارت، فردوسی کا شاہنامہ یا داستان امیر حمزہ، ہر داستان میں مرکبان تیز رفتار کے دوڑنے، تلواروں کے ٹکرانے اور نیزوں کے ٹوٹنے کی آوازیں ابتدا تا اختتام موقع بہ موقع سنائی دیتی ہیں۔

جنگ کرنا بادشاہ کا مقدر ہوتا ہے، خصوصاً شخصی حکومت میں اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے بادشاہ کا ایک قدم قلعہ میں ہوتا تو دوسرا میدان جنگ میں۔ سکندر نے تمام زندگی میدان داری میں گذاری، چنگیز خاں، ہلاکو خاں اور امیر تیمور اپنے جنگی کارناموں کی وجہ سے تاریخ میں زندہ ہیں۔ ہندوستان کے مغل خاندان کا پہلا بادشاہ بابر اور آخری بڑا بادشاہ اورنگ زیب ساری عمر معرکہ آرائی میں مصروف رہے۔

"بوستان خیال" بھی مذکورہ دیگر کتھاؤں یا رزمیہ داستانوں کی مانند بیان رزم سے آراستہ ہے تینوں صاحبقران اپنے اپنے ملک سے نکل کر ہر دوسرے قدم پر برسر پیکار نظر آتے ہیں خواہ وہ بیرون طلسم ہوں یا اندرون طلسم، یہی حال دوسرے بادشاہوں اور شاہزادوں کا ہے، اگر ایک دن محلسرا میں آرام کرتے ہیں تو ایک ہفتہ سے زیادہ میدان معرکہ میں مصروف رہتے ہیں، داستان کا اختتام ہی آخری فیصلہ کن جنگ پر ہوتا ہے۔

"بوستان" کی جنگیں دو طرح کی ہیں، ایک وہ جس میں صرف طاقت کا استعمال کیا گیا ہے اور دوسری وہ جس میں طاقت سے زیادہ سحر اور تائید غیبی شامل ہے آخر الذکر عموماً طلسمات کے اندر لڑی گئی ہیں اور ان میں شاہزادے کا مقابلہ فوق الفطرت مخلوق سے ہوا ہے یعنی اس کے حریف دیو، جن، غول بیابانی وغیرہ ہیں، شاہزادہ ان کا مقابلہ تائید غیبی، اسمائے الٰہیہ، اور لوح طلسم کی مدد سے کرتا ہے اور ان پر فتح پاتا ہے لیکن ایسی جنگوں میں بھی طریقۂ جنگ وہی ہے جو بیرون طلسم مروج ہے، اسی طرح لشکر کی صفوں کی آراستگی، مقابلہ کے لئے میدان میں آکر حریف طلب کرنا، رجز خوانی وغیرہ ہوتی ہے، بیشتر

ہتھیار بھی وہی استعمال کیے گئے ہیں لیکن ان لڑائیوں میں قوت بازو سے زیادہ انحصار جادوگری پر ہوتا ہے۔ جسمانی طاقت فتح کا سبب نہیں بنتی بلکہ غیبی یا سحری قوت مقابلہ کرتی ہے، ساحری کا سہارا بیرون طلسم کی بعض جنگوں میں بھی لیا گیا ہے مثلاً جمشید خود پرست خناز جادو کے جادو کی مدد سے لشکر اسلام کے تمام سرداروں کو مع معزالدین زخمی کر دیتا ہے، خود صاحبقران اکبر طلسم سے حاصل کی ہوئی تلوار سے جمشید کو قتل کرتے ہیں۔ ساحری وغیرہ کا تفصیلی ذکر داستان کے فوق الفطرت عناصر کے ذیل میں کیا جائے گا۔ یہاں داستان کی مدد سے اس عہد کے فوجی نظام اور ترتیب عساکر سے متعلق امور کا ایک مختصر جائزہ لیتے ہیں اس نظام کا مطالعہ اس لئے بھی ناگزیر ہے کہ آج کے ترقی یافتہ دور میں یہ نظام جنگی تاریخ کا ایک حصہ بن کر رہ گیا ہے۔ یہ دفتر پارینہ ایک مخصوص عہد کی تہذیب وتمدن ومزاج کو سمجھنے میں معاون ہو سکتے ہیں۔

گذشتہ صفحات میں ذکر کیا گیا ہے کہ شخصی حکومت میں بادشاہ خود ہی تمام شعبوں کا حکمران اعلیٰ ہوتا تھا، فوج کی کمان بھی وہ خود ہی سنبھالتا تھا اکثر وبیشتر فوج لے کر میدان جنگ میں حریف کے مقابل جاتا تھا اور اپنی قوت بازو کے جوہر دکھاتا تھا، اس لئے فنون سپہ گری میں مہارت رکھنے والے بادشاہ ہی عموماً مستحکم حکومت قایم رکھ پاتے تھے، قدیم زمانہ سے لیکر مغلوں کے آخری دور تک کی تاریخ پر اگر نظر کیجائے تو تمام بادشاہ میدان جنگ میں معرکہ آرائی میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔ رامائن کے رام چندر اور لنکا کا راجہ راون میدان جنگ میں موجود تھے، سکندر نے خود اپنی فوج کو لیکر دنیا فتح کرنیکا عزم کیا پورس اس کے مقابلہ کے لئے خود میدان کارزار میں فوج لے کر گیا[1]، یو۔آن چانگ نے ہرش وردھن کے متعلق لکھا ہے کہ "ہرش مسلسل جنگ وجدال میں مصروف رہا، یہاں تک کہ چھ سال میں اس نے پانچوں ہندوستان سے اطاعت قبول کروائی[2]"، محمود غزنوی سترہ بار اپنی فوج کے ساتھ ہندوستان پر حملہ آور ہوا، ابراہیم لودی بادشاہ ہندوستان میدان جنگ میں بابر سے مقابلہ کرتے ہوئے مارا گیا۔ اکبر بیشتر مہمات میں خود جاتا تھا، اورنگ زیب پچیس سال دکن میں برسرپیکار رہا، محمد شاہ خود نادر شاہ درانی کے مقابلہ کے لئے فوج لے کر شاہجہاں آباد سے باہر آیا، کسی بھی زبردست حریف کے مقابلہ کے لئے عموماً بادشاہ خود ہی فوج کے ساتھ جاتا تھا "بوستان" میں صاحبقران ہوں یا کسی ملک کا بادشاہ، مقابلہ کے وقت خود فوج لے کر حریف کے روبرو آتا ہے، جبل الاعلیٰ پر تمام بادشاہ اپنی اپنی فوج لے کر میدان میں آئے تھے "بوستان" کے بادشاہ جنگ میں اسی وقت حصہ لیتے ہیں۔ جب جنگ مغلوبہ ہوتی ہے یا تمام نامور پہلوان زیر ہو جاتے ہیں، جب تک پہلوان میدان میں زور آزمارہتے

---

[1] قدیم ہندوستان کی تاریخ ص ۲۵۲ [2] ایضاً ص ۵۳۵

ہیں بادشاہ ان کے مقابلہ کو دیکھتا ہے :-

"ایک طرف الصاق شاہ بھی ہودج فیل پر سوار پہلاد خاں کی یورش کا تماشا دیکھ رہا تھا" [۱]

اسی طرح صاحبقران اکبر اور دوسرے بادشاہ اپنے پہلوانوں کی جنگ کا تماشا دیکھتے ہیں :-

"صاحبقران اکبر ---------- ایک بلندی پر بالائے فیل کلاں کھڑے ہوئے اپنے شیروں اور بہادروں کی لڑائی دیکھ رہے تھے اور ایک دوربین کے ذریعہ سے ہر ایک لشکری اور لشکر کو ملاحظہ فرما رہے تھے" [۲]

اپنی موجودگی میں فوج کو تمام ہدایات بادشاہ خود کرتا تھا، گویا بادشاہ کی موجودگی کے وقت تمام عہدیدار اس کے حکم کے پابند ہوتے تھے، اس وقت وہی فوج کا سپہ سالار اعظم ہوتا تھا۔

بادشاہ اگر کسی اور مہم میں مصروف ہوتا یا کسی وجہ سے دارالخلافہ میں اپنی موجودگی ضروری سمجھتا تو ایسی حالت میں کسی شاہزادہ کو اپنا قایم مقام بنا کر شاہی فوج کے ہمراہ حریف کے مقابلہ کے لئے روانہ کرتا تھا، اس سے نہ صرف شاہزادہ کی قوت، صلاحیت اور لیاقت کا اندازہ ہوتا تھا بلکہ آیندہ حکمرانی کرنے کے لئے شاہزادہ کا تجربہ بھی بڑھتا تھا، بندوسار نے ٹکسلا کی بغاوت کو فرو کرنے کے لئے اپنے بیٹے اشوک وردھن کو وہاں بھیجا جو کامیاب ہوا [۳]، کمار گپت اول نے اپنی ضعیفی اور بیماری کے سبب ولی عہد سلطنت اسکند گپت کو پشیہ متر سے جنگ کے واسطے بھیجا، اسکند گپت نے اس مہم میں فتح حاصل کی [۴]۔ مسلمانوں کے عہد میں بھی کیونکہ بادشاہ کے بیٹے سب سے زیادہ قابل تعظیم سمجھے جاتے تھے اس لئے بادشاہ انھیں بڑی مہموں کو سر کرنے کے لئے بھیجتا تھا، سلطان جلال الدین خلجی کے بیٹے ارکلی خاں نے اودھ کے حاکم ملک چھجو سے مقابلہ کیا اور اس کی بغاوت کو دبایا [۵]، تلنگانہ اور ورنگل شاہزادہ جونا خاں نے غیاث الدین تغلق کے عہد حکومت میں فتح کئے [۶]، مغلوں کے دور میں ہر شاہزادہ کو کسی نہ کسی مہم پر شاہی فوج کے ساتھ روانہ کیا جاتا تھا، اکبر کے حکم سے شاہزادہ سلیم ایک بڑی فوج کے ہمراہ میواڑ کی مہم پر گیا بقول ڈاکٹر بینی پرشاد، بادشاہ نے شاہزادہ کو بری صحبت اور مفسد عناصر سے دور رکھنے کے لئے اسے میواڑ کی مہم پر مقرر کر دیا تھا [۷]، دکن کی مہم جہانگیر نے شاہی لشکر کے ساتھ شاہزادہ خرم یعنی شاہ جہاں کو بھیجا تھا اس وقت شاہ جہاں اپنی طاقت کے سبب سلطنت

---

[۱] ۴۷۸ ج ۴، [۲] ۳۵۰ ج ۹م، [۳] قدیم ہندوستان کی تاریخ۔ ص ۱۹۰، [۴] الیضاً۔ ص ۲۹۵،
[۵] خلجی خاندان۔ ص ۲۸، [۶] تاریخ ہند ہاشمی، جلد دوم۔ ص ۳۴۱، [۷] تاریخ جہانگیر۔ ص ۶۳

کا سب سے بڑا فوجی کماندار تھا۔[1] اسی طرح شاہ جہاں کے عہد میں کئی بڑی مہموں میں شاہزادوں ہی نے شاہی لشکر کی کمان سنبھالی، دکن شاہزادہ شجاع کو بھیجا گیا تھا۔ بلخ و بدخشاں، بیجاپور اور گولکنڈہ کی معرکہ آرائیوں میں فوج کا افسر اعلیٰ شاہزادہ اورنگ زیب تھا۔[2]

"بوستان" میں بھی شاہزادے اسی طرح میدان جنگ میں برسرپیکار نظر آتے ہیں، شاہزادہ قایم الملک محتال پر فتح پاتا ہے[3]، شاہزادہ اسمٰعیل بن قایم الملک اسطالوس[4] فرنگی اور اہالیٔ شام وغیرہ سے جنگ کرتا ہے، شاہزادہ طاقان کو ہزار کے مقابلہ کے لئے فوج لے کر جاتا ہے[5]، شاہزادہ فرخ زور فرخ زاد سارو ق سے جنگ کرنے کے لئے میدان معرکہ میں لشکر کے ساتھ آتا ہے[6] کیونکہ "بوستان" شاہزادوں کے عشق کی داستان ہے اس لئے اکثر میدانِ جنگ میں شاہزادے ہی فوج کی سربراہی کرتے ہوئے دکھائی دیتے ھیں۔

شاہی خاندان کے افراد کے علاوہ شاہی فوج کی رہنمائی اعلیٰ مرتبت امرار کو بھی تفویض کی جاتی تھی عموماً وزیر اعظم کو شاہی لشکر کے ساتھ بھیجا جاتا تھا، وزیر اعظم کی حیثیت بادشاہ کے نائب کی ہوتی ہے، بادشاہ کے بعد اس کا مرتبہ سب سے بڑا ہوتا تھا، اکبر کے زمانہ میں بیرم خاں وزیر اعظم تھا، بیشتر جنگیں اسی کی رہنمائی میں لڑی گئیں، جہانگیر کے عہد میں شریف خاں وزیر اعظم کو دکن کی مہم پر فتح پانے کے لئے شاہزادہ پرویز کے ساتھ بھیجا گیا۔[7] وزیر اعظم آصف خاں کو شاہ جہاں نے بیجاپور میں عادل شاہوں کے خلاف لشکر کشی کے لئے بھیجا[8]، نادر شاہ کے مقابلہ کے لئے شاہی لشکر کی سرکردگی وزیر اعظم نظام الملک کو سونپی گئی۔[9] "بوستان" میں عموماً بادشاہ خود ہی میدان جنگ میں جاتے ہیں لیکن وزیر اعظم بھی ان کے ہمراہ ہوتا ہے، ایک آدھ جگہ وزیر اعظم بھی فوج کا رہنما بن کر حریف کے مقابلہ کو جاتا ہے مثلاً مصر کی فتح کے لئے صاحبقران نے اپنے وزیر اعظم ابوالحسن جوہر کو فوج کے ساتھ روانہ کیا۔[10]

صباح الدین عبدالرحمٰن نے لکھا ہے کہ بادشاہ اور شاہزادوں کے بعد غزنوی دور میں اعلیٰ عہدہ دار صاحبِ دیوان یا عارض کہلاتا ہے، وہ وزیر جنگی اور حربی امور میں بادشاہ کا خاص مشیر ہوتا تھا اس کی حیثیت وزیر جنگ کی ہوتی جس کا رتبہ وزیر اعظم سے کچھ کم ہی تھا لشکر کی دیکھ بھال کی ذمہ داری اسی پر ہوتی تھی[12] آگے لکھتے ہیں کہ تیموری دور میں عارض کا عہدہ میر بخشی یا بخشی الملک کہلاتا تھا اس کے فرائض کی نوعیت عارض

---

[1] تاریخ جہانگیر، ص ۳۲۶، [2] تاریخ شاہ جہاں، ص ۵۲، [3] ۲۵۸ ج ۱ ع، [4] ۳۰۷ ج ۱، [5] ۱۱۴ ج ۱، [6] ۳۲۴ ج ۴، [7] ۴۰۷ ج ۵، [8] تاریخ جہانگیر، ص ۲۵۸، [9] تاریخ شاہ جہاں ص ۱۴۹، [10] تاریخ ہند از ہاشمی ص ۲۰۶، [11] ۲۸۴ ج ۹ م، [12] ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام، ص ۵،

ہی جیسی تھی: "بوستان" میں عارض کا ذکر تو نہیں ملتا لیکن میر بخشی کا ایک آدھ جگہ نام آیا ہے[1] - اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ پٹھان سلطنت کے بعد عارض کا عہدہ باقی نہ رہا تھا اور اس کی جگہ بخشی الملک یا میر بخشی نے لے لی تھی

بخشی کا عہدہ سپہ سالار سے مختلف ہوتا تھا، سپہ سالار کا کام میدانِ جنگ میں فوج کی کمان کرنا تھا لیکن بخشی کے ذمہ کل شاہی فوج کے معاملات کی دیکھ بھال کرنا ہوتا تھا، سپاہیوں کی بھرتی کرنا، ان کی چہرہ نویسی کی تفصیلات کا انتظام کرنا، ان کی برطرفی، بیماری اور موت کا ریکارڈ رکھنا، تنخواہیں مقرر کرنا، فوجی سواریوں کی جانچ پڑتال کرنا وغیرہ تمام فرائض میر بخشی کے ہی ذمہ ہوتے تھے -

میر بخشی دربار میں بھی بادشاہ کے دائیں جانب کھڑا ہوتا تھا اگر بادشاہ کسی کو فوجی خدمت کے صلے میں جاگیر دیتا تو فرمان شاہی پر بادشاہ اور دیوان کی مہروں کے ساتھ میر بخشی کی بھی مہر ثبت کی جاتی تھی، فوج کے تمام عہدیداروں، لشکری اور سوار وغیرہ سے متعلق تمام ذمہ داریاں اسی کے سپرد ہوتی تھیں۔ لشکر کے سفر کے انتظامات اور میدانِ جنگ کا نقشہ بھی بخشی ہی تیار کرتا تھا میر بخشی کی مدد کے لئے معاون بخشی مقرر کیے جاتے تھے -

سپہ سالار

"بوستان" میں بار بار فوج کے جس عہدیدار کا نام لیا گیا ہے وہ سپہ سالار ہے، ہر جنگ کے موقع پر داستان گو کہتا ہے کہ فلاں شخص اس بادشاہ کا سپہ سالار تھا یوں تو جب فوج میں بادشاہ یا شاہزادہ یا وزیر اعظم موجود ہوتا تو سپہ سالار یعنی فوج کا افسر اعلیٰ ہوتا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ جنگی معاملات میں تجربہ رکھنے والے کسی امیر یا سردار کو فوج کا مستقل سپہ سالار مقرر کر دیا جاتا تھا جو فوج کو جنگ کے وقت مورچوں پر تعینات کرتا تھا، خود بادشاہ اس سے جنگی معاملات میں مشورہ کرتا تھا، آئین اکبری میں سپہ سالار کے بارے میں کافی تفصیل سے لکھا ہے لیکن وہاں اس کے مرتبہ کی کم وضاحت کیگئی ہے بلکہ سپہ سالار کے اوصاف بیان کیے ہیں، ابوالفضل نے سپہ سالار کو بادشاہ کا نائب لکھا ہے[2]، "بوستان" میں بھی صاحبقران اکبر کے غیر موجودگی میں فوج کے سپہ سالار امیر مجاہدالدین نیابت کے فرائض انجام دیتے ہیں[3]۔ جنگ کے وقت جب فوج کو طبقوں میں تقسیم کیا جاتا تھا تو ہر طبقہ کا الگ الگ سردار مقرر ہوتا تھا مثلاً

"ایک سردار کو ہزار نامی کو اپنے لشکر کی ہراولی دی اور میمنہ اور میسرہ کا ازلاک

---

[1] ۳۴۴ ج ۲، [2] آئین اکبری جلد اول ، [3] ۲۴۸ ج ۴۹

اور اُلوج دو پہلوانانِ جنگ آزما کو سردار کیا"[1]

فوج کے اگلے دستہ کا سردار مقدمۃ الجیش کہلاتا تھا، اس دستہ کی فوج اس کے حکم کی پابند ہوتی تھی" تاریخ مبارک شاہی میں میمنہ اور میسرہ کے سرداروں کو "سر جاندار میمنہ" اور "سر جاندار میسرہ" لکھا ہے[2]۔

مذکورہ افسران کے علاوہ فوج میں اور بھی عہدیدار ہوتے تھے مثلاً علمدار لشکر[3] جس کے ہاتھ میں شاہی علم ہوتا تھا، برق انداز جو توپیں چلانے پر تعینات ہوتا، بابر کے زمانے میں استاد علی توپوں کے چلانے پر مقرر تھا[4]، "بوستان" میں بہرام انداز بھی استاد زمانہ تھے[5]، جماعت دار[6] یا جمعدار[7] اس کی ماتحتی میں چند سپاہی ہوتے تھے، اون باشی[8] دس سپاہیوں کا افسر ہوتا تھا، سرہنگ[9] اس کی نگرانی میں پانچسو سوار ہوتے تھے، اور یہ حاجب[10] کا ماتحت ہوتا تھا، آتش باز[11] یا قراول[12] آگ برسانے یا بندوق چلانے والے کو کہتے تھے۔ نقارچی[13] نقارۂ رزمی کو جنگ کے وقت بجایا کرتا تھا، نقیب[14] پہلوانوں کے میدانِ جنگ میں آنے پر ان کی تعریف کرتا تھا شجاعت کے گیت گاتا تھا جس سے پہلوانوں میں جوش پیدا ہوتا تھا۔

فوج کے سامان کی انتظامیہ کے الگ الگ سردار مقرر ہوتے تھے جو سب بخشی کے ماتحت ہوتے تھے، جن کا ذکر دربار کے عہدیداروں کے سلسلے میں بھی آچکا ہے مثلاً داروغۂ قورخانہ[15] یعنی ہتھیاروں کی دیکھ بھال کرنے والا، میر آخور[16] اصطبل کا نگہبان، داروغۂ فیل خانہ[17] جس کے ذمہ جنگی ہاتھیوں کی دیکھ بھال ہوتی تھی، میر آتش[18] توپ خانہ کا داروغہ ہوتا تھا، داروغۂ فراش خانہ[19] جو فوج کے پڑاؤ کے وقت خیموں کا انتظام کرواتا تھا، داروغۂ نقار خانہ[20] فوجی نقار خانہ کا منتظم ہوتا تھا، ہر فوج میں جاسوس یا مخبر بھی ہوتے تھے جو حریف کے لشکر میں رہتے اور تمام خبریں اپنے سپہ سالار تک پہونچاتے تھے[21]۔

ہتھیاروں کا نام

اس سے پہلے کہ میدانِ جنگ میں معرکہ آرائی کا نظارہ کریں مناسب ہوگا کہ ان ہتھیاروں پر نظر ڈالیں جو جنگ کے وقت استعمال ہوتے تھے آج سے تقریباً ایک دو صدی پہلے اور آج کی لڑائی میں صدیوں کا

۱؎ ۳۱۴ ج ۳، ۲؎ تاریخ مبارک شاہی ص ۶۲ بحوالہ از ہندوستان کے عہد وسطی کا فوجی نظام از صباح الدین عبدالرحمن ص ۱۱، ۳؎ ۴۰۸ ج ۲، ۴؎ ۲۵۷ ج ۲، ۵؎ ظہیر الدین بابر ص ۱۶۲، ۶؎ ۲۲۳ ج ۱، ۷؎ ۵۳۸ ج ۲، ۸؎ ۵۳۸ ج ۲، ۹؎ ۴۰۳ ج ۹، ۱۰؎ ۴۱۸ ج ۲، ۱۱؎ ۳۵ ج ۳، ۱۲؎ ۱۷ ج ۲، ۱۳؎ ۱۰۰ ج ۲، ۱۴؎ ۲۹۱ ج ۹، ۱۵؎ ۴۸۵ ج ۹، ۱۶؎ ۵۶ ج ۹، ۱۷؎ ۲۵۷ ج ۵، ۱۸؎ ۴۲۳ ج ۲، ۱۹؎ ۵۴ ج ۲، ۲۰؎ ۵۶ ج ۲، ۲۱؎ ۱۱۰ ج ۲، ۲۲؎ ۹۰ ج ۴،

ہتھیار
شش بر
گرز
ناوک
پیازی
تیر
نیزہ
خنجر
شمشیر
زاغنول
کمان
تبرزاغنول
کمان
تبر
ترکش
گروہ کمان
قیچی کارد
گپتی کارد
کارد
چاقو
پشت خار
خار ماہی
جمدہر
122
میان گپتی

فرق آگیا ہے آج ہزاروں میل دور بیٹھ کر بغیر فوج بھیجے کسی ملک پر حملہ کیا جاسکتا ہے، پہاڑ اڑا دینے والے بم پھینک کر دشمن کے ملک کو تباہ کیا جاسکتا ہے، آتشیں ہتھیاروں نے انسانی ذہن کی سوچ کی حد سے زیادہ ترقی کرلی ہے آج کی جنگ بہت کم وقت میں فیصلہ کردیتی ہے لیکن زمانہ قدیم میں ایسا نہیں تھا حریف کے ملک تک پہونچنے میں فوج کو مہینوں لگ جاتے تھے، اس وقت فوجیں آمنے سامنے آتی تھیں، آدمی آدمی سے لڑتا تھا، دور بیٹھ کر مشین گنوں سے گولیاں نہیں برسائی جاتی تھیں، ایسے حالات میں ہتھیار بھی ایسے استعمال ہوتے تھے جن سے روبرو لڑا جاسکے، پتھر کے زمانہ میں آدمی پتھروں کو نکیلا بناکر ان سے حریف پر حملہ آور ہوتا تھا، نکیلے پتھروں کو لکڑیوں میں باندھ کر نیزے کی شکل تیار کرتا تھا، جب لوہے کا زمانہ آیا تو ہتھیار لوہے کے بننے لگے، لوہے کے ہتھیار بہت کارگر ثابت ہوئے جو اب تک رائج ہیں۔

تیغ

یہ فولاد کی تین چار فٹ لمبی مضبوط پتی ہوتی ہے اس کے ایک جانب تیز دھار ہوتی ہے، ایک سرے پر پکڑنے کے لئے دستہ ہوتا ہے اس کی شکل عموماً دوسرے دن کے ماہتاب کی طرح خم کھائی ہوئی ہوتی ہے بعض تلواریں سیدھی بھی ہوتی ہیں۔

تیغ یا تلوار یا شمشیر بادشاہ سے لے کر پیادے تک ہر ایک کے پاس لازماً ہوتی تھی بلکہ پیدل فوج کا خاص حربہ تلوار ہی تھا، بغیر تلوار کے آلاتِ حرب کو ناقص سمجھا جاتا تھا، اس کا استعمال جنگ مغلوبہ کے وقت خاص طور سے کیا جاتا تھا۔

> "بہادران تہور شعار بھی تلواریں لے لے کر فوج کفار پر آگرے، اس وقت ایسی تلواریں چل رہی تھیں کہ اللہ کی پناہ، وہ جنگ مغلوبہ نہ تھی بلکہ ایک ہنگامہ حشر برپا تھا سوائے صدائے بزن و بکش کے دوسری آواز نہ آتی تھی ؎
>
> یکے بادم تیغ گردن بریدہ — یکے باسنان جسم جوشن دریدہ"[1]

تلواروں کی بہت سی قسمیں تھیں، آداب الحرب میں ان سب کا ذکر کیا گیا ہے مثلاً چینی، روسی، ضربی، رومی فرنگی، یمانی، سلیمانی، شاہی، علائی، کشمیری اور ہندی وغیرہ[2]

بعض تلواریں زہر میں بجھی ہوئی بھی ہوتی ہیں جس سے زخم کاری لگتا اور زخمی کا جانبر ہونا مشکل سے

---

[1] ۹۶، ۹۷، [2] ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام، ص ۳۷،

جنبوہ
بانک
خم کہاکہ
کہانڈہ
گپتے عصا
گپتے عصا
کٹار
بسولہ
برچھا
چکر
سانک
سیلڑہ
سینٹھے
زنگالہ
ملنٹھا
گوپھن
گجباک
گرہ کشا

ہو جاتا، جیسے شمشیر الماس کار کہتے تھے۔[1] "بوستان" میں تلواروں کی مذکورہ اقسام کے نام تو نہیں آتے البتہ شمشیر کے ساتھ اس کی صفت کا ضرور ذکر ہوتا ہے جیسے شمشیر آبدار،[2] تیغ خاراشگاف،[3] تیغ بے دریغ،[4] شمشیر خون آشام[5] وغیرہ کچھ تلواریں اتنی وزنی ہوتی تھیں کہ دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر حملہ کیا جاتا تھا، یہ تلواریں طلسم کے دیوؤں اور صاحبقران کے پاس ہیں مثلاً شمشیر صد منی یا:۔

"آخر شمشیر آبدار کہ جس کا وزن سات سو من سے کم نہ تھا غلاف سے نکالی"[6]

تلوار کا وار اتنا تیز اور بھرپور ہوتا تھا کہ خودِ آہنی کو کاٹتا ہوا سینے اور زین کو پار کر کے گھوڑے کی کمر تک پہونچتا تھا، جمشید کی شمشیر قدرت کا وار ملاحظہ ہو:۔

"اس بے حیا نے شمشیر قدرت غلاف سے نکال کر اس طرح شنقاش کے سر پر لگائی کہ خور کاٹ کے سینہ سے گذر گئی اور تنگ مرکب کو کاٹتی ہوئی زمین در آئی"[7]

مغلوں کے زمانہ میں "سروہی" نام کی تلوار جو راجپوتانہ کے ایک مقام سروہی میں بنتی تھی، کا وار اتنا ہی کاری ہوتا تھا۔[8]

خنجر[9]

تلوار ہی کی شکل کا مگر تلوار سے چھوٹا ہوتا ہے، اس کی لمبائی عام طور پر ایک یا ڈیڑھ فٹ کی ہوتی ہے تلوار ہی کی طرح اس میں پکڑنے کے لئے دستہ لگا ہوتا ہے، اس کا پھل بھی کچھ خم دار ہوتا ہے، خنجر عموماً ہر وقت ہی ساتھ رکھا جاتا تھا، داستان میں خنجر کا استعمال لڑائی کے وقت عیار زیادہ کرتے تھے خنجر ان کے خاص ہتھیاروں میں شامل ہے:۔

"مہتر سرعت نامدار مع جماعت عیاران خنجر گذار عین وقت کارزار میں پہونچا اور شاہزادہ ابراہیم بن حیدر اور مہتر شباط دیلمی کو مجمع کفار میں گھرا ہوا دیکھ کر نہایت بے قرار ہوا اور خنجر آبدار کمر سے کھینچ کر مجمع کفار پر حملہ آور ہوا --- مہتر سرعت نامدار نے صدہا کفار قتل کیے"[10]

بادشاہ خلعت زرتار کے ساتھ خنجر مرصع کار بھی دیتا تھا۔[11][12]

---

[1] ص۲۲ ج۱، [2] ص۱۲۵ ج۳، [3] ص۱۰۴ ج۶، [4] ص۲۵۷ ج۹، [5] ص۲۳۹ ج۹، [6] ص۲۴ ج۹، [7] ص۱۲۵ ج۳،
[8] ص۲۲۹ ج۹، [9] ہندوستان کے عہد وسطی کا فوجی نظام ص۳۹، [10] ص۴۲ ج۲، [11] ص۴۴۶ ج۹، [12] ص۸۹ ج۶،

نیمچہ[۱]

یہ بھی خنجر اور تلوار سے مشابہ ہوتا ہے، اسے چھوٹی تلوار کہا گیا ہے، برہان قاطع میں اس کی تشریح یہ کی ہے[۱]

"شمشیر و تفنگ کوتاہ را ہم گویند"

اس کا استعمال بھی داستان میں عیاران چابک دست کرتے ہیں:-

"یعقوب حرانی اور نہنگ نے اپنے پشتارے ظریف کو دے دیئے اور آپ نیمچے کھینچکر آگے بڑھے اور کہا تمہارے داماد ہیں یہ کہہ کے مانند برق ان پر جا پڑے ؎

یکے را بگردن یکے را بسر -- یکے را بباز و یکے را بہ بر

طرفۃ العین میں دو سو نفر کو واصل جہنم کر دیا"[۲]

صاحبقران اکبر نے ایک دیو کو نیمچہ سے قتل کیا:-

"صاحبقران اکبر نے بچابک دستی تمام ایک ہی ضرب نیمچۂ خارا شگاف سے اس دیو سیہ فام کا کام تمام کیا وہ دیو مثل پہاڑ زمین پر آرہا"[۳]

تیغہ

یہ ہتھیار بھی تلوار کی ہی ہمشکل ہوتا ہے لیکن تلوار سے چھوٹا، یعنی چھوٹی تلوار- جنگ کے وقت اشبوط ویلمی نے امیر محمد پر اس سے حملہ کیا:-

"اشبوط ویلمی امیر محمد سے جلا ہوا تھا مطلق نہ ڈرا بولا اے محمدی آ تیرے ہی ہاتھ سے دل داغ دار ہے یہ کہہ کے تیغہ مارا، امیر نے رد کیا"[۴]

نیزہ[۵]

جنگوں میں نیزے کا استعمال بھی بہت کیا جاتا تھا، بانس یا لوہے کی چھڑ میں نکیلا اور آبدار پھل لگا کر یہ ہتھیار بنایا جاتا تھا، نیزے کی ہیئت انسانی تاریخ کے ابتدائی دور ہی میں تیار ہو گئی تھی، نکیلے پتھر یا پتلی ہڈیاں لکڑی میں باندھ کر نیزہ بنا لیتے تھے، یوں بھی اگر بھیڑیئے کی پنڈلی نیزے میں لگائی جاتی تو زخم کاری

---

۱ ص ۷۴۲ ج ۲، ۲ ص ۲۷۲ ج ۹، ۳ ص ۵۶ ج ۹، ۴ ص ۳۴۹ ج ۹، ۵ ص ۲۱۶ ج ۲،

آتا تھا، نیزے کا استعمال جنگ کے علاوہ شکار کے موقع پر بھی کیا جاتا تھا کیونکہ اس کو پھینک کر بھی مارا جا سکتا ہے اس میں لگا ہوا بانس بہت ہلکا ہوتا تھا، بعض نیزوں میں نے بھی لگائی جاتی تھی، اس کا پھل فولاد کا نوکدار ہوتا تھا جو جسم کے پار نکل جاتا تھا، نیزے کی بھی کئی قسمیں تھیں جن میں بھالا، برچھا، بلم، سانگ، علم، سینتھی، سیلرہ وغیرہ شامل ھیں۔

میدانِ جنگ میں جب پہلوان جنگ کے لیئے آتا تھا تو سب سے پہلے دونوں پہلوانوں کے درمیان نیزہ بازی ہی شروع ہوتی تھی، نیزہ بازی میں کوئی پہلوان پچاس طعنیں دیتا تھا کوئی بیس ـــ سلطان علی عالم نے جب نیزہ کو پچاس طعنیں دیں تو دیکھنے والوں کی زبان سے بے اختیار واہ نکلی[۱] طعن نیزے کے داؤ کو کہتے ہیں۔ صاحبقران اکبر جب کسی جن یا شیطان کے سینہ پر نیزہ مارتا تھا تو صدہا شرارہائے آتش سنان نیزہ سے نکلتے تھے اور ہر شرارہ ایک دیو مقہور کا جسد ناپاک ہیزم خشک کی طرح جلا دیتا تھا[۲]

کہا جاتا ہے کہ نیزہ بازی کے فن میں اہلِ عرب خاص مہارت رکھتے تھے "بوستان" میں جب کوئی پہلوان نیزہ بازی میں حریف کو مات دیتا ہے تو حریف کہتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے تو عربی النسل ہے، صاحبقران اکبر جب جمشید کے نیزے کو پچاس طعن کے بعد گرا دیتے ہیں تو جمشید کہتا ہے :-

"اے شاہزادے تم واقعی عرب ہو کہ نیزہ بازی اہلِ عرب پر موقوف ہے[۳]"

جب صاحبقران اور جمشید خود پرست میں آخری مقابلہ ہوتا ہے اس وقت بھی سب سے پہلے نیزہ بازی ہی شروع ہوتی ہے :-

"نیزۂ خطی ہاتھ میں لیا اور لڑائی پر آمادہ ہو گیا شہریار فلک وقار بقوت صاحبقرانی قادر اس امر پر تھا کہ اپنے نیزے کو حرکت نہ دے اور نیزہ حریف چھین لیں لیکن فقط اظہار فنون نیزہ بازی کے واسطے نیزہ بازی شروع کی اور نیزوں کی طعنیں چلنے لگیں، نظم

ہر دو در ابروان خم افگندند — نیزہ در نیزہ ہم افگندند
ہر دو را آتش از سنان می جست — ہر چہ آن میکشاد این می است

آخر جب بیس طعنیں رد و بدل ہوئیں صاحبقران نے نیزے پر نیزے کی ڈانڈ اس ہنر سے نکالی کہ مثل تیر شہاب دست جمشید سے ہوائی ہو گیا[۴]"

---

۱ ص ۳۵۷ ج ۱۱، ۲ ص ۵۲۵ ج ۵، ۳ ص ۲۸۹ ج ۹، ۴ ص ۳۴۴ ج ۹،

مذکورہ اقتباس میں نیزہ کے ساتھ خطی کا لفظ بھی شامل ہے نیزہ خطی کے متعلق برہان قاطع میں تحریر ہے :۔

"نوعے از نیزہ باشد و بعضے گویند نیزۂ راست باشد مانند خط مستقیم" [۱]

گرز [۲]

یہ کافی بھاری ہتھیار ہوتا تھا فولادی ڈنڈے کے ایک سرے پر فولاد کا وزنی لٹو لگا ہوتا تھا، بعض گرزوں میں کئی مدور لٹو لگے ہوتے تھے، اس کی لمبائی دو ڈھائی فٹ ہوتی تھی، یہ ہتھیار عموماً پہلوانوں کے پاس ہوتا تھا اس سے حریف کا سر اور شانے توڑنے کا کام لیا جاتا تھا اس کا رواج بھی زمانۂ قدیم سے ہے۔ مہابھارت کے ایک پہلوان بھیم کا وزنی گرز مشہور ہے، "بوستان" میں بھی کہیں گرز گاؤ سر [۳] ہے، کہیں گرز ہشتاد منی [۴] اور کہیں گرز کوہ شکن [۵]۔ گرز کی ضرب اتنی زبردست ہوتی ہے کہ حریف تو کیا اس کا گھوڑا بھی زمین میں دھنس جاتا ہے، گرز بازی کا منظر ملاحظہ ہو:۔

"شاہزادہ نقاب دار صاحبقران ثانی نے بار دگر چرخ کلاں کی صورت عمود کو گردش دی اور ایک نعرۂ اللہ اکبر لگایا بعد ازاں بایں ضرب استوار جادوگر کے سر پر مارا کہ سر پلید اس کا مع گردن صندوق سینہ میں اتر گیا اور مرکب خشتی کے چاروں ہاتھ پاؤں تا السینہ زمین معرکہ میں غرق ہو گئے" [۶]

خود صاحبقران اکبر کا مرکب جمشید کے گرزِ قدرت کی ضرب کی قوت سے زمین میں دھنس جاتا ہے :۔

"القصہ جمشید پلید نے بقوتِ تمام عمود سر صاحبقران اکبر کے فرق مبارک پر مارا ۔۔۔۔۔ صاحبقران نے اسے عمود رستم دستان پر روکا، گرز پر گرز آیا کوہ البرز کوہ بے ستون پر گرا تمام کوہستان و جبل اعلیٰ میں زلزلہ پڑ گیا اگرچہ دست و بازوئے صاحبقران کو کوئی صدمہ نہیں پہونچا مگر مرکب کے چاروں ہاتھ پاؤں زمین میں دھنس گئے" [۷]

گرز کی بھی قسمیں ہوتی ہیں، شش پہلو گرز کو چماق کہتے ہیں [۸]، مذکورہ اقتباس میں اسے عمود کا نام بھی دیا گیا ہے وزنی گرزوں کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر حریف کے مارا جاتا ہے :۔

۱؎ برہان قاطع ص ۷۶۳، ۲؎ ۸۴، ج ۲، ۳؎ ۱۸۱ ج ۲، ۴؎ ۲۳۹ ج ۹، ۵؎ الف، ۶؎ ۱۱۱ ج ۶، ۷؎ ۳۴۴ ج ۹، ۸؎ ۴۵ ج ۲،

"شنقاش پہلوان دلاور نہایت غضبناک ہوا اور ایک گرز گراں سر دونوں ہاتھوں سے
اٹھاکر جمشید کے سر اس زور سے مارا کہ اگر بجائے جمشید اور کوئی ہوتا تو خاک سیاہ
ہو جاتا۔"[1]

ناچخ[2]

اس ہتھیار کو بھی گرز ہی کی ایک قسم کہا گیا ہے جس میں تلوار کی سی دھار بھی ہوتی ہے[3]، جبکہ بعض لغات
میں ناچخ کے معنی چھوٹا نیزہ لکھا ہے[4]، آداب الحرب میں اس کی تشریح یوں کی ہے :-

"سلاح بادشاہاں است کہ ہم دوست را شاید ہم دشمن را، دوست را از مہرہ ناچخ زنند
و بجائے گرز کار کنند و دشمن بر وئے ناچخ زنند، بجائے شمشیر کار کنند۔"[5]

برہان قاطع میں اس کے بارے میں لکھا ہے :-

"تبرزین را گویند، و آں نوعے از تبر است کہ سپاہیان بہ پہلوئے زین اسپ بندند
و بعضے گویند، سنانے است کہ سر آں دو شاخ باشد، و نیزہ کوچک را نیز گویند۔"[6]

تیر[7]

بید یا کلک میں لوہے کا ایک تیز پھل لگا کر تیر بنائے جاتے تھے خدنگ[8] کی لکڑی سے بھی تیر بنتے تھے،
یہ لکڑیاں وزن میں ہلکی ہوتی تھیں، اسی لئے جب تیر پھینکا جاتا تھا تو کافی دور تک پہونچتا تھا، تیر کے پھل کو
پیکان بھی کہتے ہیں[9]، پیکان جانوروں کی ہڈیوں کا بھی بنایا جاتا تھا اسے زہر آلود بھی کرتے تھے، تیر دو پھل کا
بھی ہوتا تھا :-

"صاحبقران اکبر والا شان نے بسرعت تمام تیر دو سر کو چلہ کمان میں رکھ کے اس قدر
اندازی سے رہا کیا کہ بقدرت ایزدی وہ تیر دو سر حسب مراد نشانہ پر پہونچ گیا۔"[10]

ہندی تیر بھی شاخ دار ہوتا تھا جو جسم میں پیوست ہونے کے بعد مشکل سے نکلتا تھا۔

جب میدان جنگ میں تیروں کی بارش ہوتی تھی تو تیروں کا ایک ابر سا چھا جاتا تھا۔ برنیر نے اورنگ زیب

---

[1] ۹ ج ۳۴۹، [2] ۵ ج ۲۷۵، ۲، [3] ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام، ص ۴۳، [4] لغات سعیدی ص ۲۔ بحوالہ
ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام ص ۴۴، [5] برہان قاطع ص ۴۷، [6] ۹ ج ۳۴۹م، [7] ۱۰۰ ج ۲، [8] ۳۲ ج ۲،
[9] ۵۵ ج ۹م،

اور بعدار شکوہ کے مقابلہ کا بیان نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :-

"اس کثرت سے تیر برسے کہ آسمان کا دکھائی دینا دشوار ہو گیا، یہاں تک کہ خود دارا شکوہ نے اپنا ترکش خالی کر ڈالا"[1]

ترکش[2]

تیروں کو رکھنے کے لئے ایک تھیلا ہوتا تھا جو عام طور پر چمڑے کا ہوتا تھا اور اسے ایک ڈوری کے ذریعے کمر پر لٹکایا جاتا تھا۔

کمان[3]

کمان وہ حربہ ہے جس سے تیر کو پھینکا جاتا تھا، یہ بھی مختلف چیزوں کی بنی ہوتی تھی، خم دار اور ملائم لکڑی کی بھی بنائی جاتی تھی، جانوروں کے سینگوں اور لوہے سے بھی بناتے تھے، اس کی لمبائی چار فٹ کے قریب ہوتی تھی، دونوں سروں پر کھینچ کر ڈوری باندھی جاتی تھی جس سے اس میں خم پیدا ہو جاتا تھا، ڈوری کو چلہ کہتے تھے، جنگ میں تیر و کمان کا استعمال قدیم زمانہ سے رائج تھا، "بوستان" کی بھی تقریباً تمام جنگوں میں یہ مستعمل ہیں :-

"جب قریب کفار وہ فوج جرار پہونچی اور بیس ہزار کمانیں کڑکیں، تمام فوج کفار تہ و بالا ہو گئی"[4]

تیر و کمان کا استعمال جنگ مغلوبہ کے وقت ہوتا تھا یا اس وقت یہ حربہ بہت کام آتا تھا جب کوئی بادشاہ قلعہ بند ہو جائے، دشمن قلعہ کے چاروں طرف موجود ہو، ایسی صورت میں قلعہ بند فوج قلعہ کی فصیلوں سے دشمن پر تیروں کی بارش کرتی تھی، جس طرح آج دور کے دشمن کو بندوق کی گولی سے شکار کیا جاسکتا ہے اسی طرح اس زمانہ میں بندوق کی گولی کا کام تیر و کمان کرتے تھے، ضار منکوس کی ایک آنکھ قلعہ بندی کی حالت میں حنیفہ خاتون کے تیر سے ضائع ہوئی[5] بعض تیر انداز تیر اندازی میں اس قدر مہارت رکھتے تھے کہ لوہے کو بھی تیر سے کاٹ دیتے تھے سلطان مہدی اور سلطان علی عالم کے درمیان جو مقابلہ ہوا اس میں میل آہنی کو تیر سے کاٹنا بھی شامل تھا[6]، شاہزادیاں عموماً جنگ اور شکار کے وقت تیر و کمان استعمال کرتی تھیں۔ سواد البصر بھی فن تیر اندازی میں بے پناہ مہارت رکھتی ہے :-

---

[1] شاہ جہاں کے ایام اسیری اور عہد اورنگ زیب، ص ۹۹، (سفر نامہ برنیر) [2] ص ۲۸۸ ج ۲، [3] ص ۳۴۳ ج ۹،
[4] ایضاً، ص ۱۹ ج ۳، [6] ص ۳۴۸ ج ۱،

"سواد البصر نے ۔۔۔۔ ترکش پُر از تیر روبرو رکھ لیا اور کمان ہاتھ میں لیکر آمادہ مقابلہ ہوئی ۔۔۔ آگاہ ہو کہ یہ زن فولاد جگر بیزار از زندگی فن تیر اندازی میں بے مثل معلوم ہوتی ہے ۔۔۔ سواد البصر قادر انداز ایک تیر جانگیر کی ضرب سے دو دو سو سواروں کو ہلاک کرتی ہے"[1]

تبر[2]

تبر کو کلہاڑی کی ایک قسم کہا جا سکتا ہے اس میں بھی دو ڈھائی فٹ لمبی لکڑی میں چوڑا پھل لگا ہوتا ہے کلہاڑی کے پھل کی شکل مستطیل نما ہوتی ہے لیکن تبر کے پھل کی کئی شکلیں ہوتی ہیں، کچھ نصف دائرے کی طرح اور بعض چاند نما ہوتی ہیں جس تبر میں لکڑی کے دونوں جانب پھل لگے ہوتے ہیں اسے زاغنول کہتے ہیں، تبر کو گھوڑے کی زین میں لگایا جاتا تھا،"بوستان" میں مقابلہ کے وقت تبر بھی ساتھ ہوتا ہے :-

"جملہ عیاران لشکر اسلام نے خنجر و تیر و تبر لے کر یکبارگی حملہ کیا"[3]

فلاخن

اسے گوپھن بھی کہتے ہیں، یہ رسّی کا بنا ہوتا ہے، اس رسّی کی لمبائی تقریباً ڈھائی گز ہوتی ہے، رسی کے بالکل بیچ ایک پیالہ سا بنا ہوتا ہے جس میں پتھر رکھتے ہیں، پتھر رکھنے کے بعد دونوں سروں کو پکڑ کر چرخ دیتے ہیں جب ایک سرے کو چھوڑتے ہیں تو پتھر دور کھڑے ہوئے حریف کے لگتا ہے، فلاخن سے کافی دور تک پتھر پھینکا جا سکتا ہے، اس پتھر کے لگنے سے حریف مر بھی سکتا ہے، برہان قاطع میں اس کی تشریح اس طرح کی ہے :-

"آلت سنگ اندازی باشد"

"بوستان" کے میدانِ جنگ میں فلاخن بھی استعمال ہوتی ہے :-

"جوہر نے فلاخن میں پتھر رکھ کے جو مارنا شروع کیا کئی پتھر جمشید پلید کے سرو سینہ نحس پر پڑے اور گھوڑے پر بھی لگے"[4]

جمشید خود پرست تو آدمیوں کی لاشوں کو پھنکوانے کے لئے فلاخن کا استعمال کرتا ہے :-

"بموجب حکم جمشیدی ان لاشوں کو فلاخن میں رکھ کے ایک چرخ دیا اور زور سے

۱ص ۷۸ — ۳۷۷ ج ۲، ۲ص ۳۴۹ ج ۹م، ۳ص ۴۴۴ ج ۹م، ۴ص ۲۸۹ ج ۹،

پھینکا وہ لاشیں اس غار کوہ میں جا کر گریں[۱]"

منجنیق[۲]

فلاخن ہی کی قسم کا ایک حربہ ہوتا ہے اس سے بھی پتھر پھینکنے کا کام لیا جاتا ہے، برہان قاطع کا مؤلف لکھتا ہے:- "آن فلاخن مانند لیست بزرگ کہ بر سر چوبے تعبیر کنند و سنگ و خاک و آتش دراں کردہ بر طرف دشمن اندازند"

جرجی زیدان نے اس کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے:-

"یہ ایک لکڑی کا سیدھا پھرٹ ہوتا ہے جس کے سرے پر گوپھن نما چیز نکلی ہے، اس میں پتھر رکھکر پھرٹ کو پیچھے کی طرف کھینچتے ہیں، پھرٹ کے نیچے ایک مضبوط کمانی لگی ہوتی ہے جس وقت کمانی پوری طرح دب جاتی ہے، یکایک اسے چھوڑ دیتے ہیں اور وہ پھرٹ زور کے ساتھ آگے کو جھکتے ہوئے ایک مسطح تختہ پر جا گرتا ہے اور پتھر نکل کر دور جا پڑتا ہے[۳]"

اس کی کئی قسمیں ہوتی تھیں مثلاً منجنیق عروس، منجنیق غوری داد، منجنیق دیو، منجنیق رواں وغیرہ۔

گوئے آتش

یہ بھی پتھر پھینکنے کا ایک ہتھیار تھا، اس کے متعلق کسی کتاب سے تو کچھ معلوم نہیں ہوتا البتہ "بوستان" ہی میں اس کی تشریح کر دی گئی ہے:-

"گوئے آتش چند پارچہائے سنگ سے مرکب کی جاتی ہے اور گیند کی شکل بنا کر اوپر سے اس قدر گلہائے خوشبودار اور رنگین لگائے جاتے ہیں کہ اصلی جسم اس کا نظر نہیں آتا، بس وقت غضب جس مقہور کے بدن پر وہ حربہ لگاتے ہیں ہر پارۂ سنگ سے شعلہ آتش نکل کر طرفۃ العین میں بدن کو جلا دیتا ہے اور پناہ اس کی کسی طرح نہیں ہو سکتی[۴]"

یہ حربہ عموماً طلسمات کے اندر استعمال کیا گیا ہے۔

---

[۱] ۲۴۵ ج ۲، [۲] ۲۳۱ ج ۲، [۳] تاریخ تمدن اسلام ص ۱۹۳، [۴] ۲۱۰ ج ۲،

قارورۂ آتش[1]

یہ حربہ بھی دور سے پھینکا جاتا تھا، شیشہ کے ایک گولے میں باروت بھر کر بنتا تھا جب اسے دشمن کے لشکر پر پھینکتے تو اس کے پھٹ جانے پر دھواں اٹھتا اور میدان میں ایک دوسرے کو کوئی نظر نہیں آتا تھا، یہ حربہ عام طور پر عیار اس وقت استعمال کرتے تھے جب تنہا کہیں گھر جائیں ایسی حالت میں قارورۂ آتش چھوڑ کر صاف بچ نکلتے تھے، یعقوب حرانی نے جمشید کے لشکر میں اسے پھینکا اس سے دھواں پیدا ہوا اور فضا میں تاریکی چھا گئی جس کی وجہ سے وہ بچ کر نکل گیا[2]

اس کی ترقی یافتہ شکل کو آنسو گیس کا بم کہا جا سکتا ہے۔

آتشیں ہتھیاروں کا ذکر چلا ہے تو یہاں مناسب ہوگا کہ تپنچہ، تفنگ اور توپ کا ذکر بھی کر دیا جائے یوں تو یہ آتشیں ہتھیار اس عہد میں نہیں تھے جس کی داستان قصہ گو نے بیان کی ہے اور خورشید تاج بخش کے عہد میں توپ وغیرہ کا ہونا اور بھی عجیب امر ہے، لیکن داستان گو نے اپنے عہد کے ہتھیاروں کو داستان میں شامل کیا ہے اس لئے یہ بحث ہی غیر ضروری ہوگی کہ معزالدین خلیفہ فاطمی کے زمانہ میں توپ یا بندوق تھی یا نہیں۔ لیکن مغلوں کے دور میں توپ خوب استعمال ہونے لگا تھا، بابر کی فتح ابراہیم لودھی کے مقابلہ میں اس کے توپ خانہ کی وجہ ہی سے ہوئی، مغلوں کے عہد میں آتشیں ہتھیاروں میں یہی تین چیزیں خاص تھیں، تپنچہ، بندوق اور توپ۔

تپنچہ[3]

جس طرح تلوار چھوٹی ہو کر خنجر کی شکل میں سامنے آئی، اسی طرح بندوق کی مختصر شکل نے تپنچہ کا نام لیا۔ تپنچہ کو ہاتھ میں لے کر فائر کیا جاتا ہے۔ "بوستان" کی بعض جنگوں میں اس کا استعمال ہوا ہے،

"ادھر تپنچوں کا چلنا جو وقوع میں آیا دہان نحس کہ مثل نار کوہ کشادہ تھے،

گولیاں حلق میں اتر گئیں"[4]

۱؎ ۸۱ ج ۲، ۲؎ ۵۷۷ ج ۶، ۳؎ ۳۵۰ ج ۲، ۴؎ ۱۹۶ ج ۷،

بندوق[1] یا تفنگ[2]

لکڑی پر لوہے کی نالی لگی ہوتی تھی جس سے باروت کی گولی چلائی جاتی تھی، اسے زمین پر کسی ٹیک یا کندھے کے سہارے چلاتے تھے، مغل بادشاہوں کی فوج میں بندوقچیوں کا ایک الگ دستہ رہتا تھا انگریزوں کے ہندوستان آنے کے بعد بندوق عام ہوگئی، بندوق سے اکبر کی دلچسپی کے متعلق ابوالفضل نے لکھا ہے:۔

"قبلہ عالم کو اس ہتھیار سے بے حد شوق ہے جہاں پناہ بندوق کے تیار کرنے اور اس سے نشانہ لگانے میں یکتائے روزگار ہیں، جہاں پناہ نے ایسی بندوقیں تیار کرائی ہیں جن کو بارود سے لبالب بھر کر بھی چلاتے ہیں تو نہیں پھٹتیں ... جہاں پناہ کی ہنر نوازی سے ایسی بندوقیں بھی تیار کی گئی ہیں جو بغیر فتیلے کے صرف ماشے کو جنبش دینے سے آگ پکڑ لیتی ہیں اور چل جاتی ہیں، بشتر گولیاں ایسی بنائی گئی ہیں جو تلوار کا کام انجام دیتی ہیں[3]"

توپ

آتشیں ہتھیاروں میں یہ زیادہ وزنی اور زیادہ خطرناک حربہ تھا اس کی آواز ہی سے لوگوں کے دل دہل جاتے تھے، اس کی شکل تصویر سے واضح ہوجائے گی۔

توپوں کا استعمال بابر کے آنے سے قبل ہی ہندوستان میں شروع ہوگیا تھا۔ محمد شاہ کے عہد تک پہونچتے پہونچتے بڑی بڑی توپیں بننے لگی تھیں۔ محمد شاہ کی فوج جنگ کے لئے گئی تو اس کے ساتھ اتنی وزنی توپیں بھی تھیں جن کو ایک ایک ہزار بیل کھینچتے تھے[4] ابوالفضل نے اکبری عہد کی توپوں کے متعلق لکھا ہے:۔

"یہ دیو پیکر آلہ حرب جہانبانی کے قصر کا حیرت انگیز قفل اور کشورکشائی کے دروازے کی دلکشا کنجی ہے فرمانروائی کا یہ فتح انگیز ہتھیار جس قدر کثرت سے عہد معدلت میں پایا جاتا ہے شاید ملک روم میں بھی دستیاب نہ ہوسکے بعض توپیں اتنی بڑی ہیں کہ ہر توپ بارہ من کا گولا سر کر سکتی ہے جس کو کئی

---

[1] ۶۰۷، ج ۴، [2] ۲۶۶ ج ۱، [3] آئین اکبری جلد اول ص ۲۰۶، [4] معارف۔ دسمبر ۱۹۴۸ء۔

عہدِ اکبری کی توپیں اور بندوقیں
توپ ہفدہ نال
توپ فیل
توپ بہل
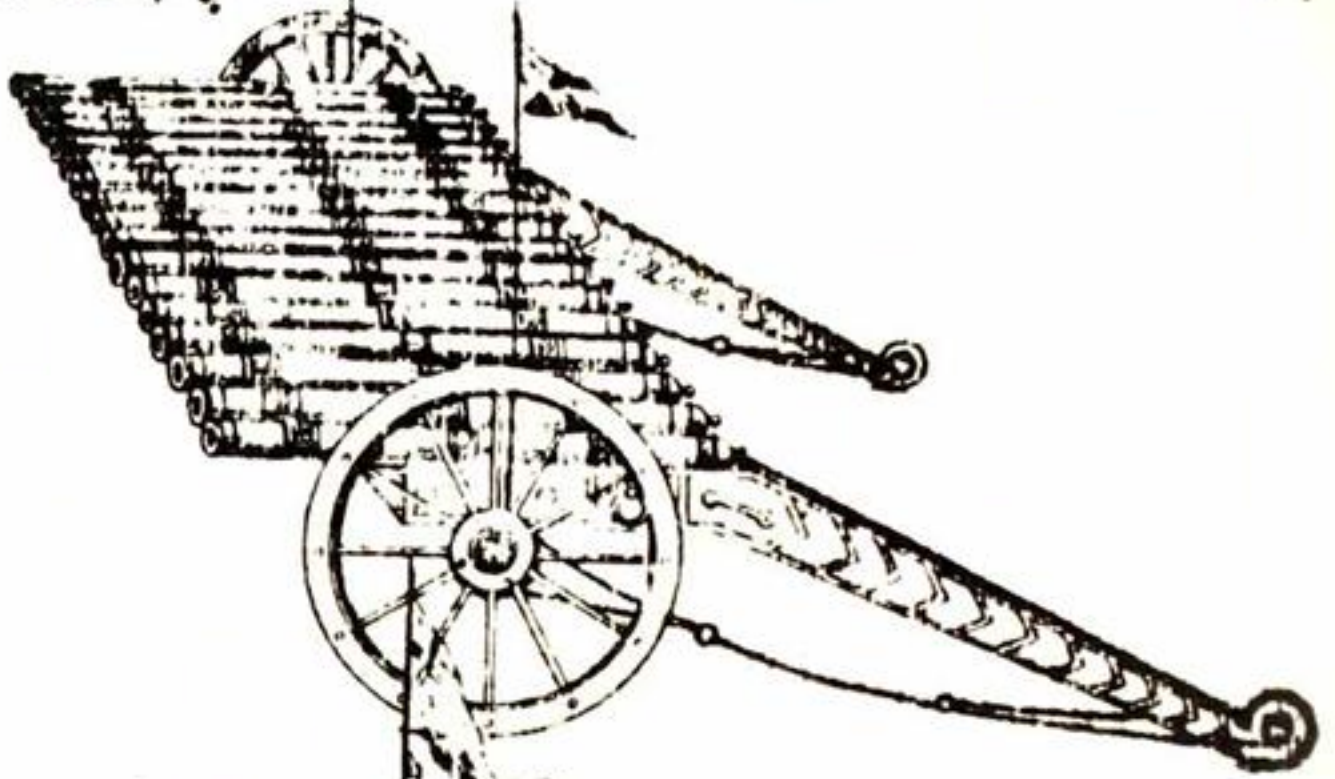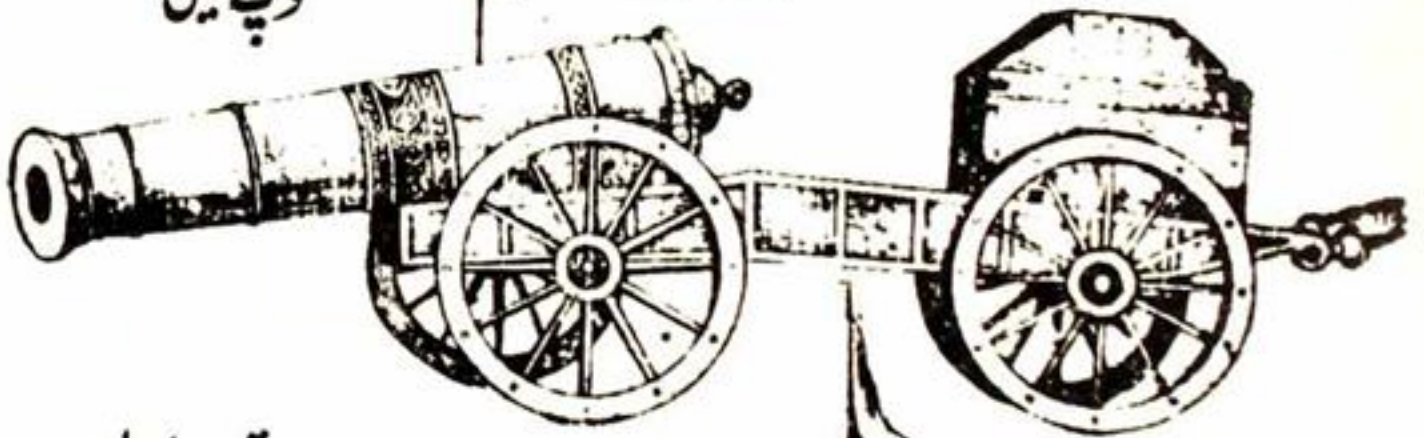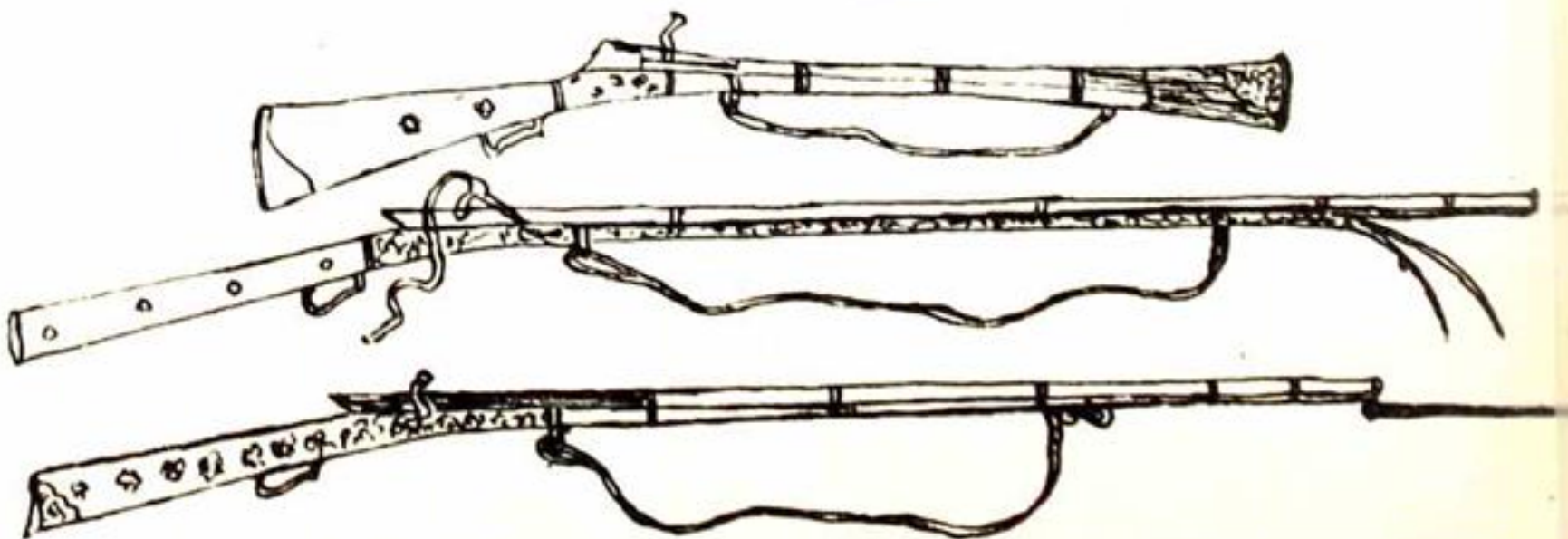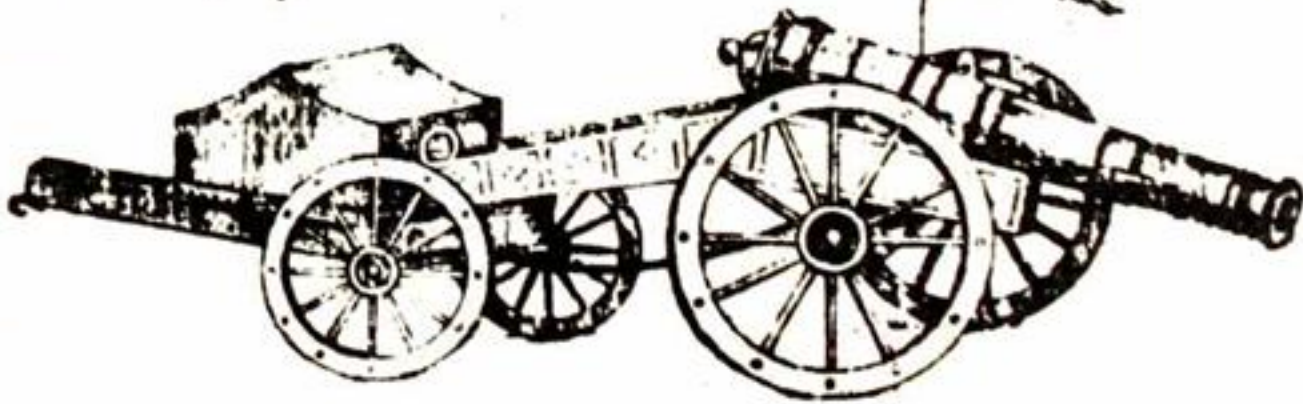
ہاتھی اور ہزاروں گائے بیل کھینچتے ہیں[۱]"

اسی عہد میں ایسی توپیں بھی بن گئی تھیں جن کو ایک ہاتھی یا ایک آدمی آسانی سے لے جا سکے۔ "بوستان" میں ایسے جزیرے بھی ہیں جہاں توپیں ساخت کی جاتی ھیں :-

"شہزادے نے فرمایا یہ ملاعین اس قدر توپ خانہ کہاں سے لائے کہ چھ فرسخ تک تین درجے قرار دیئے ہیں اور قال نے عرض کی کہ توپ خانہ وخزانہ اسی جزیرے کی متاع ہے کہ سالہا سال سے جمع ہوا ہے اور توپ بھی اسی جزیرے میں بنتی ہے[۲]"

"بوستان" کے میدان جنگ میں توپوں کا استعمال کم ہی ہوا ہے البتہ جب بادشاہ حصاری ہوتا ہے تو قلعہ کی فصیلوں پر توپیں آراستہ کر دی جاتی ہیں :-

"دروازہ شہر پناہ کا بند ہے اور قلعہ توپ و بندوق وغیرہ سے آراستہ ہے[۳]۔"

کہیں کہیں میدانِ جنگ میں بھی موجود ہیں :-

"کنعاس لعین نے گولہ اندازوں اتواپ جنگی شلک کا حکم دیا۔ جس قدر سواروں کی اجل گلہ ہائے اتواپ سے مقدر تھی معرض ہلاکت میں آئے[۴]۔"

غرضکہ توپوں کا استعمال "بوستان" میں جگہ جگہ نظر آتا ہے باقاعدہ توپ خانہ بھی موجود ہے[۵]۔

کارد[۶]

تقریباً ڈھائی فٹ لمبی چھری جس کا پھل قریب چار پانچ انچ چوڑا ہو کارد کہتے ہیں۔

چاقو[۷]

اس کا پھل ایک لکڑی کے دستہ میں لگا ہوتا ہے جس کی دھار کو دستہ کی طرف موڑ کر محفوظ کر دیتے ھیں۔

ساطور[۸]

بڑے چھرے کو ساطور کہا جاتا ہے اس کی شکل خنجر یا قصاب کے بغدہ کی سی ہوتی ہے۔

خنجر ہی کی قسم کے کچھ اور بھی حربے تھے، جمدھر اس کا پھل سیدھا ہوتا تھا، کٹارہ اس کا

---

[۱] آئین اکبری جلد اول ص ۳۷، [۲] ۲۲۲ ج ۱، [۳] ۳۳ ج ۹، [۴] ۵۷۱ ج ۶، [۵] ۲۲۳ ج ۱، [۶] ۲۱۱ ج ۲، [۷] ۴۸۴ ج ۹، [۸] ۳۴۴ ج ۹،

پھل خم دار ہوتا تھا، دشنہ یہ بھی خنجر سے مشابہ تھا۔

ان ہتھیاروں کے علاوہ اور بھی ہتھیار جنگوں میں مستعمل تھے لیکن "بوستان" میں راقم کی نظر سے نہیں گذرے مثلاً چکر جو ایک گول چھوٹا پہیہ سا ہوتا ہے اونچائی سے یہ اگر دشمن پر پھینکا جاتا تو گردن بھی کاٹ سکتا تھا، پشت خار یہ آہنی ہتھیار ہاتھ اور بازو سے مشابہ ہوتا تھا، خارماہی اس کے دونوں جانب لوہے کی مچھلی کے کانٹے جیسی کیلیں لگی ہوتی تھیں۔ گرہ کشا نیزے کی طرح ہوتا تھا۔

سپر[1]

سپر، کمند اور روغن نفط بھی جنگی سامان میں شامل ھیں۔

ہر سپاہی کے پاس سپر کا ہونا لازمی تھا، اس پر تلوار، نیزہ، تیر وغیرہ کا وار روکا جاتا تھا، یہ مختلف جانوروں کے چمڑے سے بنتی تھی[2] گینڈے کے چمڑے کی سپر بہت اچھی سمجھی جاتی تھی، آہنی سپر[3] بھی استعمال ہوتی تھی جس پر نقش و نگار بنے ہوتے، سپر کی شکل گول توے کی طرح ہوتی تھی، اس کا قطر ۱۷ سے ۲۴ انچ تک ہوتا تھا، بعض سپریں مستطیل نما بنائی جاتی تھیں جو بیٹھنے کے بعد پورے جسم کو ڈھانپ لیتیں۔

کمند[4]

یہ ایک رسی ہوتی تھی جس میں پھندہ لگا ہوتا تھا دشمن کو گرفتار کر کے دست و پا اس سے باندھ دیتے تھے، بھاگتے ہوئے دشمن کے اوپر کمند پھینک کر اسے گرفتار کر لیتے تھے، قلعہ کی فصیل پر چڑھنے میں بھی یہ مدد دیتی تھی۔ "بوستان" کے تمام عیار اپنے پاس کمند رکھتے ہیں۔ جوہر نے خناز جادو کے شاگردوں کو کمند عیاری میں باندھا ہے

چہارم شلانہ کمند اسیر زبان ساحت جاری بشکر قدیر[5]

روغن نفط[6]

یہ روغن گرم کر کے دشمن کے اوپر پھینکا جاتا تھا اس روغن کے اجزا نفط فارسی، سندروس، طلق مکلس ہوتے تھے جن کو روغن میں ملا کر پکایا جاتا تھا، کہا جاتا ہے کہ دشمن کے شہر کو جلانے کیلئے

---

۱ ج ۳ ص ۸، ۲ ج ۲ ص ۲۴، ۳ ایضاً ص ۷۰، ۴ ج ۱ ص ۴۴، ۵ ج ۲ ص ۲۳۳، ۶ ج ۳ ص ۳۰، ۷ ج ۹ ص ۲، ۸ ج ۲

اس کے دو درم کافی ہیں [۱]

"بوستان" میں دو ایسے ہتھیاروں کا بھی ذکر ہے جو شاید صرف داستانوں میں ہی استعمال ہوتے ہیں ایک "دار شمشاد" اور دوسرا "ارّہ پشت نہنگ" ۔ یہ ہتھیار عموماً دیو یا جن استعمال کرتے ہیں۔ دار شمشاد گرز کی طرح کوئی وزنی حربہ ہوتا تھا۔

"سہلاج حرام زادے نے ایک وار دار شمشاد کا نہایت زور سے نصیرون دلاور کے شانے پر لگایا، نصیرون اس ضرب کے صدمۂ سخت سے بے ہوش ہو گیا [۲]"۔

"سودال نے دست چپ سے بقوت تمام دار شمشاد سر پر شاہزادے کے لگائی، شاہزادے نے بعد رد حملہ کے ایک ہی ضرب شمشیر میں بخط مستقیم جہنم واصل کر دیا [۳]"۔

ارّہ پشت نہنگ کا وار بھی بہت زبردست ہوتا تھا۔

"دیو سیاہ نے جو کلام شاہزادہ کی زبان فیض ترجمان سے سنا، غیظ و غضب میں آ کے ارّہ پشت نہنگ اس زور و قوت سے صاحقران اکبر کے فرق مبارک پر لگایا کہ اگر صاحبقران اکبر رستم زماں خالی نہ دیں تو یقین تھا کہ اس ضرب سخت و بے پناہ سے محفوظ رہنا محال تھا ۔۔۔ وہ ارّہ پشت نہنگ اس زور سے زمین پر گرا کہ قریب تیس گز کے زمین میں در آیا اور اس قدر گرد اڑی کہ از زمین تا چرخ بریں تیرہ و تار ہو گیا [۴]"۔

ان کے علاوہ ایک جگہ کنٹھی نام کے ایک حربہ کو بھی استعمال کیا گیا ہے۔

"تیسرے کو کنٹھی ماری، اجل کا تمانچہ پڑا [۵]"

یہ تھے وہ ہتھیار جن کا استعمال "بوستان خیال" کی جنگوں میں کیا گیا ہے اور جو اُس وقت موجود تھے جب یہ داستان قلمبند کی گئی۔

جنگی لباس

میدانِ جنگ میں جانے سے قبل مخصوص جنگی لباس پہنا جاتا تھا اس کے پہننے کا مقصد جسم کی حفاظت ہوتا تھا اس لباس کی تمام چیزیں آہنی ہوتی تھیں تاکہ کوئی بھی حربہ بآسانی کارگر نہ ہو سکے۔

---

[۱] اورینٹل میگزین، اگست ۱۹۳۸ء، [۲] ص ۴ ج ۹، [۳] ص ۲۱۲ ج ۲، [۴] ص ۵۰۶ ج ۵، [۵] ص ۲۷۹ ج ۷،

دَبلغہ

سپر

شصت آویز

ڈہال

پہری

گورکہی

پیکان کش

تیر پردار

ذرّہ کلاہ

کہوکہوہ

زرہ

جنبیہ

بکتر

جوشن

چہار آئینہ
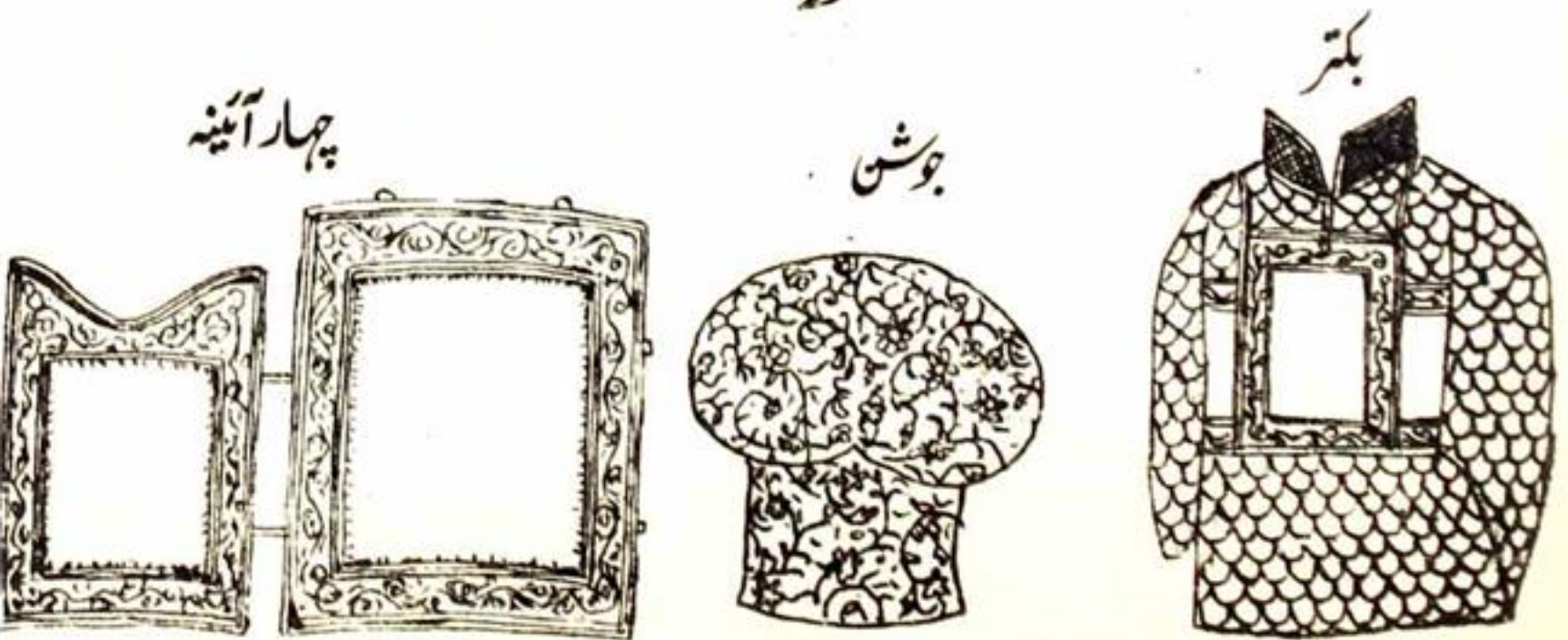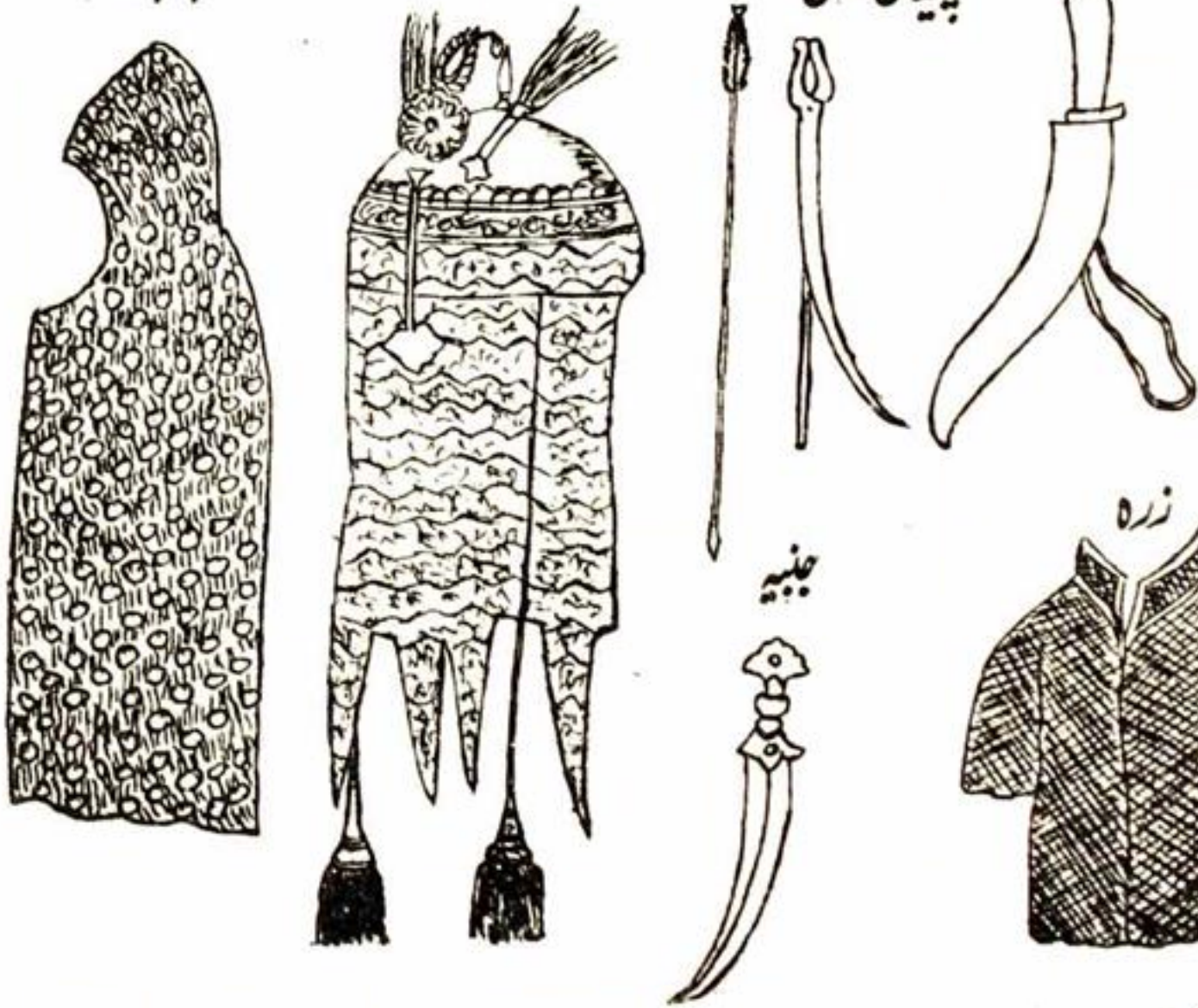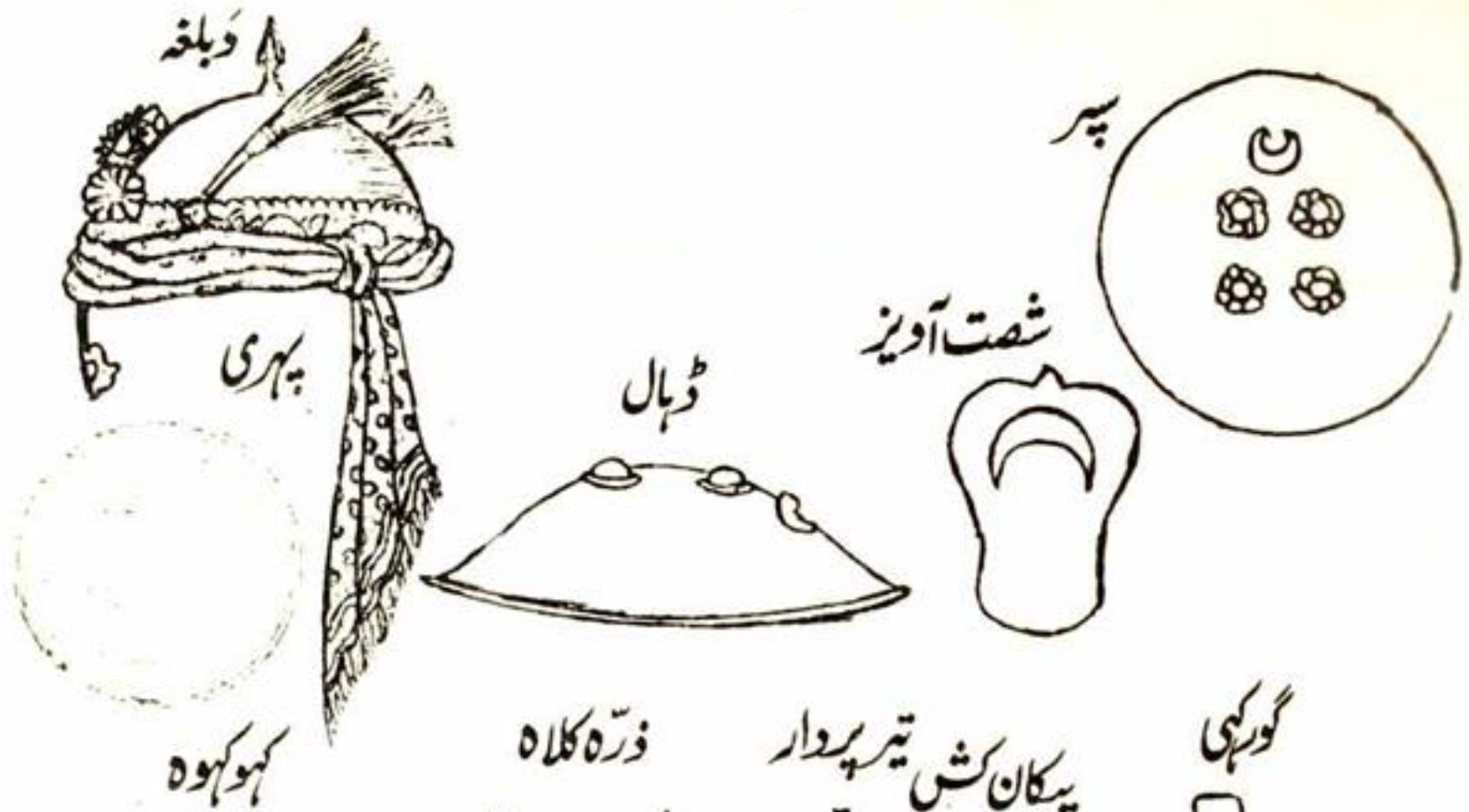
بوستان میں داستان نگار تمام چیزوں کے نام نہیں لیتا بلکہ اتنا کہہ دیتا ہے کہ فلاں پہلوان غرق آہن تھا[۱] یعنی سر سے پا تک آہنی لباس زیب جسم کئے ہوئے تھا۔ یہاں ان تمام چیزوں کا ذکر کر دینا غیر ضروری نہ ہوگا جو میدانِ جنگ میں جانے سے پہلے بغرض حفاظت پہنی جاتی تھیں اور ان کا ایک مقصد جنگ کے لئے ذہنی ماحول پیدا کرنا بھی ہوتا تھا۔

خود[۲]

یہ ایک طرح کا لوہے کا ٹوپ ہوتا تھا جس لوہے کی چادر سے یہ بنایا جاتا وہ کافی موٹی ہوتی تھی تاکہ تلوار آسانی سے نہ کاٹ سکے۔ یہ ٹوپ تقریباً سبھی لشکریوں کے سر پر ہوتا تھا، اس کے قدیم نمونے مختلف قوموں کے عسکری لباس میں مل جاتے ہیں، رومت الکبریٰ اور یونان میں جس طرح کے خود ملتے تھے اسے ہم سکندر اور دوسرے فاتحین کی تصاویر میں دیکھ سکتے ہیں، ایران قدیم کے عسکری خود استخر اور نقش رستم وغیرہ مقامات پر جو تصاویر کندہ ہیں ان سے معلوم کیا جا سکتا ہے، ہندوستان میں بھی اس کا رواج رہا ہے اور قدیم راجپوتوں کے جنگی ہتھیاروں اور ملبوسات کے سلسلے میں جو تصاویر ملتی ہیں ان سے ان کی شکل کا پتہ چلایا جا سکتا ہے، مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ذرہ بکتر کی طرح جنگی ملبوسات کا ایک لازمی حصہ خود تھا۔

اس میں امتیاز کے لئے پرندوں کے خوبصورت پَر لگائے جاتے تھے، ایرانی اور مغل بادشاہوں کے خود میں اس کو دیکھا جا سکتا ہے، داستان میں بھی ہمیں متعدد مقامات پر اس طرح کے اذکار ملتے ہیں، جن میں خود یا خود نما تاج سر پر سجانے اور اس میں جانوروں کے پر لگے ہونے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے یہ پر کسی ایسے جانور کے ہوتے تھے جو مبارک خیال کیا جاتا ہے۔

"ملک رستم نے ایک کلغی پر ہما کی کہ علامتِ شاہی ہے اپنی خود پر لگائی"[۳]

باوجود لوہے کی مضبوطی کے تلوار کی دھار خود فولادی کو کاٹتی ہوئی جسم میں اتر جاتی تھی۔

"شیشان نے ایک ضرب قضا نظیر اس قوت سے برجاس کے سر پر لگائی کہ خود آہنی کو کاٹتی ہوئی کاسۂ سر میں درآئی"[۴]

"فوراً تلوار میان سے نکالی اور ایسی ایک ضرب اس کے سر نجس پر لگائی کہ سر و خود و مغفر کو کاٹ کر سینۂ کافر میں درآئی"[۵]

---

۱ ص ۱۶۴ ج ۹، ۲ ص ۳۸ ج ۱۲، ۳ ص ۱۸۲ ج ۱۲، ۴ ص ۲۳۶ ج ۹، ۵ ص ۲۳۸ ج ۹۔

یہ واقعہ ہے کہ تلواروں کی کاٹ کا ذکر قصائد اور مدحیہ تحریروں میں اسی انداز سے کیا گیا ہے اور ایسی تلواروں کا ذکر آج بھی روایتی انداز سے سامنے آتا ہے جو خود و مغفر کو کاٹتی ہوئی سینۂ دشمن میں در آئیں ۔

مغفر[1]

یہ لوہے کی جالی ہوتی تھی جو کلاہ کے نیچے اور خود کے اوپر سے گردن اور کمر پر پھیلی ہوتی ۔ فرہنگ نفیسی میں لکھا ہے :۔

"زرہ خود کہ زیر کلاہ پوشند و زرہ پائی کہ مرد باسلاح در جنگ بر روئے افگند"[2]

اس کو زرۂ کلاہ بھی کہتے تھے ۔

دبلغہ[3]

اس سے سر، چہرہ اور ناک کی حفاظت کی جاتی تھی ، یہ بھی لوہے کا ہی ہوتا تھا ۔

جوشن[4]

اس سے سینہ اور پیٹ کو ڈھانپا جاتا تھا ، فرہنگ نفیسی میں تحریر ہے :۔

"سلاحی جبہ مانند کہ از تنکہ و حلقہ آہن سازند و شبیہہ بزرہ باشد"[5]

زرہ[6]

یہ ایک آہنی کوٹ ہوتا تھا جس کی لمبائی گھٹنوں تک پہونچتی ، اس کی آستینیں فولادی ہوتی تھیں "بوستان" میں زرہ یاقوتی بھی پہنی گئی ہے :۔

"صاحبقران اصغر کی نظر نقاب دار کی زرہ پر گئی اس صورت کی زرہ تحفہ عالم نادرہ روزگار دیکھی کہ جس کے تمام زنجیر و حلقے یاقوت احمر کے تھے"[7]

صاحبقران اکبر کے پاس زرہ صد مثقال تھی[8] جس پر کوئی حربہ اثر نہیں کرتا، یہ تصور بھی اہل عساکر میں رہتا تھا کہ جہاں ڈھالیں یا زرہیں اس طرح کی مضبوط ہوتی تھیں کہ انھیں کوئی نیزہ یا تلوار نہیں کاٹ سکتی تھی وہاں جامۂ قرآنی اور ایسی ہی بعض چیزیں زیب تن کرنے کا رواج تھا جن کی برکت سے دشمن کا وار ناکام ہو جائے اور وہ زرہ یا وہ خود و مغفر ناقابلِ تسخیر ثابت ہو ۔

۱؎ ۶۲، ج۱، ۲؎ فرہنگ نفیسی جلد ۵، ۳؎ آئین اکبری، ۴؎ ۵۷، ج۱، ۵؎ فرہنگ نفیسی جلد ۲، ۶؎ ۹۷۲، ج۲، ۷؎ ۲۰۷، ج۶، ۸؎ ۹۵، ج۹،

جنگی لباس

صادقی
انگرکھہ
کوٹھی
چہرہ زرہ آہنی
دستانہ
گجم
چہل قد
اربک گجم
راک
موزہ آہنی
قشقہ
اربک

بکتر [1]

یہ بھی ایک قسم کا آہنی کرتا ہوتا تھا یہ لوہے کی کڑیوں کو جوڑ کر بنایا جاتا تھا۔

چار آئینہ

چمڑے یا مخمل لگے ہوئے یہ چار آہنی ٹکڑے ہوتے تھے جو سینہ اور کمر کی حفاظت کرتے تھے، فرہنگ نفیسی میں اس کی تشریح ان الفاظ میں کی گئی ہے :۔

"نوعی از لباس جنگ کہ چہار تختہ از آہن ساختہ و در مخمل گرفتہ گرد لشپت و سینہ کشند" [2]

خفتان [3]

یہ بھی آہنی کرتے کی ایک قسم ہے۔

کمر بند [4]

پٹکا یا پٹی کو کمر بند کہا جاتا تھا یہ کافی چوڑی پٹی ہوتی تھی، لباس کے اوپر کمر پر باندھی جاتی تھی، خنجر اور تلوار وغیرہ اسی میں لٹکائے جاتے تھے گاؤ زوری یا کشتی کے وقت مقابل کمر بند ہی کو پکڑ کر ہاتھوں پر علم کرتا تھا :۔

"انجد نہایت خفیف ہوا اور خجلت زدہ ہاتھ کے کمر بند میں عصفور دلاور کے ہاتھ ڈال کے اٹھا لیا اور گردِ سر چرخ دے کے زمین پر مارا" [5]

دستانۂ آہنی [6]

ہاتھ کی حفاظت کے لئے لوہے کا دستانہ پہنا جاتا تھا اس پر شمشیر کی ضرب بھی رد کی جاسکتی تھی :۔

"جمشید نے بعد رد حملات وہی شمشیر قدرت غلاف سے نکال کر شیشان کے سر پر ماری، شیشان نے لغن سپہ گری اس ضرب کو دستۂ فولادی سے رد کیا" [7]

مذکورہ بیان میں ایک پہلو ایسا ہے جو تلوار کو قضا و قدر کا درجہ دے رہا ہے، یہ تصور قدیم قوموں میں

۱؎ ۳۳۸ ج ۹، ۲؎ فرہنگ نفیسی جلد دوم ۳؎ ۳۵۰، ج ۱ ۴؎ ۳۹ ج ۲، ۵؎ ۲۸۵ ج ۹ ۶؎ ۲۲۰ ج ۲، ۷؎ ۲۳۶ ج ۲

عام تھا کہ بعض تلواریں بزرگان دین کی خاص طور پر بخشش ہوتی تھیں اور جب کبھی انھیں جنگ میں استعمال کیا جاتا تھا تو شکست نہیں ہوتی۔ شیواجی کی تلوار کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ بھوانی نے اسے دی تھی۔

موزہ آہنی[1]

یہ لوہے کے موزے ہوتے تھے جن سے پیروں کی حفاظت ہوتی تھی۔

ان کے علاوہ آئین اکبری میں اور کچھ جنگی کرتوں کا ذکر کیا گیا ہے مثلاً کوٹھی، صادقی، انگرکھ، بھنجو سلح قبائی، کھوگرہ، چہل قد وغیرہ۔ ان میں سے بعض نام واضح طور پر ہندوی ہیں اور راجپوتوں سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں۔

مسلمان سلاطین کے عہد میں فوج کی کوئی خاص وردی نہیں ہوتی تھی بلکہ سب اپنے لباس میں ہوتے تھے، کوئی وردی نہ ہونے کی وجہ یہ بھی ہے کہ وہ سر سے پا تک آہن پوش ہوتے تھے ایسی صورت میں کسی وردی کی ضرورت نہیں رہتی، انگریزوں کی فوج میں ایک خاص وردی پہننے کا رواج تھا، ان کی فوج لال رنگ کی وردی پہنا کرتی تھی۔ اسی کے اثر سے "بوستان" میں بھی کہیں سبز پوش نقاب دار کے ساتھ سبز پوش فوج نظر آتی ہے اور کہیں سرخ پوش۔ صاحبقران اکبر کی فوج بھی باوردی دکھائی دیتی ہے۔

"مردم لشکری جو پیادہ ہیں وہ تو مثل مور و ملخ کے ہیں وردیاں نئی زیب تن کئے ہیں، آلاتِ حرب وضرب تن پر آراستہ ہیں، دریائے آہن میں غرق ہیں"[2]

---

[1] ج ۹ م، ۱۴۸ ص ۲، ج ۲، ۲۳۶

جنگ میں مستعمل سواریاں

آج کی فوج میں ڈیزل اور پیٹرول سے چلنے والی مختلف الاقسام گاڑیاں ہوتی ہیں لیکن اب سے سو ڈیڑھ سو
رس پہلے تک جنگ میں جانور استعمال کئے جاتے تھے، یہ جانور سواری کے علاوہ جنگی سامان کو ایک جگہ سے
دسری جگہ لے جانے کے کام بھی آتے تھے - عہد وسطیٰ میں جانوروں میں سب سے بہتر گھوڑا سمجھا
جاتا تھا اس کا سبب یہ تھا کہ گھوڑا تیز رو ی اور ایک وسیلۂ حرب کی حیثیت سے ایک ہلکا پھلکا جسم بھی
ہے جو ہاتھی کو بہر حال میسر نہ تھا- دنیا کے بیشتر علاقوں میں سفر کے لئے گھوڑا استعمال کیا جاتا تھا، کئی
اریخی جنگیں اس کا ثبوت فراہم کرتی ہیں جہاں ہاتھی کے مقابلہ میں گھوڑے نے زیادہ فیصلہ کن کردار ادا
لیا ہے ان میں سے ایک بہت نمایاں مثال سکندر اور ہندوستان کے معروف راجہ پورس کی جنگ کے
ریخی واقعہ سے بھی دی جاسکتی ہے، جنوبی ہند کے راجاؤں نے رفتہ رفتہ ہاتھی کے مقابلے میں گھوڑے کو
پنے عسکری نظام میں بنیادی اہمیت دی اس کا اندازہ جنوبی ہندوستان کے بعض مندروں میں گھوڑوں
مورتوں کی کثرت اور گھوڑ سوار فوج کے نمونوں سے بھی ہوتا ہے، اب سے کچھ پہلے تک گھوڑے کی سے
واری کو عزت و وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

پوری فوج دو حصوں میں منقسم ہوتی تھی ایک سوار اور دوسری پیدل، فوج کی زور و قوت کا اندازہ سواروں
تعداد سے کیا جاتا، جس بادشاہ کی فوج میں زیادہ سوار ہوتے، اسے اتنا ہی زیادہ طاقتور بادشاہ سمجھا جاتا
واروں میں سب سے زیادہ تعداد گھوڑ سواروں کی ہوتی ان سے کم تعداد میں ہاتھی اور اونٹ ہوتے۔

آیئن اکبری میں گھوڑے کی سات قسمیں لکھی ہیں[1]

عربی (۲) عراقی (۳) مجنس (۴) ترکی (۵) یابو (۶) تازی (۷) جنگلہ، گھوڑوں میں سب سے اول درجہ
ربی گھوڑوں کو حاصل تھا یہ تیز رفتار اور چست ہوتے تھے، عراقی گھوڑے عراق سے منگائے جاتے
تھے، مجنس عراقی اور ترکی نسل کے گھوڑوں کے میل سے تیار کئے جاتے تھے، ترکی گھوڑے توران
ے آتے تھے یہ گھوڑے بلند قامت ہوتے مجنس گھوڑے سے کم درجہ کا گھوڑا یابو کہلاتا تھا اس کا قد کم
وتا تھا تازی اور جنگلہ ہندوستانی نسل کے ہیں لیکن یہ مذکورہ بالا کے مقابلہ میں کم مرتبہ رکھتے ہیں۔
"بوستان" کی جنگوں میں بھی گھوڑوں ہی کی تعداد زیادہ ہے کہیں اسپ بوز رنگ ہیں، کہیں

---

[1] آیئن اکبری جلد اول، آیئن (۲)

اسپ تازاں اور اسپِ مشکی، کسی کے پاس اسپ نقرہ رنگ ہے تو کوئی خنگِ جہاں سیر اور جنگِ جہاں پیما پر سوار ہے، کوئی مرکب گلدار پر دوڑتا ہوا نظر آتا ہے، عربی، عراقی اور ترکی گھوڑے بھی موجود ہیں[۱] تازی[۲] اور یابو[۳] بھی میدان جنگ میں دکھائی دیتے ہیں۔ داستان میں گھوڑوں کو نسل کے اعتبار سے کم پکارا گیا ہے بلکہ ان کی صفات کو مدِ نظر رکھا ہے اسی لئے داستان نگار کسی کو اسپ برق خرام کا نام دیتا ہے اور کہیں ابلق تیز گام کہتا ہے[۴]۔

ایران اور ہندوستان میں ہاتھی کو بھی بڑی اہمیت حاصل تھی ہندوستانی راجاؤں کے یہاں بڑی تعداد میں ہاتھی موجود رہتے تھے ابتدائی زمانے میں جب مسلمان ایران پر حملہ آور ہوئے تو ان کی فوجوں کے گھوڑے پہاڑ جیسے ہاتھیوں کو دیکھ کر بھاگنے لگے جس کے نتیجہ میں مسلمانوں کو کافی نقصان اٹھانا پڑا، ہاتھیوں سے بچنے کے لئے مسلمانوں نے ایک عجیب طریقہ اختیار کیا جنگ قادسیہ کے بیان میں لکھا ہے :۔

"آج بھی ہاتھیوں کا فتنہ لشکر اسلام کے لئے بہت سخت تھا لیکن مسلمانوں نے ایک نئی تدبیر کی کہ اونٹوں پر بڑی بڑی جھولیں ڈالیں، وہ بھی ہاتھیوں کی طرح مہیب نظر آتے اور ایرانیوں کے گھوڑے ان کو دیکھ دیکھ کر بدکنے لگے جس قدر ہاتھیوں سے اسلامی لشکر کو نقصان پہونچتا تھا اسی قدر ایرانی لشکر کو ان مصنوعی ہاتھیوں سے نقصان پہونچنے لگا[۵]"

ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کی فوجوں میں ہاتھی ہزاروں کی تعداد میں شامل ہوتے تھے، محمد بن تغلق کے لشکر میں تین ہزار ہاتھی تھے، شیر شاہ سوری کے پاس پانچ ہزار ہاتھی موجود تھے۔

ہاتھی پر بیٹھ کر تیر و کمان سے جنگ کی جاتی تھی اس کا ہودج چاروں طرف سے اپنے سوار کو محفوظ رکھتا تھا، ہودج کے سوراخوں میں سے دیکھ دیکھ کر تیر پھینکے جاتے تھے جب بندوق ایجاد ہوگئی، تو بندوقچی بھی ہاتھی پر بیٹھنے لگے، ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ ایک ہودج پر بیک وقت بیس فوجی سوار ہو سکتے تھے[۶] ہاتھی کی پشت پر چھوٹی توپیں بھی رکھی جاتی تھیں اور وہیں سے انھیں داغا جاتا تھا۔

میدانِ جنگ میں ہاتھی صرف سواری کے لئے ہی استعمال نہیں ہوتے بلکہ یہ خود جنگ میں حصہ لیتے تھے جنگی ہاتھیوں کی باقاعدہ تربیت ہوتی تھی دشمن کو یہ اپنی سونڈ میں لپیٹ کر زمین پر

۱ے ۱۴۱ سمر ج ۹، ۲ے ۱۱۶ ج ۶، ۳ے ۳۰۵ ج ۳، ۵۰۸ ج ۱، ۴ے ۸۹ سمر ۵ ج ۷، ۵ے تاریخ اسلام جلد اول ص ۳۴۶-۳۴۷، ۶ے سفرنامہ ابن بطوطہ ص ۱۰۲

ے مارتے تھے، پیروں سے کچلتے تھے، پیر سے آدمی کا پیر دبا کر اسے چیر ڈالتے تھے، اس کے دانتوں میں
لمبے ہتھیار لگا دیئے جاتے تھے جن سے یہ حملہ کرتا تھا۔

"بوستان" میں بھی ہزاروں کی تعداد میں جنگ کے وقت ہاتھی نظر آتے ہیں۔ صاحبقران اکبر اور جمشید
کے درمیان جب آخری جنگ ختم ہوئی تب مقتولین کا اندازہ لگایا گیا ؛۔

"دس لاکھ فیلانِ جنگی افتادہ و بے جان تھے"[۱]

آئین اکبری میں ہاتھیوں کی بھی سات قسمیں لکھی ہیں، فیلِ مست، شیر گیر، سادہ، منجھولہ، کرہہ، پھنڈرکیہ،
موکل، "بوستان" میں فیل کے ساتھ لفظ "مست" تو اکثر داستان نگار نے لگایا ہے[۲]، بقیہ قسموں کا
ذکر نہیں کیا گیا بلکہ مست بھی باعتبار قسم نہیں لکھا گیا بلکہ ہاتھی کی مستی اور حبشی ظاہر کرنے کے لئے شامل
کیا ہے، یہاں بھی گھوڑے کی طرح ہاتھی کے ساتھ فیل کوہ پیکر، فیل کوہ شکن وغیرہ صفات لگائی گئی ہیں:

"بوستان" کی جنگوں میں بعض پہلوان کرگدن[۳] پر بھی سوار نظر آتے ہیں ؛۔

"گبر وج نامعقول اس شان و ترکیب سے میدان میں آیا کہ ایک کرگدن
دراز قد پر سوار تھا"[۴]

یہ داستان گو کا تخیل ہے کسی بادشاہ کی فوج میں کرگدن بحیثیت سواری شامل ہے اس کا کوئی ثبوت
فراہم نہیں کیا جا سکتا، البتہ گینڈے کی کھال سے ڈھالیں بنائی جاتی تھیں اس لئے کہ وہ بہت سخت
ہوتی ہے، یہاں سواری کے لئے استعمال کر کے محض پہلوان کی قوت کو ظاہر کیا گیا ہے۔

جنگوں میں اونٹ بھی استعمال کئے جاتے تھے لیکن ہندوستان میں اونٹوں سے عموماً جنگی سامان
لادنے کا کام لیا جاتا تھا۔

لادنے والے جانوروں میں بیل بھی ہوتے تھے یہ سامان کے علاوہ توپوں کو کھینچنے کے بھی کام
آتے تھے، عرابہ میں بھی بیل لگائے جاتے تھے۔

جس طرح ایک سپاہی اپنی حفاظت کے لئے ایک خاص طرح کا جنگی لباس پہنتا تھا اسی طرح ان
جانوروں کو بھی حفاظت کے لئے آہنی لباس پہنایا جاتا تھا، گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھنے کے لئے چمڑے کی
زین کے علاوہ دیگر لباس بھی ہوتا تھا ہاتھی کی پشت پر ہودج رکھا جاتا تھا جس میں سوار بیٹھتا تھا
اس کی سونڈ کو ڈھانپا جاتا تھا۔

۱۔ ۳۵۱ ج ۹، ۲۔ ۱۳ ج ۹، ۳۔ ۲۶۲ ج ۱، ۴۔ ۲۹۳ ج ۶

طریقۂ جنگ

جنگوں کے لئے وسیع میدان کا انتخاب شہر سے کچھ فاصلے پر کیا جاتا تھا تاکہ اہل شہر اس سے متاثر نہ ہوں۔ میدان کے وسیع اور ہموار ہونے سے فوج کی صف بندی میں آسانی رہتی تھی، صباح الدین عبدالرحمٰن نے آداب الحرب کے حوالے سے میدان جنگ کے انتخاب کے سلسلے میں لکھا ہے:۔

"(۱) میدان آبادی سے زیادہ دور اور نہ نزدیک ہو۔

(۲) اس کی زمین سخت ہو لیکن پتھریلی نہ ہو تاکہ گھوڑوں کے کھُر زخمی نہ ہونے پائیں۔

(۳) زمین گیلی اور ریتیلی نہ ہو تاکہ فوجوں کو نقل وحرکت میں آسانی ہو۔

(۴) زمین پر زیادہ گرد وغبار نہ ہو تاکہ جنگ کی شدت کے وقت گرد کے بادل اس میں حارج نہ ہوں۔

(۵) اس کے آس پاس پانی آسانی سے دستیاب ہو جاتا ہو۔

(۶) اس کے ارد گرد دشمن کی کمین گاہ نہ ہو۔"[۱]

جب کوئی حریف کسی بادشاہ سے جنگ کرنے کی غرض سے آتا تھا تو وہ شہر سے کچھ فاصلے پر خیمہ زن ہوتا تھا۔ مقابلہ کے لئے دوسرا بادشاہ اس کے روبرو اسی میدان میں اپنی فوج کو آراستہ کرتا تھا، شہر سے دور رکھنے کی وجہ یہ بھی تھی کہ عام شہری پریشان نہ ہوں:۔

"لیکن جنگ ومصاف کے واسطے شہر فردوس سے علیحدہ ایک مقام مقرر کرنا مناسب ہے تاکہ خلایق شہر کو کسی طرح کی ایذا و تکلیف نہ پہونچے"[۲]

فوج جب میدان میں آتی تھی تو سب سے آگے طرح طرح کے جنگی باجے بجانے والے ہوتے پھر سوار اور پیدل باقاعدہ صف بندی کے ساتھ چلتے تھے:۔

"ناگاہ ایک طرف سے علمہائے سرخ نمایاں ہوئے، نفیر و قرنا و نقارے جنگی دمامے فیلی بج رہے تھے زمین ہلی جاتی تھی، چالیس علم ظفر پرچم نمودار ہوئے، ہر ایک پر توحید خدا اور نعت حضرت سلیمان علیہ السلام مرقوم تھی"[۳]

فوج کے میدانِ جنگ میں آنے کے فوراً بعد لڑائی شروع نہیں ہوتی تھی بلکہ پہلے باقاعدہ صفیں آراستہ کی جاتی تھیں اور ایک مقررہ وقت پر جنگ کی ابتدا کے اعلان کے لئے نقارہ رزمی بجایا جاتا تھا۔ جس دن جنگ

۱۔ ہندوستان کے عہد وسطی کا فوجی نظام ص ۲۷۳، ۲۔ ۱۶۲ ج ۳، ۳۔ ۹۴ ج ۷م،

جنگ پانی پت [1]

ملاحظہ ہو پانی پت کے میدان میں بابر اور ابراہیم لودھی کی فوجوں کی صف آرائی جس سے فوج کی ترتیب کی وضاحت ہو جائے گی۔

جنگ سے پہلے کا نقشہ :-

میسرہ قلب میمنہ

ہراول

بیل گاڑیوں اور رسوں کی باڑ

ہراول

کھائی

بندوقچی توپچی

میسرہ قلب یسار قلب یمین میمنہ

میمنہ خفیہ

میسرہ خفیہ

فوج محفوظ

پانی پت گاؤں

گرے ہوئے درخت

جب جنگ ہوئی تو فوج اس طرح پھیل گئی

میسرہ خفیہ میمنہ خفیہ

میسرہ میمنہ

قلب یسار قلب یمین

بندوقچی اور توپچی

کھائی

باڑ

بابر کی فوج

سلطان ابراہیم کی فوج

پانی پت گاؤں

گرے ہوئے درخت

[1] ظہیرالدین بابر۔ ص ۱۶۷
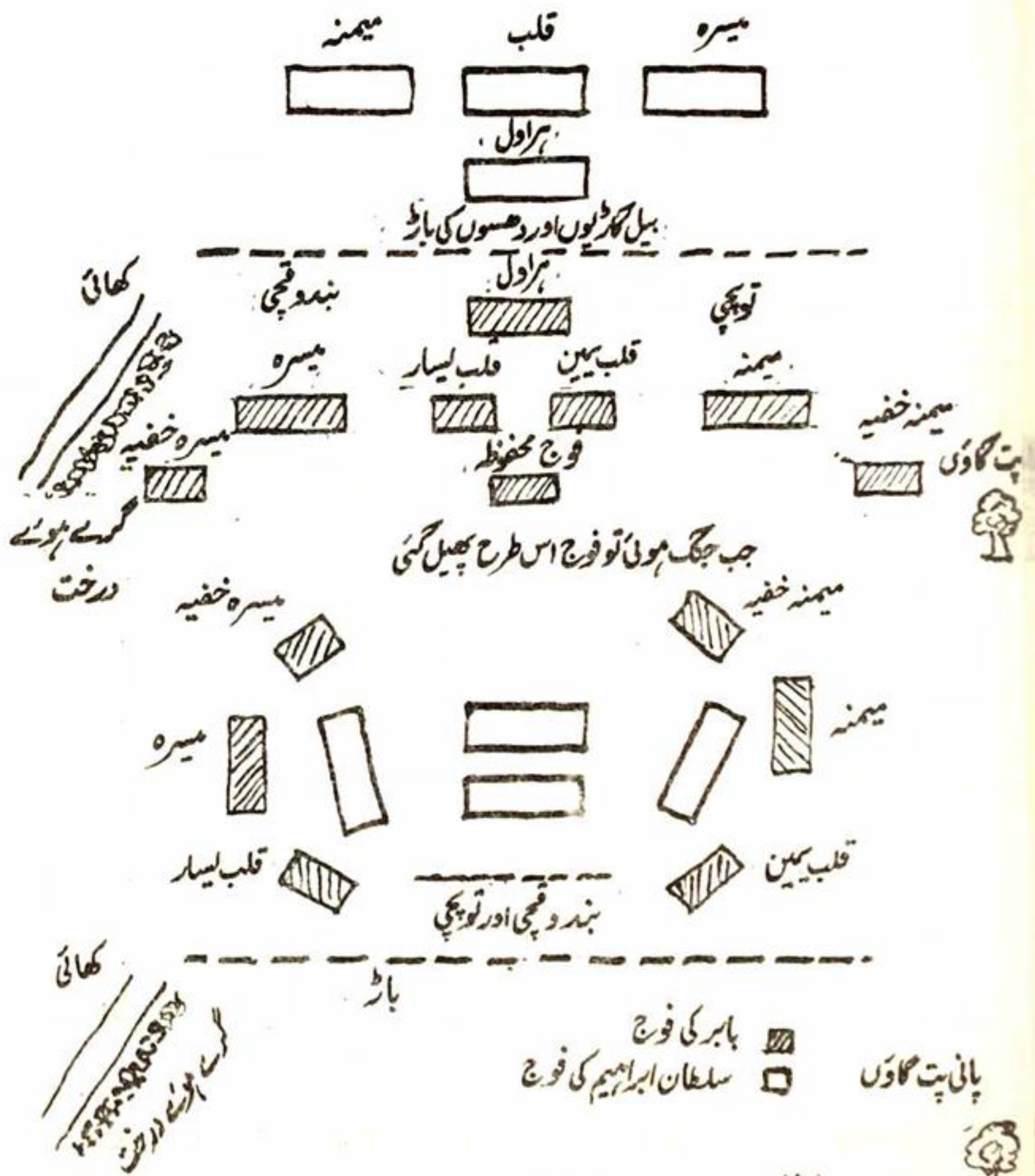
کا ارادہ ہوتا اس کی رات کو ہی طبلِ جنگ بجتا۔[1]

طبلِ جنگ بجنے کے بعد تمام شب جنگ کی تیاریاں ہوتی تھیں:۔

"رات بھر دہ تیرہ دروں اعنی جمشید و ضار منکوس ملعون سامان جنگ میں
میں سرگرم رہے خواب کیسا پلک تک نہ جھپکی"[2]

طبلِ جنگ بجنے کے بعد جنگ رک بھی سکتی تھی اگر کسی طرف سے کوئی معذوری ظاہر کی جاتی:۔

"ہر چند کہ طرفین سے لشکروں میں طبلِ جنگ بجے ہیں لیکن ہمیں ایسی ایک ضرورت
درپیش ہوئی ہے کہ کل کی میدان داری سے معذور رہیں گے طاقان نوجوان نے
پیام آور سے فرمایا خیر تمہارے بادشاہ کی یہی مرضی ہے ورنہ یہاں لشکر ظفر اثر
میں کارسازی حرب ہو گئی تھی"[3]

صبح ہوتے ہی میدانِ جنگ میں دونوں فوجوں کی صف بندی ہوتی، پوری فوج کو الگ الگ طبقوں میں تقسیم کیا جاتا، ہر طبقہ یا دستہ کا ایک الگ سردار مقرر ہوتا، عموماً فوج کے چار دستے ہوتے تھے، "ہراول"[4] یہ دستہ فوج کے سب سے آگے رہتا تھا ہراول کو مقدمۃ الجیش[5] یا جناح[6] بھی کہتے ہیں۔ فوج کا یہ حصہ تمام فوج سے پہلے کوچ کرتا تھا:۔

"دوسرے دن شاہزادہ فلک شوکت نے مخلص نوجوان کو ہراول لشکر کا خلعت دیا
اور فرمایا تم ہم سے پیشتر روانہ ہو ہم بھی ایک دو دن کے بعد کوچ کریں گے"[7]

فوج کا درمیانی حصہ قلب کہلاتا تھا[8]۔ قلب میں عموماً بادشاہ خود رہتا تھا قلب کے دائیں جانب ایک اور فوجی دستہ ہوتا جسے میمنہ کہتے تھے[9]۔ بائیں جانب کا دستہ میسرہ کہا جاتا تھا[10]۔ ان سب دستوں کے سردار علیحدہ علیحدہ ہوتے تھے:۔

"امیر نصیر الدین طرف دست راست اور امیر فیروز طرف دست چپ واقطاع خونریز
ہراول و ملک رشید قیروانی و لشکر مصر جنداول ہوئے"[11]

ہر دستہ کی فوج اپنے سردار کا حکم مانتی تھی کبھی کبھی قلب کو قلب یمین[12] اور قلب یسار[13] نام کے دو دستوں میں بھی تقسیم کر دیا جاتا تھا۔

۱ہ ص ۲۹ ج ۱، ۲ہ ص ۳۲ ج ۳، ۳ہ ص ۳۳۹ ج ۶، ۴ہ ص ۱۶۱ ج ۲، ۵ہ ص ۸۵ ج ۹، ۶ہ ص ۱۳۸ ج ۲، ۷ہ ص ۳۸ ج ۵، ۸ہ ص ۳۸ ج ۳، ۹ہ ایضاً، ۱۰ہ ایضاً، ۱۱ہ ص ۲۵۶ ج ۱، ۱۲ہ ص ۳ ج ۹، ۱۳ہ ایضاً،

اسلام کے ابتدائی دور میں مسلمانوں کی تمام جنگیں غیر مذہب والوں سے ہوئیں اس لیے جنگ کرنے سے قبل اہل اسلام کفار کو دین کی دعوت دیتے تھے اگر حریف ایمان لے آتا تو خونریزی نہیں ہوتی بصورت دیگر جنگ کی جاتی، غزوہ بنو مصطلق میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کو حکم دیا کہ تم آگے بڑھ کر ان کو اسلام کی دعوت دو چنانچہ حضرت عمرؓ نے بڑھ کر ان کو تبلیغ کی جس کو حریف نے سختی سے رد کیا اس کے بعد طرفین سے حملہ آوری ہوئی۔[۱]

"بوستان" کی جنگیں بھی اہل اسلام اور کفار کے درمیان ہوئی ہیں یہاں بھی پہلے حجت شرعی کرلی جاتی ہے اس کے بعد جنگ شروع ہوتی ہے یا مغلوب کافر پہلوان کو قتل کیا جاتا ہے :-

"شاہزادہ فرخ زاد نے فرمایا اے فرزند بخت بلند موافق سلاطین ماضیہ اول ایک نامہ مشتمل بر نصائح و پند اور ہدایت سودمند ملک اسلوق کو لکھنا واجب ہے تاکہ اتمام حجت ہو جائے"[۲]

دوسری بات یہ کہ اہل اسلام جنگ میں پہل نہیں کرتے بلکہ جب حریف حملہ آور ہوتا تب اس پر جوابی حملہ کرتے تھے۔ جنگ بدر کے موقع پر آپؐ نے فرمایا تم جنگ میں ابتدا نہ کرنا۔[۳] یہی صورت "بوستان" میں بھی ہے۔ لشکر اسلام کا پہلوان وار کرنے میں پہل نہیں کرتا بلکہ حریف کو موقع دیتا ہے :-

"صاحبقران اکبر نے فرمایا اے بدبخت اہل اسلام کا طریقہ نہیں کہ پہلے وار کریں تو پہلے وار کر"[۴]

صف بندی اور اتمام حجت کے بعد فوجیں مکمل طور سے جنگ کے لئے آمادہ ہوجاتی تھیں ہندوستان میں راماین اور مہابھارت کے زمانہ میں اور عرب و ایران میں مسلمانوں کے ابتدائی دور تک جنگ کا یہ طریقہ تھا کہ اول دونوں فوجوں میں سے ایک ایک پہلوان میدان میں آتا، دونوں میں مقابلہ ہوتا، ان کے فیصلے کے بعد اور پہلوان یکے بعد دیگرے میدان جنگ میں آتے اور آپس میں زور آزمائی کرتے جنگ مغلوبہ کی نوبت اس وقت آتی جب پہلوان ختم ہوجاتے یا کوئی بادشاہ اس اعتبار سے اپنے لشکر کو کمزور پاتا۔

پہلوانوں کی جنگ کی روایت عرب اور ایران میں کافی بعد تک رہی تاریخ اسلام کے ابتدائی دور پر اگر نظر کی جائے تو مفرد جنگوں کی بہت سی مثالیں ملتی ھیں مثلاً جنگ ذات السلاسل جو مقام ابلہ پر لڑی گئی۔ ملاحظہ ہو اس لڑائی کا ایک منظر :-

---

[۱] تاریخ اسلام ج اول ص ۱۸۶، [۲] ۲۲۷ ج ۵، [۳] تاریخ اسلام جلد اول ص ۱۵۷، [۴] ۲۸۹ ج ۹ م،

"اول حضرت خالدؓ بن ولید میدان میں نکلے اور ہرمز کو مقابلہ کے لئے طلب کیا، ہرمز حضرت خالدؓ کی آواز سن کر میدان میں نکلا، دونوں سردار گھوڑوں سے اتر کر پیادہ ہو گئے، اول حضرت خالدؓ نے وار کیا، ہرمز نے فوراً پیچھے ہٹ کر پینترا بدل کر وار خالی دیا اور پھر نہایت پھرتی سے حضرت خالدؓ پر تلوار کا وار کیا حضرت خالدؓ نے فوراً کے ساتھ آگے سمٹ کر اس کی کلائی تھام کر تلوار چھین لی، ہرمز تلوار چھنواتے ہی حضرت خالدؓ کو لپٹ گیا اور کشتی کی نوبت پہونچی، حضرت خالدؓ نے اس کی کمر پکڑ کر اٹھایا اور زمین پر اس زور سے پٹکا کہ پھر وہ حرکت نہ کر سکا اس کے سینے پر چڑھ بیٹھے اور سر کاٹ کر پھینک دیا[1]"

اس جنگ میں اور "بوستان" کی جنگوں میں غیر معمولی مماثلت ہے، پہلوانوں کی لڑائیوں کو داستانوں اور قصوں میں رواج دینے کا سہرا کافی حد تک شاہنامہ فردوسی کے سر ہے، فارسی اور اردو داستانوں پر شاہنامہ کا بہت بڑا اثر پڑا ہے، رستم پہلوان تھا اور مفرد جنگ کیا کرتا تھا حریف کو قتل کرتا یا زندہ گرفتار کرتا، رستم اور سہراب میں تنہا ہی جنگ ہوئی تھی اس زمانہ میں وہی بڑا اور طاقتور بادشاہ سمجھا جاتا تھا جس کے پاس زیادہ پہلوان ہوتے تھے۔ پہلوانوں ہی کے بھروسے پر بادشاہت کی جاتی تھی۔

پہلوان بھی روایتی طور پر اتنے زبردست ہوتے تھے کہ ایک ہی گرز کے وار سے کوہ بدن ہاتھی کو مار ڈالتے اور ایک گھونسے سے شیر کو ہلاک کر دیتے[2]۔

جب جنگ کے لئے دونوں فوجیں بالکل تیار ہوتیں تو نقیب میدان میں آتے اور اپنے پہلوانوں کی تعریف کرتے، اور پہلوانوں کو دعوتِ رزم دیتے، نقیبوں کے آنے سے قبل میدان کو خس و خاشاک سے صاف کیا جاتا تھا۔

"صف آرا ہوا، جانبین کے نقیبوں نے نقابت کی دلاورانِ جانبین فرطِ شجاعت سے جھومنے لگے[3]"

"میدانِ رزم خار و خاشاک سے پاک و صاف کیا گیا نقیبان بلند آواز نے پہلوانانِ جنگ گذار و مبارزان تہور شعور کو حرب و قتال کے واسطے بلایا[4]"

کسی لشکر کا ایک سردار میدان میں آتا اور اپنے لئے حریف طلب کرتا، جنگ کا قاعدہ یہ تھا کہ جب پہلوان میدان میں آتا اور اپنے حریف کو دعوتِ مبارزت دیتا تو طرفِ ثانی سے آواز کے ساتھ ہی پہلوان سامنے

---

[1] تاریخ اسلام جلد اول ص ۳۱۵، [2] ۲۱۴ ج ۱، [3] ۴۸۴ ج ۲، [4] ۱۶۹ ج ۲

آتا اور اس میں تاخیر کو باعثِ توہین سمجھا جاتا تھا۔[۱] جب کوئی بڑا سردار میدان میں جاتا تھا تو اس کے ساتھ تھوڑی دور تک بطور مشایعت بقیہ سردار جایا کرتے تھے :۔

"شہزادہ بشوکت تمام و بزینت مالا کلام میدان کا متوجہ ہوا، شاہزادہ حسن اور شاہزادہ حیدر اور جمیع سردار واسطے مشایعت اس شاہزادہ فلک شوکت کے مرکبوں سے پیادہ ہو کے جلو میں چلے، شاہزادہ برادروں اور سرداروں کو رخصت کر کے میدان میں گیا"[۲]

جب دونوں سردار روبرو آجاتے تھے تو اپنی، اپنے نسب کی اور اپنے بادشاہ کی تعریف کرتے تھے یعنی رجز خوانی میں مصروف ہوتے تھے، رجز کا بیان مرثیوں میں خاصا شان و شکوہ کے ساتھ سامنے آتا ہے "بوستان" میں رجز کو عموماً نظم ہی میں پیش کیا گیا ہے :۔

"سر سے پا تک دریائے آہن میں غرق مرکب برق وش پر سوار مانند اژدہائے دمان و شیر غران میدان میں آ کے اس طرح رجز خوانی کی ؎

منم آں دلاور کہ دوز کمیں	زنم آسمان را بروئے زمیں
چہ زال چہ رستم چہ افراسیاب	زتیغم شود زہرہ ہر یک آب
کنم از غضب گر نظر بر سپہر	ز دہشت فتد لرزہ بر جرم مہر
بتسخیر کردن چو بندم میاں	بہ نیزہ ربایم از آسمان"[۳]

رجز خوانی کے بعد ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتے تھے، جنگ عموماً نیزہ بازی سے شروع ہوتی تھی، نیزے گر جانے پر تلواریں نکلتی تھیں جب تلواروں سے بھی کوئی مغلوب نہیں ہوتا تو گرز بازی کی ابتدا ہوتی تھی، اس پر بھی فیصلہ نہیں ہوتا تو گھوڑوں سے اتر کر کشتی یعنی گاؤزوری میں مصروف ہوتے تھے، طاقتور پہلوانوں میں گاؤزوری کئی روز تک چلتی تھی، بالآخر ایک سردار دوسرے کو ہاتھوں پر علم کر لیتا تھا، اور زمین پر دے مارتا تھا۔[۴] جس طرح حضرت خالدؓ اور ہرمز کے مقابلہ کا بیان اس سے پیشتر نقل کیا جا چکا ہے

اس طرح کے مقابلے بڑے آرام سے ہوتے تھے دراصل ان میں پہلوانوں کی قوتِ بازو کو آزمایا جاتا تھا، کیونکہ ان مقابلوں میں کئی روز لگ جاتے تھے اس لئے پہلوان ساتھ میں آرام بھی کرتے تھے، میدانِ جنگ ہی میں قالیچہ بچھوا کر پہلوان کو کھانا کھلاتے تھے اور کھانے کے بعد پہلوان پھر جنگ میں مشغول ہو جاتا تھا۔[۵]

---

[۱] ۲۸۵ ج ۲، [۲] ۲۵۳ ج ۱، [۳] ۳۵۵ ج ۱، [۴] ۲۲۲ ج ۹ م، [۵] ۳۳۵ ج ۱،

اگر دونوں سردار راضی ہوتے تو یہ مقابلہ رات میں بھی ہوتا تھا کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر مشعلیں روشن کی جاتی تھیں اور ان مشعلوں کی روشنی میں پہلوان کشتی لڑتے تھے[۱]۔

"بہرام نے تمام شب شاہزادہ عالی نسب سے کشتی کی اور جانبین سے ہنر ہائے مردانہ ظاہر ہوئے[۲]۔"

بعض اوقات میدان میں ایک سردار کے بجائے کئی کئی سردار آتے ہیں حریف کے لشکر سے بھی ہر ایک کے مقابلے کے لیے الگ الگ سردار باہر نکلتے ہیں۔ غزوہ بدر میں کفار کے لشکر سے جنگ شروع ہونے پر عتبہ، شیبہ، اور ولید بن عتبہ میدان میں آئے اور حریف طلب کیے، ان کے مقابلے کے لئے لشکر اسلام سے حضرت حمزہؓ، حضرت عبیدہؓ اور حضرت علیؓ گئے بالترتیب مقابلہ ہوا[۳]، ایسے ہی ایک مرتبہ جمشید کے حکم سے دس نفر میدان رزم میں آئے اور انھوں نے حریف طلب کیے[۴]۔

اوّل لکھا جا چکا ہے کہ جنگ سے قبل میدان کو صاف کیا جاتا تھا تاکہ مقابلہ کے وقت گرد و غبار نہ اڑے لیکن جنگ کے دوران جب میدان میں خاک اڑتی اور غبار چھا جاتا تو مشکیزوں سے پانی کا چھڑکاؤ کیا جاتا[۵]۔

ان پہلوانوں کی جنگ کے دوران دونوں فوجیں مستعد رہتی تھیں کیونکہ کسی بھی سردار کے ہارنے پر اس کا بادشاہ جنگِ مغلوبہ کا حکم دے سکتا تھا۔ جنگِ مغلوبہ کے وقت دونوں فوجیں ایک دوسرے پر حملہ کر دیتیں اس وقت سوائے بزن بزن اور بکش بکش کے اور کوئی آواز نہ آتی، نیزے لہراتے، تلواریں لہو بکھیرتیں، تیروں کی بارش ہوتی، غرضکہ عجیب قیامت کا منظر ہوتا ؎۔

"القصہ اس قدر جنگِ مغلوبہ واقع ہوئی اور ہنگامۂ قیامتِ کبریٰ برپا ہوا کہ بجز صدائے چقاچق شمشیر کے دوسری آواز کان میں نہ آتی تھی اور وہ میدان کارزار مثل لالہ زار زخمیوں کی کثرت سے معلوم ہوتا تھا، سروں کی بارش ہو رہی تھی، لاشوں کا انبار لگا تھا، گھوڑے بے سوار دوڑ رہے تھے، زخمیوں کو روند رہے تھے ایک سمت نقاب دار سیہ پوش قیامت کر رہا تھا دوسری طرف نقابدار سرخ پوش نے حشر کا عالم برپا کر رکھا تھا ادھر صاحبقران اکبر فلک قدر پہلوانان تہمتن کے سروں کو قلم کر رہے تھے غرضکہ یہ حال تھا کہ باپ کو بیٹا اور بیٹے کو باپ، بھائی کو بھائی نہ پہچانتا تھا[۶]۔"

۱؎ ۳۳، ج ۱، ۲؎ ۲۰۵ ج ۱، ۳؎ تاریخ اسلام جلد اول ص ۱۵۷، ۴؎ ۳۱۴ ج ۹، ۵؎ ۴۳ ج ۹، ۶؎ ۴۵ ج ۹،

تاریخ میں اس طرح کی جنگوں کی بے شمار مثالیں موجود ہیں مسلمانوں کے آنے تک ہندوستان میں مفرد جنگوں کا رواج کم ہو گیا بلکہ اس عہد میں اس کی چند مثالیں ہی ملتی ہیں عام طور پر جنگ مغلوبہ ہی ہوا کرتی تھی۔ فتح کے بعد شکست خوردہ فوج کے فوجی فرار اختیار کرتے اور کچھ گرفتار ہوتے، گرفتار شدہ لوگوں کو دست و پا بستہ قید خانوں میں بھیج دیا جاتا[۱]، عورتوں کی عزت و حرمت کی جاتی انھیں خود مختار کر دیا جاتا کہ وہ چاہے جہاں جائیں[۲]۔ بعض قیدی عورتوں کو کنیز و خواص کے زمرے میں شامل کر لیا جاتا۔

سطور بالا میں جس طرح کی جنگوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ باقاعدہ آدابِ حرب کے ساتھ لڑی جاتی تھیں، ان میں حریفوں کی رضامندی کو پورے طور سے مدِ نظر رکھا جاتا تھا یعنی جب دل چاہے کوسِ رزمی بجاؤ اور مقابلہ کرو اور جب لڑنے کا ارادہ نہ ہو تو طبلِ بازگشت بجاؤ اور جنگ موقوف کرو، پھر جب ارادہ ہو میدانِ کارزار کو آراستہ کر لو[۳]۔

بعض اوقات ایک لشکر دوسرے پر شب خون بھی مارتا تھا، شب خون کا مطلب ہے کہ ایک بادشاہ بغیر اطلاع کئے خاموشی سے رات کے اندھیرے میں دوسرے کی خوابیدہ فوج پر حملہ کر دے، **جنگ کے** تمام اخلاقی آداب اور تہذیبی ضابطوں کے باوجود شب خون مارنا جنگی رسومات کے خلاف تصور نہیں کیا جاتا تھا، شب خون میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں افراد بے دریغ قتل ہو جاتے تھے ایسی حالت میں حملہ آور کو اکثر فتح بھی ہو جاتی تھی کیونکہ سوئی ہوئی فوج بوکھلاہٹ میں اچھی طرح مقابلہ نہیں کر پاتی تھی:۔

> "نصف شب کے وقت اس نے سات ہزار سوار کی جمعیت سے بے خبر امیر مجاہدالدین کے لشکر پر شب خون مارا۔ ۔ ۔ جب چار طرف لشکر میں ایک شور مثلِ شورِ محشر برپا ہوا امیر مجاہدالدین کی بھی غش سے آنکھ کھلی اور پوچھا یہ کیا ہنگامہ ہے ایک غلام نے کہا ظاہراً کسی دشمن نے اس وقت ہمارے لشکر پر شب خون مارا ہے ۔ ۔ ۔ بعد ازاں واسطے روشن کرنے مشعل و مہتاب کے حکم دیا[۴]"

جبکہ رات کو پہریدار طلایہ یعنی پہرہ دیتے تھے:۔

> "آج کی شب جمشید کے دل میں یہی خیال پکا کہ ہم خود لشکر کا طلایہ دیں گے[۵]"

کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ اگر کسی بادشاہ کو میدانِ جنگ میں اپنی شکست نظر آتی اور اس کا شہر

۱؎ ص ۳۵۰ ج ۹م، ۲؎ ص ۲۸۴ ج ۱، ۳؎ ص ۱۷۶ ج ۳، ۴؎ ص ۹۶ ج ۳، ۵؎ ص ۶۳ ج ۳،

قریب ہوتا تو وہ میدان سے فرار اختیار کر کے قلعہ بند ہو جاتا، شہر کے دروازے بند کر دیئے جاتے اور زیر فصیلِ شہر موجود دشمن کی فوج کا فصیل کے اوپر سے مقابلہ کیا جاتا، تیر و کمان، فلاخن، منجنیق، بندوقیں اور توپیں، وغیرہ جیسے آلاتِ حرب ایسے ہی وقت میں زیادہ استعمال ہوتے تھے۔ اس طرح کے محاصرے برسوں چلتے تھے، یہاں تک کہ شہر میں کھانے پینے کی اشیا ختم ہو جاتی تھیں۔ اور مجبوراً محصور بادشاہ صلاح کر لیتا تھا، یا کبھی حریف ہی شہر کی فصیل کو توڑ کر اندر داخل ہو جاتا تھا اور شہر کے اندر جنگ کرتا تھا۔

"لشکرِ جمشید کا بلائے بید رماں کی مانند شہر میں در آیا اور خفتہ و بیدار کو قتل و غارت کرنا شروع کیا۔[1]"

بیانِ جشن میں ہم لکھ چکے ہیں کہ بادشاہوں کے یہاں جشن منانے کے لئے کسی بہانے کی ضرورت ہوتی تھی، جنگ میں فتح حاصل کرنے سے زیادہ خوشی کا موقع اور کیا ہو سکتا تھا اس لئے فتح کے بعد باقاعدہ جشن منایا جاتا تھا، امرا اور خواتینِ محل بادشاہ کو نذریں پیش کرتے تھے، بادشاہ انھیں انعامات سے نوازتا تھا محفلِ رقص و سرود منعقد ہوتی تھی سب کی تفریح کا سامان فراہم کیا جاتا تھا، فتحیاب بادشاہ کی فوج اور رعایا کا ہر آدمی خوشی مناتا تھا۔ "بوستان" میں جگہ جگہ بیانِ رزم میں فتح کے جشن کا ذکر بھی کیا گیا ہے، صاحبقران اکبر نے جب جمشید خود پرست پر فتح پائی اس موقع پر داستان نگار لکھتا ہے:۔

"قصہ کوتاہ صاحبقران اکبر نے صورت فتح آئینۂ مراد میں جلوہ گر دیکھی، درگاہ ایزدی میں شکر کا سجدہ ادا کیا اور فرحناک اور شادمان داخل خیمۂ معلیٰ ہوئے سلاطین نامدار و امرائے عالی وقار نے نذریں گذرانیں۔[2]"

"الغرض اسی وقت اپنے لشکر کے سرداروں کو بلا کر حکم دیا کہ تم آج کی رات اپنے اپنے خیموں میں بزم نشاط و طرب آراستہ کرو، اور مہوشان گلعذار کے رقص و سرود کا تماشا دیکھو۔[3]"

محفلِ نشاط کے لئے رقص و سرود کا انتظام جنگ کے میدان میں ہی رہتا تھا، دارالخلافہ پہونچ کر پھر جشن کا اہتمام کیا جاتا تھا، محلسرا کی خواتین خوشیاں مناتیں اور فاتح کو نذریں پیش کرتیں[4] بادشاہ بھی انھیں انعام سے نوازتا تھا۔

۱؎ ۳۳ ج ۲، ۲؎ ۳۵۲ ج ۹ م ۱ ۳؎ ۳۵۲ ج ۳، ۴؎ ۳۴۵ ج ۳،

حرم سرا

دربار کی آرائش و آراستگی اور شان و شوکت کو دیکھنے کے بعد حرم سرا کی تصویر نگاہوں کے سامنے آتی ہے جو بیگمات شاہی کی رہائش گاہ کے علاوہ حریم شاہی میں داخل دیگر خواتین کے رہنے کی جگہ بھی ہوتی تھی اور جہاں وہ اپنے اپنے مرتبے اور بادشاہ کی نظر میں اپنی محبوبیت کے مطابق رہتی تھیں، بادشاہوں کی حرم سرا میں بے شمار عورتیں ہوا کرتی تھیں، آئین اکبری میں شاہی حرم سرا کا ذکر کرتے ہوئے ابوالفضل نے لکھا ہے کہ پانچ ہزار عورتیں وہاں رہا کرتی تھیں[1]، اس سے زیادہ قابل توجہ خلجی سلطان نصیرالدین ابن سلطان غیاث الدین کی حرم سرا ہے جس نے حسین عورتوں کا ایک شہر آباد کیا تھا جہانگیر نے لکھا ہے :-

> "بعدازاں اس نے پندرہ ہزار عورتیں اپنے محل میں اکٹھا کر کے عورتوں کا ایک شہر آباد کیا جہاں اسے کسی حسین عورت کے بارے میں معلوم ہوتا اس کو ہر حیلہ سے لے آتا تھا"[2]

یہی حال دوسرے بادشاہوں کی حرم سرا کا تھا یہ بات صرف ہندوستان کے بادشاہوں ہی میں نہیں بلکہ دوسرے ممالک کے مسلم اور غیر مسلم بادشاہوں کے یہاں بھی تھی اور دوسرے ممالک کے سلاطین کے بارے میں تو یہاں تک لکھا ہے :-

> "حرم سرا میں اس کثرت سے لونڈیاں باندیاں تھیں کہ سلاطین کو باضابطہ شادی کرنے کی ضرورت باقی نہ رہی تھی"[3]

یہ سلاطین عثمانیہ کی حرم سرا کا حال ہے جہاں سنہ ۱۵۲۰ء کے بعد صرف تین سلطانوں نے باضابطہ عقد کیا، اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ مسلمانوں میں کنیزوں کی اولاد کو ناجائز نہیں سمجھا جاتا تھا، ہندوستان کے مسلم حکمراں یہ روایت صرف اپنے ساتھ ہی نہیں لائے بلکہ یہاں کے ہندو راجاؤں کو بھی ایسا ہی پایا، جن کے محلوں میں بے شمار رانیاں ہوتی تھیں، اگرچہ ہندوؤں میں دوسری شادی کرنا معیوب سمجھا جاتا رہا ہے لیکن حکمراں طبقہ پر اس طرح کی کوئی پابندی عائد نہیں تھی، مغلیہ عہد میں بھی ہندو راجاؤں کے حرم کی یہی صورت تھی، اکبری عہد میں مارواڑ کے راجہ اودے سنگھ کی رانیوں سے چھتیس اولادیں تھیں، جہانگیر کے برادر نسبتی راجہ بھگوان داس کے لڑکے راجہ مان سنگھ کی پندرہ سو بیویاں تھیں، عالمگیری عہد کے مشہور

---

[1] آئین اکبری۔ ص ۲۷، [2] تزک جہانگیری۔ ص ۲۱۳، [3] "اردو" شمارہ ۲۔ ص ۱۱،

راجپوت منصب دار راجہ جسونت سنگھ کی وفات پر اس کی چتا پر آٹھ رانیاں ستی ہوئیں[1]

خوبصورت، حسین اور فنکار عورتوں کی اتنی بڑی تعداد میں موجودگی بادشاہت کے لئے صرف جذباتی تسکین کا ہی ذریعہ نہ تھی بلکہ اس سے شاہانہ ثروت کا بھی ایک طرح سے اندازہ ہوتا تھا اس لئے کہ غلام، کنیزیں، خواصیں اور باندیاں بادشاہ کی حرم سرا میں گذرنے والی زندگی کے ان لوازمات کا حصہ تھیں، جن سے بادشاہ کی صرف جنسی زندگی وابستہ نہیں تھی اس کا تعلق اس نفسیاتی تسکین سے بھی تھا جو بہت سی اچھی چیزوں پر قبضہ و تصرف کے احساس سے پیدا ہوتی ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ملکی اور مالی معاملات اور دوسرے اہم مسائل کی وجہ سے بادشاہ کا ذہن جس اعصابی تناؤ کا شکار رہتا تھا یہ اسے کم کرنے کا ایک موثر وسیلہ تھا لیکن ہر موقع پر یہ سوچنا شاید مناسب نہ ہوگا اس لئے کہ نصیر الدین شاہ گجرات کی زندگی میں ہم ایسا کوئی واقعہ، سانحہ، یا مہم جو یانہ سلسلہ نہیں دیکھتے جس کے نتیجہ میں اس کی ضرورت پیش آجائے وہاں تو یہ صرف شاہانہ جاہ و ثروت کا حصہ نظر آتا ہے۔

مذہبی لٹریچر نے بھی اس طرح کے تصورات کو کسی نہ کسی سطح پر عام کرنے کی کوشش کی ہے راجہ اندر اور اس کی پریاں اس کی سب سے نمایاں مثال ہے، رن واس کے تصور سے ہم قدیم ہندو راجاؤں کی زندگی کو بھی خالی نہیں پاتے۔ کھاجراؤ، کونارک اور بعض دوسرے مقامات کے مندر اس کی بہت نمایاں شہادتیں ہیں، قدیم مصر، یونان، ہخامنشی تہذیب اور قدیم ایران میں بھی یہ رجحان اور اس کی مثالیں مل جاتی ہیں، یہ شاہی ادارے کے لوازمات میں سے رہا ہے۔

مغلوں میں جب تک کیمپ لائف کا تصور رہا، اس وقت کی صورت حال صرف عیش پرستانہ انداز نظر سے تعلق رکھتی ہے اور بات اس سے آگے نہیں بڑھتی ؎ بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست۔ لیکن جب مغل سلطنت باقاعدہ قایم ہوئی اور ہندوستان جیسے ملک میں قایم ہوئی جس کے ساتھ قدیم سے آتی ہوئی بہت سی روایتیں وابستہ تھیں، راجپوت دور کی کہانیاں، گیت اور موریہ عہد کی داستانیں اور ہندوستان کے قدیم مندروں میں موجود دیوداسیاں اور دیوکنیائیں، اس کا اثر کسی نہ کسی معنوں میں مغلوں کی اس زندگی پر بھی پڑا جنھیں ہم خلوت کدوں سے تعبیر کرتے ہیں۔

حرم سرا مردانے سے الگ بنائی جاتی تھی، جہاں بہت سخت پہرہ ہوتا تھا کوئی شخص بجز خواجہ سراؤں کے حرم سرا کے اندر داخل نہیں ہوسکتا تھا اگر کوئی قریبی رشتہ دار جانا چاہتا تو پہلے اسے بادشاہ کی طرف

---

[1] ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے، ص ۱۹۳،

سے اجازت لینی پڑتی تھی ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ امیر سیف الدین جو محمد بن تغلق کا بہنوئی تھا اپنی شادی کے بیس دن بعد محل میں گیا، اندر جانا چاہا، امیر حاجب نے اسے روک دیا لیکن اس نے کچھ پرواہ نہ کی اور زبردستی اندر جانے لگا، دربان نے اس کی زلفیں پکڑ لیں اور الٹا دھکیل دیا، امیر نے دربان کو مارا، جس کے بعد اسے قید خانہ میں ڈال دیا گیا، قید سے رہا ہونے پر اس کی جاگیر واپس لے کر اسے جلا وطن کر دیا۔[1]

اس قدر پہرے اور پابندی سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ حرم سرا کسی ایک مکان یا ایک بڑے کمرے کا نام ہے جس میں خواتین کو قید کر دیا جاتا تھا بلکہ یہاں ایک پوری دنیا آباد ہوتی تھی، بڑے بڑے چوک، باغیچے اور محل نما مکانات وغیرہ سب ہی کچھ ہوتا تھا تاکہ حرم سرا کے اندر رہنے والوں کو کسی طرح کی گھٹن یا پابندی کا احساس نہ ہو، پوری طور سے آزاد زندگی گذاریں، ہر بیگم اور شاہزادی کا الگ محل ہوتا تھا، کنیزوں کے الگ الگ کمرے ہوتے تھے، حرم سرا کی شان وشکوہ کا اندازہ وہاں ہونے والی تقریبات سے لگایا جا سکتا ہے ولادت سے لیکر شادی تک کی بیشتر رسومات انھیں محلات میں ادا ہوتی تھیں، آئے دن تہوار اور جشن منائے جاتے تھے مغلیہ عہد میں ہندو رانیوں کے محل میں آجانے کے سبب ہندوؤں کے بھی بعض تہوار منائے جانے لگے تھے، بادشاہ خود ان میں شرکت کرتا تھا۔

جس وقت بادشاہ محل میں آتا تھا ہر طرف خاموشی چھا جاتی تھی اِدھر اُدھر اُچھلتی کودتی کنیزیں تصویر بن کر اپنے اپنے مقامات پر ایستادہ ہو جاتی تھیں، خواجہ سرا بادشاہ کی آمد کا اعلان کرتا تھا:۔

> "خواجہ سرائے معلیٰ نے پکارا اے خواتینِ محل شاہزادہ مہمان محلسرا میں داخل ہوا' ہوشیار ہو جاؤ اور اپنے اپنے منصب و قرینہ سے دور ویہ ایستادہ ہو۔۔۔ بمجرد اس صدا کے۔۔۔۔ خواتین صف بصف ایستادہ ہو گئیں"[2]

بادشاہ کے استقبال کے لئے خواتینِ ذی مرتبہ محل کے دروازے تک جاتی تھیں :۔

> "بادشاہ دیوانِ عام سے محلسرا میں آئے ملکہ عالم کہ جس کا حسینہ خاتون نام تھا اور ملکہ گل اندام دونوں مادر و دختر مع کنیزانِ محل بطریق استقبال در محل سرا پر ایستادہ تھیں"[3]

بادشاہ کو کمال عزت و احترام کے ساتھ تخت تک لے جایا جاتا تھا جب وہ تخت پر بیٹھ جاتا تو خواتینِ محل سلام و مجرے کے واسطے حاضر ہوتیں :۔

---

[1] سفر نامہ ابن بطوطہ۔ قسط سوم، ص ۱۵۷، [2] ص ۳۵۷ ج ۲، [3] ص ۱۱۲ ج ۵،

"جملہ خواتینِ محل واسطے سلام و مجرے کے پایہ تخت سے تا درِ محل سرا دو رویہ
صف بصف استادہ ہو گئیں اور ہر ایک کے ہاتھ میں عود سوز مینا نگار تھا[۱]"

دربار کے بیان میں ذکر کیا گیا ہے کہ جب کوئی شخص بادشاہ کے روبرو حاضر ہوتا تھا تو کچھ نہ کچھ بادشاہ کی خدمت میں نذر ضرور پیش کرتا تھا، خواہ وہ کوئی شاہزادہ ہو یا امیر، وزیر یا سفیر۔ سب نذریں گذرانتے تھے، محل سرا میں بھی یہ قاعدہ رائج تھا، خواتینِ محل اپنی حیثیت کے مطابق نذریں پیش کرتی تھیں ؎۔

"ملکہ حسینہ خاتون اور گل اندام نے نذریں دیں اور زر و جواہر سر پر سے نثار
کیا اسی طرح جملہ خواتینِ محل نے حسبِ قدر نذریں گذرانیں[۲]"

پھر محفل عیش و نشاط، رقص و نغمہ شروع ہوتی تھی، بادشاہ ان سے لطف اندوز ہوتا تھا، شراب کا دور چلتا تھا اور شکر لبوں کے بوسے گاہ گاہ گزک کا کام کرتے تھے حرم سرا میں بعض بیگمات اور شاہزادیاں بھی شراب پیتی تھیں، کہانیوں میں اس طرف اشارے خاصے عمومیت کے ساتھ سامنے آتے ہیں ؎۔

"بعدہ پھر صحبت رقص و نوا کا سامان ہوا، ساقیان سیمیں ساق مع شراب
ارغوانی حاضر ہوئے اور نازنینان ماہ جبیں نے خود شاہزادہ کی ساقی گری کی[۳]"

اس طرح کی محفلیں روز ہی آراستہ ہوتی تھیں، ہر روز بادشاہ کسی نہ کسی ملکہ کے محل میں جاتا تھا، بعض عیش پسند بادشاہوں کے بارے میں تو یہاں تک مشہور ہے کہ وہ حرم سرا سے مہینوں باہر نہیں آتے تھے، نہ امور سلطنت کی پرواہ تھی اور نہ باغیوں کو سرزنش کرنے کی فکر۔ یہ بات کچھ مبالغہ آمیز ضرور معلوم ہوتی ہے لیکن کسی حد تک حقیقت سے دور نہیں کہ اٹھائیس برس کے زمانۂ حکومت میں محمد شاہ نے مشکل سے ایک دو دفعہ باہر قدم نکالا ہوگا، سارا وقت عیش و عشرت میں اور رامش و رنگ میں گذرتا تھا[۴]۔ صاحبقران اکبر نیز دوسرے شاہزادوں کا بھی تقریباً یہی حال ہے اور پھر داستان نگار کا مقصد ہی شاہزادہ کو عیش و نشاط میں غرق رکھنا ہے ؎۔

"روز پانزدہم صاحبقران والا مقدار محل سرا سے باہر نکلا اور دیوانِ عام میں
تشریف لایا[۵]"

یعنی کئی کئی روز تک محلسرا میں دادِ عیش دینا معمولات میں شامل ہوتا، اس اثنا میں اگر کوئی ضروری کام درپیش ہوتا یا کسی سے ملاقات کرنی ہوتی تو اسے خلوت خانہ میں بھی کبھی کبھی باریابی کی عزت بخشی جاتی تھی ؎۔

۱؎ ۵۰۶ ج ۳، ۲؎ ۱۱۲ ج ۲، ۳؎ ۲۲۳ ج ۹، ۴؎ میر تقی میر از خواجہ احمد فاروقی، ص ۲۶، ۵؎ ۵۹۰ ج ۵،

«محلدار نے حسب الحکم محل سرا میں مردانہ کروایا اور راوس مصور کو صحن باغ میں
بادشاہ کے پاس لے گیا۔»[1]

محلدار شاہی معمولات سے متعلق قلعہ کا محافظ اور ملازمانِ شاہی کا افسرِ اعلیٰ ہوتا تھا۔

حرم سرا کے مکینوں کو تین طبقات میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، بیگمات یعنی بادشاہ کی منکوحات، شاہزادیاں اور کنیزیں۔

حرم سرا میں بیگمات کا احترام بطورِ خاص کیا جاتا تھا چونکہ یہ بادشاہ کی بیاہتا بیویاں ہوتی تھیں اور انھیں کی اولاد آگے چل کر سلطنت کی وارث بنتی تھی، بادشاہ سے ان کو قربت بھی زیادہ ہوتی تھی اور ان میں سے بیشتر کیونکہ بڑے امراء و سلاطین یا ہندوستان میں صاحبانِ ریاست کی بیٹیاں یا قریبی رشتہ دار ہوتی تھیں اس لئے بادشاہ خود بھی ان کا بہت خیال رکھتا تھا اور ان کا اعزاز و احترام گویا رعب و داب شاہی کا ایک حصہ تصور کیا جاتا تھا۔ محل میں بیگمات کو وہی مرتبہ حاصل ہوتا تھا جو دربار میں بادشاہوں یا شاہزادوں کو حاصل تھا، داستانوں میں بیگمات کا ذکر کم ہی ہوتا ہے کیونکہ داستان نگار کی نظر کا مرکز تو شاہزادیاں ہوتی ہیں جو قصہ کو آگے بڑھاتی ہیں اس لئے داستانوں کی حرم سرا میں بیگمات اور بچے شاذ ہی نظر آتے ہیں۔ عموماً شادی بیاہ جیسی تقریب کے موقع پر ہی داستان نگار کی توجہ بیگمات کی طرف جاتی ہے درمیانِ قصہ ضرورتاً ہی ان کو یاد کیا جاتا ہے۔ شروع سے آخر تک شاہزادیوں کا ذکر ہوتا ہے اور جب یہ شاہزادیاں بیگم کا مرتبہ حاصل کرلیتی ہیں، تو داستان ختم ہوجاتی ہے۔ "بوستان خیال" میں دو بیگمات کا تذکرہ قدرے تفصیل سے کیا گیا ہے اول ملکہ عالیہ خاتون[2] جو سلطان اسمٰعیل کی بیگم اور صاحبقران اکبر معزالدین کی والدہ ہیں۔ دوسری بیگم شاہنامہ خورشیدی میں ملکہ ماہ سیما ہیں[3] جو صاحبقران اعظم اور صاحبقران اصغر کی والدہ ہیں۔ یہاں پھر وہی بات آجاتی ہے کہ دونوں کا ذکر بھی صاحبقرانانِ داستان کی ولادت یا رسم کتخدائی کے موقع پر کیا گیا ہے۔ اور ان مقامات پر ان کی بیگماتی حیثیت ختم ہوجاتی ہے بلکہ ان کا ذکر اس لئے کیا جاتا ہے کہ یہ شاہزادوں کی مائیں ہیں۔

مذہب اسلام میں بیک وقت چار بیویاں رکھنے کی اجازت دی گئی ہے لیکن بعض مسلمان بادشاہ اس حد کو بھی تجاوز کر گئے ہیں۔ ہندوستان کے مغل حکمرانوں میں تقریباً سبھی نے چار سے زیادہ نکاح کیئے، بابر سات شاہزادیوں کو اپنے نکاح میں لایا، اکبر کے گیارہ بیویاں تھیں۔ جہانگیر کے نکاح میں اٹھارہ شاہزادیاں آئیں[4]۔ اس روایت کو بعد کے بادشاہوں نے بھی جاری رکھا لیکن یہ بات قابلِ بیان ہے کہ ان بیگمات میں

۱؎ ص ۲۴۵ ج ۴ ۲؎ ص ۲۰ ج ۱ ۳؎ ص ۹ ج ۳ ۴؎ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے، ص ۱۱۵

آپسی رشک و حسد کم ہوتا تھا بلکہ وہ اسی کو اپنے لئے اعزاز سمجھتی تھیں کہ اس مرتبے کو پہونچیں، ملکہ عالیہ خاتون کو تو اس بات پر فخر تھا کہ اس کے شوہر کے حرم میں بہت سی عورتیں تھیں، اس فخر کے پیچھے یہ بات بھی دبی ہوئی ہے کہ قانونِ قدرت یہی ہے کہ بادشاہ ایک سے زیادہ عورتیں رکھے ۔

"عالیہ خاتون نے کہا میرا شوہر عجب صاحبِ طالع ہے کہ قریب بیس نازنینوں کو کنیزی میں لیا ہے کہ جو ہر ایک دخترِ بادشاہ ہے الاملکہ عالیہ خاتون نے مشکیں مو و محفل روشن چہرہ کی نہایت عزت کی اور وہ بھی ہر امر میں رعایت کرتی تھیں کیونکہ زنِ اول عالیہ خاتون تھی"[۱]

"ملکہ نے کہا اے پدر شاہزادے نے ان سب سے عیش و عشرت کیا تو میں نے کیا کہا کہ اب کچھ کہوں گی بلکہ جس امر میں رضائے پروردگار ہے میں بھی اس میں راضی ہوں"[۲]

زنِ اوّل کا لفظ ایک اور بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ عام طور پر بادشاہ کی پہلی منکوحہ کو دوسری بیگمات کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ عزت و احترام حاصل ہوتا تھا یا زنِ اول وہ کہلاتی تھی جسے بادشاہ زیادہ عزیز رکھتا تھا یا جو ولی عہد کی ماں ہوتی تھی، اسے ملکہ کلاں بھی کہتے تھے[۳]

اگرچہ بیگمات کو محلسرا کے اختیارات حاصل ہوتے تھے لیکن وہ بھی بادشاہ کی اجازت کے بغیر کسی کو بلا نہیں سکتی تھیں ۔

"بادشاہ نے خواجہ اسعد سوداگر کے طفیل دوبارہ زندگی پائی، بادشاہ کی بانوئے خانہ یعنی شاہ بانو نے عہد کیا کہ میں خواجہ اسعد کو محل سرا میں ضرور بلاؤں گی"[۴]

عہد کرنے کا مطلب ہے کہ اسے عام اختیار نہیں تھا، عہد اسی جگہ کیا جاتا ہے جہاں کچھ رکاوٹ ہو۔

جب کوئی محل میں آتا تھا خواہ مرد ہو یا عورت تو ملکہ اسے انعام سے بھی نوازتی تھی۔ ابن بطوطہ کی بیوی جب محمد بن تغلق کے محل میں گئی تو اسے ایک ہزار روپے، سونے کے جڑاؤ کڑے اور ہار اور زر دوزی کتان کے کرتے، زردوزی ریشم کا خلعت اور کپڑے کے کئی تھان دیئے گئے اسی طرح "بوستان" میں جب شاہزادہ آردشیر بلباس زنان اپنی خالہ کے ہمراہ محل سرا میں گیا ۔

۱ے ۳۸۳ ج ۱، ۲ے ایضاً، ۳ے ۲۲ ج ۶، ۴ے ۱۲۰ ج ۵،

"ملکہ کلاں نے بطریق رونما ایک عقد مروارید مجھے دی اور نہایت خاطر مدارات سے بٹھایا۔"[1]

کسی امیر یا وزیر کی بیوی یا دختر اگر بیگم سے ملنے آئے اور وہ اسے روکنا چاہیں تو اس کا شوہر واپس بلانے کی جرأت نہیں کر سکتا خواہ وہ کتنے ہی عرصہ محل میں قیام کرے :-

"جب تک مرضی مبارک ہو اپنی خدمت میں رکھئے[2] میں خود سال دو سال کے بعد اس سے مل جایا کروں گا۔"

مذکورہ اقتباس سے ایک اور نکتہ سامنے آتا ہے کہ اس زمانہ میں سال دو سال بیوی سے دور رہنا کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ بلکہ ایک عام سی بات تھی، اس کا سبب یہ تھا کہ بادشاہ کو مہمات سر کرنے کے لئے دور دراز ملکوں میں جانا پڑتا تھا، آمد و رفت کے ذرائع محدود تھے، تیز رفتار سواریاں نہیں تھیں، اس لئے ایک مہم سے فارغ ہونے ہی میں برسوں لگ جاتے تھے، اگرچہ بادشاہ کا حرم سفر میں ساتھ ہوتا تھا لیکن اس کی تعداد محدود ہوتی، حرم کے تمام افراد کو ساتھ لے جانا بھی ناممکن تھا بادشاہ کے ساتھ اس کی کچھ بیویاں یا کنیزیں ہی ہوتی تھیں امرا یا سپاہی تنہا اپنے گھروں پر سب کو چھوڑ کر جاتے تھے۔ یہ قاعدہ بھی تھا کہ بعض لوگ روانگی کے وقت اپنی بیویوں کو آزاد کر دیتے تھے یعنی طلاق دے دیتے تھے تاکہ وہ دوسری شادی کر سکیں، مرد جس جگہ جاتے تھے، وہاں کی عورتوں سے تعلق قائم کر لیتے تھے، ہندوستان میں اس طرح آزاد کرنے کا رواج نہیں تھا بلکہ ہندو تہذیب میں عورت کی دوسری شادی بہت بری سمجھی جاتی تھی، ایسی حالت میں جب بیگمات برسوں کے لئے اپنے شوہروں سے جدا ہو جاتی تھیں حرم سرا میں پوشیدہ طور سے برائیاں پیدا ہوتی تھیں، جنسی آسودگی کے لئے خواتین ناجائز طریقے اختیار کرتی تھیں، "بوستان" میں ملکہ غاشیہ اسی قبیل کی عورت ہے :-

"ملکہ غاشیہ کا قاعدہ کلیہ تھا کہ اپنے لشکر کے بیشتر جوانان پر شہوت و مجردان قوی الاعضا کو بہر حیلہ و بہانہ محل سرا بلاتی تھی اور ان سے حسب دل خواہ فعل بد کرواتی تھی۔۔

۔۔۔۔ ہر گاہ ان کی جنروی مردی میں فرق آجاتا پھر ان کو زندہ نہ رکھتی تھی"[3]

یعنی محل کی یہ خواتین اپنے گناہوں پر پردہ ڈالنے کے لئے اس شخص کا سلسلۂ حیات ہی قطع کروا دیتی تھیں۔

کبھی کبھی بیگمات سے بھی زیادہ رتبہ بادشاہ کی ماں کو حاصل ہوتا تھا، محل کے اندر اور باہر سب ہی اس کی عزت کرتے تھے، اکثر مائیں بادشاہ کے درباری کاموں میں بھی دخیل ہوتی تھیں۔ التمش کی بیوہ شاہ ترکان نے اپنے لڑکے سلطان رکن الدین فیروز شاہ کے عہد میں سلطنت کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لی تھی،

---

[1] ۲۴۴ ج ۵، [2] سفرنامہ ابن بطوطہ قسط ۴، ص ۱۳۱، [3] ۱۵۴ ج ۵،

فرمان بھی وہی جاری کرتی تھی[۱]۔ ابن بطوطہ نے محمد تغلق کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ اپنی ماں کا بڑا احترام کرتا تھا، ایک مرتبہ جب وہ سفر سے واپس آئی تو بادشاہ خود اس کے استقبال کے لیے گیا :-

"جب وہ دارالخلافہ واپس آئی تو بادشاہ نے اس کا استقبال کیا اور گھوڑے پر سے اتر پڑا جب وہ پالکی میں سوار ہوئی تو اس کے پاؤں کو بوسہ دیا، اس وقت سب لوگ دیکھ رہے تھے"[۲]

مغل بادشاہ بھی اپنی ماؤں کے ساتھ بے حد احترام سے پیش آتے تھے، "بوستان" کے شاہزادے بھی اپنی ماؤں کا انتہائی احترام و اکرام کرتے ہیں :-

"شہزادہ قائم الملک باضطراب تمام مہدیہ سے نکل کے اپنی مادر کے استقبال کو سر راہ کھڑے ہوئے، بعد ساعت ملکہ ماہ جہاں سیدہ خاتون بنت سید اعزالدین کی سواری آئی، شاہزادہ قایم الملک اس سواری کے ہمراہ ہوئے اثنائے راہ میں شاہزادہ رکن الملک بھی پہونچے اور بعزتِ تمام اس سواری کو محل میں داخل کیا"[۳]

خورشید تاج بخش کا معمول تھا کہ صبح کو اپنی والدہ ماجدہ کے پاس سلام کے واسطے جایا کرتا تھا[۴]، ملاحظہ ہو اس وقت کی تعظیم جب وہ بیمار ہوا اور ماں اس کے پاس آئی :-

"اور تین بار فرزند دلبند کی بلا گرداں ہوئی ہر چند شاہزادہ کے جسم نازنیں میں طاقت نشست و برخاست کی نہ تھی باز ہم مادر بزرگوار کو تعظیم دی اور بآواز ناتواں کہا آپ نے کس واسطے تکلیف کی اب میں فضلِ الٰہی سے اور جناب حکیم صاحب کی توجہ سے تندرست ہوں"[۵]

محل سرا میں ماں کے بعد بادشاہ کی دایہ کا بہت احترام کیا جاتا تھا کیونکہ بادشاہ خود اسے ماں کی جگہ سمجھتا تھا، دایہ کا ذکر رسوماتِ ولادت کے سلسلے میں کیا گیا ہے۔ دایہ وہ عورت ہوتی تھی جو شاہزادہ یا شاہزادی کو دودھ پلاتی تھی، اکبر ماہم بیگم کی ماں کی طرح عزت کرتا تھا اپنی عقل و دانش کی وجہ سے یہ سلطنت کے معاملات میں کافی دخیل ہوگئی تھی، اکبر کو اس نے دودھ پلایا تھا، جہانگیر اپنی رضاعی ماں کے بارے میں لکھتا ہے :-

"ذی قعدہ کے مہینے میں قطب کوکہ کی والدہ رحمت ایزدی میں پیوست ہوگئیں۔ انھوں نے مجھ کو دودھ پلایا تھا اور میری والدہ کی جگہ پر تھیں، بلکہ ماں سے بھی زیادہ

---

۱ ہندوستانی مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے، ص ۱۵۷، ۲ سفرنامہ ابن بطوطہ ماخوذ ایضاً ص ۱۵۷، ۳ ۶۸۷ ج ۱، ۴ ۱۰۱ ج ۴، ۵ ۱۵۰ ج ۴،

مہربان رہیں، میں نے بچپن سے انھیں کی گود میں پرورش پائی، میں اپنے کاندھے پر ان کا جنازہ لے کر کچھ دور تک گیا اور ان کی وفات سے ایسا رنج والم طاری ہوا کہ کچھ روز تک نہ کھانے اور نہ لباس تبدیل کرنے کی خواہش ہوئی۔[۱]

"بوستان" میں دایہ کو یہی مقام حاصل ہے، تمام شاہزادے اور شاہزادیاں اپنی دایہ کا احترام کرتے ہیں جب معزالدین کی دایہ اس کی کتخدائی کے جشن میں آتی ہے :-

"دایہ شاہزادہ ذی جاہ نے جوشِ محبت اور غلبۂ الفت سے شاہزادہ کو گلے سے لگایا اور پیشانی ورخسار کے متواتر بوسے لئے، شاہزادہ معزالدین بھی کثرتِ محبت سے مثل مادر کے دایہ سے ملا۔"[۲]

"بوستان" میں شاہزادی کے کردار کے ساتھ ایک دایہ موجود ہے، جو شاہزادی کے مزاج اور کام میں اس کی ماں سے زیادہ دخیل ہوتی ہے، ہر معاملہ میں شاہزادی کی مدد کرتی ہے اسے اتنے اختیارات ہوتے ہیں کہ وقت پڑنے پر شاہزادی کو ڈانٹ سکے یا کسی غلط بات سے روک سکے، کفار میں ایک دایہ ایک شاہزادہ کو اس طرح نصیحت کرتی ہے :-

"خمرانہ دایہ ملعونہ بھی ملکہ کی خلوت گاہ میں پہونچی اور اس قطامہ نے بزبان تلخ ملکہ سے کہا او ناشدنی عشق باز ننگ خاندانِ سلاطین خبردار اگر بار دگر تو نے عشق و محبت کا لفظ نکالا یا کسی مرد غیر کو محلسرا میں بلایا پھر یاد رکھ کہ قید دائمی میں گرفتار کروادوں گی اس معنی کا شکر خداوند اقیانوس کی جناب میں بجالا کہ میں نے اس قصہ بدانجام کی خبر تیرے والدین کو نہیں کی ورنہ محلسرا میں قیامت عظیم برپا ہو جاتی حتیٰ کہ کوئی کنیز و خواص زندہ نہ رہتی۔"[۳]

شاہزادیوں سے بادشاہ یا ملکہ براہ راست کچھ نہیں کہتے تھے بلکہ ان کی دایہ کے ذریعہ ہی کہلواتے تھے، اور اسی طرح شاہزادیاں بھی دایہ کی معرفت بادشاہ یا ملکہ تک اپنی بات پہنچواتی تھیں۔[۴]

"ملکہ نے یہ سن کے کہا اے دایہ میری مادر سے میری طرف سے کہہ کہ یہ کتخدائی مجھ کو منظور نہیں، تم عبث زحمت نہ کرو، اور اگر اس امر میں مجھ کو زیادہ عاجز کروگی تو میں اپنے کو ہلاک کروں گی، دایہ اس بات پر برہم ہوئی اور نصیحت کرنے لگی۔"[۵]

---

[۱] تزک جہانگیری، ص ۳۲ [۲] ص ۳۸۹ ج ۹م، [۳] ص ۳۶ ج ۲، [۴] ص ۴۸۰ ج ۵، [۵] ص ۵۸۲ ج ۱،

داستان میں بعض جگہ تو دایہ کو اتنا اختیار دے دیا ہے کہ وہ شاہزادی کے والدین سے پوشیدہ اسے نکاح کرنے کی اجازت بھی دے دیتی ہے، ملکہ ناہید اور خسرو شیر دل والدین سے پوشیدہ شاہزادہ خورشید تاج بخش کی مدد سے ملتے ہیں اور ملاقات ہونے پر ملکہ کی دایہ کہتی ہے کہ "اگر مرضی مبارک ہو حضور اسی وقت برضامندی طرفین ملکہ ناہید کا خسرو شیر دل سے نکاح کر دیں، ہم دو چار زن و مرد شہادت کے واسطے کافی ہیں"۔ دایہ اس بات کی بھی ضرورت محسوس نہیں کرتی کہ والدین سے مشورہ لیا جائے[1]

شاہزادیاں دایہ کا احترام تو کرتی ہی تھیں ان سے خائف بھی رہتی تھیں۔

"اے گیسو بریدہ پھر تمہارا کیا ارادہ ہے کیا اس سیہ روزگار سے عشق بازی کرنا چاہتی ہو"

ملکہ کچھ خائف سی ہو کر کہتی ہے:۔

"اے دایہ جان خفا نہ ہو، میں چاہتی ہوں کہ جس کو نجات دی ہے اس کو اپنے ہاتھ سے قتل نہ کروں"[2]

ان چند مثالوں سے ہی یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ حرم سرا میں دایہ کی کس قدر عزت ہوتی تھی، اسے کتنا بڑا مرتبہ حاصل تھا۔

داستان میں حرم سرا کی روحِ رواں شاہزادیاں ہوتی ہیں جو قصہ کو آگے بڑھاتی ہیں اور جن کی حرکات و سکنات ہی قصہ کے اجزاءِ خاص ہوتے ہیں، دوسری صاحبِ رتبہ خواتین کی طرح شاہزادیوں کے بھی الگ الگ محلات ہوتے تھے، جہاں ان کی خدمت کے لئے کنیزیں موجود رہتی تھیں، بیرونِ شہر ہر شاہزادی کا ایک باغ ہوتا تھا جس میں وہ اپنی کنیزوں کے ساتھ جاتی اور کئی کئی روز وہاں گذارتی تھی، باغ میں قیام کیلئے محل بنا ہوا تھا لیکن شاہزادیاں بغیر بادشاہ کی اجازت کے وہاں نہیں جا سکتی تھیں[3]

حیرت ہے کہ مشرقی تہذیب میں خواتین پر ایک طرف اتنی پابندی تھی کہ وہ کسی نامحرم کی تصویر نہ دیکھ سکتی تھیں اور دوسری طرف تمام شاہزادیاں عشق کرتی ہوئی نظر آتی ہیں، اپنے مطلوب کو باغ یا محل میں بلا کر اس سے بوس و کنار کا بازار گرم کرتی ہیں۔ دراصل شاہزادیوں کی یہ آزادی قصہ کے لئے ناگریز ہے کیونکہ جب تک دونوں طرف آتشِ عشق نہیں بھڑکے گی، قصہ آگے نہیں بڑھے گا اس لئے قصہ گو اگر یہ کہتا ہے کہ "شریف زادیاں بجز خانہ پدر و مادر اور کہاں رہتی تھیں"[4] تو ایک مقام پر یہ بھی کہہ دیتا ہے:۔

---

[1] ۲۰۲، ج ۴، [2] ۲۳۵، ج ۱، [3] ۵۴، ج ۵، [4] ۲۹، ج ۴،

"میں اپنی قوم میں شاہزادی ہوں اور شاہزادیاں مطلق العنان ہوتی ہیں ان کے افعال
کا بند و بست نہیں ہو سکتا ہے[1]"

داستان کی شاہزادیوں پر دوسری بات صادق آتی ہے، اس کا سبب قصہ گو کی وہی مجبوری ہے کہ وہ گاڑی کو ایک پہیئے کے سہارے نہیں چلا سکتا، صاحبقران معزالدین اگرچہ شمسہ کے عشق میں وطن سے نکلتا ہے لیکن شمسہ بھی غائبانہ اس پر عاشق ہو جاتی ہے اور کتخدائی سے قبل بارہا دونوں ملاقات کرتے ہیں، ایسے ہی حالات ملکہ نوبہار گلشن افروز، صبح دلکشا، ملکہ صبح روشن گہر کے ساتھ پیش آتے ہیں، وصال کی بےتابیاں دونوں جانب ہیں۔ تقریباً سبھی شاہزادیوں کا یہی حال ہے اور یہ داستان کے مرکزی خیال کا تقاضا ہے لیکن اپنی جگہ یہ درست ہے کہ شاہزادیاں محلوں ہی کی زینت تھیں۔ وہاں رہ کر ہی ان کی عزت و توقیر تھی، جملہ خواتین کے علاوہ بادشاہ بھی ان کا احترام کرتا تھا، یہ محض اتفاقیہ اور قصوں کی بات ہے کہ وہ کسی پر عاشق ہوئیں اور گھر بار تیاگ دیا جبکہ ان کی نازپروری صحرانوردی کی متحمل نہیں ہے۔

"ان کے کف پا جو برگ گل سے زیادہ نازک تھے مشقت پیادہ پائی سے پر از آبلہ ہو گئے
طاقت رفتار باقی نہ رہی، ناچار کنارہ دریا ایک درخت کے سایہ میں آرام لیا،
اور اپنی پریشان حالی و خستہ جانی پر زار زار روئیں، سلاطین عظیم الجاہ کی دختران
ناز پرور تھیں کبھی ایسی مصیبتِ جانفرسا اور سختی ایام کا ذکر بھی نہ سنا تھا تمام
عمر مہدِ ناز و نعمت میں پرورش پائی تھی[2]"

یہ تو عشق کی ستم ظریفیاں ہیں کہ دختران پردہ نشیں کو دشت پُرخار سے واسطہ پڑا ورنہ "دختران سلاطین عظیم الجاہ کو اس قدر فرصت کہاں کہ آستانِ قصر سے قدم باہر رکھیں[3]" اور نہ ان کو دروازے سے باہر قدم رکھنے کا حکم تھا[4]، اگر کوئی نامحرم اسے دیکھ بھی لیتا تھا، تو اس بے گناہ کا قتل واجب ہو جاتا تھا[5] خود شاہزادیاں اپنے نام کا بھی پردہ کرتی تھیں کسی غیر مرد کے روبرو اپنا نام ظاہر نہیں کرتیں[6]۔ یہاں تک کہ شاہزادی کے پدر بزرگوار کی بھی یہ حسرت رہتی تھی کہ شاہزادی کے محل کو اندر سے دیکھ سکیں۔

"آج تک کسی مرد نامحرم کا قدم محل میں نہیں آیا حتیٰ کہ ابو عامر ملکہ کے والد امجد کو
بھی تمام عمر اندر سے محل دیکھنے کی حسرت رہی اور کبھی یہ آرزو نہ نکلی چہ جائے کہ
مزدور ۔۔۔۔ محل میں جائیں[7]"

لہ ص۱۴۲ ج ۱، ۲ہ ص ۵۰ ج ۱، ۳ہ ص ۲۰۵ ج ۱، ۴ہ ص ۲۵۵ ج ۱، ۵ہ ص ۲۸ ج ۱، ۶ہ ص ۲۹۰ ج ۱، ۷ہ ص ۲۳ ج ۳۔

اگرچہ داستان کی شاہزادیاں اپنے محل یا باغ میں اپنے مطلوبوں سے مختلط ہوتی ہیں لیکن شرم و حیا کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑتیں، گویا ان کی پرورش ایسے ماحول میں ہوتی ہے کہ ادب و لحاظ ان کے خمیر میں شامل ہو جاتا ہے، حیا ان کا زیور بن جاتی ہے اور شرم ان کا لباس۔ ان شاہزادیوں کے سامنے کسی غیر مرد کی تعریف کرنے کی بھی ممانعت ہوتی[1] تھی :۔

"اے ضعیفہ اجل گرفتہ دیوانی ہوئی ہے کہ ایک غیر مرد کی صورت کی تعریف ملکہ کے روبرو کرتی ہے"[2]

اگر کوئی دوسرا ان کے مطلوب کا نام ان کے روبرو لے دیتا[3] تھا یا اس کی محبت کا ذکر کر دیتا تھا[4] تو شرم سے غنچہ ہو جاتی تھیں۔

اگرچہ یہ بات مسلم ہے کہ عورت مرد سے زیادہ عیاش ہوتی ہے لیکن وہ حیا و لحاظ کا دامن بہت کم ہی چھوڑتی ہے، مرد جلد باز اور بے صبر ہوتا ہے، عورت ضبط کرنے کی قوت رکھتی ہے :۔

"جب شاہزادے نے ملکہ سے قصد صحبت کیا ملکہ نے کہا اے شاہزادے مجھ کو میرے وطن لے چلو اور میرے پدر سے میری خواستگاری کرو، وہ مجھ کو بمنت تم کو دے گا اور اس طرح اگر چاہتے تو مجھ کو منظور نہیں، شاہزادے نے بناچاری قبول کیا[5]"

وہ والدین کی اجازت اور خاندان کی عزت کو اولیت دیتی تھیں :۔

"آپ ہی غور فرمائیے کہ اگر میرے والدین یہ خبر موحش سنیں گے کہ زہرہ لقا بے اجازت ہماری طلسم کشا کے ساتھ ہم بستر ہوئی کس قدر ملول و آزردہ ہوں گے[6]"

یہ اس تہذیب کی پروردہ شہزادیاں ہیں جہاں کسی شاہزادے کا بھی غرفہ کے نیچے کھڑا ہونا باعث رسوائی سمجھا جاتا تھا[7] جہاں شاہزادیاں نامحرم سے بچنے کے لئے اپنے کو ہلاک کرنے کا عزم کرتی تھیں[8]

اس درجہ پوشیدگی اور پردہ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انھیں محل کے قید خانوں میں رکھا جاتا تھا بلکہ یہ اپنے محل میں بالکل آزاد ہوتی تھیں، اپنے باغوں میں سیر کے لئے جایا کرتی تھیں، اگر خواہش ہوئی یا والدین نے یاد کیا تو ان سے ملاقات کے لئے چلی گئیں[9]۔ شاہزادیاں جب باغ میں جاتی تھیں، تو بڑا اہتمام کیا جاتا تھا، ان کی آمد سے قبل باغ میں خواجہ سرا آتے تھے تاکہ اگر کوئی غیر شخص محل میں آ گیا ہو تو اسے نکال دیں، جاروب کش

---

[1] ج ۵، ۱۳۰ [2] ج ۴، ۴۴۴ [3] ج ۲، ۳۵۲ [4] ج ۲، ۵۰۷ [5] ج ۱، ۵۱۵ [6] ج ۵، ۴۵۴ [7] ج ۵، ۴۱۶ [8] ج ۵، ۸۷، ۱۱۸۶ [9] ج ۲، ۶۸ ج ۴م،

باغ کو خس و خاشاک سے پاک و صاف کرتے تھے، فراش آکر ایوان کو فرش پاکیزہ سے مزین کرتے تھے، پھر کنیزیں آتی تھیں تمام باغ کے مکانات کو آراستہ کرتی تھیں، درختوں کو بھی اطلس و زر لبفت سے منڈھا جاتا تھا لبِ حوض تخت مکلف بچھتا اور جب شاہزادی کی سواری آتی تھی تو صدہا نازنینان سیم اندام دو رویہ صف بستہ ایستادہ ہو جاتی تھیں، نہایت تجمل و شوکت کے ساتھ شاہزادی تختِ رواں پر سوار ہو کر باغ میں داخل ہوتی تھی[1] باغ میں پہونچ کر وہ اپنی ہم سنوں کے ساتھ کھیلتی، کبوتر و فاختہ کا شکار کرتی[2] صحرا میں ہرن وغیرہ کے شکار کے واسطے جاتی[3] اس طرح کبھی کبھی روز باغ میں گزار دیتی اور یہ بات بھی نہیں تھی کہ بادشاہ اس کے اس مشغلے سے غافل رہتا ہو :-

"حوران ملک ہمارے سلام کے واسطے نہیں آئی ملکہ نے کہا پانچ روز سے حوران ملک سیر باغ کے واسطے گئی ہے، ملک عنتر برہم ہوا اور کہا اب وہ شوخ دیدہ ایسی مطلق العنان ہو گئی کہ پانچ پانچ دن برابر باغ میں رہتی ہے"[4]

حرم سرا میں شاہزادیاں اور بیگمات مختلف تفریحی کھیل کھیلا کرتی تھیں مثلاً شطرنج[5]، چوسر[6] وغیرہ۔ مصوری کا بھی شوق رکھتی تھیں[7] خوبصورت جانوروں کو بھی محل میں پالا کرتی تھیں ہرن پالنے کا عام طور پر رواج تھا[8]۔ طوطے پالنے اور انھیں پڑھانے کا رواج قدیم زمانہ سے ہے کئی داستانوں میں طوطے کی مدد سے قصہ آگے بڑھتا ہے۔ "بوستان" میں بھی ہندوستان کے بادشاہ کی دختر روپ سنگار کو طوطوں کا بہت شوق ہے کئی ہزار طوطے اس کے محل میں موجود ہیں اور چار سو برہمن انھیں تعلیم دینے کے لئے نوکر ہیں، تاکہ ان کو حکایات رنگین اور غزل و دوہے کا سبق دیں[9]

محل میں شاہزادیوں کے لئے کتب خانہ بھی ہوتا تھا جس کی دیکھ بھال کے لئے کنیزوں ہی میں سے کوئی ایک داروغہ مقرر ہوتی تھی[10] غرضکہ ہر طرح کا عیش و آرام اور آزادی شاہزادیوں کو حاصل ہوتی تھی ان کے محل کی آرائش و خوبصورتی بھی اپنی مثال آپ تھی :-

"صاحبقران نے اس صنعت و ترکیب اور آرایش و زینت کا محل دیکھا کہ ہوش بجا نہ رہے یعنی قطع نظر مکانات وسیع و رفیع کے بالائے اشجار متعدد انہار و چشمہائے آب شیریں جاری تھے اور ۔ ۔ ۔ مکانات کے در و دیوار میں

---

[1] ۳۴۶ ج ۴، ۵۳۱ ج ۵، [2] ۳۹۳ ج ۴، [3] ۲۶۶ ج ۵، [4] ۵۲۶ ج ۴، [5] ۲۶۵ ج ۴، [6] ۵۶۲ ج ۶، [7] ۶۳۲ ج ۴، [8] ۳۳۱ ج ۵، [9] ۳۰۵ ج ۱، ۱۹۲ ج ۵، [10] ۱۰۲ ج ۴،

ایسے نقش و نگار تھے کہ ہر مکان بجائے خود صفحہ مانی وارژنگ کا حکم رکھتا تھا[1]۔

حرم سرا میں سب سے زیادہ تعداد کنیزوں یا لونڈیوں کی ہوتی تھی، یہ ہزاروں کی تعداد میں حرم سرا میں رہتی تھیں، آئین اکبری میں ابوالفضل نے پانچ ہزار کے قریب لکھا ہے، یہ عروج کا زمانہ تھا، عہد زوال ہی میں احمد شاہ ابدالی کو حضرت محل کے جہیز کے ساتھ چار سو کنیزیں دی گئیں، برنیر کنیزوں کے بارے میں لکھتا ہے:

"محل میں مختلف نسلوں سے تعلق رکھنے والی دو ہزار عورتیں ہیں جن کے الگ الگ مناصب اور معمولات ہیں ان میں سے کچھ بادشاہ کی خدمت گار ہیں، کچھ بیگمات اور شاہزادیوں کی اور کچھ حرم سرا کی مختلف خدمات پر مامور ہیں، ہر خدمت گار کا اپنا علیحدہ ایک کمرہ ہے اور ہر بارہ کنیزوں پر ایک خواص نگرانی کرتی ہے جسے ان کنیزوں ہی میں سے منتخب کیا جاتا ہے[2]۔"

اتنی تعداد اور ایسے ہی مراتب کے ساتھ کنیزیں "بوستان" کے شاہی محلات میں موجود ہیں۔ داستان نگار ایک شاہزادی کی کنیزوں کے بارے میں لکھتا ہے کہ "ایک ہزار کنیزیں ماہرو اور خواصیں سنبل موہم عمر ملکہ محبوبہ کی ہم بازی کے واسطے معین تھیں[3]۔ ان میں حبشیہ بھی ہیں اور ترکیہ بھی[4]۔ محلسرا میں حمالی اور محافظت کے فرائض عام طور پر کنیزانِ حبشیہ انجام دیتی تھیں[5]۔ جو کنیزیں پہرہ دیتی تھیں انھیں کنیزانِ چوکی یا پاسدار کہتے تھے[6]۔ کنیزانِ محل بیشتر خوبصورت ہوتی تھیں، ان میں بعض کو بادشاہ یا شاہزادوں کی خاص عنایت بھی حاصل ہوتی تھی، جو بادشاہ کے محل میں آجانے کے بعد ہر وقت اس کی خدمت میں لگی رہتی تھیں، بادشاہ بھی انھیں نظر التفات سے دیکھتا تھا، یہاں ایک بات اور واضح کر دینا مناسب ہے کہ اسلام میں خریدی ہوئی کنیزوں کو اپنے تصرف میں لانا جائز تھا اس لئے مسلمان حکمران کافی تعداد میں اپنے حرم میں کنیزیں رکھتے تھے، داستان نگار خود اس نکتہ کی وضاحت کرتا ہے :-

"پھر وہ صاحبقرانِ نامدار کی کنیزانِ خاص کا حکم رکھتی ہیں اور کنیزوں کا تصرف میں آنا شرعاً و عرفاً کسی طرح ممنوع نہیں ہے[7]۔"

مغل بادشاہانِ ہند اور نوابین اودھ کے حرم کنیزوں سے بھرے ہوئے تھے، داستان میں بھی تمام شاہزادے بے شمار کنیزوں سے ہم صحبت ہوتے ہیں، طلسم کی ہر نازنیں شاہزادے کی کنیز کا درجہ رکھتی ہے اور شاہزادہ ہر ایک سے مختلط ہوتا ہے[8] اور یہ نازنین اس بات کو باعثِ فخر سمجھتی ہیں۔

---

[1] ۴۱۰ ج ۵، [2] فکر نو، شاہ جہاں آباد نمبر، ص ۲۹، [3] ۱۰۲ ج ۵، [4] ۱۳۶ ج ۹م، [5] ۵۱۵ ج ۳، [6] ۵۹۹ ج ۵، [7] ۵۹۴ ج ۵، [8] ۵۶۷ ج ۱،

محل سرا میں بادشاہ اور شاہزادوں کی خدمت کنیزوں ہی کے ذمہ ہوتی تھی، جب شاہزادہ منھ ہاتھ دھونے جاتا ہے تو یہ سیلاپچی اور آفتابہ لے کر حاضر ہوتی ہیں[1]۔ غسل کے وقت یہ کنیزیں کیسہ ہائے زرکار اور طاسہائے زریں لے کر حمام میں پہونچتی ہیں اور شاہزادہ کے بدن کو مل مل کر نہلاتی ہیں[2]:۔

"صاحبقران نے ان سے فرمایا میں آج غسل ترتیبی نہیں کرنے کا، چند آفتابوں سے نہلا دو[3]"

"غمزہ ملک نے لنگ بستہ نہایت تکلف و سلیقہ سے صاحبقران خورشید مرتبت کو نہلایا[4]"

شام کے وقت محفل رقص و نغمہ آراستہ ہوتی تھی اور بادشاہ، شاہزادے سونے کے لئے بستر پر دراز ہو جاتے تھے تو کنیزیں اس کے گرد پہرہ دیتی تھیں:۔

"کنیزیں بطریق چوکی پلنگ کے گرد و پیش جمع تھیں[5]"

کچھ پانوں سہلانے کی خدمت انجام دیتی تھیں:۔

"اور موافق معمول آخر شب سو رہا کنیزیں کمال ادب و سلیقہ سے نوبت بنوبت پانوں سہلاتی رہیں[6]"

بادشاہ یا شاہزادے ہی کنیزوں کی صحبت سے فیض حاصل نہیں کرتے تھے بلکہ ان کے امرا بھی انھیں کے نقش قدم پر چلتے تھے، بیویاں اگر عاذر کرتیں تو ان کی خواصوں کو تصرف میں لاتے[7]، شاہزادوں یا امرا کے ان افعال پر ان کی بیگمات معترض نہیں ہوتی تھیں، لیکن بعض حساس خواتین اس امر کو برا سمجھتی تھیں، ملکہ رضیہ سلطان جو ایک پاک دامن صاحبِ عصمت و عفت شاہزادی ہے جب عالم خواب میں صاحبقران اصغر کو قمر سیما سے عیش کرتے ہوئے دیکھتی ہے تو خواب ہی میں کہتی ہے:۔

"او مرد عیش دوست بدنیت طلسم کشا ہونا آسان مگر قوت ممیزہ حاصل ہونی مشکل فرقہ انسان کو مشکل ہے آیا اس حال سے بھی تجھے کسی رہنما نے آگاہ کیا ہے یا نہیں کہ یہ قمر سیما تیری زیر مشق و منظور ایک لولی طلسم یعنی زن رقاصہ و مطربہ ہے، حیف صد حیف کہ تیرے مانند جوان باقدر و منزلت ایسی مبتذل، کم مرتبہ عورت سے ہم آغوش ہو[8]"

لے ص ۱۴ ج ۵، ۲ے ص ۴۰ ج ۵، ۳ے ص ۶۰۴ ج ۵، ۴ے ص ۶۰۶ ج ۵، ۵ے ص ۱۴۵ ج ۵، ۶ے ص ۳۲۹ ج ۳، ۷ے ص ۵۵۷ ج ۳، ۸ے ص ۲۷ ج ۶

رضیہ سلطان کا یہ طنز ذہن کو اس طرف بھی منتقل کرتا ہے کہ شعوری یا غیر شعوری طور پر طلسم کشا سے متعلق یہ بات کہتے وقت مصنف کے ذہن میں جہاندار شاہ کی لال کنور اور محمد شاہ کی اودھم بائی رہی ہوگی، ادب و لحاظ یا خوف کی وجہ سے چاہے بادشاہ پر کوئی اعتراض نہ کرسکے لیکن ادنیٰ درجہ کی عورت کا مرتبۂ شاہی تک پہونچنے کا قلق سب کو تھا۔

کنیز کی حیثیت بہر حال خدمت گار کی ہے، طلسم بیضا میں ملکہ روشن گہر کا مرتبہ صاحبقران اکبر کی چار ازواج کے بعد کنیزی میں آتا ہے تو وہ برہم ہوتی ہے :۔

"مجھے اپنا مرنا قبول ہے لیکن کنیزی اور پرستاری سے نامزد ہونا منظور نہیں، یہ امر میرے حق میں اچھا ہو یا بدتر مجھ کو اس لفظ کے سننے کی تاب نہیں ہے"[1]

اس طرح زہرہ لقا اپنے مرشد سے کہتی ہے :۔

"یہ زیادہ تر کاہش دل کی بات ہے ----- کہ حسب احکام بانیان طلسم اور حسب سررشتہ طلسمی طلسم کشا کی زمرۂ کنیزوں میں شمار کی جاؤں گی اور کنیز و خواص کی جو توقیر و آبرو ہوتی ہے وہ حضرت کے ضمیر انور پر روشن ہے"[2]

کنیزوں کا زیادہ تعلق بیگمات سے رہتا تھا اس لئے وہ اپنی بیگم کی بہت عزت کرتی تھیں، بیگمات بھی ان پر مہربان رہتی تھیں، موقع بموقع انھیں انعامات سے نوازتی تھیں، انھیں نوازشات کی وجہ سے کنیزیں ملکہ کو مجازی خدا سمجھتی تھیں :۔

"اے ملکہ آفاق آپ ہماری خدائے مجازی ھیں"[3]

اور ملکہ کی جوتیاں کھانے کو بھی تیار رہتی تھیں :۔

"ہمیں کفش کاری کرنا خاص ملکہ آفاق کا منصب ہے دوسرے کی مجال نہیں، کس واسطے کہ وہ ہماری ولی نعمت ہیں تعزیر دیں"[4]

وقت پڑنے پر ملکہ کی حفاظت کے واسطے دشمن سے مقابلہ کے لئے آمادہ رہتی تھیں :۔

"خواصوں نے عرض کیا اے ملکہ خوباں اگرچہ ہم نے اپنے ہاتھ سے فی الحقیقت کدو تک نہیں تراشا، مگر دشمن کے سر تراشنے میں حتی الوسع قصور نہیں کرینگے"[5]

ملکہ کے لئے جان بھی قربان کرنی پڑ جاتی تو دریغ نہیں کرتیں :۔

---

[1] ۱۸۰ ج ۹م، [2] ۲۱۶ ج ۵، [3] ۲۵۷ ج ۳، [4] ۲۵۶ ج ۳، [5] ۲۸۲ ج ۲،

"ذکیہ سلطان نے کہا قربانت شوم سعی و کوشش کے کیا معنی اگر ہماری جان بھی تمہارے
معاملے میں ضائع ہو جائے گی بخدا دریغ نہیں کرنے کے بلکہ نجات دارین سمجھیں گے"[1]

اپنی خاتون کا خوف ہر وقت ان کے دل پر چھایا رہتا تھا کسی سے ملنے میں بھی اعتدال کو ملحوظ رکھتی تھیں :-

"تم بے اعتدالی کو کام فرماتے ہو ایسا نہ ہو کہ میری خاتون کو اس صحبت بے تکلفانہ کی
خبر پہونچے اور وہ مجھ کنیز کے حال پر عتاب فرمائے"[2]

ایک اور کنیز یوں کہتی ہے :-

"سلاطین زادیوں کا افشائے راز کرنا گویا نخل حیات قطع کرنا ہے"[3]

حرم سرا میں کنیزوں اور خواصوں کے علاوہ خواجہ سرا بھی ہوتے تھے، خواجہ سرا کو شاہی خاندان میں بڑا رسوخ حاصل رہتا تھا، اس کی حیثیت پہرہ دار کی بھی ہوتی تھی اور پیام رساں کی بھی یہ مخنث مرد ہوتے تھے، خواتین کی طرح بڑے زرق برق لباس میں رہتے تھے، خواجہ سرا بنانے کی رسم ہندوستان میں قدیم زمانہ سے تھی جس کی وجہ سے اکثر بچے ضائع بھی ہو جاتے تھے، محل سے تعلق ہونے کے لالچ میں خواجہ سرا بنایا جاتا تھا، جہانگیر نے لکھا ہے کہ :-

"میں نے حکم دیا کہ اس رسم کو تمام ملک سے ختم کیا جائے صوبہ بنگال کے حاکم
اسلام خاں اور دیگر حاکموں کو فرمان جاری کیے کہ اگر کوئی اس حکم کی خلاف
ورزی کرے تو اسے پوری پوری سزا دی جائے انشاءاللہ تھوڑی ہی مدت میں
یہ منحوس رسم بند ہو کر خواجہ سراؤں کی خرید و فروخت بالکل بند ہو جائے گی"[4]

محمد شاہ کے زمانہ میں ایک خواجہ سرا جاوید خاں شاہی معاملات میں بڑا دخیل تھا۔ بوستان ہیں بھی بعض جگہ خواجہ سراؤں کا ذکر آیا ہے[5]

پیشتر ذکر کیا جا چکا ہے کہ شاہی حرم سرا کے اطراف بڑا سخت پہرہ ہوتا تھا نہ کسی کو اندر جانے کی اجازت تھی اور نہ کوئی باہر آ سکتا تھا، شاہی خاندان کی خواتین کی عزت و آبرو کا بڑا خیال رکھا جاتا تھا، اسلام میں یوں بھی کسی عورت کو غیر مرد کے روبرو آنے کی اجازت نہیں، پردہ کرنے کی ہدایت کی گئی ہے، ہندو راجاؤں کے یہاں بھی پردے کا ذکر ملتا ہے، "بوستان" ہی میں ہندو عورتوں کے بارے میں لکھا ہے کہ :-

"ایک پردہ باریک بطریق نقاب چہرہ پر ضرور ہوتا ہے۔"[6]

---

[1] ۳۸ ج۲، [2] ۲۳۵ ج۲، [3] ۲۰ ج۲، [4] تزک جہانگیری ص ۱۱۳، [5] ۶۵ ج۳، [6] ۲۵۳ ج۱،

مسلمانوں کے ہندوستان آنے کے بعد پردہ بہت سخت ہو گیا، یہ مردوں کی طرف سے خواتین کیلئے پابندی نہیں تھی بلکہ شریف عورتیں خود اس بات کو پسند نہیں کرتی تھیں کہ کوئی غیر مرد انھیں دیکھے مشہور ہے کہ ایک مرتبہ نورجہاں ہوا خوری کے لئے محل کے کوٹھے پر ٹہل رہی تھی کہ کسی راہ گیر نے اسے دیکھ لیا، غیرت نے یہ گوارا نہ کیا، اسی وقت تمنچہ نکال کر راہ گیر کو ختم کر دیا، جہاں آرا بیگم نے اسی جرم میں ایک شاعر صیدی طہرانی کو شہر سے نکالنے کا حکم دیا تھا، ابوالفضل نے حرم سرا کے گرد پہرے کے متعلق لکھا ہے :-

"حرم شاہی کے اندرونی حصے میں باعصمت عورات بطور پاسبان مقرر ہیں ..... حصار حرم کے باہر خواجہ سراؤں کا پہرہ ہے اور ان سے مناسب فاصلے پر باوفا اور قابلِ اعتماد راجپوتوں کا ایک گروہ پاسبانی کا کام انجام دیتا ہے، راجپوتوں کے بعد حصار کے دروازوں پر بھی جفاکش و راست باز پاسبان پہرے کے لئے مقرر ہیں ان نگہبانوں کے علاوہ حصار کے بیرون چاروں طرف امرا، احادی و دیگر اہلِ فوج مرتبہ بمرتبہ نگہبانی کرتے ہیں"[۱]

ایسے ہی پہرے کو دیکھکر برنیر کہتا ہے کہ قریب قریب ناممکن ہے کہ وہ انسان کو نظر آسکیں[۲]

"بوستان خیال" میں بھی پردے کی یہی سختی نظر آتی ہے، خورشید لقا اس وجہ سے صاحبقران اصغر کے روبرو نہیں آتی کہ اس نے والدین سے اجازت نہیں لی ہے[۳] جبکہ خورشید صاحبقران کی ملکِ خاص تھی[۴] شاہزادے سے گفتگو کے وقت درمیان میں پردہ حائل ہوتا ہے[۵]، ملکہ محفل افروز شاہزادے کے سامنے آنے سے قبل نقاب افگندہ ہوتی ہے[۶]، بیگمات اس وقت تک کسی کے سامنے نہیں جاتیں جبتک اپنے شوہر سے اجازت حاصل نہ کرلیں[۷]

"بغیر رضامندی یا بے اجازت مالکِ نفس کے کسی غیر کے روبرو بے پردہ ہونا صاحبانِ عفت و عصمت سے بعید ہے[۸]"

صاحبقران اکبر کے حریف جمشید خود پرست کی بیوی بھی پردہ کرتی ہے[۸]، اس کی وجہ یہ ہے کہ داستان نگار ہر مذہب و ملت کی عورت کا مرد نامحرم کے روبرو جانا خلافِ شرع سمجھتا ہے[۹] یہ بیگمات اگر کبھی ثواب کے لئے قیدیوں کو کھانا کھلانے جاتی ہیں تو اول قیدیوں کی آنکھوں پر پٹیاں بندھوا دی جاتی ہیں تاکہ کوئی دیکھ نہ سکے[۱۰]

۱؎ آئینِ اکبری جلد اول ص ۷۵، ۲؎ سفرنامہ برنیر، ص ۵۴۳، ۳؎ ۳۲۹ ج ۵، ۴؎ ۵۵۲ ج ۱، ۵؎ ۴۳۷ ج ۱، ۶؎ ۷۴۳ ج ۱، ۷؎ ۴۶۶ ج ۴، ۸؎ ۳۰۴ ج ۴، ۹؎ ۳۷۲ ج ۵، ۱۰؎ ۷۶ ج ۳،

سلطان رکن الملک نے صرف اس وجہ سے بیٹی کو قتل کرنے کا ارادہ کیا کہ اس نے مردانہ لباس پہن کر میدانِ جنگ میں مقابلہ کیا جس سے اس کے قد و قامت پر نامحرموں کی نظر پڑی[1]۔ حرم سرا میں پردہ کا یہ عالم ہے کہ جب دس سالہ بدرِ منیر محل میں جاتا ہے تو نو سالہ شاہزادی حجرہ میں مخفی ہو جاتی ہے[2]۔

صرف خواتین ہی اپنے پردہ کا لحاظ نہیں رکھتیں بلکہ مرد بھی ان کے پردے کا خیال کرتے ہیں:

"دیوانہ ہوا ہے خبردار ایسی حرکت نہ کرنا ہمارا یہ منصب نہیں کہ اپنے ولی نعمت کی ناموس کو دیکھیں[3]"

"تم محلسرا میں پردہ کرواؤ، سالوط نے پردہ کروایا اور انکو اندر محلسرا کے لے گیا"[4]

غرض نامحرم سے پردہ کا ذکر داستان میں ہر جگہ موجود ہے[5]۔

حرم سرا میں کسی تہوار یا خوشی کے موقع پر جو جشن کیے جاتے تھے ان کی رونق بھی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی، تمام بیگمات اور شاہزادیاں اس میں ہمہ تن معروف و مسرور نظر آتی تھیں، کبھی یہ بادشاہ یا شاہزادہ کی فتح پر جشن مناتی تھیں اور کبھی اپنے محل میں بادشاہ کو دعوت دیتی تھیں۔ نور جہاں نے شاہ جہاں کی فتح کی خوشی میں جشن کی محفل منعقد کی تھی اور سب کو انعامات سے نوازا تھا[6]۔ جہانگیر کے لئے بزم دعوت کا اہتمام کیا تو پورے محل میں چراغاں کیا تھا[7]۔ ایسے موقعوں پر محلسرا میں رقص و سرود کی محفلیں منعقد ہوتی تھیں، کنیزیں نقلیں پیش کرتی تھیں، طرح طرح سے دل بہلایا جاتا تھا، جشن کا تفصیلی ذکر تفریحات کے ذیل میں کیا گیا ہے۔

---

[1] ص ۳۶۱ ج ۱، [2] ص ۴۰ ج ۴، [3] ص ۱۵۵ ج ۳، [4] ص ۱۸۰ ج ۲، [5] ص ۱۹۶، ۳۲۸ ج ۱، ۱۵۲ ج ۲، ۳۲۶، ۳۴۱، ۵۴۰، ۵۴۱ ج ۴، ۱۵۶، ج ۵، [6] تزک جہانگیری، ص ۳۶۱، [7] ایضاً، ص ۱۹۸،

(ب)

معاشرتی حالات

کیفیتِ شہر۔ ملبوسات۔ زیورات و جواہرات۔ اشیائے خورد و نوش اور آدابِ دسترخوان۔ تفریحات۔ جشن۔ گیندہ بازی۔ شطرنج۔ مینا بازار۔ قصہ گوئی۔ نقالی۔ چوگان بازی۔ شکار۔ عرس اور میلے۔ درباری مسخرہ اور اخلاقی اقدار۔ اعتقادات۔ رسم و رواج۔

ہر دور کا ادب اپنے عہد کی تہذیب اور زندگی کا عکاس ہوتا ہے اور اپنے دور کی عصری حسیت کو پیش کرتا ہے جس کا اظہار کم و بیش زندگی کے ہر شعبہ میں دکھائی دیتا ہے، اس حقیقت کو وہ لوگ بھی فی الجملہ تسلیم کرتے ہیں جو ادب برائے ادب کے قائل اور اس کا رشتہ ذہنی اور زندگی سے زیادہ کتاب اور لغت سے جوڑنا چاہتے ہیں بقول ڈاکٹر محمد حسن "انفرادی ذہن بھی بالآخر سماجی زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے اور وہ ادیب بھی جو اپنی نفسیاتی الجھنوں کی عکاسی کرتے ہیں دراصل زندگی ہی کے عکاس ٹھہرتے ہیں"[1]

جب ہم کسی عہد کا مطالعہ کرتے ہیں تو تاریخ کی کتابوں سے ہماری رسائی صرف بیشتر سیاسی موضوعات تک ہو پاتی ہے جس کی روشنی میں ہم اس زمانہ کی زندگی کی معاشرت و معیشت کو بھی ایک حد تک سمجھ سکتے ہیں۔ عام طور پر ہمارے قدیم مورخ اس عہد کی تہذیب کو مختلف دائروں میں رکھکر سمجھنے اور پرکھنے کی کوشش نہیں کرتے جس سے نہ صرف یہ کہ اس کی صحیح تصویر سامنے آجائے بلکہ اس کا اپنے زمانہ اور اس دور میں گذاری جانے والی زندگی سے رشتہ بھی اپنے داخلی اور خارجی عوامل کے ساتھ واضح ہوتا چلا جائے دوسرے الفاظ میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ کوئی بھی مورخ اس عہد کی تہذیب و تمدن پر روشنی نہیں ڈالتا وہ یہ نہیں بتاتا کہ اس دور کے سماجی حالات کیا تھے، لوگ کس طرح زندگی گذارتے تھے، ان کے رہن سہن کا انداز کیا تھا، وہ کیا پہنتے تھے، کیا کھاتے تھے، ان لوگوں میں کیا برائیاں اور کیا اچھائیاں تھیں اور کن معاشرتی اقدار کی وجہ سے وہ طبقوں میں تقسیم ہو جاتے تھے، سماج کی ان باتوں سے دوسرے لفظوں میں تہذیبی تاریخ سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے اس عہد کے ادب کا مطالعہ کرنا پڑیگا، ادب اپنے عہد کی زندگی کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔

کسی معاشرے کی زندگی کے منفرد اور مجموعی خد و خال کو دیکھنے کے لئے فنون لطیفہ میں فن تعمیر اور دستکاریوں کے نمونے بھی کام آتے ہیں لیکن سب سے زیادہ مدد اس زمانے کے ادب پاروں سے ملتی ہے تمام تہذیبی اور سماجی تاریخیں ادب ہی کے ذریعہ مرتب کیجاتی رہی ہیں خواہ یہ ادب مذہبی ہو یا غیر مذہبی، اس کا تعلق عوام سے ہو یا خواص سے۔ اگرچہ ادیب اپنی تخلیقات کی زیادہ تر بنیاد محض اپنی قوت متخیلہ پر رکھتا ہے لیکن نیم شعوری یا لاشعوری طور پر وہ حقیقی زندگی جو اس کے ارد گرد پھیلی ہوئی ہوتی ہے، اس کی تخلیق میں شامل ہو جاتی ہے کیونکہ کوئی قلمکار اپنی اطراف کی دنیا سے صرف نظر کر کے قلم اٹھا ہی نہیں سکتا اس کا مطالعہ اور مشاہدہ ہی تخلیقی فکر دریاؤں

---

[1] ادبی تنقید۔ ص: ۱۲

کی شکل میں روپ بدل کر سامنے آتا ہے۔ تخیل سے زندگی کی وابستگی کے سلسلے میں ڈاکٹر اجمل اجملی نے رالف فاکسن کے حوالے سے لکھا ہے کہ :۔

"ہماری تمام تخلیقات جو قوت متخیلہ سے تعلق رکھتی ہیں ایک ایسی دنیا کا عکس ہیں جس میں ہم زندگی بسر کرتے ہیں، یہ اپنی دنیا سے ہمارے تعلقات، ہماری محبت، ہماری نفرت اور جو کچھ تاثرات ہم اس دنیا سے حاصل کرتے ان کا نتیجہ ہیں، یہ آب و رنگ، یہ شکل و شباہت، یہ ہوا کے جھونکے، یہ زندگی کی خوشبوئیں، انسانی زندگی کی حیاتی خوبصورتی اور بدصورتی، یہ انسان، عورت، مرد کے یہ خواب و خیالات، فکر و عمل، جن سے ہمارا بھی تعلق ہے، یہ ساری چیزیں ادب اور فن کا مواد فراہم کرتی ہیں۔"[1]

ادب میں شاعری ہو یا فکشن، اپنے عہد کی بولتی تصاویر ہر صنف میں نظر آتی ہیں لیکن بمقابلہ شاعری کے فکشن میں مفصل بیان کرنے کا موقع اکثر زیادہ ملتا ہے اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ شاعری کا دائرہ وسعتِ بیان کیلئے تنگ ہے۔ مثنوی میں بہت کچھ سمیٹ لیا جاتا ہے لیکن اوزان و بحور و قوافی کی قید بیان کو زیادہ دور اور دیر تک نہیں لے جا پاتی، اس کے برعکس افسانوی ادب کی مخصوص صنف داستان بحرِ ذخار ہے جو پوری کائنات کو اپنے اندر سمونے کا حوصلہ رکھتی ہے۔

اصنافِ ادب میں داستان وہ واحد صنف ہے جس میں معاشرے کی زیادہ واضح تصویریں نظر آتی ہیں، ناول یا افسانہ زندگی کے کسی ایک واقعہ کو بیان کرتا ہے جس کا تعلق ہمارے ارد گرد کی زندگی سے ہوتا ہے اور اس کے کردار ہمیں اپنے جیسے لگتے ہیں اس لئے وہ ہمیں اپنی زندگی کے مسائل سے زیادہ قریب نظر آتے ہیں لیکن کسی ایک ناول یا افسانے سے سماج اور تہذیب کے کسی ایک پہلو پر تو روشنی پڑ سکتی ہے مکمل تاریخ مرتب نہیں کی جا سکتی، تہذیب کی عکاسی کے وقت وہ آئینہ نہیں بن سکتے اس کے برعکس کوئی بھی ایک داستان فرد اور اس کی زندگی از ولادت تا وفات، اس کے اطراف کا معاشرہ، معاشرہ کی رسم و رواج، رہن سہن کے طریقے، آداب و اعتقادات وغیرہ کو بڑی وضاحت سے پیش کر دیتی ہے کسی بھی ایک داستان سے اس کے عہد کی تہذیب و تمدن کی واضح تصویر بنائی جا سکتی ہے مثلاً سحر البیان، گلزارِ نسیم، فسانۂ عجائب اگرچہ چھوٹی چھوٹی داستانیں ہیں لیکن ہر ایک اپنے عہد کی عکاس ہیں، بقول ڈاکٹر محمد حسن :۔

"یہ ہمارے تمدن کی ابتدائی تصویریں ہیں اور انہی کے بل بوتے پر ہم اس دور کے تمدنی خاکہ مرتب کر سکتے ہیں اس دور کی تاریخ کو کوئی تذکرہ اس سے زیادہ سچی اور واضح تصویر پیش نہیں کر سکتا۔"[2]

داستان نگار کا مقصد اگرچہ صرف ایک مسلسل قصہ بیان کرنا ہوتا ہے لیکن اس قصہ کے ساتھ جو ایک پورا معاشرہ، ایک تہذیب چلتی ہے وہ صرف طبقۂ اعلیٰ کی زندگی کو پیش نہیں کرتی بلکہ عام زندگی کے مرقعے بھی شامل ہوتے ہیں، داستان کے بڑے اور بنیادی

۱۔ اردو کے افسانوی ادب میں عوامی زندگی کی عکاسی از ڈاکٹر اجمل اجملی ص ۵ ، ۲۔ ادبی تنقید ص ۱۷۷

کرداروں کی تعداد چند ہوتی ہے، ایک شاہزادہ، ایک شاہزادی ان کے علاوہ ایک آد بادشاہ یا وزیرزادہ، لیکن داستان کی باقی بھیڑ کا تعلق اس دنیا ہی سے ہوتا ہے جو عوام کی نمائندگی کرتی ہے، غلام، کنیزیں، سپاہی وغیرہ سماج کے عام طبقہ سے ہی تعلق رکھتے ھیں۔ خود داستان نگار کوئی بادشاہ یا شاہزادہ نہیں ہوتا بلکہ ایک معنی میں اس کا تعلق طبقۂ عوام ہی سے ہوتا ہے۔ وہ دربارِ شاہی میں قصہ ضرور سناتا ہے، لیکن دن، رات کا بیشتر وقت عام لوگوں کے ہی درمیان گذارتا ہے۔ ان کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہے، انھیں کی طرح باتیں کرتا ہے، وہی چیزیں کھاتا پیتا ہے، وہی رسم ورواج جو عام زندگی میں رائج ہوتے ہیں اور اس کے گرد و پیش میں جن کی جیتی جاگتی تصویریں سامنے آتی رہتی ہیں اس کی زندگی میں بھی شامل ہوتی ہیں، ایسی حالت میں یہ لازمی ہے کہ اس کے قصے میں غیر شعوری طور پر اس کے اطراف کی زندگی میں مل ہوجائے وہ دربار کی تفریح ومزاج سے ہم آہنگی کے لئے داستان کے بنیادی کرداروں کو بادشاہوں جیسا زرق برق لباس پہنا دیتا ہے اور ان شاہی کرداروں کو قلعوں کے اندر رنگینیوں میں غرق کردیتا ہے کیونکہ اس کے سننے والے بادشاہ یا امیر کو پھٹے حال غلام یا سپاہی کی کہانی سننے سے چنداں دلچسپی نہیں وہ تو داستان سُن کر دن بھر کے سیاسی مسائل سے تھکے ہوئے دماغ کے لئے فرحت وانبساط اور سکون کا سامان فراہم کرنا چاہتا ہے اور عام لوگ بھی اپنی تکلیف دہ زندگی کے قصے سننا پسند نہیں کرتے تھے وہ بھی قصوں کی رنگین دنیا میں پہونچ کر اپنی زندگی سے فرار چاہتے تھے۔ بادشاہوں کا داستان سننے کا سبب فرحت وسکون کے حصول کے ساتھ ان کی عیش دوستی اور لذت پرستی بھی ایک حد تک تھا اسی لئے داستان گو اپنے قصوں میں شاہزادوں اور شاہزادیوں کے رومان پرور واقعات کو لطف لے لے کر بیان کرتا ہے لیکن جب محلوں میں رہنے والے یہ شاہی کردار زندگی کی مختلف تقریبات منعقد کرتے ہیں تو ان کی رسوم وہی ہوتی ہیں جو عوام میں رائج ہیں۔ یا جب کسی مشکل سے دوچار ہوتے ہیں تو عام آدمی کی طرح دعا کے لئے خانقاہوں اور مزاروں پر جاتے یعنی داستانوں کے یہ بڑے کردار بھی ایک منزل پر آکر اسی عوامی زندگی کی نمائندگی کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جس کا نمائندہ خود داستان گو ہوتا ہے۔

" بوستان خیال " اگرچہ بادشاہوں اور شاہزادوں کی بزم اور رزم کی داستان ہے شاہانہ زندگی کی رنگینیوں کو بیان کرنا داستان گو کا بنیادی مقصد ہے لیکن وہ خود محل میں نہیں رہتا، نہ وہ کسی شاہی خاندان کا فرد ہے۔ اس نے محل کی زندگی کے بارے میں سنا ہے اور دربار کو آنکھوں سے دیکھا ہے۔ قلعہ معلیٰ کی کچھ سنی اور کچھ دیکھی ہوئی ان باتوں کو عام شہری زندگی کی روشنی میں قلمبند کیا ہے اسی لئے اس کی اس طویل داستان میں عوامی زندگی بھی جا بجا نظر آتی ہے۔ اس میں اس کے عہد کے دلی والے، اس عہد کی دلی اور اس کے تہذیبی مرقعے اس طرح موجود ہیں جیسے یہ دلی کی تہذیبی تاریخ ہے۔ حیرت ہے کہ ڈاکٹر گیان چند نے یہ بات داستان کے کس حصہ کو پڑھکر کہہ دی کہ " بوستان خیال " میں شاید ہی کسی عوامی کردار کا ذکر ہو[۱] ڈاکٹر صاحب کا یہ دعویٰ بھی میرے خیال میں مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ " داستان گو عوام کی زندگی بیان کرنے پر قدرت نہ رکھتے تھے عوامی زندگی سے واقف نہ تھے انھیں صرف اپنا علم دکھانا مقصود تھا[۲]" یہ صحیح ہے کہ اپنے علم کی نمائش بھی داستان گوئی کا مقصد تھا لیکن یہ بات عجیب سی لگتی ہے کہ ایک شخص ان دیکھی دنیا کی تصویر کشی کر رہا ہو اور اپنے اطراف کی دیکھی بھالی زندگی کے بیان پر قدرت نہ رکھتا ہو یا اس سے ناواقف ہو۔

اٹھارہویں صدی ہندوستان کی سیاسی تاریخ کی ایک پُر آشوب صدی تھی ہر صوبے میں انتشار اور بدامنی پھیلی ہوئی تھی دلی کی مرکزی سالمیت دن بدن تحلیل ہوتی جارہی تھی ہر ایک مہم جو اور اقتدار پسند اب شاہی شہر پر تسلط حاصل کرنے کی کوشش میں لگا ہوا نظر آتا تھا جس کے لئے لڑائی دلی کی فصیلوں تک پہونچ چکی تھی بلکہ ہم اسے سڑکوں پر ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ ان آئے دن کے بغاوتوں اور حملوں نے اہلِ دہلی کو پریشان اور بدحال کر دیا۔ لوگ دلی چھوڑ کر فیض آباد، مرشدآباد اور دوسرے مقامات پر جانے لگے۔ دلی میں رہ کر پیٹ بھرنا اور عزت بچانا مشکل ہوگیا ہے

---

[۱] اردو کی نثری داستانیں ص۶۹۲، [۲] ایضاً ص۲۷

شده روز قیامت آشکارا — دل مردم شده از غم فگارا
خلائق شد سراسیمہ پریشاں — دویدند چار سوی چوں گوئے چوگاں
پدر را از پسر خبرے نماند — زن و شوہر جدا ہر سو فتادہ
زنانی ہا کہ در پردہ بماندہ — فتادہ از خانہ بیروں سر کشادہ
زن و مرداں شدہ در کوئے و بازار — سراسیمہ پریشاں و دل افگارہ
خبر از جان و مال کس نماندہ — خیالِ مرگ بر دلہا نشاندہ [1]

دلّی والوں کی اس پریشاں حالی کو داستان نگار بھی نظرانداز نہیں کرتا :-

"شباط نے اہلِ شہر کو بہت پریشان و متردد پایا یہاں تک کہ دو دو چار چار آدمی ہر ایک جائے باہم سرگوشی کر رہے تھے ..... ایک نے دوسرے سے کہا اے بھائی اب اس شہر میں رہنے کا لطف نہیں، بہت جلد اپنے قبائل کسی جائے بھیج دو تاکہ ناموس کی آبرو ریزی نہ ہو،" [2]

دلّی کی یہ حالت نادر شاہ کے طوفانی حملے کے بعد ہوئی اس سے پہلے کی دلّی دنیا میں اپنی نظیر نہیں رکھتی تھی، ہر طرف رنگینیاں بکھری ہوئی تھیں، اونچی اونچی شاندار عمارتیں تھیں۔ جگہ جگہ سرسبز و شاداب باغات لگے ہوئے تھے، شہر کے بیچ میں نہر بہتی تھی، فیض بازار اور چاندنی چوک جیسے بازار تھے، خوش شکل اور خوش مزاج لوگ اس شہر میں گھومتے ہوئے نظر آتے تھے، میرؔ نے ایسی ہی دلّی کو یاد کرتے ہوئے کہا تھا :-

دلّی کے نہ تھے کوچے اوراق مصور تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

ڈاکٹر تنویر احمد علوی کے الفاظ میں "اس وقت کی دلّی اپنی شان و شکوہ اور تہذیبی و تمدنی امتیازات کی وجہ سے قرطبہ، قیروان، بغداد، قاہرہ، قسطنطنیہ اور سمرقند و بخارا پر فوقیت رکھتی تھی اور بڑے احترام کے ساتھ اسے حضرت دہلی کہا جاتا تھا۔ [3]

---

[1] چہار گلشن شجاعی (قلمی)، ص ۲۴۲ ماخوذ از اٹھارہویں صدی میں ہندوستانی معاشرت ص ۱۲۳۔ [2] ص ۳۶۴ ج ۴، [3] فکر و نور شاہ جہاں آباد نمبر ص ۹

یہ حضرت دہلی "بوستان" کے مؤلف کے پیش نظر تھی اگرچہ خیال کا وطن دہلی نہیں تھا، تلاش معاش میں اس نے دکن سے دہلی اور دہلی سے بنگال تک سفر کیا، اس نے ہندوستان کے اس عہد کے بڑے شہروں کو دیکھا لیکن مرکز ہونے کی وجہ سے شاہ جہاں آباد اس کے لیے ایک آئیڈیل تھا، یہی وجہ ہے کہ جب وہ کسی شہر کا بیان کرتا ہے تو وہ شاہجہان آباد سے مختلف نہیں ہوتا۔

"نہایت وسیع و آباد شہر ہے اور اس شہر کے چالیس دروازے ہیں اور ہر ایک دروازہ سے اقل مرتبہ نصف فرسخ کا بعد رکھتا ہے علاوہ ازیں وہ شہر نہایت حسن خیز ہے اور زن و مرد حسن و جمال سے قطع نظر غنی و صاحب مال ہیں، شہر میں متعدد بازاریں ہیں، اور اس درجہ آباد ہیں کہ ہر ایک بازار میں صرف جوہری جوہری کی چار ہزار دکانیں ہیں، علی ھذہ بزازہ بھی تصور کرنا چاہیے، بنابراں اہل حرفہ مثل نان بائی، حلوائی، تنبولی، گندھی، ستار، لوہار، کمہار، عطار وغیرہ کے۔ ہر گلی کوچہ صاف و شفاف، دو طرفہ لالٹین نصب ہیں، چھڑکاؤ دونوں وقت ہوتا ہے، خاکروب ہر وقت جاروب ہاتھوں میں لیے خس و خاشاک سے ہر مقام کو پاک و صاف کرتے ہیں، ہنگامہ داد و ستد ہر وقت گرم رہتا ہے، ہر ایک قسم کا صناع وہاں موجود ہے، ہر قوم و ملت کا آدمی وہاں بسا ہے، تجار ہزار در ہزار جن میں ہر ایک ملک التجار ہے، ہر وقت ہر ایک شے موجود و مہیا رہتی ہے جس ملک و ولایت کی چیز درکار ہو بکثرت وہاں دستیاب ہو سکتی ہے"[1]

یہ داستان کا کوئی تخیلی شہر نہیں بلکہ دہلی کا ہی بیان معلوم ہوتا ہے دلی میں شہر کے چاروں طرف بہت سے دروازے تھے، اجمیری دروازہ، ترکمان دروازہ، کشمیری دروازہ، لاہوری دروازہ، دلی دروازہ وغیرہ آج بھی موجود ہیں شہر کے اندر چاندنی چوک، فیض بازار، اردو بازار، چاوڑی بازار، خاص بازار، بازار سیتارام

---

[1] ج ۸ م ۱۵۱ - ۵۲ -

وغیرہ متعدد بازار تھے، ان میں جوہریوں، بزازہ، ہتھیاروں وغیرہ کی سینکڑوں دکانیں تھیں۔ پیشہ وروں کے محلے انھیں کے نام سے آباد تھے۔ آج بھی یہ نام سننے کو ملتے ہیں مثلاً محلہ دھوبی واڑہ چوڑی والان، محلہ رودگران، محلہ نائی واڑہ، کوچہ نٹوان، کوچہ چرخہ والان، کوچہ بلی ماران وغیرہ

"بوستان" میں موجود پیشہ وروں کی الگ الگ بستیاں آباد ہیں، کہیں دھوبیوں کی بستی ہے[1]، کسی جگہ بزدار[2] اور قصاب[3] رہتے ہیں، تو کہیں بزاز کپڑا بیچتے ہوئے نظر آتے ہیں[4]، کسی محلے میں درزیوں کے مکان ہیں[5]، ایک طرف نان پز نان و پنیر بیچنے میں مصروف ہیں[6] تو دوسری طرف حداد شمشیر سازی میں مشغول ہیں[7]، ماہی گیروں کی الگ بستی ہے[8]۔ سمندر میں سفر کرنے والے سوداگر الگ آباد ہیں۔ سوداگروں کی "بوستان" میں ایک بڑی بھیڑ ہے۔ یہ سمندر سے صدف ہائے مروارید نکالتے ہیں[9] اور بادشاہوں کی نذر کرکے انعام پاتے ہیں[10]۔ سوداگروں کے بازار طلسمات کے اندر بھی لگے ہوئے ہیں وہاں بھی مثل دنیا خرید و فروخت ہوتی ہے[11] "بوستان" کے بازاروں میں کہیں سرمہ فروش عورتیں[12]، زغال فروش[13] اور زرہ فروش[14] کے علاوہ حمال[15] اور یکہ سوار[16] بھی نظر آتے ہیں بلکہ ایک جگہ داستان نگار نے ایک شہر کا بیان کرتے ہوئے چاندنی چوک ہی نام لے دیا ہے، لکھتا ہے:-

> "خورشید تاج بخش بحشمتِ تمام شوکتِ مالا کلام خرم و شاد شہر آصف آباد میں داخل ہوئے، دیکھا کہ بہت معمور ہے ہر در و دیوار طلائی مینا کار تجلی میں رشکِ کوہ طور ہے دکانوں پر لاجوردی کا نقش و نگار، ہر مکان قطعہ دار، زمین سنگ مرمر کی، تمام جہاں کی چیزیں موجود، صرافہ، بزازہ گرم، انواع و اقسام کے میوے، کنجڑنیں حور وش نارپستان لئے بیٹھی ہیں۔ خرید و فروخت ہو رہی ہے ..... سواری چاندنی چوک میں پہنچی ..... قلعے میں داخل ہوئی"[17]

یہاں سواری کا چاندنی چوک سے گذر کر قلعہ میں داخل ہونا ہماری اس بات کو تقویت بخشتا ہے کہ آصف آباد کا بیان دراصل شاہ جہاں آباد کا بیان ہے۔ دلی کے قلعہ

۱؎ ۲۳۲ ج ۳، ۲؎ ۱۷۵ ج ۲، ۳؎ ۲۶۹ ج ۲، ۴؎ ۲۵۱ ج ۲، ۵؎ ۲۶۸ ج ۲، ۶؎ ۲۶۸ ج ۲، ۷؎ ۳۲۷ ج ۲،
۸؎ ۲۲۷ ج ۴، ۹؎ ۴۰ ج ۴، ۱۰؎ ۲۷ ج ۱، ۱۱؎ ۲۹۳ ج ۱، ۱۲؎ ۱۹۵ ج ۲، ۱۳؎ ۲۷۷ ج ۳، ۱۴؎
۱۱۹ ج ۲، ۱۵؎ ۲۶۸ ج ۲، ۱۶؎ ۳۰۷ ج ۲، ۱۷؎ ۳۱۷ ج ۴،

معلیٰ کالاہوری دروازہ ٹھیک چاندنی چوک کے سامنے ہے۔ چاندنی چوک کے علاوہ ''بوستان'' میں اردو بازار بھی ہے لیکن اس کا تعلق لشکر سے ہے[1] ویسے لشکر کے بازار ہی کو اردو بازار کہا جاتا تھا۔

''بوستان'' میں ایسے قصبے بھی ملتے ہیں جہاں کے رہنے والے ہندوستان کے دہقانیوں کی طرح اپنے گھروں میں مکان ضرور بھی نہیں بنواتے بلکہ آفتابہ لے کر قصبہ سے باہر جاتے ہیں[2] یہاں زمیندار بھی رہتے ہیں[3] اور زراعت بھی ہوتی ہے[4] ان قصبوں میں پنگھٹ بھی موجود ہیں :۔

> رفتہ رفتہ عصر کے وقت ایک ایسے چاہ عمیق پر پہونچا کہ جس کے کناروں پر سنگ ہائے رنگارنگ نصب تھے اور زن و مرد پانی بھر رہے تھے'' [5]
>
> ''اس گاؤں کی عورتیں گھڑے مٹی اور تانبے اور پیتل کے سر پر رکھے پانی کے واسطے آتی ہیں'' [6]

یہ ہندوستان ہی کے گاؤں ہیں، جہاں آج بھی تانبے، پیتل اور مٹی کے گھڑے لیکر عورتیں کنوؤں سے پانی لاتی ہیں خواتین کا یہ عمل یہاں کی تہذیب کا ایک اہم حصہ ہے اردو اور ہندی کے بہت سے شاعروں نے پنگھٹ کے اس رومانی منظر کو دلکش انداز میں نظم کیا ہے، پانی پلانے کو آج بھی ایک کار ثواب سمجھا جاتا ہے اور اس عملِ خیر کو غریب گھرانوں میں رہنے والی لڑکیوں کے علاوہ محلوں کی شاہزادیاں بھی کرتی تھیں، داستان نگار نے ہندوستان کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :۔

> ''اس ملک میں قدیم الایام سے یہ قاعدہ معین ہے کہ دختران راجہ وغیرہ صاحب مقدور ایک ظرف سیمیں یا برنجی خاص اپنے سر پر رکھ کر واسطے آب کشی کے چاہ پر جاتی ہیں اور پانی چاہ کا بایں نیت اپنے اپنے مکان کو لے جاتی ہیں کہ شرع خانہ داری میں اس عبادت سے زیادہ تر کوئی عبادت نہیں ہر چند صاحب مقدور ہوں الا اس عمل بزرگ سے کوئی عورت ناکتخدا پرہیز و انکار نہیں کرسکتی تھی[7]

---

[1] ص ۵ ج ۴، [2] ص ۱۸ ج ۲، [3] ص ۲۶۸ ج ۱، [4] ص ۳۳۰ ج ۱، [5] ص ۳۹ ج ۴، [6] ص ۱۰۴ ج ۴، [7] ص ۳۲۵ ج ۱۲۸

یہاں پانی لانا گھر گرہستی کا سب سے اہم کام نہیں ہے، بلکہ ایک مقدس فریضہ ہے یہ نمائباً اس وقت کی یادگار ہے جب ہندوستان کے بعض علاقوں میں پانی بہت مشکل سے حاصل ہوتا تھا اور اس کے لئے بہت دور تک سفر کرنا پڑتا تھا گجرات اور راجستھان کے بہت بڑے علاقہ میں آج بھی یہ حالت ہے۔

"بوستان" کے شہروں میں مسافروں کے لئے کارواں سرائیں بھی بنی ہوئی ہیں[1] اور مکان بھی کرایہ پر ملتے ہیں[2]، سفر کرنے کے لئے کرایہ پر سواریاں بھی مل جاتی ہیں[3]، لوگوں کو انصاف دلانے اور بے راہ روی کو روکنے کیلئے قاضی کی عدالت[4] اور کوتوالی[5] بھی موجود ہے، اس عدالت اور کوتوالی کا رعایا کے دلوں میں اس قدر خوف بھی ہے کہ حاکمِ وقت کے خلاف اپنے گھر میں بھی گفتگو نہیں کر سکتے[6] اور اس رعب وداب کا سبب یہ ہے کہ حاکمِ وقت واجب القتل کو بیچ شہر قتل کرواتا ہے تاکہ خلایق شہر عبرت حاصل کرے اور حکمراں کا ڈر دلوں میں بیٹھ جائے[7]،

"بوستان" کا مصنف بادشاہوں کے قصے بیان کرتے کے باوجود اپنے قریب رہنے والے لوگوں کو کبھی نہیں بھولتا۔ یہاں جن عام لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے "بوستان" میں ان کا تفصیلی بیان موجود ہے۔ یہاں تک کہ رعایا کے عام افراد کو صاحبقران اکبر کی بارات کے جلوس میں بھی شریک کیا ہے۔ اس شاہانہ جلوس میں اگر ایک امیر وکبیر محفلِ رقص ونغمہ میں محو تماشا ہیں تو دوسری طرف صاحبقراں کی رعایا کے عام لوگ معیار کے اعتبار سے گانجہ، افیون اور بھانگ کا نشہ کرنے میں مصروف ہیں، اور طوائفوں کا ناچ دیکھ رہے ہیں[8]۔

جلوس میں شریک مردوں کی سواری کے لئے اگر گھوڑے، ہاتھی اور اونٹ موجود ہیں تو خواتین کے لئے ڈولیاں[9]، فینسیں[10]، سکھپال[11]، تامجان مرصع نگار[13]، ہوادار[14] اور محافے[15] موجود ہیں۔

---

[1] ۱۸۴-۸۹ ج ۲، [2] ۳۳۰ ج ۳، ۸۳، ج ۷م، [3] ۷۷، ۳ ج ۳، [4] ۲۶۸ ج ۲، [5] ۱۴۹ ج ۲، [6] ۵۶۴ ج ۴، [7] ۱۱۰ ج ۲، [8] ۳۱۲ ج ۹م، [9] ۳۶۶ ج ۷م، [10] الف، [11] ۳۰۴ ج ۹م، [12] ۹۸۴ ج ۹م، [13] ۹۴ ج ۹م، [14] ۹۴ ج ۹م، [15] ۱۴۷ ج ۳،

کسی بھی معاشرہ کی تہذیبی اقدار کسی ایک طبقہ میں تشکیل نہیں پاتیں، بلکہ عوام و خواص کے باہم اشتراک سے وجود میں آتی ھیں، اور پرورش پاتی ہیں، اگرچہ بعض قدریں اعلیٰ طبقہ کے انفرادی رکھ رکھاؤ کے سبب رائج ہیں لیکن ان کا دائرہ اسی وقت وسیع ہوتا ہے جب وہ عوام تک پہونچتی ہیں اور عوام یعنی اکثریت میں رواج پانے کے بعد وہ قدریں اس قوم کی پہچان بن جاتی ھیں۔

ملبوسات

قوموں کی پہچان اور طبقوں کی تقسیم کو ظاہر کرنے میں ان کے رسم و رواج کے علاوہ ان کی پوشاکیں بھی ممد و معاون ہوتی ہیں، ہر ملک اور ہر مذہب کا آدمی ایک خاص انداز کا لباس پہنتا ہے جس سے اس کی انفرادیت ظاہر ہو جاتی ہے اسی طرح دولت مند اور غریب کے درمیان فرق کے اظہار کا ذریعہ لباس ہی بنتا ہے اعلیٰ طبقہ سے تعلق رکھنے والے اپنے معیار و رتبہ کے اعتبار سے پوشاک زیبِ تن کرتے ہیں اور نچلے درجے کے لوگ اپنی حیثیت کے مطابق کپڑے پہنتے ھیں۔

بادشاہت کے عہد میں لباس پر خاص توجہ دی جاتی تھی وہ دور نمائش کا دور تھا جس طرح بادشاہ خود کو دوسروں کی نظر میں ممتاز کرنے کے لئے زرق برق پوشاک اور ہیرے جواہرات وغیرہ زیب جسم کرتا تھا اسی طرح وزراء اور امراء اپنی امتیازی حیثیت برقرار رکھنے کے لئے قیمتی لباس استعمال کرتے تھے۔ ہندوستان کے بعض راجہ اور مسلمان حکمراں لباس زرنگار پہنتے تھے "بوستان" کے بھی بیشتر کرداروں کا تعلق شاہی خاندان یا دربار سے ہے اس لئے سبھی زرق برق پوشاک میں نظر آتے ہیں۔ زرق برق کپڑوں میں یہاں بادلہ[1]، زربفت[2]، کمخواب[3] بھی موجود ھیں، دیبائے چینی[4] اور باناتھ[5] بھی۔

مردوں کے لباس میں عمامہ[6]، جبہ[7]، دستار[8]، خلعت زرتار[9]، چکن[10]، قبا[11]، عبا[12]، پاجامہ[13]، اور تہبند[14] وغیرہ دکھائی دیتے ہیں۔ "بوستان" کے ایک عیش دوست بادشاہ کا لباس

ملاحظہ ہو۔

[1] ص ۸۶، ج ۲، [2] ص ۸۴، ج ۲، [3] ص ۱۳۵، ج ۹م، [4] ص ۸۶، ج ۲، [5] ص ۱۳۵، ج ۹م، [6] ص ۱۶۷، ج ۲، [7] ص ۱۸۳، ج ۲، [8] ص ۱۲۸، ج ۲، [9] ص ۷۹، ج ۹م، [10] ص ۱۳۵، ج ۹، [11] ص ۱۴۱، ج ۹، [12] ایضاً، [13] ص ۲۷۶، ج ۷م، [14] ص ۱۱۹، ج ۲

"لباس دیکھا کہ شہ نشین میں تخت پر ایک مرد پیر محاسن سفید لباس زری پہنے زلفوں میں خضاب کیے دانتوں میں مسی ملے، دستار رنگین بر سر، عطر مالیدہ، سرمہ آنکھوں میں، مالائے مروارید گلے میں، انگشتریہائے جواہر قیمتی ہاتھ میں، پائجامہ کم خواب بیش قیمت سرخ رنگ ہوس خیز، بالوں میں غازہ ملے ہوئے بالباس تنگ وحیت مثل شاہد بازوں کے بیٹھا ہے"[1]

مردوں کے لباس میں کمر بند[2] بھی لازمی تھا جس میں تلوار اور خنجر لٹکائے جاتے تھے، مردوں کے لباس بھی عموماً عورتوں کی طرح زرق برق ہوتے تھے۔ البتہ ان کی بناوٹ میں فرق ہوتا تھا۔

عورتوں کے خاص لباس پشواز[3]، کرتی[4]، پاجامہ[5]، دوپٹہ[6]، انگیا[7]، شال[8]، دوشالہ[9]، وغیرہ تھے۔ کنیزوں اور کہاریوں کے لباس بھی زرتار ہوتے تھے[10] بعض عورتیں برقع بھی اوڑھتی تھیں[11]

زیورات وجواہرات

لباس کی زینت ادھوری رہتی ہے جب تک زیورات سے جسم کو سنوارا نہ جائے جس طرح مرد اور عورتیں زرتار لباس پہنتے تھے اسی طرح دونوں جواہرات کا استعمال کرتے تھے۔ آرائش وزیبائش کے لئے دونوں ہی زیورات سے جسم کو سجاتے تھے، لیکن مردوں کی بہ نسبت عورتوں کے زیورات کی تعداد زیادہ ہے، مردوں کے زیورات میں ہار اور انگوٹھیاں خاص تھیں۔ زیورات میں انگشتری[12]، دست بند[13]، سر پیچ[14]، آویزہ[15]، گوشوارہ[16] گلوبند[17]، جوشن[18]، اکون[19]، حلقۂ طلائی[20]، خاتم[21]، پازیب[22]، خلخال[23] شامل ھیں۔ محلوں میں رہنے والی کنیزیں اور کہاریاں بھی زیورات سے خود کو آراستہ کرتی ہیں۔ مثلاً داستان نگار لکھتا ہے کہ:-

---

۱ ج ۱، ۳۴۰ ۲ ج ۲، ۱۳۸ ۳ ج ۴، ۳۷۴ ۴ ج ۴، ۱۳۲ ۵ ج ۴، ۳۵۰ ۶ ایضاً، ۷ ایضاً، ۸ ایضاً، ۹ ج ۲، ۲۷۱ ۱۰ ج ۲، ۲۴۷ ۱۱ ج ۴، ۳۹۴ ۱۲ ج ۲، ۵۱۵ ۱۳ ج ۲، ۳۲۴ ۱۴ ج ۴، ۳۹۸ ۱۵ ج ۴، ۸ ۱۶ ج ۶، ۱۰۸ ۱۷ ج ۴، ۳۹۴ ۱۸ ایضاً، ۱۹ ج ۲، ۱۸ ۲۰ ایضاً، ۲۱ ج ۴، ۵۰ ۲۲ ج ۲، ۲۶۵

"کمہاریوں کے لباس زرتار، ہاتھوں میں موٹے موٹے کڑے، جواہر
پر شانوں پر پریاں تھیں وہ وشیں راست وچپ تانیں پکڑے زیور
لعل والماس زیب جسم مگر وضع ایسی جیسی سلاطین کے جلوس
ہوتے ہیں"۔[1]

محل میں جو مطربائیں ہیں وہ ناک میں نتھ، کانوں میں بالیاں، ہاتھوں میں چوڑیاں اور گلے میں
طوق پہنتی ہیں[2]

یہ تمام زیورات طلائی یا نقرئی ہیں اور ان میں جواہرات جڑے ہوئے ہیں۔ جواہرات کی
بے شمار قسمیں ہیں، ابوالفضل نے اکبر کے عہد کے جواہرات کے بارے میں لکھا ہے کہ:۔

"اگر جواہرات کی حقیقتیں اور ان کی مقدار کی کیفیت لکھی جائے تو
ایک مدت دراز درکار ہے"[3]

"بوستان" میں بھی جواہرات کی بہت سی قسمیں ہیں، جن کا ذکر جگہ جگہ آتا ہے مثال
کے طور پر یاقوت[4]، فیروزہ[5]، بلور[6]، لعل[7]، لعل رمانی[8] لعل احمر[9] یاقوت رمانی[10]
مروارید[11]، مرجان[12]، عقیق[13]، الماس[14]، زمرد[15] وغیرہ پیش کیے جا سکتے ہیں۔ ان جواہرات
کی حفاظت کے لیے محلوں میں باقاعدہ جواہر خانہ بھی ہیں[16]

شاہزادیوں کے سنگار میں سرمہ، نورافشاں، مہندی اور پان کی سرخی بھی شامل
تھی۔ آئین اکبری میں جہاں ہندو عورتوں کے سولہ سنگار کا ذکر کیا گیا ہے ان میں یہ
چیزیں بھی شامل ہیں[17] "بوستان"، کی ایک عروس ملکہ نوبہار گلشن افروز کا سنگار
ملاحظہ ہو:۔

"ملکہ نوبہار گلشن افروز ایک تو حسنِ خداداد رکھتی تھی دوسرے لباس
مکلف عروسی اور زیور گراں بہا سے ایسی ترقی حسن و جمال ہوئی کہ
دیکھنے والوں کی جان قربان ہوتی ہے اور دل بہزار اشتیاق صدقے
ہوتا ہے رنگینی حنائے دست و پا سر دست خونریزی پر آمادہ ہے

۱؎ ج۴ ص ۹۸، ۲؎ ج۳ ص ۵۰، ۳؎ آئین اکبری جلد اول ص ۲۲۴، ۴؎ ج۴ ص ۹۵، ۵؎ ج۲ ص ۲۳۴، ۶؎ ج۲ ص ۸، ۷؎ ج۲ ص ۱۲۹، ۸؎ ج۲ ص ۲۲۵، ۹؎ ج۲ ص ۲۶۰، ۱۰؎ ج۲ ص ۱۹۶، ۱۱؎ ج۲ ص ۶۰، ۱۲؎ ج۲ ص ۵۴۴، ۱۳؎ ج۲ ص ۲۹۲، ۱۴؎ ج۲ ص ۱۳۸، ۱۵؎ ج۲ ص ۵۱۲، ۱۶؎ ج۲ ص ۲۲۵، ۱۷؎ آئین اکبری جلد ۲ ص ۲۸۲۔

آنکھوں میں سرمہ دنبالہ دار لگا ہوا ہے دیکھنے والوں کو شمشیر اصفہانی کھنچی ہوئی نظر آتی ہے پان کی سرخی سے لبِ نازک رشک عقیق یمن معلوم ہوتے ہیں۔ لباس سرخ میں رُخ پر نور ملکہ نو بہار گلشن افروز یوں نظر آتا ہے جیسے شفق میں مہرِ تاباں اور ملبوس ملکہ نو بہار گلشن افروز عطر سہاگ سے ایسا معطر و معتبر ہے کہ بوئے مشک و عنبر بھی غیرت سے محجوب ہے نظر نہیں آتی، پیشانی انوار پر ملکہ نو بہار کے ایسی افشاں چنی ہوئی ہے کہ پیرِ فلک بھی دیکھ کر زر انجم ملکہ نو بہار کے فرق پر نثار کرتا ہے“ [۱]

یہاں یہ وضاحت کرنا بھی غیر ضروری نہ ہوگا کہ مذکورہ اقتباس میں سنگار کی جن اشیاء کا ذکر کیا گیا ہے وہ زمانہ قدیم سے ہندوستان میں رائج ہیں اہلِ ہنود کے یہاں عروس کو سرخ کپڑے پہنائے جاتے ہیں۔ اس کے مہندی اور سرمہ لگاتے ہیں۔ مانگ میں سیندور یعنی افشاں کا بھرنا لازمی ہے اور پان تو ہندوستان ہی کی پیداوار ہے۔ مسلمانوں نے ہندوستان آکر ہی اس کا استعمال شروع کیا رفتہ رفتہ پان مہمان نوازی کا لازمی حصہ بن گیا۔ پان کے بغیر مہمان کی خاطر تواضع نامکمل سمجھی جاتی تھی، ابو صفا عمر شبلی نے لکھا ہے :-

”خاطر تواضع کے موقعوں پر ہندوستان میں پان سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں سمجھی جاتی، یہاں تک کہ مہمان کی مہمانی میں ...... دنیا کی کل اچھی چیزیں موجود کر دی جائیں مگر پان نہ دیا جائے تو ایسی مہمانی قابلِ ذکر اور قابلِ قدر نہیں سمجھی جاتی اور مہمان بھی سمجھتا ہے کہ میری کچھ عزت ہی نہیں کی گئی“ [۲]

مسعودی کا بیان ہے کہ ہندوستان کے بڑے چھوٹے سب لوگ سفید دانت ناپسند کرتے ہیں اور ایسے شخص سے الگ رہتے جو پان نہیں کھاتا [۳] بادشاہوں کے دربار میں اگر کسی شخص کو بادشاہ کی طرف سے پان پیش کیا جاتا تو یہ بڑے افتخار کی بات ہوتی

---

[۱] ۹۷،۳۹۷ م، [۲] بحوالہ محمد شاہ تغلق ص۲۱۸، [۳] عربی لٹریچر میں قدیم ہندوستان ص۲۵۹

تھی، ہندوستان کی اس نعمت کا ذکر امیر خسروؒ نے قران السعدین میں بڑی تفصیل سے کیا ہے[۱]

"بوستان" میں پان کا استعمال صرف منھ کی سرخی کے لئے ہی نہیں ہوتا، بلکہ مہمان کے لئے بھی پیش کیا جاتا ہے[۲]

"ملکہ نے بدست خود عطر و پان دے کر رخصت کیا،"[۳]

محلوں میں پان دان ہوتے تھے[۴] بازاروں میں پان کی دکانیں ہوتی تھیں جن پر تنبولنیں بیٹھی پان بناتی تھیں۔

"القصہ شاہزادہ جوہری کی دکان سے گذر کر تنبول کی دکان پر پہونچا، صاحبِ دکان ایک کنیز تھی، شوخ طبع و صاحب جمال، چند بیڑے بطریق نذر شاہزادے کے پاس لائی۔۔۔۔ شاہزادے کو بیڑے نذر دئے،"[۵]

غرضکہ پان مردوں اور عورتوں دونوں ہی کے چہروں کی زیبائش اور مہمان نوازی کا ایک لازمی حصہ تھا۔

اشیائے خورد و نوش اور آدابِ دسترخوان

جس طرح لباس اور زیورات وغیرہ کسی خاص عہد کی خاص تہذیب کا نشان دیتے ہیں اسی طرح خوردنی اور نوشیدنی اشیاء اور ان کے برتنے کا ڈھنگ طرزِ معاشرت کو ظاہر کرتا ہے۔

کھانے کے معاملے میں ہندوستان میں قدیم زمانہ سے ہی صفائی اور پاکیزگی کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ ہندوؤں کے یہاں جس جگہ کھانا بنتا اس جگہ کو مٹی اور گائے کے گوبر سے لیپ دیا جاتا، وہاں کوئی جوتے پہن کر نہیں جا سکتا تھا جس جگہ بیٹھ کر کھانا کھایا جاتا، وہ جگہ بھی لیپی جاتی تھی۔ یہ لوگ علیحدہ علیحدہ کھانا کھاتے تھے اگر کھانا مٹی کے برتنوں یا پتل پر کھاتے تو پھر انھیں دوبارہ استعمال نہیں کرتے تھے

---

[۱] ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں ص۹۵ [۲] ۳۲۰ ج ۳، [۳] ۲۸۶ ج ۲، [۴] ۳۴۴ ج ۳۔

[۵] ۳۶، ج ۱،

ہندو زیادہ تر سبزی خور تھے، ان کے کچھ طبقوں میں گوشت بھی استعمال کیا جاتا تھا، چاول، دال خوب کھاتے تھے۔

جب مسلمان یہاں آئے تو گوشت کا رواج زیادہ ہوا، کیونکہ مسلمانوں کی گنتی ہی گوشت کھانے والی قوموں میں ہوتی ہے اس لئے انھوں نے گوشت کو مختلف طریقوں سے بنا کر کھانے کے لئے تیار کیا، مغلیہ عہد میں دسترخوان پر جہاں سینکڑوں طرح کے کھانے چنے جاتے تھے وہیں ان میں سب سے زیادہ تعداد ایسے کھانوں کی ہوتی تھی جن کو گوشت کے ساتھ بنایا جاتا تھا۔ اس طرح کئی طریقوں سے چاول تیار ہوتے تھے۔ برنیئر نے اپنے عہد کے شاہی مطبخ کے بارے میں لکھا ہے کہ ہر روز شاہی مطبخ پر ایک ہزار روپے کا صرفہ کیا جاتا ہے اور انواع و اقسام کی نعمتیں دسترخوان پر چنی جاتی ہیں[۱]

"بوستان" کے شاہی دسترخوان بھی اتنے ہی وسیع ہیں اور ان پر بھی مختلف الاقسام کے کھانے رکھے جاتے ہیں مثلاً

> "وقت چاشت کھانا آیا کئی سے خوان سیمیں و زریں، خوان پوش کے مغرق نازنیناں زرتار لباس کے سروں پر ایک جواں خوش رو مشک مو شیریں کلام نمکین ادا ساتھ، دسترخوان پر تکلف بچھایا گیا، انواع اقسام کے طعام پلاؤ، زیر بریاں، مزعفر، قورمہ، قلیہ کباب، مرغ، کوفتے، پسندے، میانہ پر، باقرخانیاں، شیرمالیں، آبی، تنکی، خمیری، میٹھے چاول، فرنی، یاقوتی، دلیا، دلمیا، رائتا، اچار، مربے ساری دنیا کے میوے چنے گئے"[۲]

دسترخوان پر طرح طرح کے پھل اور مٹھائیاں بھی رکھی جاتی تھیں، پھلوں میں خربزہ، سیب، بہی اور انگور کے ساتھ امرود، زرد آلو اور شفتالو بھی شامل ہوتے تھے[۳] ایک اور دسترخوان ملاحظہ ہو:۔

> "پھر دسترخوان بچھا انواع اقسام کے کھانے چنے گئے، یخنی، پلاؤ، قورمہ پلاؤ، زیر بریاں، مطنجن، میٹھے چاول، پھولی، شیر برنج،

---

[۱] "فکر نو" شاہجہاں آباد نمبر ص ۳۰، [۲] ص ۹۸ ج ۴ م ۶، [۳] ص ۴۴۳ ج ۵،

قرنی، خشکہ۔ شوربے دار سالن، آبی، تنکی، گاؤ دیدہ، باقرخانی،
شیرمال، دہی، اچار، چٹنی، رائتا، ملائی، مربا، کباب ماہی،
پسندے، میانزیرہ، شاہی خطائی، کوفتے، مٹھائی، پیڑا، برفی، لڈو،
جلیبی، امرتی، نورہ بادام، حلوا مغربی، انار، ناشپاتی، انگور، بہی سردے
ہمہ نعمت مہیا طعام نوش فرمایا۔[۱]

ان اقسام طعام کے علاوہ نانِ نخود[۲] نان باقلہ[۳] نان خمیری[۴] پنیر[۵] آش جو[۶] ، ماش پلاؤ[۷]
کلیچہ[۸] پکوان[۹] اور نانِ جو[۱۰] بھی موجود ھیں۔ پکوان یعنی پوری کا ذکر اس وقت کیا گیا ہے جب
شاہزادہ ہندوستان کی سرحد میں پہونچتا ہے۔ پکوان ہندوستان کے خاص کھانوں میں
ہے، دعوتوں میں اس کو خاص طور سے پیش کیا جاتا ہے اور نانِ جو اس وقت شاہزادے
کے سامنے آتی ہے جب وہ ایک غریب کی جھونپڑی میں مہمان بنتا ہے۔

شکار کے وقت یا دورانِ سفر ہرن کے کباب بنائے جاتے تھے۔ ایسے موقعوں پر
شاہزادے خود بھی کام کرتے تھے:۔

"ایک کیسہ دراز سے نمک و فلفل و دارچینی و ادرک وغیرہ
تمام سامان نکال کر شاہزادہ کے روبرو رکھ دیا اکلیل الملک نے
خود ہرن کے کباب پکائے،،[۱۱]

لیکن محل میں اہتمام دعوت کا کچھ اور ہی عالم ہوتا تھا:۔

"داروغۂ مطبخ نے عرض کی کہ خاصہ تیار ہے ملکہ نے کہا بسم اللہ
دسترخوان بچھاؤ۔ کنیزوں نے طرفۃ العین میں طعامہائے رنگارنگ
و میوہ ہائے گوناگوں سے صحن دسترخوان مثلِ چمن پر بہار آراستہ
کرایا فریدون جمیل نے ایک قاب میں سے قدرے کھانا کھایا،،[۱۲]

بادشاہ یا ملکہ کے بغیر شاہی دسترخوان پر کھانا شروع نہیں کیا جاتا[۱۳] جب وہ آجاتے تھے،
تو خدمتگار ہر شخص کے سامنے آفتابہ اور سلفچی لے کر حاضر ہوتے تھے۔ اور ہاتھ دھلاتے تھے[۱۴]

۱؎ ۹۰ ج ۶ م ۲۶، ۲؎ ۹۰ ج ۳ ۲، ۳؎ ایضاً، ۴؎ ۶۰۰ ج ۵، ۵؎ ۳۴۶ ج ۶ م ۲۶، ۶؎ ۱۲۸ ج ۲، ۷؎ ۲۲۸ ج ۲، ۸؎ ۱۶۱ ج ۲

۹؎ ۳۵۳ ج ۲، ۱۰؎ ۱۳۰ ج ۲، ۱۱؎ ۳۰۲ ج ۶، ۱۲؎ ۵۵۴ ج ۵، ۱۳؎ ۱۴ ج ۱، ۱۴؎ ۶۳۸ ج ۸ م ۱

اول بادشاہ کھانا شروع کرتا تھا اور اس وقت تک کھانے سے ہاتھ نہیں کھینچتا جب تک اسے یقین نہ ہو جائے کہ دستر خوان پر موجود سبھی افراد نے سیر ہو کر کھا لیا، کیونکہ بادشاہ کے کھانے سے ہاتھ کھینچ لینے پر سب کو ہاتھ روک لینا ضروری ہو جاتا تھا۔ کھانے کے بعد برف کے پانی کی صراحیوں[۱] کا پانی ظرف گلی[۲] سے پیتے تھے۔ خدمتگار پھر سب کے ہاتھ دھلاتے تھے۔ کھانے سے فراغت کے بعد تمام اشخاص کو پان پیش کئے جاتے تھے[۳] دوپہر کے کھانے کے بعد آرام کیا جاتا تھا[۴] اور رات کے کھانے کے بعد محفلِ رقص و نغمہ آراستہ ہوتی تھی۔ بادہ نوشی کا دور چلتا ہے[۵]

شاہی مطبخ چار حصوں میں تقسیم ہوتا تھا، اول مطبخ جہاں کھانا پکتا تھا، یہاں کے انچارج کو داروغۂ مطبخ کہا جاتا تھا جو باورچی خانہ کی تمام دیکھ بھال کرتا تھا[۶] دوم آبدار خانہ اس میں پانی وغیرہ کا انتظام کیا جاتا تھا۔ اس کے ملازم کو آبدار کہتے تھے[۷] سوم رکاب خانہ، یہاں آٹے کی اشیاء تیار ہوتی تھیں۔ اور میوہ خانہ جس میں ہر طرح کے پھل موجود ہوتے تھے۔ کھانا کھاتے وقت تمام خدمتگار مثلاً بکاول[۸]، رکابدار[۹]، نوش ماں[۱۰]، آبدار[۱۱] وغیرہ موجود رہتے تھے۔

دستر خوان پر طلائی اور نقرئی برتنوں کے علاوہ ظروف آب[۱۲]، ظروف چینی[۱۳]، ظروف بلوری[۱۴]، اور ظروف غوری[۱۵] بھی موجود ہوتے تھے ان میں قاب غوری[۱۶] سب سے اہم تھی۔ یہ عموماً بادشاہوں کے دستر خوان پر ہوتی تھی۔ اگر کھانے میں زہر ملا ہو تو یہ پلیٹ شق ہو جاتی تھی[۱۷] اس لئے بادشاہوں کے کھانے کو پہلے اسی قاب میں ڈالا جاتا تھا[۱۸]

مغلوں نے جہاں فنونِ لطیفہ کو فروغ دیا، وہاں ان کے مزاج کی نفاست ولطافت اور جمال پرستی نے دوسرے شعبوں کو بھی ترقی دی۔ نئے نئے طرز کے لباس بنوائے، خوشبویات ایجاد کیں، اسی طرح کھانوں میں بھی جدتِ طبع کو استعمال کیا اور بیسیوں اقسام کے لذیذ و نفیس کھانے تیار کروائے جن میں سے بیشتر کے نام یہاں لکھے جا چکے ہیں،

۱ے ۲۹۱ ج ۴ م، ۲ے ۲۱۳ ج ۵، ۳ے ۸۳۸۴ ج ۸ م، ۴ے ۳۷۶ ج ۶ م، ۵ے ۱۶۱ ج ۵،

۶ے ۵۵۴ ج ۵، ۷ے ۱۸۵ ج ۲، ۸ے ۱۶۱ ج ۲، ۹ے ایضاً، ۱۰ے ۱۱ ج ۲، ۱۱ے ۱۸۵ ج ۲، ۱۲ے ۱۷ ج ۲،

۱۳ے ۲۷۸ ج ۲، ۱۴ے ۱۱۲ ج ۲، ۱۵ے ۱۱ ج ۲، ۱۶ے ۳۰۶ ج ۱، ۱۸ے ۱۵۹ ج ۵، ۱۹ے ۱۳۴ ج ۳،

تفریحات

کسی بھی قوم کی ترقی و تنزّلی اور مہذب و غیر مہذب ہونے کا اندازہ اس کے ذرائع تفریحات سے بھی لگایا جا سکتا ہے اگر کسی ملک کے حکمراں اور اس کی رعایا کو ایسے کھیلوں سے دلچسپی ہے جس میں بہادری کا مظاہرہ اور جان کا خطرہ ہو تو سمجھنا چاہیئے کہ حاکم وقت بہادر اور صاحب حوصلہ ہے اور اس کی سلطنت مستحکم اور پائدار ہے اور اس کے برعکس اگر بادشاہ کی رغبت ان ذرائع تفریحات کی طرف زیادہ ہے جو محل کے اندر ہی محدود ہیں، جیسے رقص و نغمہ، شطرنج و چوپڑ، نقالی اور قصہ خوانی وغیرہ تو اس سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ سلطنت رو بہ زوال ہے۔

بابر، اکبر اور اورنگ زیب کی حکومتوں کی مضبوطی اور پائداری میں ان کے مزاج کی بہادری اور جانبازی شامل تھی۔ ان لوگوں کی رقص و نغمہ سے زیادہ دلچسپی ہاتھی اور دوسرے جانوروں کی لڑائیاں دیکھنے اور شکار کھیلنے میں تھی۔ جہانگیر کے مزاج میں عیش دوستی شامل تھی، لیکن عسکری اور جسمانی کھیلوں کا بھی وہ شائق تھا۔ شکار کا اسے بے حد شوق تھا، تزک جہانگیری میں اس نے جگہ جگہ شکار کھیلنے کے واقعات درج کئے ہیں۔ اس کے شکار کے شوق کا اندازہ اس کی لکھی ہوئی اس تفصیل سے ہوتا ہے، لکھتا ہے کہ :-

"دو شنبہ ۱۹ ماہ ذی الحجہ کو مچھلی کا شکار کھیلا اور کل تین سو تیس مچھلیاں پکڑیں حتی کہ ۲ ماہ محرم ۱۰۲۰ھ کو باغ عبدالرزاق معموری میں قیام کیا اور یہاں سے میں نے حکم دیا کہ مدت شکار اور تعداد شکار پیش کی جائے چنانچہ مجھے بتایا گیا کہ ۹ ماہ آذر سے لے کر ۲۹ اسفندار سنہ پانچ جلوس تک تین مہینے اور ۲۰ روز کی مدت میں ۱۲ شیر ایک بارہ سنگھا، ۴۴ چکارہ ہرن، ۱ یازہ ہرن، ۲ چو سنگھا ہرن، ۱۸۱ سیاہ ہرن، ۲۱ مادہ ہرن، ۴۴ لومڑیاں، ۸ کرارا ہرن، ایک بڑا کھوا، ۵ ریچھ، ۳ ہونڈرا، ۶ خرگوش، ۱۰۸ نیل گائے، ۱۰۹۶ مچھلیاں، ۱ عقاب، ۱ تغذری، ۵ مور، ۵ کرواکنگ، ۵ تیتر، ۱ سرخاب، ۵ سارس، ۱ ڈھیکن، یعنی اس مذکورہ مدت میں ایک ہزار چار سو چودہ جانور

شکار ہوئے ہیں۔[1]

اس تفصیل کو یہاں بیان کرنے کا ہمارا مقصد یہ ہے کہ مغل سلطنت کے اس دور کے شاہزادوں اور بادشاہوں کے شوق اور مزاج کا اندازہ ہو سکے جو اس سلطنت کا عہد عروج تھا، اسی سلطنت کے دور زوال کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ تفریحات کا دائرہ سمٹ کر محلوں کے اندر محدود ہو جاتا ہے، اس عہد کے بادشاہوں کے تفریحات کے ذرائع میں مرکب و فیل اور شمشیر و بھالے کے بجائے طاؤس و رباب، رقاصاؤں کے پازیب کی جھنکار اور مغنیانِ خوش آواز کے دلکش نغمے اس حد تک شامل ہو گئے تھے کہ اجداد سے ورثہ میں ملا ہوا جوش بہادری اور شوقِ جانبازی غرقِ مے ناب ہو گیا تھا۔

مغلیہ سلطنت کے عہد زوال میں بادشاہوں کی تفریحات رنگ محل کے اندر محدود ہو گئی تھی، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ایسا پر آشوب اور طوائف الملوکی کا دور تھا کہ بادشاہ رنگ محل کی رنگینیوں میں مست و سرشار رہنے میں ہی عافیت سمجھتے تھے، فرش مخمل سے پھوٹتی ہوئی گھنگھروؤں کی آوازیں اور دیواروں سے نکلتے ہوئے نغمے ان کی تفریح و تفنن کا مکمل سامان بن گئے تھے۔

جشن

سلطنت پر اگر کسی ادبار کا سایہ نہ ہو، بادشاہ کے دل و دماغ پر سیاسی آفات کا کوئی بار گراں نہ ہو تو قلعہ شاہی کے اندر دن عید اور رات شبرات ہوتی ہے۔ محلوں میں یوں تو روز ہی تفریح کے واسطے رقص و سرود کی محفل آراستہ ہوتی تھی، لیکن وقتاً فوقتاً کسی نہ کسی بہانے سے بڑے پیمانے پر جشن کا انعقاد کیا جاتا تھا۔ کبھی کسی تہوار پر، کبھی کسی کی تقریب شادی یا رسم سالگرہ پر یا کسی کی تاجپوشی یا فتح یا غسل صحت پر جشن کا اہتمام کیا جاتا تھا جس کا مقصد سوائے تفریح کے کچھ اور نہ تھا، کیونکہ ان موقعوں پر تمام لوازمات عیش مہیا کیے جاتے تھے، ذہنی کلفتیں اور جسمانی تھکاوٹیں جام و مینا میں غرق ہو جاتی تھیں۔ کنور محمد اشرف نے جشن کے مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :-

---

[1] تزک جہانگیری ص۱۲۳۔

"... پسندیدہ سماجی یا تفریحی اجتماعات کو جشن کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ جب کبھی جشن کا ذکر ہوتا تو سننے والے کے دل و دماغ پر ایک کیفیت طاری ہو جاتی اور اس کی نظروں کے سامنے ساز اور موسیقی، نفیس شراب، خشک میوہ جات اندرون خانہ کھیل جیسے چوسر اور شطرنج وغیرہ گھوم جاتے تھے۔ ......
ان محفلوں کی دلچسپ ترین مد شراب تھی جسے حسین ساقی کباب وغیرہ کے ساتھ پیش کرتے تھے۔"[1]

مذکورہ بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جشن کا عام تصور کیا تھا اور اس کا مقصد صرف عیش اور لذت حاصل کرنا ہوتا تھا۔

جشن ہندوستان میں قدیم زمانہ سے منائے جاتے ہیں۔ اہل ہنود دسہرہ، دیوالی، ہولی وغیرہ مذہبی تقریبات کے علاوہ عام دنوں میں بھی جشن کا اہتمام کرتے تھے، ہندوستان میں جب مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی تو اس میں اور ترقی ہوئی ....۔ ہندوستانی جشن میں ایرانی اثرات شامل ہو گئے۔ جشن جس عہد میں انتہائی عروج پر پہونچے وہ مغلوں کا دور تھا۔ اس دور میں تمام بادشاہ بابر سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک جشن منانے کے معاملے میں فراخدل رہے، مذہبی تقریبات کے علاوہ دوسری خوشیوں کے موقعوں پر بھی باقاعدہ اہتمام جشن کیا جاتا تھا۔ مغل بادشاہوں میں اورنگ زیب کے علاوہ سبھی بادشاہ ایرانی تہوار نوروز کو بڑے جوش وخروش سے مناتے تھے، اور ایک بڑے جشن کا اہتمام کرتے تھے۔ اس موقع پر عید کی طرح خوشیاں منائی جاتی تھیں، لوگ نئے نئے کپڑے پہنتے، رقص و نغمے کی محفلیں آراستہ ہوتیں، جہانگیر نے اپنے عہد حکومت کے پہلے جشن نوروز کے بارے میں لکھا ہے کہ:-

"چونکہ میری تخت نشینی کے بعد یہ پہلا جشنِ نوروز تھا، اس لئے میں نے حکم دیا کہ دولت خانہ خاص و عام کو ...۔ آراستہ و پیراستہ کریں ....۔ میری رعایا نے فراخدلی سے عیش و عشرت منائی ہر قسم کے سازندے اور موسیقار دربار میں حاضر تھے،

---

[1] ہندوستانی معاشرہ عہد وسطیٰ میں ص۳۰۹

ایسی حسین رقاصہ جو نازوادا سے فرشتوں کے دل موہ لیں، محفل
کو رونق دیتی رہیں، میں نے حکم دیا کہ شراب اور دیگر نشہ آور
اشیا، ہر شخص کو استعمال کرنے کی اجازت ہے۔“[۱]

جہانگیر کی اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ جشن نوروز کے موقع پر کس قدر خوشی و مسرت کا اظہار کیا جاتا تھا ”بوستان خیال“ میں جس جشن کو سب سے بڑا جشن کہہ سکتے ھیں۔ وہ بھی جشن نوروز ہی ہے۔ یہ جشن شہر فردوسیہ میں ہر سال برپا ہوتا ہے[۲] اس جشن کا اہتمام ملکہ شمسہ تاجدار کا پدر ابو عامر کرواتا ہے۔ ابو عامر کا تعلق عیسائی فرقہ سے ہے۔ یہ وہی جشن ہے جس میں شاہنامہ خورشیدی پڑھا جاتا ہے۔ اور جس کا پڑھنا ملکہ مذکور کی کتخدائی کی شرائط میں شامل ہے۔ اس موقعہ پر شہر فردوسیہ کے ایک اونچے مقام پر بڑے میدان میں شامیانے اور قناتیں لگائی گئی گئیں، چاروں طرف زربفت گجراتی اور دیبائے چینی کے پردے لٹکائے گئے ھیں، بیچ بارگاہ میں صاحبقران اکبر کے لئے مسند بچھی ہے چراغدان سلیمانی روشن ہے، جس کی روشنی سے کہکشاں کو رشک آتا ہے، آفتاب خجالت سے رخ روشن چھپاتا ہے۔ جگہ جگہ قنادیل و فانوسیں آویزاں ھیں جن کی کثرت انجمہائے آسمانی کو خجل کرتی ہے۔[۳]
خیموں کے نقش ونگار کے بارے میں راوی کہتا ہے:۔

”خیموں کے استر میں اس قدر نقش و نگار عجائب روزگار تھے کہ
تماشائی کی آنکھ اس کے دیکھنے سے سیر نہ ہوتی تھی یعنی بعینہ
گلستاں پر از گلہائے رنگارنگ کا لطف آتا تھا اسی طرح
تصاویر کے عالم کو قیاس کرنا چاہیئے۔“[۴]

اس جشن نوروز میں شرکت کے لئے بادشاہ فردوسیہ نے تمام قرب وجوار کے بادشاہوں کو دعوت دی تھی اور سبھی جشن کی رونق سے لطف اندوز ہونے کے لئے جبل اعلیٰ پر آئے تھے۔ صاحبقران اکبر کے حکم کے مطابق تمام بادشاہ بغیر سلاح کے شریک ہوئے تھے[۵] ہر بادشاہ کے لئے ایک تخت رکھا ہوا تھا ہر تخت کے

۱؎ تزک جہانگیری ص ۹۵، ۲؎ ۲۶ ج ۲، ۳؎ ۶۹، ۳ ج ۳ ۴؎ ۵۱۵ ج ۳، ۵؎ ۵۲۲ ج ۳،

روبرو ایک ایک صندلی طلائی رکھی تھی جس پر نرگس دان، گلاب پاش اور چند صراحی و جام مرصع یاقوت نگار اور عود سوز طلائی جملہ سامان مجلس آراستہ تھا۔[۱]

اس جشن کی نوعیت ان جشنوں سے مختلف ہے جو محل کے اندر ہوتے ہیں اور جہاں رقص و نغمہ کی محفل آراستہ ہوتی ہے، اس جشن میں دلکش نغموں کے بجائے دلچسپ قصے بیان کئے گئے ہیں انھیں قصوں کے سننے کا اشتیاق لے کر دور دراز سے بادشاہان ذی قدر جشن میں شریک ہوئے، یہ بات ہم کہہ چکے ہیں کہ بادشاہوں کی تفریح کا ایک ذریعہ قصہ سننا بھی تھا جس کے لئے باقاعدہ قصہ گو ملازم رکھے جاتے تھے۔

محلوں میں تقریبًا ہر روز ہی محفل عیش و نشاط سجائی جاتی تھی، رقاصائیں رقص کرتی تھیں[۲]، خوش آواز کنیزیں نغمے سناتی تھیں[۳]، کبھی یہ محفل بادشاہ یا شاہزادہ کے لئے سجتی تھی[۴]، کبھی شاہزادیاں اپنا دل بہلاتی تھیں[۵]، اس طرح کے جشن کی ابتدا رات کے جشن کی ابتدا کے ساتھ ہوتی تھی جب پورے محل میں قنادیل و فانوسیں اور شمعیں روشن ہو جاتی تھیں، رقص و نغمے کی یہ محفلیں روزانہ کی تفریحات میں شامل تھیں لیکن جب کسی خاص تقریب کا وقت آتا تھا تو پورے قلعہ بلکہ پورے شہر کو آئینہ بند کیا جاتا تھا اور جشن کی مدت کبھی ایک ہفتہ[۶] کبھی چالیس دن[۷] اور کبھی تین مہینے[۸] رہتی تھی۔

کبھی کبھی قلعے سے نکل کر جشن کا انتظام باغ کے اندر بھی کیا جاتا تھا، عمومًا شاہزادیاں بعض تہواروں اور موسموں کا لطف حاصل کرنے کے لئے اپنے باغوں میں جاتی تھیں۔ اس وقت فطرت کے حسن پر مصنوعی حسن کا اضافہ کر کے چار چاند لگائے جاتے تھے، روشوں پر سبز مخمل بچھائی جاتی، درختوں پر قنادیل آویزاں کی جاتی، حوضوں کو آب شفاف سے پُر کیا جاتا، اس میں فوارے چلتے، رنگ برنگی مچھلیاں اٹھکھیلیاں کرتیں، ایک باغ کی آراستگی ملاحظہ ہو:۔

۱؎ ۵۱۵، ج ۳، ۲؎ ۲۹۰، ج ۳، ۳؎ ۲۵۶، ج ۳، ۴؎ ۲۶۲، ج ۴، ۵؎ ۴۰۵، ج ۳، ۶؎ ۲۵۲، ج ۶،
۷؎ ۲۷۴، ج ۱، ۸؎ ۲۳۲، ج ۲،

"در محل کاشانی اور سامان قنادیل بلوری و فانوس ہائے حلبی اور
شمع دانہائے زریں و سیمیں سے روش کو آراستہ کر رکھا تھا
اسی طرح صفہائے رنگانہ کی ہر صفہ پر قنادیل و شمعہائے کافوری
کی کثرت سے روشنی ہو رہی تھی تمام حوض گلاب خالص و آب
سرد و خوشگوار سے لبریز تھے اور گرد و اطراف حوضوں کے بیشتر
بہ چمن مختصر گلہائے رنگارنگ سے آراستہ اس نزہت و
کیفیت کے تھے کہ ان کی نظارت سے طبیعت سیر نہ ہوتی تھی"[۱]

شاہزادیوں کے لیئے محلوں کی تقریبات کے علاوہ سب سے اہم تفریح گاھیں بہی باغ
تھے، یہاں یہ شاہزادیاں کئی کئی روز تک قیام کرتی تھیں اور اپنی ہمسنوں کے ساتھ طرح
طرح کے کھیل کھیلتی تھیں۔

گیندہ بازی

باغوں میں شاہزادیوں سے کھیلوں میں ایک خاص کھیل گیندہ بازی تھا۔ اس کھیل
میں گیندہ کے پھول کو ایک دوسرے کے مارا جاتا تھا، مصحفی نے اس کھیل کو یوں نظم کیا ہے ؎

گیندہ بازی میں مہارت ہے یہ تجھ کو کہ تری
کومتی پار تلک پہونچی ہے اب دار کی گیند
زعفرانی رنگ آتا ہے نظر ــــــ صحن چمن ـــــ
گیندہ بازی کو جو ہیں مشغول طفلان ـــــ

"بوستان" کی بعض شاہزادیاں بھی یہ کھیل کھیلتی ہوئی دکھائی دیتی ھیں۔ صاحبقران کبر
جب باغ میں پہونچے تو دیکھا کہ :۔

"کئی نازنینیں صاحب جمال گل رخسار باللباس گلنار روش
پر گیندہ کھیل رہی ھیں"[۲]

یہ کھیل شاہزادیاں اور بچے ہی کھیلا کرتے تھے۔

---

[۱] ص ۶۵ ج ۵، [۲] ص ۴۹۸ ج ۴ م،

شطرنج

جاگیردارانہ دور میں شطرنج بہت مقبول کھیل تھا اسے شاہی کھیل کہا جاتا تھا، بادشاہ سے لے کر حرم سرا کی خواتین تک اس کھیل کا شوق رکھتی تھیں۔ شطرنج ہندوستان کا قدیم کھیل ہے، مسلمانوں نے ہندوستان آ کر ہی یہ کھیل سیکھا۔ اس کھیل کو سب سے زیادہ مقبولیت مغلیہ دور میں ہوئی۔ اکبر اس کھیل میں بڑی مہارت رکھتا تھا اس نے شطرنج کی بساط فتحپور سیکری کے محل کے فرش پر بنوائی تھی اور مہروں کی جگہ خانوں میں کنیزوں اور غلاموں کو مختلف رنگ کے لباس پہنوا کر کھڑا کرتا تھا[1] محمد شاہ اور شاہ عالم رات کے وقت حرم سرا کی مستورات کے ساتھ شطرنج کھیلا کرتے تھے[2]

"بوستان" میں بھی شطرنج کے شوقین موجود ھیں۔

"مہتر توفیق نے خولاک آہن تاب سپہ سالار سے کہا اے
نامدار شطرنج منگاؤ ہم ایک دو ساعت دل بہلانا
چاہتے ھیں[3]"

لیکن "بوستان" میں اس کی مثال ایک آدھی جگہ ملتی ہے کیونکہ بوستان کے شاہزادوں اور شاہزادیوں کی تفریح کا سامان رقص و نغمہ زیادہ ہے۔ جبکہ اس عہد میں بہت سے کھیل تماشے رائج تھے، جیسے چوپڑ، گنجفہ، کبوتر بازی، مرغ اور بٹیر بازی، پتنگ بازی، پچیسی وغیرہ۔

مینا بازار

مغلوں کے زمانۂ حکومت میں بادشاہوں نے قلعہ کے اندر تفریح کا ایک اور دلچسپ طریقہ نکالا تھا وہ یہ کہ قلعہ میں رہنے والی خواتین ایک بازار لگاتی تھیں، جس میں ہر شے کی دکان ہوتی تھی، ان دکانوں پر سامان بیچنے کے لئے عورتیں ہی بیٹھتی تھیں، شاہی خاندان کے افراد معہ بادشاہ اور شاہزادوں کے بازار میں آتے تھے اور خرید و فروخت

---

[1] ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر ص ۲۰۳، [2] اٹھارہویں صدی میں ہندوستانی معاشرت ص ۲۳۴، [3] ص ۵۶۲ ج ۶،

کرتے تھے، دلچسپ بات یہ تھی کہ بادشاہ اور شاہزادے دکاندار عورتوں سے ایک ایک پیسے پر جھگڑتے تھے اور بعد میں کوڑیوں کے بجائے اشرفیاں دے جاتے تھے، اس طرح کے بازار کی ابتدا سب سے پہلے اکبر نے کی، ابوالفضل نے لکھا ہے کہ:-

"اس بازار میں عورتیں بے حد شوق کے ساتھ سوداگری کیلئے جمع ہوتی ھیں اور تمام بلاد و ممالک کی صنعتیں اور ساز و سامان دکانوں میں جمع کئے جاتے ھیں۔ خواتین حرم و دیگر پردہ نشیں مستورات اس بازار میں آتی ہیں اور خرید و فروخت عام طور پر کی جاتی ہے، دوربین بادشاہ بھی نقاب ڈال کر پہونچ جاتے ہیں اور سامان خرید کر کے نرخ سے واقفیت حاصل کرتے ہیں"[۱]

اس بازار کے لگانے سے اکبر کا مقصد بیگمات کی تفریح کے علاوہ بازار کی اشیاء کی قیمتوں سے واقف ہونا بھی تھا۔ لیکن اس کے جانشینوں کے دور میں یہ بازار صرف ایک تفریح کا ہی ذریعہ بن گیا تھا اور اس کا خاص طور سے انتظام کیا جانے لگا تھا، شاہ جہاں کے زمانہ میں لگنے والے مینا بازار کا ذکر برنیر نے اپنے سفرنامہ میں بڑی دلچسپی سے کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ:-

"کبھی کبھی ان جشنوں کے وقت محلسرائے میں ایک فرضی بازار بھی لگا کرتا تھا جس میں امراء اور بڑے بڑے منصب داروں کی خوبصورت اور دل ربا بیویاں دکانیں لگا کر بیٹھتیں اور عمدہ کمخواب اور نئی نئی وضع اور عمدہ زردوزی کام کی چیزیں اور زر کار مندیلیں اور سفید باریک کپڑے جو امیر زادیوں کے استعمال میں آتے ہیں، بادشاہ اور اس کی بیگمیں، شاہزادیاں، اور دوسری عالی رتبہ خاتونیں خریدار بنتی ہیں۔۔۔۔ اس میلہ کا بڑا لطف یہ ہے کہ ہنسی اور مذاق کے طور پر خود بادشاہ ایک ایک پیسہ کے لئے جھگڑتا ہے اور کہتا ہے یہ بیگم صاحب بہت گراں فروش ہیں دوسری جگہ سے اچھی اور سستی چیز مل سکتی ہے ہم ایک کوڑی بھی زیادہ نہ دیں گے"[۲]

---

[۱] آئین اکبری ص ۲۱۲ جلد اول۔ [۲] شاہجہاں کے ایام اسیری اور عہد اورنگ زیب ص ۵۸ (سفرنامہ برنیر)

غرضکہ اس بازار کا منظر بڑا پر لطف ہوتا تھا۔ دکاندار اور بادشاہ وغیرہ کے درمیان خوب جھگڑا سا ہو جاتا تھا۔ دکانوں پر بیٹھی ہوئی بیگمات بھی بڑی بے باکی سے باتیں کرتی تھیں، بعض تو بادشاہ سے یہاں تک کہہ دیتیں کہ آپ اپنے برف بیچنے کی فکر کریں "ان چیزوں کی قیمت آپ کیا جانیں، آپ کے لائق نہیں ہیں، بہتر ہے کسی اور جگہ تلاش کر لیں۔

دکانوں پر بیٹھی ہوئی ان خواتین کی شوخیوں سے بھرا ہوا بازار "بوستان" میں بھی نظر آتا ہے یہاں بھی خاص طور سے سلطان اسمٰعیل کے لئے یہ زنانہ بازار لگایا گیا ہے اس بازار کی سوداگر بھی خوبصورت نازنینیں ھیں، شاہزادہ اسماعیل جب اس بازار میں جاتا ہے تو بالکل سے شاہ جہاں کے مینا بازار کا سا منظر دکھائی دیتا ہے، یہ حسینائیں بھی شاہزادہ سے اسی طرح جھگڑتی ھیں، شوخیاں کرتی ھیں اور سامان فروخت کرتی ھیں۔

"ایک طرف بازار زنانہ مقرر ہوا تھا کہ دو طرف سراچہائے مرتفع استادہ کر کے بقدر چار سو گز زمین کے ان سراچوں میں چھوڑ دی تھی اور وہ سراچے شہر مہدیہ کے دروازے تک متصل تھے اور ان سراچوں میں دونوں طرف دکانیں تھیں، ہر نازنیں دکاندار آفتاب طلعت کا سن آٹھ نو برس سے زیادہ نہ تھا جو ہر سے گاذر تک اہلِ حرفہ اس بازار میں موجود تھے ـ ـ ـ ـ ـ ان میں اکثر کنیزیں صاحبِ شعور و شیریں حرکات و موزوں طبع بھی تھیں اور اس شب مقرر تھا کہ ہر کنیز موافق اپنے شعور کے شاہزادے سے شوخی کرے زنانِ زنانہ و رقاصہ وغیرہ بھی جا بجا اس بازار میں اپنے کام میں مشغول تھیں"[۱]

محلوں کے اندر دل بہلانے کے لئے قصہ خوانی اور نقالی بھی ہوتی تھی، قصہ گوئی کا ذکر ہم دربار کے سلسلے میں بھی کر چکے ھیں، قصہ گو باقاعدہ ملازم رکھے جاتے تھے رات کے وقت یہ لوگ اپنے دلچسپ اندازِ بیان کے ذریعہ بادشاہ اور اہلِ حرم کو محظوظ کرتے تھے

---

[۱] ۳۶۶ ج ۱،

"بوستان" کے بادشاہوں کے یہاں بھی قصہ گو ملازمت کرتے ھیں۔

"ایک زن ضعیفہ شہر نظرستان باشندہ واسطہ بانونام خدمت افسانہ گوئی پہ میری سرکار میں نوکر تھی اور میں گاہے گاہے اس سے قصہ سنتا تھا"[۱]

نقالی ڈرامہ کی ابتدائی شکل کہی جا سکتی ہے اس میں کسی بھی کہانی کو نقال نقل کر کے حاضرین کو خوش کیا کرتے ھیں۔ محلوں میں یہ نقلیں کبھی کبھی ہوتی تھیں لیکن بازاروں اور میلوں میں تقریباً روز ہی ہوا کرتی تھیں، عوام اس میں بے حد دلچسپی لیتے تھے۔ اٹھارہویں صدی کے نقالوں کے بارے میں مرقع دہلی میں لکھا ہے کہ چاندنی چوک وغیرہ بازار میں جگہ جگہ یہ لوگ اپنی دکان سجا کر بیٹھ جاتے ہیں اور دیکھنے والوں کو محظوظ کرتے ہیں[۲]۔ نوابین اودھ کے محلوں میں یہ نقلیں زیادہ مقبول تھیں، خود واجد علی شاہ کرشن وغیرہ کا روپ اختیار کر کے نقل میں شریک ہوتا تھا۔

اسی طرح "بوستان" کے شاہزادے نقالوں کے ساتھ شرکت کرتے ہیں اور تفریح حاصل کرتے ہیں، داستان نگار لکھتا ہے کہ۔

"حکیم صاحب نے فرمایا ---- اے نادرہ تو ملکہ نوبہار کو میری طرف سے کہنا کہ تم اپنی مجلس کے اہل تقلید اور نقالوں کو حکم دو کہ وہ خسرو شیریں کے عشق و عاشقی کی نقل ابتدا سے تمہارے روبرو بیان کریں، شاہزادے کو خسرو قرار دیں اور بجائے شیریں ملکہ نوبہار مقرر ہو"[۳]

غرضکہ شاہی محلوں کی یہ وہ تفریحات تھیں جن سے نہ صرف مغل بادشاہ اور شاہزادے حظ اٹھاتے تھے بلکہ "بوستان" کے شاہی خاندان سے تعلق رکھنے والے افراد بھی لطف اندوز ہوتے ھیں۔ یہ تمام تفریحات عموماً محلوں کے اندر ہی حاصل ہو جاتی تھیں لیکن بعض ایسے شوق بھی تھے جن کو پورا کرنے کے لئے محل سے باہر جایا جاتا تھا، "بوستان خیال" کی ایسی تفریحات میں چوگان بازی اور شکار خاص ھیں۔

---

[۱] ج ۲، ۲۹۳ [۲] مرقع دھلی۔ ص ۱۳۲، [۳] ج ۲، ۴۰،

چوگان بازی

چوگان بازی کی ابتدا مسلمانوں کے ہندوستان آنے کے بعد ہوئی ہے[۱] مسلمان اس اس کا بے حد شوق رکھتے تھے، سلطان قطب الدین ایبک کی وفات اسی کھیل کو کھیلتے وقت گھوڑے سے گر جانے کے سبب واقع ہوئی۔

یہ کھیل گھوڑوں پر سوار ہو کر گیند اور چوگان یعنی بلہ سے کھیلا جاتا ہے، اس کھیل میں دس آدمیوں سے زیادہ حصہ نہیں لیتے، کھلاڑیوں کی دو دو کی جوڑی ہوتی ہے اس کے کھیلنے کا طریقہ "رول" کہلاتا ہے جس میں سوار گیند کو چوگان (بلہ) کے خم میں لے کر سب کے درمیان سے نکال لے جاتا ہے اور میدان کے کنارے پر پہونچا دیتا ہے دوسرا طریقہ یہ ہے کہ تیزی سے گیند کو چوگان سے ضرب لگائی جاتی ہے اور پھر کھلاڑی سب سے تیز آگے بڑھ کر دوبارہ گیند کو آگے بڑھاتا ہے اسے "دبیلہ" کہتے ہیں، جب گیند کو کھلاڑی "حال" یعنی مقررہ کنارہ پر پہونچا دیتا ہے تو نقارہ بجا کر اس کا اعلان کیا جاتا ہے[۲]

اکبر کو اس کھیل سے بڑا شغف تھا اس نے اندھیری رات میں بھی چوگان کھیلنے کا طریقہ نکال لیا تھا[۳]

"بوستان" میں صاحبقران اکبر اور ملکہ نوبہار کے علاوہ دیگر شاہزادے اور شاہزادیاں بھی چوگان بازی میں مہارت رکھتی ھیں، بلکہ دختران سلاطین کے لئے یہ ضروری سمجھا گیا ہے کہ وہ اس کھیل میں دلچسپی رکھتی ہوں[۴] اور "بوستان" کی شاہزادیاں اس سے دلچسپی رکھتی تھیں۔

"داروغہ کو طویلہ نے حکم دیا کہ ملکہ کا ارادہ چوگان بازی کا ہے تم بارہ مرکب چالاک فلاں دروازہ پر باغ کے تیار رکھنا"[۵]

داستان میں ایک مقام پر شاہزادیوں اور ان کے شوہروں کے درمیان چوگانے

---

[۱] ہندوستانی معاشرہ عہد وسطی میں ص۳۰۲، [۲] منتخب التواریخ از بدایونی ص۱۵۴،
[۳] ایضاً، [۴] ص ۴۰، ج ۲، [۵] ص ۸۱ ج ۲،

بازی کا مقابلہ ہوتا ہے۔ اس مقابلہ میں معزالدین کے ساتھ ملکہ نوبہار کھیلتی ہے۔

"والغرض ملکہ نو بہار اور شاہزادہ معزالدین نے اس طرح چوگان
بازی کی کہ صدائے تحسین و آفریں ہر ایک آدم زاد کے حلق سے
بلند ہوئی اور غالب و مغلوب تمیز نہ ہوا" [۱]

چوگان بازی عام طور پر شاہی خاندان کے افراد یا امراء ہی کھیلا کرتے تھے۔

شکار

زمانۂ قدیم میں جب انسان تہذیب سے واقف نہیں ہوا تھا، جانوروں کو شکار کرنا اس کی ضرورت تھی، وہ جانوروں کو مار کر اپنے لئے غذا فراہم کرتا تھا، لیکن جیسے جیسے انسانی برادری میں تہذیب داخل ہوتی گئی اور آدمی مہذب ہو گیا تو جانوروں کو شکار کرنا ضرورت سے زیادہ اس کی تفریحات میں شامل ہو گیا آدمی صرف اپنے شوق کی خاطر شکار کھیلنے لگا اور اس کے لئے وحشی انداز کو چھوڑ کر باقاعدہ طریقے بنالئے، حکمراں طبقے میں شکار کھیلنا اہم تفریحات میں شامل سمجھا جاتا تھا۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے قبل بھی شاہی خاندان کے افراد اور صاحب حیثیت لوگ خوب شکار کھیلا کرتے تھے کیونکہ ہندوؤں کی برہمن ذات کے علاوہ دوسری ذاتوں میں گوشت کھایا جاتا تھا۔ اس وقت بھی شکار کا شوق اس حد تک تھا کہ شکاری جانوروں اور پرندوں پر کئی ضخیم کتابیں تصنیف کی گئیں [۲] مسلمان اس شوق کو اپنے ساتھ بھی لے کر آئے، جس طرح زندگی کے دوسرے شعبوں میں ایرانی اثرات شامل ہوئے اسی طرح شکار کھیلنے میں بھی ایرانی طریقہ اختیار کیا۔ یہ طریقہ "قمرغہ" کہلاتا تھا اس میں کسی جنگل کے گرد درختوں اور لکڑوں کا احاطہ بنا دیا جاتا جس سے جانور گھر جاتے تھے درختوں پر بنے ہوئے مچان پر بادشاہ اور شاہزادے بیٹھتے تھے جب تیس تیس کوس سے ہانکا کیا جاتا تو مختلف الاقسام چرندے اور پرندے اس احاطہ میں آجاتے تھے، پھر احاطہ کو بند کر کے بادشاہ اور شاہزادے شکار کرتے تھے، محمد بن تغلق

---

[۱] ۱/۴۷، ۲۳ [۲] ہندوستانی معاشرہ عہد وسطیٰ میں ص ۳۰۵

ی سرکار میں تین ہزار آدمی صرف شکار کو ہانکا دینے پر تعینات تھے[1]

شکار کے اس قدر شوق کی وجہ سے بادشاہوں نے اپنی سرکار میں باقاعدہ ایک شکار کا محکمہ قائم کر دیا تھا، جس کے افسران کے ذمہ شکار سے متعلق تمام کام انجام دینا ہوتا تھا، یہ لوگ شاہی شکارگاہیں تیار کرواتے تھے، شکار کے لیے سواریوں اور شکاری جانوروں اور پرندوں کا انتظام کرتے تھے، سواری کے لیے عام طور پر ہاتھی اور گھوڑے ہی استعمال کیئے جاتے تھے۔ شکار میں مدد دینے کے لیے شکاری کتے، چیتے سیاہ گوش، باز، شاہین وغیرہ کو تربیت دی جاتی تھی، بندوقوں کی ایجاد سے قبل شکار کے لیے نیزے، تیر اور تلواریں استعمال ہوتی تھیں۔

عہد وسطیٰ کے سبھی سلاطین شکار کے شوقین تھے۔ ابن بطوطہ نے محمد بن تغلق کی شکار کے لیے جانے والی سواری کا تفصیل سے ذکر کیا ہے[2] اس تفصیل سے یہ قیاس ہوتا ہے جیسے بادشاہ کسی بڑی مہم کے لیے جا رہا ہو۔ بادشاہ خود ہاتھی پر سوار ہوتا تھا، اس وقت اس کے ہمراہ دو لاکھ سوار اور دو سو ہاتھی ہوتے تھے، چار لکڑی کے محل آٹھ سو اونٹوں پر لاد کر لے جائے جاتے تھے، محلوں کے علاوہ بہت سے تمبو، ڈیرے ساتھ چلتے تھے[3] محمد بن تغلق کے اس اہتمام شکار کے مطابق دوسرے سلاطین کے شوق کا اندازہ لگانا چاہیئے

مغلیہ دور میں شکار کے شوق میں اور اضافہ ہوا، مغل خاندان کے تقریباً سبھی بادشاہ اور شاہزادے شکار کے شوقین تھے، اکبر کی شکار سے دلچسپی کے بارے میں ابوالفضل نے آئین اکبری میں تحریر کیا ہے، جہانگیر نے جگہ جگہ اپنی تزک میں شکار کے متعلق لکھا ہے، ملکہ نور جہاں کو بھی شکار کا شوق تھا، اس نے کئی بار بندوق سے شیروں کا شکار کیا۔[4]، اورنگ زیب نے شاہزادہ معظم کو اس وقت دکن کی صوبہ داری عطا کی جب اس نے ایک شیر کو شکار کیا[5]، جہاندار شاہ، فرخ سیر اور محمد شاہ بھی شکار کھیلنے میں دلچسپی رکھتے تھے۔ محمد شاہ کے عہد میں تالکٹورہ، رمنہ بدلی اور پالم بہت اہم شکارگاہیں تھیں[6]

---

[1] محمد شاہ بن تغلق صفحہ ۲۲۸، [2] سفرنامہ ابن بطوطہ قسط ۲ صفحہ ۹۴، [3] محمد شاہ بن تغلق صفحہ ۲۳۲، [4] تزک جہانگیری صفحہ ۲۱۸، [5] برنیر صفحہ ۲۶۲، [6] اٹھارہویں صدی میں ہندوستانی معاشرت صفحہ ۲۳۹،

داستانوں میں شاہزادوں اور شاہزادیوں کا شکار کھیلنا بڑی اہمیت رکھتا ہے، داستان گو شاہی خاندان کے افراد کو محض تفریح کے لئے شکار کھیلنے میں مشغول نہیں رکھتا۔ بلکہ شکار پر جانے کو داستان کے پلاٹ کا ایک حصہ بنا دیتا ہے۔ یعنی کبھی کوئی شاہزادہ کسی ہرن کے تعاقب میں اپنے ساتھیوں سے دور نکل جاتا ہے، ہرن گم ہو جاتا ہے، شاہزادہ صحرائے لق و دق میں حیران و پریشان گھومتا ہے کہ کسی شاہزادی کا باغ نظر آجاتا ہے شاہزادہ باغ کے اندر داخل ہوتا ہے اور نتیجہ میں داستان سامنے آتی ہے۔ یا اسی طرح کوئی شاہزادی شکار کے لئے جاتی ہے اور شاہزادہ مل جاتا ہے[1]

ہرن کے تعاقب میں جانا فارسی یا اردو داستان ہی کا پہلا موضوع نہیں ہے بلکہ ہندوستان کی قدیم کتاب رامائن میں بھی ہرن کا پیچھا کرتے ہوئے رام چندر دور نکل گئے تھے اور سیتا جی کو راون اٹھا کر لے گیا تھا۔

داستانوں میں عام طور پر شاہزادے ہرن ہی کے شکار کے لئے نکلتے ہیں، ہرن دراصل علامت ہے محبوب کی، ہرن کا حسن محبوب کے حسن سے مشابہ ہے شاعری میں ہرن کی آنکھوں اور اس کی دوسری حرکات کو محبوب کی آنکھوں اور حرکات سے تشبیہ دی جاتی ہے، ابوالفضل نے بھی اس کی تعریف محبوب کے حسن کی طرح کی ہے لکھا ہے کہ :-

> "ہرن کا رنگ اور اس کی چال دلنشیں ہوتی ہے اور اس رفت و خیز دیکھنے والوں کو خوش کرتی ہے، بادشاہ اس جانور پر بے حد توجہ فرماتے ہیں"[2]

ہرن کے تعاقب میں جاکر حیران و پریشان ہونا اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ راہِ عشق میں بھی اسی طرح کی سرگردانی و پریشانی کا سامنا ہوتا ہے۔

بوستان کے شاہزادے بھی شاہانِ مغلیہ کی طرح شکار کا شوق رکھتے ہیں، ان کے شکار کا طریقہ بھی وہی ہے یعنی صیدگاہیں بنی ہوئی ہیں[3] جہاں یہ شاہزادے امراء کے ساتھ صید اندازی کیلئے جاتے ہیں، شکاری جانور اور پرندے ان کے ساتھ ہوتے ہیں[4]

---

[1] ۹۱۳۹ج۴، [2] آئین اکبری جلد اول صفحہ ۳۲۴، [3] ۸۶۴ ج ۲، [4] ۹۱۴۹ ج ۵،

"جب خسرو عالی شان محاصرہ حصار حصن الحدید سے دل تنگ ہوا، فراغ خاطر کے لئے متوجہ شکار نیل و رنگ ہوا، مرکب آہو تک پر سوار ہمراہ چیتے، باز، جرے، باشے تیار کیے، تازی بڑے گلڈانگ بود ار شکار کناں صید افگناں دشت و بیاباں میں چلا جاتا تھا۔۔۔۔۔ ہرن، قازیں، قرقرے، پڑی، گرپا۔۔۔۔ افسروں کو بھی شکار کا حکم دیا، کبک و تیہور پر باز جھپڑوائے، وحش و طیر کے ڈھیر لگا دیے۔"[1]

شاہزادوں کو یہ شوق بچپن ہی سے ہوتا تھا۔ یوں بھی ابتدا ہی سے شاہزادوں کو شکار پر جانے کی تربیت دی جاتی تھی تاکہ ان میں بہادری اور جانبازی کا جذبہ پیدا ہو، خطروں سے مقابلہ کی عادت پڑے، شاہزادہ خورشید تاج بخش جب دس سال کی عمر کو پہونچا تو شکار کھیلنے کے واسطے گیا۔

"جب سال دہم ہوا ایک دن پدر بزرگوار بہرام شاہ سے اجازت لے کر بعزم صید و شکار شہر سے باہر نکلا، جملہ سامانِ شکار، جانورانِ شکاری پلنگ و سیاہ گوش وغیرہ ساتھ تھے، تمام دن صحرائے پُر بہار و مرغزارِ جنت نشاں میں جانوران چرند و پرند کا شکار کھیلا۔"[2]

جنگلی جانوروں کے علاوہ مچھلی کا شکار بھی کھیلا جاتا ہے، جہانگیر نے تزک میں کئی جگہ مچھلی کے شکار کا بیان کیا ہے۔

عرس اور میلے

متذکرہ بالا تفریحات کے علاوہ کچھ تفریح کے ذرائع ایسے بھی تھے جن سے عوام و خواص دونوں ہی لطف اندوز ہوتے تھے۔ بلکہ خواص سے زیادہ عوام کی دلچسپی اور ان کی تفریح کا سامان ان میں ہوتا تھا۔ یہ بزرگان دین کے مزارات پر لگنے والے عرس اور میلے

---

[1] ۹۳، ج ۷م، [2] ۲۳ ج ۴،

تھے، ہندوستان میں جس طرح اہل ہنود اپنے تہواروں پر میلے کا اہتمام کرتے ہیں، مقدس مقامات پر پوجا کے لئے جاتے ہیں اسی طرح مسلمانوں نے بھی بزرگوں کی یاد میں ان کے مزارات پر سالانہ عرس کرنے شروع کر دئے، عرس کے موقع پر محفل سماع آراستہ ہوتی تھی، میلہ لگتا تھا جس میں کھیل تماشوں کے ساتھ ہر شے کی دکانیں لگائی جاتی تھیں، مرد، عورت، خورد و کلاں سبھی ان میلوں میں شریک ہوتے تھے۔

ہندوستان میں ابتدائی مسلم حکمرانوں کے عہد میں ہی عرس کرنے اور مزارات پر میلہ لگانے کی روایت شروع ہوگئی تھی، مغلیہ دور تک آتے آتے عرس اور میلے ہندوستانی تہذیب کا جزو لانیفک بن گئے، ہر شہر کے ہر مزارِ مقدس پر سال کے سال دھوم دھام سے عرس منایا جانے لگا۔ یہاں تک کہ جہانگیر نے اکبر کے مزار پر عرس منانے کا حکم دیا، اپنی تزک میں عرس منانے کو ضروری خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:-

> "میرے والد بزرگوار کا عرس بھی اتفاق سے اسی دن مقرر تھا عرس منانا بھی ہندوستان کی ایک قدیم رسم ہے، اپنے بزرگوں کے عرس کے موقع پر اس کے متعلقین انواع واقسام کے کھانے پکواتے ہیں، خوشبودار چیزیں جلاتے ہیں، متقی و پرہیزگار لوگ اس موقع پر اکھٹے ہوتے ہیں اور عبادت کر کے ان کو ثواب پہونچاتے ہیں میں نے اپنے بیٹے خرم کو حکم دیا کہ وہ والد بزرگوار کے روضہ مبارک پر جا کر عرس کی محفل کرائے، اس غرض کے لئے میں نے دس معتبر ملازموں کو دس ہزار روپے دے کر روانہ کیا کہ وہ اس رقم کو غرباء اور فقراء میں تقسیم کریں"۔[1]

یہ عرس بادشاہ بیٹے کی باپ سے عقیدت کا اظہار تھا، لیکن باقاعدہ جو عرس منائے جاتے تھے ان میں بیشتر مزارات ان بزرگوں کے ہوتے تھے جنھوں نے اپنی تمام زندگی دین کی خدمت میں گذاری تھی یا دین کی خاطر شہید ہوتے تھے۔ مغلیہ عہد میں دلی کے جن مزارات پر

---

[1] تزک جہانگیری ص۱۴۰،

پابندی سے عرس ہوا کرتا تھا ان کا ذکر مرقع دہلی میں مفصل طور سے کیا گیا ہے جن خاص زیارتوں پر عرس ہوتا تھا ان میں قدم شریف، قدم گاہ امام، درگاہ قطب الاقطابؒ، مرقد مبارک سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاؒ، حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ، مزار مرزا بیدلؒ، حضرت شاہ ترکمان بیابانی، حضرت شاہ حسن رسول نما، شاہ عزیز اللہ، حضرت باقی باللہؒ وغیرہ شامل ہیں ان سب زیارت گاہوں پر عرس کی رسم منائی جاتی تھی اور بڑی دھوم دھام سے میلہ لگایا جاتا تھا، قوالوں کی ٹولیاں آتی تھیں اور قوالیاں سناتی تھیں، رقص و نغے کی محفلیں سجتی تھیں، زائرین جوق در جوق وہاں آتے تھے، کئی روز تک وہاں رہ کر لطف اٹھاتے تھے، باغوں اور چمن زاروں کی سیر کرتے تھے۔ کھیل تماشے دیکھتے تھے، دکانوں سے خرید و فروخت کرتے تھے، صاحب مرقع دہلی نے عرس خلد منزل کا منظر اس طرح پیش کیا ہے:۔

> در خلد منزل کی قبر حضرت قطب الاقطاب کے روضہ شریف کے جوار میں واقع ہے ----- عجیب عجیب طریقوں سے اس مقام کی تزئین کی جاتی ہے اور طرح طرح سے اس کو سجایا جاتا ہے ------ من چلے سیلانی اپنے اپنے معشوقوں کے ساتھ ہم آغوشی کے انداز میں سیر گشت کرتے ہوئے پھرتے ہیں اور جذبات میں ڈوبے ہوئے لوگ کوچہ و برزن میں رقص جمل کا منظر پیش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں شراب خانہ خراب کے متوالے محتسب کے اندیشے سے بے پرواشیشہ و جام سے دل بہلاتے دیکھے جاتے ہیں حسین امردوں اور نوخطوں کا وہ ہجوم کہ اسے دیکھیں تو زہاد کے تقوے لوٹ جائیں، غزالوں جیسی آنکھوں والوں کی وہ ٹولیاں کہ اہل تقویٰ کو زندگی بھر توبہ یاد نہ آئے -------- ہر گوشہ بساط امرار و خواتین سے آراستہ رہتا ہے اور ہر گلی و کوچہ میں فقیر دل اور دریوزہ گروں کے جمگھٹ دکھائی دیتے ہیں وہ شور و غل ہوتا ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی، سازندے

اور قوّال اتنے کہ کوئی گننا چاہے تو گن نہ سکے اور تماشائیوں کی وہ کثرت کہ خدا کی پناہ "۔ [۱]

یہاں ہم نے مختصراً مرقع دھلی سے ایک عرس کا منظر نقل کیا ہے جس سے عرس کی فضا کا اندازہ ہو جاتا ہے، مرقع دہلی "بوستان" کا عہد ہے "بوستان خیال" بھی اسی وقت لکھی جارہی تھی جب مرقع دھلی قلمبند کی گئی، مرقع دہلی حقیقی واقعات و مناظر پر مبنی ہے اور "بوستان" داستان نگار کے تخیل کا نتیجہ، لیکن جب ہم ان کے تحریر شدہ واقعات و مناظر کا موازنہ کرتے ھیں تو یک سرِ مو فرق نہیں پاتے، یعنی "بوستان" اگرچہ تخیل کی پرواز ہے لیکن وہ تخیل اس مشاھدہ کا اظہار ہے جیسے داستان نگار اپنے عہد میں دیکھ رہا ہے۔ جو عرس کے موقعوں میلوں کے مناظر اس زمانہ کی دلّی میں تھے یا آج بھی ھیں ان کی مکمل عکاسی "بوستان" کا مصنف کرتا ہے۔ یہاں بھی درختوں کے نیچے حلوائی طرح طرح کی مٹھائیوں سے بھری دکانیں لگائے بیٹھے ہیں، بکری ہو رہی ہے، نان بائیوں کے یہاں تنور گرم ہیں، شیرمالیں اور باقرخانیاں لگ رہی ہیں، سیخوں پر گرم گرم کباب چڑھے ھیں، ہزاروں پھول والی سرخ سبز شمعیں لٹک رہی ھیں۔ ناڑے الائچی دانے، ہار چھڑیوں پر رکھے ہیں، عطاروں کی دکانیں مشک واذفر و شمامہ ہائے عنبر سے نافہائے چین و ختن ھیں۔ تنبولنیں پری زاد حور نژاد رنگین و خوش مزاج زمرد کے پتے کانوں میں صرف برگ شماری تنباکو والیاں دھواں دھار جن کے لب حقہ مرجان میوہ فروش تمام جہاں کے میوے بیچ رہے ھیں، ہجوم خلائق اس قدر کہ تھالی پھینکو تو سروں پر جائے، وضیع و شریف، پیر و جواں، خورد و کلاں، حسین و خوش جمال پُر تکلف لباس پہنے ہوئے اپنے اپنے تصورات میں سرگرم، کتنے نظارہ بازی میں مشغول، بہت سے نذر و نیاز کے سودے میں مصروف، بعضے جھولا جھولتے ہیں، اکثر شرابی کی دکان پر ملال و کلال دفع کرنے کو جھکے ہیں، پیالے پی پی کے چھکے ہیں، دائرے بج رہے ہیں، غزلیں گائی جا رہی ھیں، افیونیوں کا مجمع ہے، چسکیاں چل رہی ھیں، گنے چھپتے ہیں، حقے پیتے ہیں، چنین اڑاتے ہیں، کٹورا کھنک رہا ہے، کہیں سپیرے تماشا کرتے ہیں، کہیں

---

[۱] فکرِ نو (شاہ جہاں آباد نمبر)، ص ۱۴۱

داستان ہو رہی ہے[1] غرضکہ "بوستان" میں ہندوستان کے مزارات پر لگنے والے میلوں کا منظر ہو بہو نقل کر دیا ہے۔

عارف شاہ کے تکیہ پر لگنے والے عرس کا بیان دلی کے مزارات پر منائے جانے والے عرسوں کے ساتھ ساتھ فسانۂ عجائب میں بیان کیے ہوئے لکھنؤ کی بھی یاد تازہ کرتا ہے۔ داستان نگار نے تمام جزئیات پر نظر رکھتے ہوئے لکھا ہے کہ :-

"یہاں سے پانچ کوس عارف شاہ کا تکیہ ہے ہر سال ان کا عرس ہوا کرتا ہے کافر و مومن سب جاتے ہیں، گانا ہوتا ہے، کھانا بٹتا ہے تین دن تک میلا رہتا ہے ----- لاکھوں آدمی پیر تا جواں خورد و کلاں، پوشاکیں رنگین نفیس پہنے ہوئے چلا جاتا تھا کھلونے والے، پنکھیوں والے، سینکڑوں تھے، ایک طرف دیکھا تو کھمبے گڑے ہیں، لوگ جھومتے ہیں کہیں ہنڈولے کے چکر چل رہے ہیں، غزلیں گائی جا رہی ہیں، ٹھمریاں اڑ رہی ہیں، بھنگڑنیں خوبصورت لال سفید دھانی زعفران، جوڑے، گلے میں جوڑے بندھے ہوئے سرمے لگائے، مسّی کی دھڑی جمائے، کانوں میں سونے کی بجلیاں دو کانوں پر بیٹھی ہیں، رنگا رنگ حقّے دھرے ہیں، نیچوں میں ہار لپٹے ہوئے ہیں، گھمارٹھی چھن رہی ہے، عشاق کا مجمع ہے، چار جھومتے ہیں، آٹھ ڈھمڈھیاں بجاتے، بجا بجا کے بنارس کی کجریاں گا رہے ہیں، تنبولنیں پری وش گو یا حسن کی ساری دولت انھوں نے ڈھولی تھی، عاشقوں کی جانسپاری کا بیڑہ اٹھائے ہوئے بیٹھی ہیں، چار سے پانچ سے نظارہ باز کھڑے ہیں، دید ہو رہی ہے، حلوائیوں کی دکانیں برابر چلی گئی ہیں، انواع و اقسام کی مٹھائیاں تھالوں میں چنی ہوئی، چوڑیاں ہاتھوں میں جھل رہے ہیں، بکری ہوتی جاتی ہے ہار والے پکارتے ہیں ہار ہیں موتیے کے، شوقین لے رہے ہیں،

---

[1] ۵۴، ج ۷، م،

کوئی مول چکاتا ہے، کوئی کہتا ہے لے لالا کے ایسے ہار نہ ملیں گے بیلو
اور لے لے کے گلے میں ڈالتے ھیں، عطر ملتے ھیں، خوشبو پھیلی ہوئی
ہے، کسبیوں کی ڈولیاں، فینسیں جو میلے جاتے ہیں انھیں کی جلو میں
یہ بھی جاتے ھیں۔ جھانک تانک اشارے بازی ہو رہی جاتی ہے جن
سے رسم ہے وہ ڈولیاں لئے ہوئے ٹھکانے ڈھونڈتے پھر رہے ھیں
بازار میں کٹورا کھنک رہا ہے، گگڑ والے حقے پلا رہے ھیں، گنڈیریاں ے
کٹرنے کی صدا آرہی ہے کوئی کہتا ہے تونچوڑے ھیں، گرم مسالے
کے، سینکڑوں برف کی ٹھلیاں جما رہے ھیں ...'' لے

داستان نگار نے بڑی تفصیل سے اس میلہ کا بیان کیا ہے، اس میں ہر شخص کی تفریح و شوق کا سامان موجود ھے، شرابی شراب سے ہونٹ تر کرتے ھیں، رقص کے شوقین رقص سے محظوظ ہوتے ھیں، نغموں کے عاشق نغمات دلفریب سے حظ اٹھاتے ھیں، قوالی سے دلچسپی رکھنے والے قوالیاں سن سن کر جھومتے ھیں، جواری جوا کھیلنے کے لیے موقع نکال لیتے ہیں، جیب کترے ہاتھ کی صفائی دکھاتے ہیں، غرضکہ ہر شخص اپنے مزاج کے مطابق اپنے شوق پورے کرتا ہے، امیر و غریب بھی اس میں شریک ہوتے ھیں، عام لوگوں کی تفریحات میں اس طرح کے عرس اور میلے سب سے مقبول تھے کیونکہ ان میں بآسانی دل بہلانے کا سامان فراہم ہو جاتا تھا اور مذہبی عقیدے کے لحاظ سے عرس میں شرکت کرنا کار ثواب اور بزرگانِ دین کی دعائیں حاصل کرنے کا ذریعہ خیال کیا جاتا تھا، آج بھی بزرگوں کے مزارات پر اسی دھوم دھام کے ساتھ عرس منائے جاتے ھیں۔

داستانوں میں تفریح کا ایک ذریعہ عیار بھی ہے اگرچہ بعض عیار داستان میں بڑا اہم کردار ادا کرتے ہیں لیکن کبھی کبھی ان کی حیثیت بادشاہ کے دربار میں صرف مسخرے کی سی رہ جاتی ہے اور ان کا مقصد بادشاہ کو خوش کرنا ہوتا ہے جس طرح بادشاہوں کے دربار میں نقال ملازم رہتے تھے اسی طرح مسخرے بھی دربار سے وابستہ ہوتے تھے بادشاہ ان کی کسی گستاخی کو ناگوار خیال نہیں کرتا تھا، بلکہ اس کے ہر فعل و عمل کو اس کی مسخرگی سے تعبیر

لے ۲۷۶ ج ۷م،

کیا جاتا تھا، داستان نگار کی عیاروں کے بارے میں یہ رائے ہے کہ :-

"عیاران ظریف طبع ہمیشہ بادشاہوں کے سامنے مذاق کرتے ہیں اور رؤسا کی خدمت میں گستاخ رہا کرتے ہیں، بادشاہ ان کے ناز بردار رہتے ہیں اور اسی پر انعام و اکرام پایا کرتے ہیں"[1]

جمشید سیہ قبا کے دربار میں ضحکان نام کا ایک مسخرہ موجود ہے جو اپنی باتوں اور حرکتوں سے اہلِ دربار کو ہنساتا ہے، جمشید اس کی کسی بات سے ناراض نہیں ہوتا[2] داستان کا عیار بیک وقت مسخرہ، بہروپیہ اور نقال بھی ہوتا ہے۔ یہ اگر ایک طرف اپنی عیاری کے فن سے بادشاہ کی مدد کرتا ہے تو دوسری طرف اپنے مزاج کی مسخرگی سے بادشاہ کا دل بہلاتا ہے۔

---

[1] ۹۳ ج ۹۱، [2] ۲۸۵ ج ۱،

اخلاقی اقدار

محاسن : بزرگوں کا احترام ، پاس نمک ، مہمان نوازی ، احسان مندی ، غیرت مندی ،

معائب : عیش دوستی ، شراب نوشی ، طوائف پسندی امرد پرستی ، غلاموں کی خرید و فروخت ، قزاقی ، لڑکیوں کی کم قدری ، رسم ستی ، رشوت خوری وغیرہ ،

اخلاقی خوبیاں

ہر قوم، ہر شہر اور ہر ملک میں بعض قدریں وجہ امتیاز ہوتی ہیں جو دوسرے کے مقابلے میں شناخت کا ذریعہ بنتی ہیں، ہندوستان بہت سے صوبوں میں تقسیم ہے ہر صوبہ سے اس کی کچھ انفرادی قدریں وابستہ ہیں جن کے سبب ہر صوبہ کا باشندہ اپنی پہچان کراتا ہے قدروں کے اسی فرق نے مشرقی تہذیب اور مغربی تہذیب کی اصطلاحیں تشکیل کیں، اہل مشرق اپنی تہذیبی اقدار پر نازاں ہیں تو اہل مغرب بھی اپنی تہذیبی قدروں پر فخر کرتے ہیں۔ ایک قوم دوسری قوم کی قدروں کو اسی وقت اپناتی ہے جب اسے اپنے متعلق احساس کمتری ہو۔ اگرچہ ہر شخص اپنے انفرادی عادات واطوار رکھتا ہے لیکن ماحول کے زیر اثر بعض قدریں تمام اشخاص میں مشترک ہوتی ھیں مثلاً مجموعی طور پر یوں کہا جاتا ہے کہ فلاں علاقہ کے لوگ بڑے مہمان نواز ہیں یا فلاں جگہ کے افراد عیاش اور بداخلاق ھیں۔ اس طرح کی آرا کسی بھی معاشرے میں اکثریت کے مابین ذہنی طور پر قدریں مشترک ہونے کے بعد قائم کی جاتی ہیں۔

کسی بھی تجزیے کے وقت دو باتیں ملحوظ رکھی جاسکتی ہیں، اچھائیاں اور برائیاں سے کسی معاشرے کا تجزیہ کریں یا کسی شخصیت کا مطالعہ کریں انھیں بنیادی اقدار یا ارکان پر اس کا انحصار ہوتا ہے، ہر معاشرے میں اگر خوبیاں ہوتی ہیں تو خامیاں بھی ان کے پہلو بہ پہلو چلتی ہیں، کبھی اچھائیاں غالب آجاتی ہیں اور کبھی برائیاں —— یہ قول ایک بہت بڑی سچائی ہے کہ جب کسی نظام کو اپنایا جاتا ہے تو اس کی خوبیوں کے ساتھ اس کے معائب کو بھی اپنانا پڑتا ہے، —— چاہے بظاہر کوشش صرف یہ ہو کہ اس کی خوبیوں کو اپنائیں اور اس کی خامیوں کو چھوڑ دیں۔

فی الوقت جس دور کا معاشرہ زیر گفتگو ہے وہ آج سے بہت کچھ مختلف تھا، طرز زندگی کچھ اور تھا، آداب و رسوم مختلف تھے اور اس وقت جن باتوں کو تسلیم کیا جاتا تھا ان پر شدت کے ساتھ عمل ہوتا تھا، آج کے صنعتی دور نے معاشرے کو آداب و رسوم کی پابندیوں سے آزاد کر دیا ہے، اس زمانہ کے لوگ انتہا پسندی کی حد تک ماضی پرست تھے۔ صدیوں سے مروج اخلاقی قدروں پر چلنا فرض اولین سمجھتے تھے۔ بزرگوں

کی روایات کو زندہ رکھنا بہت بڑی سعادت تصور کیا جاتا تھا، سماجی قدروں کے متعلق سوچتے وقت ذہن کو آزاد نہیں چھوڑتے تھے کیونکہ آزادی سے سوچنے کا نتیجہ بغاوت کی شکل اختیار کر سکتا ہے اور بغاوت سے اعتقادات مجروح ہوتے ہیں، مروجہ اعتقادات سے انحراف نافرمانی کے مترادف خیال کیا جاتا ہے۔ اور لوگ آج کے مقابلہ میں نسبتاً نافرمان کم تھے، کنور محمد اشرف نے اس دور کا مطالعہ کرتے ہوئے لکھا ہے ۔

"اس دور کی خوبیاں اور برائیاں مجموعی طور پر گنی چنی تھیں، تاہم یہ خصوصیات خاصی ترقی یافتہ مضبوط بنیادوں پر قائم تھیں، رسوم و رواج اور مذہب جنھوں نے ان طور طریقوں کی مختلف صورتوں سے حفاظت کی موجودہ دور کے ذہنی اور اخلاقی اعتقادات سے زیادہ مضبوط قوتیں تھیں" [۱]

اعتقادات کی پختگی کا ایک سبب مذہبی ذہن بھی تھا اس عہد میں بیشتر لوگوں کے دل و دماغ پر مذہب کا غلبہ تھا اور اس شدید غلبہ نے لوگوں کو توہم پرستی کی حد میں داخل کر دیا تھا، مذہب پرستی کا مطلب یہ نہیں کہ لوگ برائیوں سے دور تھے بلکہ برائیاں بھی شدید تھیں، اب یہاں ہم "بوستان خیال" کی روشنی میں اس عہد کی معاشرتی قدروں کا جائزہ لیتے ہیں۔

وہ زمانہ شخصی حکومت کا تھا جس میں حاکم وقت کے خلاف ایک لفظ بھی کہنا اور کسی طرح کی گستاخی کرنا اپنی موت کو دعوت دینا تھا بادشاہ کا ادب و لحاظ ہر شہری پر فرض تھا دربار میں بادشاہ کی موجودگی کے وقت بغیر اس کے حکم کے جسم کو حرکت بھی نہیں دی جا سکتی تھی، تمام حاضرین کا دست بستہ ایستادہ ہونا درباری آداب میں شامل تھا دربار کے باب میں اس کا تفصیلی ذکر کیا جا چکا ہے۔ مختصراً یہ کہ اس طرح کے آداب و لحاظ رکھتے رکھتے وہ ان کے عادی ہو گئے تھے۔ یہ درباری اقدار ان کی زندگی میں شامل ہو گئی تھیں۔

زندگی کا معیار ہمیشہ بلندی پر بنتا ہے اور پستی کی طرف آتا ہے۔ یعنی معاشرے

---

[۱] ہندوستانی معاشرہ عہد وسطیٰ میں ص ۳۲۴،

کا ڈھانچہ اہل دول کی طرز رہائش پر تیار ہوتا ہے، ہر طبقہ کا آدمی اپنے سے بڑے طبقہ والوں کی نقل کرتا ہے، خود کو اس کے برابر لانے کی کوشش میں رہتا ہے، رہن سہن کے انداز میں اس کا طریقہ اپناتا ہے، پہننے کھانے میں حتی المقدور اس کا طرز اختیار کرتا ہے بادشاہ جس طرح محل میں رہتا تھا یا دربار میں اٹھتا بیٹھتا تھا اس کے امراء اور وزراء بھی اس کی پیروی کرتے تھے، اپنے محلوں میں اسی انداز سے رہتے تھے، امراء کا اتباع کرنے کی کوشش ان سے کم درجہ کے لوگ کرتے تھے، غرضکہ معاشرہ کے آداب و رسوم کا اصل ڈھانچہ قلعہ شاہی یا خانقاہ میں تشکیل پاتا تھا، خانقاہ کا بھی معاشرے پر بڑا گہرا اثر پڑتا ہے دربار میں بادشاہ کا احترام جبراً کیا جاتا تھا لیکن خانقاہ میں بزرگوں کا احترام اخلاقی فرض سمجھ کر ہوتا تھا ہر شخص دوسرے کی عزت کرنا کسی جبر کے تحت نہیں بلکہ ضمیر کی آواز کے سبب لازمی سمجھتا تھا۔

بزرگوں کا احترام

معاشرہ کی خوبیوں میں ایک خوبی بزرگوں کا احترام کرنا بھی ہے اپنے سے بڑے ہر آدمی کو قابل احترام سمجھا جاتا تھا، اس کی موجودگی میں خود اونچی آواز سے نہیں بولتے تھے کوئی گستاخانہ بات نہیں کہتے تھے، اس سے بحث نہیں کرتے تھے اس کی غلطی پر خاموش رہنا ادب میں شامل تھا، یہاں تک کہ دسترخوان پر کسی بڑے کی موجودگی میں کوئی چھوٹا اس سے پہلے کھانا شروع نہیں کر سکتا تھا۔ بزرگوں کا احترام خود بادشاہ بھی کرتے تھے، دربار میں اگر کوئی بزرگ آتا تو اس کے استقبال کے لئے دربارگاہ تک جاتے، کبھی تخت سے اتر کر سرو قد تعظیم دیتے، کبھی تخت پر نیم قد تعظیم ادا کرتے، تعظیم کا انحصار آنے والے کی مرتبۂ بزرگی پر ہوتا۔ صاحبقران اکبر جب ابو عامر سے ملنے جاتا ہے تو اس کی بزرگی کا لحاظ رکھتا ہے جبکہ صاحبقران کا مرتبہ ابو عامر سے بلند ہے:-

> "ایدروس نے ابو عامر سے کہا کہ تم تخت پر سے اترو اور صاحبقران
> سے بغل گیر ہو ابو عامر تخت سے اترا چاہتا تھا کہ صاحبقران بنظر
> بزرگی خود ابو عامر کے تخت کے برابر اپنا تخت لایا اور مصافحہ
> میں سبقت کی،" [1]

---

[1] ج ۳، ۲۳۸

دربار میں اگر کوئی اعلیٰ مرتبت درویش یا حکیم آتا تو بادشاہ انھیں بڑی تعظیم دیتے اسے اپنے پہلو میں تخت پر بٹھاتے، حکیم فیثاس الحکمت اور حکیم اسقلینوس ایسے ہی قابلِ احترام حکما میں شامل ہیں جنھیں دیکھ کر صاحبقران اپنے تخت چھوڑ دیتے ہیں [1]

بعض بزرگ رشتے بھی قابلِ احترام ہوتے ہیں، مثلاً خاندان کے بزرگوں کی عزت و حرمت ہر خورد پر لازمی ہوتی تھی خصوصاً والدین کا رشتہ ایسا ہے کہ جن کا احترام و اکرام نہ صرف اخلاقی فریضہ ہے بلکہ مذہبی اعتقاد کے مطابق باعثِ نجات بھی ہے ہر مذہب میں اس رشتہ کو بڑا محترم مانا گیا ہے۔ رام چندر نے اپنے باپ کے حکم کی تعمیل کے لیے چودہ برس کا بن باس اختیار کیا، قرآن پاک میں بار بار ھدایت کی گئی ھے کہ والدین کی عزت و خدمت کرو۔ ہندوستان میں شردن کمار کا قصہ مشہور ہے کہ وہ اپنے ضعیف ماں باپ کو ٹوکریوں میں سوار کر کے خود اپنے کندھے پر رکھ کر تیرتھ کرانے کے لیے نکلا تھا۔

معاملاتِ سلطنت میں اگرچہ باپ بیٹے کا رشتہ کوئی معنی نہیں رکھتا، وہاں بنیادی امر حکومت حاصل کرنا ہوتا تھا اسی لیے اکثر شاہی خاندانوں میں تختِ سلطنت کے لیے پدر و پسر میں جنگ ہوتی رہی ہے، لیکن رشتہ کی محبت اور فرمانبرداری کی مثالیں بھی ملتی ھیں۔ مثلاً بلبن کی وفات کے بعد اس کا پوتا معزالدین کیقباد بن بغرا خاں سلطان بنا، جبکہ اس کا باپ بقیدِ حیات بنگال میں موجود تھا، جب اسے معلوم ہوا کہ اس کا بیٹا اس کی موجودگی میں سلطان بن گیا تو اس نے یہ سوچ کر کچھ احتجاج نہیں کیا کہ اپنا بیٹا ہی تو ہے، معزالدین کی سعادت مندی یہ تھی کہ جب بغرا خاں دربار میں آیا تو تخت سے نیچے اتر آیا اور باپ کو تخت پر اپنے پہلو میں بٹھایا، مغلیہ خاندان کے بیشتر شاہزادے اگرچہ بادشاہت کے لیے باغی ہوئے لیکن یہ شاہزادے بھی ابتدائی عمروں میں فرمانبردار اور سعادت مند نظر آتے ھیں خصوصاً ہمایوں جو بابر کی آخر وقت تک خدمت کرتا رہا، خود بابر اپنے بیٹے سے اس قدر محبت کرتا تھا کہ اپنی زندگی دے کر اسے بچایا، اورنگ زیب کے بیٹے

---

[1] ۲۳۸ ج ۳ -

سلطان محمد نے اس لئے اپنے دادا شاہ جہاں کو فرار ہونے کا موقع نہیں دیا کہ باپ کا حکم نہیں تھا۔

شاہی خاندانوں میں ہوس سلطنت کے سبب اولاد کی سعادت مندی اور فرمانبرداری ملنا ہی حیرت کی بات ہے۔ لیکن عام لوگوں میں اس رشتہ کی بڑی قدر تھی، باپ کیسا ہی کیوں نہ ہو، بیٹا اس کی فرمانبرداری کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ ”بوستان“ میں مسلمان شاہزادے فرمانبرداری کی مثالیں پیش کرتے ہیں۔ ان کی سعادتمندی کا یہ حال ہے کہ میدان جنگ میں سب کے روبرو باپ بیٹے کے تمانچہ مارتا ہے اور بیٹا سر نیچا کئے کھڑا رہتا ہے، جلال الدین بن امیر فیروز محض قوت آزمائی کیلئے شاہزادہ قائم الملک کے مقابلہ کو میدان میں آیا، امیر فیروز کو جب یہ معلوم ہوا تو اس نے غصہ میں سب کے سامنے جلال الدین کے منہ پر تمانچہ مارا، وہ احتراماً خاموشی سے سرنگوں کھڑا رہا[1]

والدین کی اجازت کے بغیر کہیں جانا بھی برا سمجھا جاتا ہے، غضنفر نوجوان جب امیرزادہ کے ساتھ جانے کو تیار ہوتا ہے تو امیرزادہ کہتا ہے، اس امر میں والدین کی رضامندی ضروری ہے۔ غضنفر بتاتا ہے کہ میں نے ان سے اجازت لے لی ہے[2] یہ بھی آداب میں شامل ہے کہ والدین کے روبرو کوئی ایسی بات نہیں کی جاتی۔ جس سے بےشرمی ظاہر ہو، مثلاً کتخدائی کے وقت پسر یا دختر کبھی اپنی پسند والدین کے سامنے بیان نہیں کرتے بلکہ کسی کی معرفت کہلواتے ہیں، جس طرح سعد نوجوان اپنی محبت کا باپ سے ذکر نہ کر سکا بلکہ ایک رقعہ میں سب حالات لکھ کر بھیجے[3] یا شاہزادہ اسمٰعیل نے اپنے پدر سے کہلوایا اور بعد کہلوانے کے جب پدر کا سامنا ہوا تو تعظیم کر کے شرم وحیا سے سر جھکا لیا[4]۔ یہی شاہزادہ جب قلعہ میں جاتا ہے تو اول پدر سے ملنا واجب سمجھتا ہے۔

”باسانہ پری نے عرض کی ۔۔۔۔ اگر حکم ہو اول سلطان کو لے آدیں اور اگر رغبت ہو تو اول محلسرا میں تشریف لے چلیں،

؎۱ ۳۲۸ ج ۱، ؎۲ ۲۲۵ ج ۴، ؎۳ ۴۰۳ ج ۴، ؎۴ ۳۴ ج ۱،

شاہزادہ نے فرمایا اگرچہ میں حد سے زیادہ ملکہ کا مشتاق ہوں
لیکن اول جد و پدر کا دیکھنا واجب ہے، مجھ کو سلطان
کے پاس لے چلو۔"[1]

صاحبقران اکبر کو جب جبل اعلیٰ پر والدین کی یاد آتی ہے تو بے اختیار رونے لگتا ہے[2] اسی طرح قائم الملک بھی اپنے پدر کو یاد کرتا ہے:۔

"سلطان کی قدم بوسی کی مجھ کو نہایت آرزو ہے، مدت سے
اس عالی جناب کی مجھ کو خبر نہیں معلوم ہوئی اتنی فرصت
بھی نہیں ہوئی کہ کسی کو بھیجتا"[3]

خوبی اور خامی لازم و ملزوم ہیں اگر ایک طرف سعادت مندی اور فرمانبرداری کی مثالیں ملتی ہیں تو اس کے ساتھ ساتھ ناخلف اولاد بھی نظر آتی ہے جو باپ سے برسر پیکار ہوتی ہے، نافرمانبرداروں میں ایک مثال جمشید خود پرست ہی کی ہے اس کے علاوہ لاقوت شاہ کو اس کے بیٹے نے قتل کیا اور پدر کش کہلایا[4] ایک اور مثال ملاحظہ ہو:۔

"۔۔۔۔۔ اسی حالت غصہ میں اس زور سے تمانچہ باپ کے کلّہ
پر مارا کہ منہ میں سے جوئے خون جاری ہوئی۔ اشباط بارگاہ
سے باہر آیا اور طارق سے کہا افسوس کہ تو نے اپنے باپ کی
بزرگی کا کچھ بھی لحاظ نہ رکھا، صد ہزار لعنت تجھ پر یہ اہل
مجلس دل میں کیا لعن و نفریں کرتے ہوں گے۔"[5]

لیکن اس طرح کی مثالوں سے یہ بھی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ معاشرے میں باپ کو قابل احترام سمجھا جاتا تھا اور اگر کوئی پسر اس کے خلاف کرتا تو اکثریت اس پر لعنت بھیجتی[6] اولاد کی نافرمانی کی صورت میں پدر اسے عاق بھی کر دیا کرتے۔ عاق کرنے کا مطلب ہے کہ باپ کی جائداد وغیرہ سے عاق کیے ہوئے پسر کو کچھ نہیں ملتا۔ بوستان میں ایسی ناخلف اولاد بھی موجود ہے:۔

---

[1] ص ۲۶۰ ج ۱، [2] ص ۳۸۱ ج ۹، [3] ص ۳۸۱ ج ۹، [4] ص ۳۲ ج ۳، [5] ص ۲۳۲ ج ۴،

"میں نے اس ناخلف نمک حرام حق ناشناس بدکردار کو اسی دن
سے عاق کر دیا ہے جس دن اس نے اپنے مخدوم زادہ کے ساتھ
حرکت ناجیانہ کی۔ ایسے نارشیر کو منعم حقیقی دونوں جہاں میں
روسیاہ کرے گا۔" لہ

اپنے والدین کی طرح بیوی کے والدین بھی لائقِ حرمت ہوتے ہیں، انھیں بھی باپ کی جگہ سمجھا جاتا ہے، شاہ جہاں نے بادشاہ ہوتے ہی اپنے خسر آصف خاں کو عہدۂ وزارت عطا فرمایا۔ تاریخ میں اس کی اور بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ 'بوستان' کے شاہزادہ قائم الملک نے اپنے خسر شاہ بہرام کو اس لیے میدان جنگ میں نہیں جانے دیا کہ اگر خدانخواستہ ہار ہوئی تو مجھے خفت ہوگی ۲ہ ایک مرتبہ جب قائم الملک اپنے خسر ملک ساطوع سے آزردہ ہوا تو سلطان مہاری نے کہا "نہ بابا یہ تمہارا پدرِ زن ہے اس کی حرمت ضروری ہے۔" ۳ہ

پاسِ نمک

والدین کی فرمانبرداری اور ان کا احترام کرنا عجیب بات نہیں کیونکہ ان سے خون کا رشتہ ہوتا ہے لیکن اس رشتہ سے کچھ بڑھ کر جو رشتہ لائق احترام سمجھا جاتا تھا وہ آقا کا تھا، آقا سے مراد وہ شخص ہے جس کے یہاں ملازمت اور نوکری کی جائے۔ گذشتہ صدیوں کے ملازمین دو طبقوں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں۔ ایک وہ جو کسی بادشاہ یا امیر کے یہاں نوکری کرتے تھے اور تنخواہ پاتے تھے، دوسرے زرخرید غلام جو اپنے مالک کے ہی یہاں رہتے تھے، کھانا پینا اور دوسری تمام ضروریات کا کفیل مالک ہی ہوتا تھا اور اس کے عوض مالک اچھا، برا، چھوٹا یا بڑا ہر کام اس سے لے سکتا تھا، یعنی غلام یا کنیز جو زر دے کر خرید لے جائیں اپنے مالک کی ملکیت ہوتے تھے وہ جس طرح چاہتا ان سے خدمت لے سکتا تھا۔

مالک اور ملازم کا رشتہ بے حد مضبوط ہوتا تھا۔ مالک کا وفادار ہو کر رہنا فرض خیال

لہ ۲۲، ج ۴، ۲ہ ۳۵۳ ج ۱، ۳ہ ۳۹، ج ۱،

کیا جاتا تھا، اس کے لئے ملازم اپنی جان دینے سے بھی دریغ نہ کرتے تھے۔ اپنی نہیں بلکہ اپنے مالک کی مرضی کے مطابق زندگی گذارتے تھے۔ اس دور میں جب صنعتی دور نہیں تھا عموماً لوگ بادشاہ یا امراء ہی کے ملازم ہوتے تھے، کچھ قلعہ میں خدمت انجام دیتے اور بیشتر فوج میں شامل رہتے۔ جنگ کے وقت اپنی جاں نثاری کا ثبوت پیش کرتے، اس وقت نمک حلالی کا احساس اور وفاداری کا جذبہ لوگوں میں آج کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھا لوگوں کا یہ عقیدہ تھا کہ اگر کوئی آدمی مالک کی خدمت کرتے ہوئے مر بھی جائے تو وہ سیدھا جنت یا سورگ میں جاتا ہے۔ مالک کی وفاداری اس درجہ اہم سمجھی جاتی تھی کہ کبھی کبھی ان کے آگے والدین کا رتبہ بھی کم نظر آنے لگتا ہے "بوستان" میں کئی مقامات پر ایسے حالات پیدا ہوئے ہیں کہ باپ ایک بادشاہ کی فوج میں شامل ہے اور بیٹا دوسرے بادشاہ کی۔ جنگ کے وقت حق نمک ادا کرنے کے لئے باپ بیٹے میں جنگ ہوتی ہے، اس وقت کسی طرح کی رعایت نہیں برتی جاتی بلکہ اپنی نمک حلالی کا ثبوت فراہم کرنے کے لئے دونوں ایک دوسرے کو ختم کرنیکی کوشش میں رہتے ہیں۔ مجد الملک نے اپنے باپ مؤید الملک کو میدان معرکہ میں قتل کیا[1] ضابط نے اپنے باپ اشبوط دیلمی کو میدان جنگ میں مارا[2]

حق نمک کی ادائیگی یعنی مالک کے لئے جان دینے کی مثالیں تاریخ میں بہت بکھری ہوئی ہیں۔ فوج کا بادشاہ کے لئے جان قربان کرنا وفاداری کا ہی اظہار ہے، ضیاءالدین برنی نے کئی واقعات اس سلسلے میں نقل کئے ہیں۔ ملک چھجو کے بارے میں لکھتا ہے کہ اس نے جلال الدین خلجی کے خلاف بغاوت کی اور اپنے بادشاہ سابق بلبن کے گھرانے کا ساتھ دیا جسے زوال آچکا تھا۔ جلال الدین اس کی اس بات سے ناخوش نہیں ہوا بلکہ اس نے اس نمک حلالی کے بدلے میں اسے انعامات سے نوازا[3] کنور محمد اشرف نے حاجی کے حوالے سے سلطان علاءالدین خلجی کا ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ سلطان نے سابق غدار سپہ سالار محمد شاہ کو بڑے تزک واحتشام سے دفنایا جو اپنے قدیم ہندو آقا ہمیر دیو کا آخر دم تک وفادار رہا تھا۔ سلطان نے اس وقت کہا

---

[1] ۹۲۴ ج ۴، [2] ۲۷۸ ج ۳، [3] تاریخ فیروز شاہی ماخوذ از ہندوستانی معاشرہ عہد وسطیٰ میں ص ۲۳۷

تھا کہ وفاداری کا جذبہ خواہ دشمن میں ہو اس کی تعریف کرنی چاہیئے [۱] شیر شاہ کو بچانے کے لئے سیف خاں کی نمک حلالی کی خود ہمایوں نے داد دی [۲] بیرم خاں ہمایوں کا وفادار سردار تھا۔ جس کی وفاداری کو دیکھ کر شاہِ ایران نے ہمایوں سے کہا تھا کہ حیرت ہے کہ آپ کے ساتھ اتنے وفادار سردار ہیں اور آپ کو شکست ہوئی، خود بیرم خاں کے ساتھ بھی ایسے ہی وفادار ساتھی تھے، ایک مرتبہ شیر شاہ سے بچ کر بیرم خاں ابوالقاسم حاکم گوالیار کی مدد سے گجرات جا رہا تھا کہ راستے میں شیر شاہ کے آدمیوں نے انھیں گھیر لیا۔ انھوں نے پوچھا کہ بیرم خاں کون ہے؟ بیرم خاں نے خود کو پیش کیا اسی وقت ابوالقاسم نے اپنی بہادری اور وفاداری کا ثبوت دیا اور کہا کہ یہ میرا ملازم ہے، چاہتا ہے کہ مجھ پر نثار ہو جائے، اس کو چھوڑ دینا چاہیئے، شیر شاہ کے آدمیوں نے بیرم خاں کو چھوڑ دیا اور اس کے دھوکے میں ابوالقاسم کو مار ڈالا [۳] برنیر نے راجپوتوں کی وفاداری کے سلسلے میں لکھا ہے کہ وہ اپنے رئیس کے سامنے جان دے دینا اپنا فخر سمجھتے تھے اور اس کو دشمن کے ہاتھ میں کبھی نہیں چھوڑتے [۴] مآثر الامراء میں ایک راجپوت رام سنگھ کے بارے میں لکھا ہے کہ:۔

"سموگڑھ کی جنگ میں ــ ــ ــ ــ وہ دارا شکوہ کا ہراول تھا
مقابلہ کے وقت اس نے بہت بہادری دکھائی اور حق
نمک حلالی کو نظر انداز نہیں کیا اور مردانہ وار مقابلے
(اورنگ زیب) کی فوج کی تلوار سے قتل ہو گیا" [۵]

وفاداری اور نمک حلالی کا یہی جذبہ "بوستان" کے امیروں اور سرداروں میں موجود ہے، اپنے بادشاہ یا مالک کے لئے جان دے دینا اپنا فرض سمجھتے تھے، جب شاہزادہ طاقان نے سرخام پر فتح پائی اور اس سے مسلمان ہونے کے لئے کہا اس نے اس شرط پر مسلمان ہونا قبول کیا کہ اسے آزاد کر دیا جائے تاکہ وہ کسی طرف چلا جائے اگر طاقان کے لشکر میں رہے گا تو اپنے بادشاہ سے مقابلہ کرنا ہوگا اور یہ نمک حلالی سے بعید [۶] ہے۔

---

[۱] ایضاً ص ۳۳۸ ، [۲] صولت شیر شاہی ص ۴۹ ، [۳] مآثر الامراء جلد اول ص ۷۱-۳۷۰ ، [۴] برنیئر ص ۸۴ ،
[۵] مآثر الامراء جلد دوم ص ۲۶۸ ، [۶] ۵۹ ج ۴ ،

جو لوگ نوکری کرتے تھے ان کا قاعدہ تھا کہ جس کی سرکار میں ملازم ہوتے اسی کے لئے لڑتے، خواہ اس کا مقابل سابق آقا ہی کیوں نہ ہو، مجدالملک اول گہرتاج کی سرکار میں ملازم تھا جب اس سے الگ ہو گیا اور دوسری سرکار سے وابستہ ہو کر ملک گہرتاج کے مقابلہ کو آیا تو گہرتاج نے پرانی نمکخواری یاد دلائی جس پر مجدالملک جواب دیتا ہے:

"میں تمہارے خاندان کا غلام زرخرید نہیں کہ تمام عمر پاس نمک کا پابند رہوں ہاں ملازم تھا جب تک منظور ہوا نوکری کی اب دوسری سرکار میں ملازم ہوئے" ؎۱

جب تک سرداروں کے بازوؤں میں قوت رہتی ہے اپنے بادشاہ کو تکلیف جنگ نہیں دیتے، سلطان مہدی جب ایک مہم پر جانے کا قصد کرتے ہیں تو امراء کہتے ہیں اول ہم جاتے ہیں اگر خدانخواستہ کوئی کام نہ ہوا اس وقت سلطان کو اختیار ہے ؎۲

مقابلہ کے وقت سرداروں کو یہ احساس رہتا تھا کہ یہ وقت حق نمک کی ادائیگی کا ہے اور ہمیں ہر صورت میں اپنے مالک کی حفاظت کرنی ہے، ملکہ شمسہ تاجدار کے محل پر جب حملہ ہوتا ہے تو پاسبان حملہ آوروں کے ساتھ دل و جان سے مقابلہ کرتے ہیں، پاسبانوں کا سردار جارب بن جنید ساتھیوں سے کہتا ہے کہ:-

"آج ہی تمہاری نمک حلالی و حق شناسی کا دن ہے مبادا یہ ملاعین بے دین قصر میں داخل ہو جائیں اور ہماری تمام عمر کی خدمت و نمک خواری خاک میں مل جائے------
واللہ یارو مجھے اپنی جان ضائع ہونے کا کچھ خیال نہیں اسی دن کے واسطے نمک شاہی کھاتے تھے" ؎۳

ظاہر ہے جب ایک شخص اپنے ولی نعمت کا اتنا وفادار اور جاں نثار ہوگا تو ہمیشہ اپنے مالک کی تعریف ہی کرے گا اسی لئے صاحبقران ایک خادمہ سے کہتا ہے کہ:-

---

۱؎ ج ۲، ص ۴۲۹، ۲؎ ج ۳، ص ۳۴۴، ۳؎ ج ۳، ص ۲۲۲،

"تیری تعریف قابلِ اعتبار نہیں کس واسطے کہ تو نوبہار افروز کی نمک خوار ہے اور ملازم اپنے ولی نعمت کا مداح ہوتا ہے" [۱]

ولی نعمت خواہ کسی مذہب یا فرقے سے تعلق رکھتا ہو ملازم ہر حال میں اس کا وفادار ہوتا ہے :-

"حالانکہ میں بذاتِ خود مسلمان اور خدا پرست ہوں مگر ملازم کو اپنے آقا کا پاسِ نمک بھی شرط ہے ۔۔۔۔ جب تک قالب میں جان باقی رہے گی اپنے بادشاہ کے حکم کی بجا آوری کروں گا" [۲]

یہاں یہ بات بھی واضح کر دینا غیر ضروری نہ ہوگا کہ فوج کا جو حصہ جس شاہزادہ یا شاہزادی یا سردار کی کمان میں ہوتا تھا وہ اپنے سردار کا ہی حکم مانتا تھا، اگر وہ سردار اپنے بادشاہ سے بھی لڑنے کا حکم دیتا تو کوئی سپاہی انکار نہیں کر سکتا تھا، ایک شاہزادی کے سپاہی کہتے ہیں :-

"سرداروں نے متفق اللفظ کہا دایہ صاحب یہ حال تم کو خوب روشن و ظاہر ہے کہ ہم غیر ذات والا صفات ملکہ کے کسی کو موجود نہیں جانتے اگر ملکہ ہمیں خاص بادشاہ سے جنگ و جدل کا حکم دیں بے عذر و حجت جاں نثاری کے واسطے حاضر ہیں۔ دایہ سالمہ نے کہا آفریں ملازمِ نمک حلال ایسے ہی ہوتے ہیں" [۳]

پاس نمک کی ان مثالوں سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ اس عہد میں اپنے بادشاہ یا مالک مجازی کے لئے وفاداری اور جاں نثاری کا جذبہ لوگوں کے دلوں میں بہت زیادہ تھا۔

مہمان نوازی

جس معاشرے میں اپنے مالک کے لئے جان قربان کرنا باعث فخر سمجھا جاتا تھا، وہاں مہمان کا مرتبہ مالک مجازی سے بھی زیادہ خیال کیا جاتا تھا۔ مہمان ناخواندہ کو ہدیۂ خدا کہتے تھے [۴]

---

[۱] ۲۸۹ ج ۴، [۲] ۲۰۰ ج ۳، [۳] ۶۵۹ ج ۴، [۴] ۴۰۵ ج ۳،

داستان میں ایک مقام پر زہرہ لقا اور خورشید لقا میں محض اس بات پر ان بن ہوگئی کہ دونوں چاہتی تھیں کہ ملکہ کوکبہ پہلے میری مہمان رہے[1] جہاں مہمان کی اتنی قدر ہو وہاں اس کی تواضع بھی اسی نسبت سے تصور کرنی چاہیئے۔ ایک شہر میں تو مہمان کو اس درجہ عزت حاصل ہے۔

"حضرت جس مرد کا مہمان خطاب ہوتا ہے اس سے تمام شہر کی عورتیں روپوش نہیں ہوتیں۔"[2]

مہمان کی خاطر مدارات کی چند مثالیں سفراء کی آمد کے ذیل میں لکھی گئی ہیں۔ امراء اور عوام سبھی مہمان کی قدر کرتے تھے بلبن کے دربار میں پندرہ مہمان شاہزادے مستقل حاضر رہتے تھے۔ ابن بطوطہ نے اپنی اور اپنے غلاموں کی دربار میں عزت افزائی کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے[3] خلیفہ المستنصر باللہ عباسی کے خاندان کا ایک امیر غیاث الدین محمد عباسی محمد بن تغلق کے دربار میں حاضر ہوا تو بادشاہ نے اس کا بڑا پرجوش استقبال کیا، ہر منزل پر خیر مقدم کے لئے امیر بھیجے، جب وہ دارالسلطنت کے قریب پہونچا تو بادشاہ خود اس کے استقبال کے لئے گیا۔ ملاقات کے وقت سواری سے اتر کر غیاث الدین سے ملا، سیری کا محل اس کے ٹھہرنے کے لئے مقرر کیا۔ ایک مرتبہ غیاث الدین کسی بات پر ناراض ہو گیا تو سلطان خود معذرت کے واسطے اس کے پاس پہونچا یہاں تک کہ اسے راضی کرنے کے لئے اپنی گردن پر امیر مذکور کا پاؤں رکھوایا۔[4] ایک عرب امیر سیف الدین کے ساتھ محمد بن تغلق نے انتہائی مخلصانہ سلوک کیا، کہ اپنی بہن کی شادی اس امیر سے کی[5] جوامع الحکایات میں بھی مہمان نوازی کی بہت سی مثالیں پیش کیگئی ہیں۔ مثلاً حجاج بن یوسف کے متعلق لکھا ہے کہ اگرچہ وہ بہت ظالم اور سفاک تھا، لیکن مہمان داری میں اس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ لشکر کے پڑاؤ کے وقت اس کا حکم ہوتا کہ تمام لشکر اور رعایا اس کے دسترخوان پر کھانا کھائے، اس کی تواضع کا جذبہ اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ اگر کوئی شخص اس کے حکم کی تعمیل نہ کرتا تو اس پر حجاج کا عتاب نازل ہوتا[6] ایک اور واقعہ منقول ہے کہ ایک مرتبہ

---

[1] ۱۷ / ۲ج ۵۱، [2] ۳۸۰ ج ۲ ص ۳، [3] سفرنامہ ابن بطوطہ قسط ۳ ص ۱۳۲، [4] ایضاً ص ۱۵۳، [5] ایضاً ص ۱۵۵، [6] جوامع الحکایات جلد دوم ص ۱۳۲

معن زائدہ نے حضرموت سے آتے ہوئے تین ہزار قیدیوں کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ان میں ایک بچہ بھی شامل تھا جس نے کہا اے مارنے والے مارنے سے قبل ہمیں پانی پلا دیا جائے جب وہ سب پانی پی چکے تو اسی بچہ نے کہا کہ یا امیر اب ہم سب آپ کے مہمان بن چکے ہیں، اور سادات مہمانوں کی بہت عزت کرتے ہیں، ہمیں امید ہے کہ آپ مہمانوں کے خون سے ہاتھ رنگنا پسند نہ فرمائیں گے۔ معن نے بچہ کی بات سن کر تمام قیدیوں کی جان بخشی کر دی۔[1]

"بوستان" میں طلسم اور بیرونِ طلسم مہمان کو جو عزت دی گئی ہے وہ کسی اور شخص کے حصے میں نہیں آئی۔ طلسم کے اندر طلسم کشا شاہزادے کی حیثیت مہمان کی ہوتی ہے اس لئے ادنیٰ و اعلیٰ اس کے واسطے فرش گل بچھاتا ہے۔ خواہ طلسم کشا کا رویہ ان کے ساتھ کیسا ہی ہو۔ طلسم اجرام واجسام میں ایک مقام پر صاحبقران اکبر ملکہ نوبہار کے فراق میں دیوانگی کی حالت میں آوارہ و سرگرداں پھرتا ہے لیکن اہل شہر اس بات کا خیال نہیں کرتے۔ اس عالم میں بھی اس کی تواضع و ضیافت کرتے ہیں، کیونکہ وہ مہمان ہے[2] شاہزادہ جب کسی محل میں جاتا ہے کنیزانِ محل کو تاکید ہے کہ جس روز شاہزادہ مہمان تشریف لائے صحن باغ کو خلوت خانہ کر دینا کوئی آدمی غیر محل وہاں نہ جائے[3] اور جب شاہزادہ وہاں پہونچتا ہے تو :۔

"صاحبقرانِ اکبر نے اس صحن میں قدم مبارک رکھا بس اسی وقت اس شہریار گردوں وقار کے گرد و پیش نازنینانِ ماہ لقا و زہرہ جبینان دلربا نازک اندام و سبک خرام جمع ہوگئیں۔ صاحبقرانِ اکبر خراماں خراماں اسی ایوان عالی شان میں تشریف لائے ۔۔۔۔۔۔ ہزارہا نازنینان سنبل مو ہر طرف ایوان میں انتظار کر رہی تھیں، فوراً واسطے استقبال صاحبقرانِ اکبر کے کھڑی ہوگئیں"[4]

مہمان کی تواضع کی جاتی ہے اسکی تفریح کے واسطے محفلِ طرب آراستہ ہوتی ہے :۔

---

[1] جوامع الحکایات جلد دوم ص۱۴۱، [2] حدائق انظار ج۲، [3] ج ۶ ص۴۴، [4] ص۱۳۹ ج ۹م،

"شاہزادہ کو نہایت اعزاز واکرام سے اسی تخت پر پہلو میں بٹھایا
بعدہٗ ارباب طرب کو حکم دیا کہ تم آج کوئی درجہ سازنوائی ونغمہ
سرائی کا باقی نہ رکھنا کس واسطے کہ ایک مہمان عزیز ہم اسیروں
کے کلبۂ تاریک میں وارد ہوا ہے۔ اس کی خاطر مدارات ہمیں بے
بجان و دل منظور ہے"[1]

مہمان کے آتے ہی اول بطور شگون شربت پیش کیا جاتا تھا[2]۔ جس طرح مرد مہمان کے استقبال کے لیے بادشاہ یا امراء کچھ دور تک جاتے تھے اسی طرح حرم سرا کی خواتین مہمان کا استقبال کرتی تھیں۔ ملکہ شمسہ تاجدار کے قصر میں جب ملکہ نو بہار وغیرہ پہونچتی ہیں تو ملکہ شمسہ شمع وفانوس لے کر کنیزوں کو ان کے استقبال کیلئے بھیجتی ہے، خود بھی کچھ دور تک خیر مقدم کے لیے بڑھتی ہے اور کلمات نیاز مندانہ اس طرح ادا کرتی ہے:۔

"تم نے کرم کیا کہ جو اس کلبہ تاریک میں تشریف لائیں تمہارا
خانۂ بے تکلف ہے اور مجھے اپنا خدمت گار سمجھو"[3]

اگر مہمان بہت ہی عزیز اور قریبی ہوتا ہے تو رسم تقبیل ومعانقہ بھی عمل میں آتی ہے[4]

"ملکہ زہرہ لقا بکمال فروتنی وانکسار کو کبہ روشن تن سے ملی
طرفین سے رسم تقبیل ومعانقہ عمل میں آئی"[5]

مہمان کے لیے آراستہ کی ہوئی کوئی بھی محفل خواہ وہ حرم میں ہو یا دربار میں بغیر رقص ونغمہ کے ادھوری سمجھی جاتی تھی۔

"اول کنیزوں نے دسترخوان پر طعام ہائے گوناگوں چنے کھانے کے
بعد رقص وسرود کا انتظام کیا"[6]

"القصہ چمن افروز وزیرزادی نے طعام وشراب اور رقص ونغمہ
جملہ سامان مہمانی مہیا کیا اور خود تمام شب صاحبقران کی خدمت
میں نقلہائے رنگین وحکایات وشیریں بیان کرتی رہی"[7]

مہمان کی تواضع حد سے بڑھ کر کی جاتی تھی، ہر طرح سے مہمان کا خیال رکھا جاتا تھا،

له ۱، ج ۲، ۲له ۱، ص ۴۸۱ ۳له ۱، ج ۵، ص ۴۴، ج ۳، ص ۴۴۳۲ ۴له ۱، ج ۵، ص ۴۲۷، ج ۵ ۵له ۶، ص ۸۵ ۶له ۴، ج ۵ ۷له ۶، ص ۲۸۹، ج ۲

تاکہ وہ جب واپس ہو تو میزبان اور اہلِ شہر کے بارے میں اچھی رائے لے کر جائے، مہمان نوازی کا جذبہ کسی قسم کے لالچ یا دولت کی فراوانی کے اظہار کے لئے نہیں تھا بلکہ یہ ایک اخلاقی فریضہ سمجھا جاتا تھا ہر خاص و عام، ادنیٰ و اعلیٰ اپنی بساط کے مطابق مہمان کی خاطر کرتا تھا ہر شخص مہمان کو اپنے یہاں رکھنے خواہشمند ہوتا تھا اور اسے باعثِ فخر سمجھتا تھا۔

"تمیم نے وقتِ رخصت جمشید سے کہا اے بادشاہ اگر شہر میں تشریف لے چلو اور میرا آب و نمک قبول فرماؤ، یہ بات میرے اعزاز و آبرو کی ہے"۔[۱]

مہمان نوازی محض روٴسا و امراء کے محلوں تک محدود نہیں تھی بلکہ جھونپڑے میں رہنے والا شخص بھی اپنے اندر مہمان نوازی کا اسی قدر جذبہ رکھتا تھا۔ اس جذبۂ خلوص میں کسی طرح کی غرض و لالچ شامل نہیں ہوتا تھا۔ بارہا "بوستان" کے طوفان زدہ شاہزادوں کو ماہی گیر سواحل دریا سے عالم بے ہوشی میں اٹھا کر لائے اور ہفتوں ان کو اپنے یہاں مہمان رکھ کر اُن کی خدمت کی۔ یہ خدمت صرف انسانی رشتہ کے ناطے کی جاتی تھی۔ یوں بھی مسافر نوازی کو کارِ ثواب سمجھا جاتا ہے۔ اکثر اشخاص کسی مسافر، اجنبی پریشان حال کو اپنے ساتھ لے جاتے ہیں اور نہ صرف اس کی مدد کرتے ہیں بلکہ بطور مہمان اس کو اپنے یہاں رکھتے ہیں۔ اور اس کی آمد کو باعثِ برکت خیال کرتے ہیں۔

جب کوئی شخص کسی کے یہاں مہمان بن کر آتا ہے تو اس کی تمام ذمہ داریاں میزبان پر عائد ہو جاتی ہیں یعنی جب تک وہ اس کے یہاں قیام کرے اسے کسی طرح کی تکلیف نہ ہو۔ علاء الدین کے عہد میں رنتھمبور پر چوہان راجہ ہمیر دیو کی حکومت تھی ہمیر دیو نے منگول باغی محمد شاہ اور اس کے بھائی کہر دکو جو جالور کے قریب ہونے والی بغاوت کے سرغنہ تھے، اپنے یہاں پناہ دے رکھی تھی، علاء الدین کی فوج الغ خاں کی زیر کمان رنتھمبور پہونچی اور مطالبہ کیا کہ باغیوں کو ہمارے سپرد کر دو یا

---

[۱] ۲۹ ج ۳،

انھیں قتل کر دو، لیکن ہمیر دیو نے اپنے مہمانوں کے ساتھ اس طرح کا سلوک کرنے سے صاف انکار کر دیا، کیونکہ یہ اس کے گھرانے کی قدیم آن کے خلاف تھا، چنانچہ علاء الدین کی فوج اس پر حملہ آور ہوئی[۱] شاہِ ایران نے ھمایوں کو اپنے یہاں مہمان رکھا اور اس کی حفاظت کی۔

انسانیت کا یہ جذبہ فوق الفطرت مخلوق میں بھی موجود ہے، اشقال دیو نے آہن تساخ کو پناہ دی اور کہا۔

"میں نے تجھ کو پناہ دی اب کسی کی مجال نہیں کہ تیری طرف نگاہ کج سے بھی دیکھ سکے[۲]۔

مہمان نوازی کا یہ جذبہ اس قدر قابلِ احترام سمجھا جاتا تھا کہ اگر دشمن بھی بطور مہمان آئے تو اس کے ساتھ بھی وہی سلوک کرتے تھے جو مہمان کے لئے لازم تھا۔کرمان کے ایک بادشاہ کی مہمان نوازی کا یہ عالم تھا کہ جب عضدالدولہ نے کرمان پر فوج کشی کی اور شہر کا محاصرہ کر لیا، اس موقع پر بھی بادشاہ کرمان نے اپنی وضع داری کو ہاتھ سے نہ جانے دیا وہ دن کو جنگ کرتا تھا اور رات میں غنیم کے لشکر کو کھانا بھجواتا تھا، جب عضدالدولہ نے ایلچی بھیج کر اس کا سبب معلوم کیا تو بادشاہ نے کہلوایا دشمن سے جنگ کرنا مردوں کا شعار ہے اور مسافروں کو کھانا کھلانا مردانگی کا اظہار، تمہارے سپاھی ایک ہی وقت میں دشمن بھی ھیں اور مسافر بھی، اس لئے جس طرح جنگ کرنا ضروری ہے اسی طرح ان کی خاطر بھی[۳]۔

دشمن کو نہ صرف مہمان رکھتے ہیں بلکہ دلوں کی رنجیدگی ختم کرنے کے لئے ایک ہی قاب میں کھانا کھاتے ھیں:۔

"اے فرزندِ ارجمند میری خوشی ہے کہ تم اور اشبوط دونوں پہلو بہ پہلو ایک ہی قاب میں کھانا کھاؤ تاکہ باہم دلوں کا فساد رفع ہو،"[۴]

---

[۱] خلجی خاندان ص۹۹-۹۸، [۲] ص ۶۴۸ ج ۱، [۳] جوامع الحکایات جلد دوم ص۵۰-۴۹،
[۴] ص ۳۸۰ ج ۴،

مذکورہ بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مہمان کا اس سوسائٹی میں کیا مرتبہ تھا اسی قدر و منزلت کا سبب ہے کہ جب مہمان رخصت چاہتا تو اسے روکا جاتا۔

"وبیعان جنی نے جب مصافحہ کرنے کے بعد ہی صاحبقران سے رخصت کی اجازت مانگی تو صاحبقران اکبر نے کہا کہ یہ امر خلاف مروت و اخلاق ہے کہ اتنی جلد آپ کو رخصت کر دوں"۔[1]

آج بھی یہ قاعدہ ہے کہ وقت رخصت مہمان کو کچھ نذرانہ پیش کیا جاتا ہے اُس وقت بھی یہ رسم جاری تھی بادشاہ کے دربار میں آئے ہوئے مہمانوں کو خلعتیں اور دوسری اشیاء دی جاتی تھیں۔

"آخر شب ملکہ حوران ملک سے رخصت ہوئے حوران ملک نے چند جواہر گراں قیمت بطور پیش کش صاحبقران کی نذر گذرانے"۔[2]

ملکہ حسن آرا کا قاعدہ یہی تھا کہ جب کسی کو رخصت کی اجازت دیتی تو اسے خلعت سے نوازتی۔[3] رخصت کے وقت یہ اخلاقی فرض ہے[4] کہ مہمان کے ساتھ کچھ دور جایا کرے۔[5]

"فرتوت بھی تھوڑی دور بطور مشایعت لاقوت شاہ کے ساتھ گیا"۔[6]

غرضکہ مہمان کی آمد کو باعث برکت و عزت سمجھا جاتا تھا جو لوگ صاحب متاع تھے۔ اُن کے دستر خوان اتنے وسیع ہوتے تھے کہ ہر روز ان کے دستر خوان پر ہزاروں آدمی کھانا کھاتے تھے۔ کوئی بھی شخص دشمن ہو یا دوست جب گھر میں آجاتا تھا تو مہمان کہلاتا تھا اور مہمان ھدیۂ خدا ہوتا ہے۔

احسان مندی

سوسائٹی کی اعلیٰ اقدار میں سے ایک قدر یہ بھی ہے کہ ایک آدمی وقتِ ضرورت دوسرے آدمی کے کام آئے، یہ عمل نہ صرف سماجی اقدار میں شامل ہے بلکہ انسانی

---

[1] ص ۷۶ ج ۹ م، [2] ص ۲۵۰ ج ۴، [3] ص ۲۲۷، ج ۱، [4] ص ۵۸۵ ج ۴، [5] ص ۲۹ ج ۹ م، [6] ص ۳۵۳ ج ۳،

فرض بھی ہے۔ مذہبی اعتبار سے بھی اس عمل کو قابلِ احترام سمجھا گیا ہے اسلام کے اصولوں پر چلنے والے ہر شخص پر دو حقوق فرض ہوتے ہیں ایک حقوق اللہ اور دوسرا حقوق العباد حقوق اللہ کا تعلق خدا سے ہے لیکن حقوق العباد کا رشتہ مخلوقِ خدا سے ہوتا ہے، کہا گیا ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو یہی تمہاری نجات کا ذریعہ ہوگا۔ مختلف مذاہب میں بھی اس نقطۂ نظر کی تائید کے نمایاں پہلو اور ان سے نسبت رکھنے والے واقعات موجود ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اشتراکیت کا بنیادی طریقۂ فکر بھی یہی ہے کہ معاشرے کے مختلف افراد اور طبقات میں تعاون کا رشتہ قائم ہو، اور وہ ایک دوسرے کی محبت اور محنت اور باہمی کارکردگی سے زندگی کو زیادہ بامعنی اور پُر مسرت بنا سکیں۔ مصیبت یا پریشانی کے وقت اگر کوئی کسی کے کام آجائے تو اسے احسان سے تعبیر کرتے ہیں۔ مہذب اور شریف لوگوں کا قاعدہ ہے کہ وہ اپنے مددگار کا احسان تاحیات فراموش نہیں کرتے، بلکہ اس کوشش میں رہتے ہیں کہ اپنے محسن کے احسان کا بدلہ کسی نہ کسی بہتر شکل میں ادا کر دیے مغلیہ دور ہی میں نہیں بلکہ ہندوستان کی تاریخ میں ھمایوں کی احسان مندی کی سی مثال شاید ہی دوسری ملے، ہمایوں نامہ میں یہ واقعہ اس طرح درج ہے کہ نظام نامی ایک سقہ نے ھمایوں بادشاہ کو اس وقت بھنور میں سے صحیح وسلامت نکالا جب وہ دریا پار کرتے ہوئے اپنے گھوڑے سے جدا ہو گیا تھا، ھمایوں نے اس احسان کے بدلے میں سقہ کو تخت پر بٹھا دیا اور حکم دیا کہ سب امراء اس کے سامنے کورنش بجالائیں اور اس کا جو جی چاہے اور جس کو پسند کرے منصب عطا کرے، اس سقہ کو دو دن کی بادشاہی دی گئی تھی، [۱]

کسی کے کیے ہوئے احسان کو تسلیم کرنا اعلیٰ ظرفی کا اظہار ہے اور احسان کو فراموش کر دینا کم ظرفی کا ثبوت ہے "بوستان" کے مصنف کے روبرو بیشتر ایسے کردار ہیں جو اپنے محسن کے تاحیات خدمت گذار رہتے ہیں۔ اور پھر بھی یہی سمجھتے ہیں کہ حقِ احسان ادا نہیں ہوا، بادشاہِ مغرب سلطان شاہ نے مسرور

---

[۱] ھمایوں نامہ ص ۴۵،

نوجوان کے ساتھ ایسے احسانات کیے کہ وہ شکر گذاری کے لیے بادشاہ کی خدمت میں رہنے لگا۔[۱] صاحبقران بھی کہ جس کی عزت و حرمت کرنا ہر ادنیٰ و اعلیٰ اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتا ہے اپنے محسن کا شکر گذار نظر آتا ہے، حارث تاجدار نے جب اس کی مدد کی تو اس نے حارث سے کہا۔

”تم نے مجھ غریب الوطن آوارۂ جہاں نا آشنا کے حال پر بے وجہ و بے سبب ایسا احسان عظیم کیا ہے کہ مجھ سے اس کا شکر و سپاس نامہ پڑھا رہے ہے اگر کشمکش روزگار آفات زمانہ سے زندہ رہا اور کریم کارساز نے مجھے مقاصد دلی سے بہرہ مند فرمایا انشاء اللہ العزیز اس شفقت و خدمت کی ایسی تلافی کروں گا کہ جیسی فرزندانِ رشید والدین سے کرتے ہیں“[۲]

اور وقت آنے پر صاحبقران احسان کا بدلہ چکانے کی کوشش کرتا ہے، مہتر توفیق کو جب ایک دیو نے دوسرے بدکار دیو کے ہاتھوں سے بچایا تو صاحبقران نے اس کے بدلے میں اپنی سلاح اسے دے دی[۳]

شرفاء کا یہ اصول ہے کہ اپنے سے کمتر کا احسان نہیں لیتے کیونکہ ایسی حالت میں وہ اس کے روبرو نگاہ نہیں اٹھا سکتے، ملکہ خوباں دورانِ سفر جب پریشان ہوئی اور اس وقت ایک سوداگر نے اس کی مدد کرنی چاہی تو اس نے مدد لینے سے انکار کر دیا[۴] لیکن اگر بحالتِ مجبوری مدد لینی پڑ جاتی ہے تو اس وقت کی تلاش میں رہتے ہیں جب کسی طرح احسان کا بوجھ ان کے کاندھوں سے اتر جائے، ایک کم درجہ بدمعاش شخص نے بھوک اور پیاس کی حالت میں ملکہ زہرہ جبیں کو ایک وقت کھانا کھلایا، اتفاق سے وہ شخص کسی کا قرضدار تھا قرض کے ادا نہ کرنے کی صورت میں نوبت اس کے قتل تک پہونچی، ملکہ نے حق نمک ادا کرنے کے لیے اپنے زیورات قرض خواہ کو دیئے، اسے نجات دلائی اور حاضرین سے کہا

”اس شخص یعنی جزئیل نے ایک بار مجھے اپنے ساتھ کھانا

---

[۱] ۱۹۱ ج ۳، [۲] ۵۶۶ ج ۴، [۳] ۳۲۰ ج ۴، [۴] ۲۸۲ ج ۲،

کھلایا ہے بس وہی شرطِ نمک اس وقت میں نے ادا کی"[۱]

حقِ نمک یعنی احسان سے متعلق داستان نگار نے ایک جگہ لکھا ہے کہ :-

"خاندانِ شرفا میں حقِ نمک کو سررشتہ محبت و الفت پر بمرتبہ فوق ہے"[۲]

آپس میں ایک دوسرے کی مدد کرنا مذہبی اعتقاد سے باعثِ ثواب سہی لیکن سب سے پہلے انسانیت کے فرائض میں سے ایک ہے، خصوصاً یتیم کے ساتھ ہمدردی اور دلداری سے پیش آنا انسانی فریضہ ہے، "بوستان" میں یتیم کی پرورش کرنے کی سب سے نمایاں مثال جوہر کی ہے جو بے یار و مددگار جنگل میں سے سلطان مہدی کو ملا تھا۔ سلطان نے اسے معزالدین کے ساتھ محل سرا میں رکھا[۳] اس طرح کی اور کئی مثالیں ہیں مثلاً جب گل افروز کے پدر و مادر ہلاک ہو جاتے ہیں تو سردار مہران سخت کمان اسے اپنی فرزندی میں لے لیتا ہے اور اس کی شادی وغیرہ کا سامان خود ہی کرتا ہے[۴]

غیرت مندی

سوسائٹی میں طبقاتی تقسیم نے طبقوں کے اردگرد ایک حصار قائم کر دیا تھا، ہر طبقہ کا آدمی اس میں قید رہتا تھا، روایت و اقدار کا پاس و لحاظ کرنے کے لئے وہ مجبور تھا۔ برہمن وہ کام نہیں کرتا جو ویش یا شودر کے لئے مخصوص تھا۔ شودر برہمن کا ہم رتبہ نہیں ہو سکتا تھا، دولت اور پیشے نے بھی لوگوں کو ذاتوں میں بانٹ دیا تھا جس پیشے کا آدمی جو کام کرتا تمام زندگی اسے وہی کرنا ہوتا بلکہ اس کی اولاد بھی وہی کام کرتی تھی اگرچہ یہ تقسیم اسلامی نقطۂ نظر سے صحیح نہیں لیکن مسلمانوں میں بھی دوسری قوموں کے اثر سے ہم مذہب ہونے کے باوجود فرق کیا جانے لگا تھا خصوصاً شادی وغیرہ کے وقت اس مسئلہ پر زیادہ غور کیا جاتا اپنے سے کمتر کے یہاں رشتہ قائم کرنے یا اپنے معیار سے کم درجہ کا کام کرنا غیرت

---

[۱] ۴۸۰، ج ۴، [۲] ۵۲۵ ج ۴، [۳] ۲۷۵ ج ۱، [۴] ۲۳۶، ۲۱۱ ج ۴،

مندی کے خلاف سمجھا جاتا تھا، مثلاً دختران سلاطین سے عام آدمی کا تعلق خاطر کرنا بھی معیوب تھا فقیر زادہ جمیل ایک سلطان کی لڑکی پر عاشق ہوا تو سلطان اس سے اس طرح پیش آیا:۔

"اس نے ایک عالم غضب میں جمیل سے کہا اے گدازادہ تصدق خوار اب پیشہ دریوزہ گری سے تو اس درجہ کو پہونچا کہ دختران سلاطین پر عاشق ہوا اور اپنی قدر و منزلت پر تجھے کچھ نظر نہ رہی، معلوم ہوا کہ سلسلہ درویشی اپنے خاندان کا خاک دخون میں ملانا چاہتا ہے" [1]

خود دختران سلاطین کی غیرت اس بات کو گوارا نہیں کرتی تھی کہ ان سے کم مرتبہ کا شخص ان کا مطلوب ہو، عاقب حرانی کے عشق کا حال جب طرہ مشکین کو معلوم ہوا تو اس نے کہا:۔

"سبحان اللہ اب گردش زمانہ ناہنجازی سے میری یہ نوبت پہونچی کہ مرد یہودی عیار پیشہ مجھ پر عاشق ہوا عیار بھی وہ کہ میرے بھائی کی سرکار میں ادنیٰ ملازم تھا افسوس صد ہزار افسوس اس زندگی سے مرگ بمراتب بہتر ہے" [2]

اسی طرح دولت مند آدمی بازار سے سودا خریدنا بھی عیب سمجھتے تھے۔ ایک شخص جب صاحبقران کو بازار میں دیکھتا ہے تو اس کے قریب جاکر کہتا ہے:۔

"اے جواں مرد تیرے بشرے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک آدمی دولت مند صاحب مقدار ہے اور دولت مند بازار سے سودا خریدنا اور اپنے ہاتھ سے کھانا پکانا نہایت عیب کی بات جانتے ہیں" [3]

یہ بات بھی وضع داری کے خلاف سمجھی جاتی تھی کہ کوئی شخص اپنی عزت و وقار کو برقرار رکھنے کے لیے اپنا اسباب بازار میں فروخت کرے، ایک مرتبہ شاہزادہ

---

[1] ۲۳۱، ج ۱، [2] ۹۸ ج ۳، [3] ۱۷۸ ج ۴،

کے ساتھ ایسی مجبوری پیش آتی ہے اور نوبت سامان بیچنے تک پہونچتی ہے تو اس کا رفیق امراؤ سے یوں کہتا ہے :-

"جنس و اسباب کا بازار میں بیچنا کس قدر بدنامی کا موجب ہے" [۱]

ایک طرف بازار میں اسباب کا فروخت کرنا باعث رسوائی تھا تو دوسری جانب ضرورت کے وقت کسی کے آگے ہاتھ دراز کرنا بھی ذلت کی بات تھی، صاحبقران اکبر صرف لنگ باندھے عریاں بدن موسم سرما میں پریشان و سرگرداں پھرتا رہا۔ لیکن کسی سے لباس طلب نہیں کیا کیونکہ زبان سے کچھ مانگنا رکیک بات تھی [۲] شرفا کا یہی قاعدہ تھا کہ فاقہ برداشت کر سکتے تھے لیکن دستِ لاچار دراز کر کے داغِ رسوائی نہیں اٹھاتے تھے اسی عہد کے پروردہ میرؔ نے کہا تھا :-

آگے کسو کے کیا کریں دستِ طمع دراز
وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے

شرفا اس بات کو بھی بے غیرتی کے مترادف سمجھتے تھے کہ انھیں روزگار ان کی بیوی کے واسطے ملے کیونکہ مرد کی نظر میں عورت کا مرتبہ ہمیشہ کم رہا ہے اور اپنے سے کمتر کا احسان لینا باعثِ ننگ ہے۔ عورت کے فرائض یہی تھے کہ وہ گھر کی چہار دیواری میں مرد کی محکوم بن کر رہے، اس کی ضروریات کو پورا کرنے کی ذمہ داری مرد کی ہوتی ہے تاکہ عورت مرد کی روزی کا ذریعہ بنے۔ مجدد الملک کو جب اس کی شریک حیات کی وجہ سے روزگار مل جاتا ہے تو اس پر داستان نگار اس طرح طنز کرتا ہے :-

"مجدد الملک بے غیرت جہاں، دل میں خوش ہوا، یہ نہ سمجھا کہ
اہلیہ کے توسل سے روزگار کا ہونا مردمان شریف
باغیرت کے مشرب میں عیب کی بات ہے" [۳]

بیوی سے مزدوری کروانا اور خود گھر میں بیٹھ کر کھانا اور بھی زیادہ ذلت اور توہین کی بات سمجھی جاتی تھی۔

لے ۹۰ ج ۵، ۲ے ۵۲۷ ج ۵، ۳ے ۴۳۳ ج ۴،

اہل ہنود کے یہاں یہ قاعدہ ہے کہ داماد کے یہاں بہت کم جاتے ہیں اور جب جاتے ہیں تو اس کے یہاں کا پانی بھی نہیں پیتے بلکہ کچھ دے کر ہی آتے ہیں "بوستان" میں ایک جگہ یہ اثر نظر آتا ہے۔

"خالدہ بانو نے ملکہ خاندانہ کو بلا کر کہا۔۔۔ خیر میں بھی تیری محبت کے باعث بے حیائی و بے شرمی کو کام فرماؤں گی۔ اور تیرے ہمراہ داماد کے گھر چلوں گی"[۱]

اس عہد کے لوگ انتہائی غیرت مند تھے عزت و آبرو کی خاطر چھوٹی چھوٹی باتوں پر تلواریں نکل آتی تھیں قتل و خون کا بازار گرم ہوتا تھا، بے غیرتی کی زندگی سے موت بہتر سمجھی جاتی تھی۔ بابر نے بابر نامہ میں لکھا ہے کہ جب میدنی رائے کے سپاہیوں نے میدان جنگ میں خود کو بے بس پایا تو ان کی غیرت نے یہ گوارا نہ کیا کہ زندہ گرفتار ہوں بلکہ انھوں نے خودکشی کرنے کا ارادہ کر لیا اور ایک سپاہی کے ہاتھ میں برہنہ تلوار دے کر ایک ایک کر کے اپنے سر اس تلوار کے نیچے سے گذار دئے اور راہیِ عدم ہوئے[۲]۔ راجپوتوں میں جوہر کی رسم غیرت مندی ہی کی وجہ سے رائج ہوئی، مرد کی غیرت کبھی یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ اس کے ناموس پر حرف آئے، یہاں تک کہ اپنی بیٹی کا نام بھی کسی غیر مرد کی زبان سے سننا گوارا نہیں کر سکتے تھے، وزیر ذوالفراست نے جب اپنی دختر ناکتخدا کا نام ایک ذلیل سردار مہر لق کی زبان سے سنا تو بے اختیار غصہ سے سرخ ہو گیا، غیرت نے جوش کھایا لیکن بادشاہ کے خوف سے کچھ نہیں کہا۔

"مجبور ہوں بادشاہ کے خوف سے کچھ کہہ نہیں سکتا ورنہ اس نطفہ حرام کو زندہ زمین میں دفن کروا دیتا"[۳]

جمشید اور اشبوط کے درمیان محض اسی بات پر جنگ ہوئی اور بہت سے لوگ مارے گئے کہ جمشید نے اشبوط سے کہا تیری بیٹی امیر حمد کی معشوق ہے جس کے جواب میں اشبوط بولا تیری بہن یعقوب حرانی کی بغل گرم کرتی ہے۔ غیرت اس طنز کو برداشت نہ کر سکی اور دونوں میں لڑائی ہوئی[۴]۔ ایک اور مقام پر جب ایک

---

[۱] ص ۲۳۵ ج ۲، [۲] بابر نامہ ص ۳۸۴، [۳] ص ۶۹۷ ج ۴، [۴] ص ۳۷۹ ج ۴،

بادشاہ کے محل سے اس کی دختر غائب ہوگئی تو اس نے غصہ میں اس کی تمام کنیزوں کو قتل کروادیا[1]۔ دراصل سوسائٹی کا ماحول ہی ایسا تھا کہ ہر فرد بے غیرتی اور بے عزتی کی زندگی پر موت کو ترجیح دیتا تھا، لوگ پُر وقار اور باغیرت زندگی گذارتے تھے، دوسرے کی عزت وغیرہ کا بھی لحاظ رکھتے تھے۔ ایک مجلس رندانہ میں جب کسی نے کسی عفیفہ کا نام لیا تو ملک اسلیمون تاجدار نے کہا:

"یارو اس مجلس رندانہ میں ایک عفیفہ بے گناہ کا نام لینا اور ناحق اس کو بدنام و رسوا کرنا شیوہ وغیرت سے بعید ہے"۔[2]

اس طرح کی ذہنیت ماحول کے اثر سے پیدا ہوتی ہے، اس ماحول میں عزت وغیرت مرد اور عورت کے زیور تھے۔ نمک حلالی، مہمان نوازی، احسان شناسی اور غیرت مندی کے ساتھ ساتھ وعدہ کا وفا کرنا بھی ان کی تہذیبی فطرت کا جزو بن گیا تھا:

"تم اپنے بادشاہ کو اس پیام کا جواب دینا کہ مردان صادق القول اور سلاطین اولوالعزم کا قاعدہ کلیہ ہے کہ جو بات زبان سے نکالتے ہیں یا کوئی عہد و پیماں کرتے ہیں اس کا ایفاء اور انجام واجبات سے جانتے ہیں"۔[3]

بادشاہوں کے لئے داستان میں کہا گیا ہے کہ "بادشاہ دروغ گو نہیں ہوتے، اپنے وعدے کا ایفا کرتے ہیں"[4] صادق القول یعنی قول کا سچا اور بات کا پکا ہونا بڑی بات تھی اور اسے شیوہ شرافت اور مردانگی خیال کیا جاتا تھا۔

برائیاں

کوئی بھی انسان یا معاشرہ محض خوبیوں کا ہی مجموعہ نہیں ہوتا بلکہ برائیاں بھی اس کے پہلو بہ پہلو چلتی رہتی ہیں دولت کی فراوانی اگر انسان کو ایک طرف جد و جہد زندگی میں سہولت اور آرام فراہم کرتی ہے تو دوسری جانب اخلاقی خرابیوں کی طرف بھی رغبت دلاتی ہے، ماضی کی تاریخ کا اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ طبقۂ

۱؎ ۳۷-۵۲۶ ج ۳، ۲؎ ۱۸۴ ج ۳، ۳؎ ۳۴۷ ج ۴، ۴؎ ۶۰۰ ج ۵،

لطین و امراء کے بیشتر افراد کسی نہ کسی منزل پر آکر غرق مئے ناب ہو جاتے ھیں،
ناجب کسی بادشاہ کے قدم سریر سلطنت پر جم جاتے اور وہ اطراف و جوانب سے
مئن و بے فکر ہو جاتا تو اس کا زیادہ تر وقت اور دولت رامش و رنگ کی محفلوں
ںذر ہوتی اور نتیجتاً ایک وقت ایسا آتا کہ اس کی حکومت بادۂ گلرنگ کے ساتھ
جاتی۔ عام طور پر جب کوئی آدمی اپنے اختیارات کا دائرہ وسیع پاتا ہے تو اوّلے
سی خواہشات کی تکمیل کی طرف متوجہ ہوتا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ معاشرہ
جنسی خواہش کی تسکین کے لئے آزادی میسّر نہیں بلکہ انتہائی درجہ کی پابندیاں
لیکن حکمراں عموماً ہر پابندی سے آزاد ہوتے تھے، ملک کی ہر شے پر پہلے ان کا
ق ہوتا تھا۔ سلطنت کی جس عورت کو چاہتا وہ اپنے حرم کی زینت بنا سکتا تھا،
ہ بجبر خواہ بخوشی۔ بادشاہ کیخسر تاج نے غیرت افروز کو بجبر اپنی محلسرا میں بلوایا[1] یا
اور جگہ ایک بادشاہ ایک عورت کو حاصل کرنے کیلئے کہتا ہے:۔

"اگر یہ اس کی منکوحہ نہیں کوئی رشتہ دار ہے ہم اس کو کچھ زر نقد
دے کر راضی کر لیں گے اور بالفرض شوھر ہے پھر کسی جرم
کے حیلہ سے اس کا قتل یا دائم الحبس کرنا کیا مشکل بات ہے[2]"

یہ شاہی اختیارات کا وہ استعمال ہے جو بالآخر سلطنت میں انتشار کا سبب بنتا ہے
ہندوستان میں پہلی مستحکم مسلم حکومت غلام خاندان کی تھی۔ قطب الدین ایبک سے
کر بلبن تک اس خاندان نے انتہائی شان و شکوہ کے ساتھ حکومت کی۔
سن انتہائی عروج زوال کی آمد کی نشاندہی کرتا ہے۔ بلبن کی موت کے بعد
ز الدین کیقباد نے تخت سلطنت کو ایسی رونق بخشی کہ غلام خاندان کا چراغ سلطنت
گل ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ کیقباد کی عیش پرستی کا یہ عالم تھا کہ جب وہ اپنے باپ
اخاں سے ملنے کے لئے اودھ گیا تو حسینوں کا ایک قافلہ اس کے ہمراہ تھا[3]۔
کیقباد کی عیش پرستی کے سبب بلبن کی اولاد کا اقتدار ختم ہوا، اور سلطنت
ی خاندان میں منتقل ہو گئی، خلجی خاندان میں علاء الدین کا زمانہ عروج کا دور رہا۔

ے ۳۸۷ ج ۴، ۲ے ۴۴۴ ج ۴، ۳ے اوراق مصور ص ۳۲

لیکن جب اس خاندان کی تباہی آئی تو قطب الدین جیسا عیاش سلطان تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوا "خلجی خاندان" کے مؤلف نے برنی کے حوالے سے لکھا ہے کہ:۔

"روم کے عیاش الاگیلیس (تیسری صدی عیسوی) کی مانند سلطان کی شہوت کنیزوں کے ایک طویل سلسلے سے یا بے ریش غلاموں کی کثیر تعداد سے نہیں بجھتی تھی وہ خود عورتوں کے کپڑے پہننے کو ترجیح دیتا جو گوٹے کناری سے کڑھے اور ہیرے جواہرات سے آراستہ ہوتے تھے اور وقتاً فوقتاً وہ امرا کے گھروں میں رقص کرتا ہوا جاتا تھا وہ نوخیز خواجہ سراؤں اور بے باک عورتوں کی صحبت سے لطف اندوز ہوا کرتا تھا، آوارہ عورتیں برہنہ اس کے دربار میں آتی تھیں اور اعلیٰ امرا مثلاً عین الملک ملتانی اور قرابیگ کے ساتھ فحش مذاق کرتی تھیں۔ مختصر یہ کہ قطب الدین کا دربار انتہائی برہنہ، شہوت رانی اور فحاشی کا منظر پیش کرتا تھا" [۱]

عموماً خاندانوں کی بربادی کا سبب اخلاقی پستی ہی رہی ہے۔ دربار کے اخلاق کی گراوٹ کا اثر محض دربار ہی تک قائم نہیں رہتا بلکہ رعایا پر بھی پڑتا ہے دربار اور رعایا کا بڑا گہرا تعلق ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی رح نے لکھا ہے:۔

"سلطان روح کی مانند ہے اور رعایا جسم کی طرح ہے اگر روح صالح ہوتی ہے تو جسم بھی صالح رہتا ہے اگر روح فاسد ہو جاتی ہے تو بدن میں بھی فساد پڑ جاتا ہے"۔ [۲]

مغل خاندان کے برسر اقتدار آنے پر ایک بار پھر مسلمانوں کو ہندوستان میں عروج حاصل ہوا اور ایک بڑی مستحکم اور مضبوط سلطنت قائم ہوئی۔ لیکن جیسا کہ پہلے کہا گیا کہ عروج کی انتہا زوال کی آمد ہوتی ہے اور زوال اخلاقی برائیوں کو اپنے ساتھ لاتا ہے، شاہ جہاں اور اورنگ زیب کا عہد مغل سلطنت کا نقطۂ عروج

---

[۱] خلجی خاندان ص ۳۲۴، [۲] ماخوذ از اٹھارہویں صدی میں ہندوستانی معاشرت، ص ۲۸۶ ۔

کہا جاتا ہے کہ اتنی بڑی اور پُرشکوہ سلطنت اس وقت دنیا میں دوسری نہ تھی۔
سرے ممالک کے لوگ اس سلطنت کی دولت وثروت کی داستانیں سُن کر
یہ چلے آتے تھے، لیکن عروج کا مقدر زوال ہے اسی لئے اس خاندان میں
نت وسطوت کی افراط نے بہت نااہل اور عیش دوست بادشاہوں کو تخت
ٹھایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ پوری سلطنت ساغر ومینا میں ڈوب گئی۔
رہویں صدی کہ جس دور میں "بوستان خیال" کی تالیف عمل میں آئی۔ مغل
لنت کی تباہی وبربادی کی صدی تھی۔ اورنگ زیب کا انتقال محض ایک جلیل القدر
باہ یا حکمرانِ سلطنت کی موت نہیں تھی بلکہ اسی کے ساتھ گویا تاریخ کا ایک
نتم ہوگیا تھا۔ عہد زوال میں حکمرانی کرنے والے بادشاہوں کی پوری توجہ
گی سے فرار کی طرف مبذول تھی تاکہ انھیں اپنی کمزوریوں کا احساس نہ ہو۔
لگ زیب کے جانشینوں میں جہاندار شاہ جب بادشاہ ہوا تو نظام سلطنت
ی معشوقہ ڈومنی لال کنور کے ہاتھوں میں آگیا، دربار طوائف کا کوٹھا بن گیا۔
ساہت کا وقار ختم ہوگیا۔ کبھی بادشاہ لال کنور کے ساتھ سیر وتفریح کے لئے
دوں میں نکل جاتا، کبھی مے نوشی کی غرض سے شراب خانوں کا رخ کرتا۔
نور کی وساطت سے دربار میں بازاری لوگوں کا تقرر ہونے لگا۔ انھیں جاگیریں
ی گئیں۔ لائق اور باصلاحیت لوگوں کو پس پشت ڈال دیا گیا، جہاندار شاہ کے
ق ڈاکٹر محمد عمر نے خافی خاں کا یہ بیان نقل کیا ہے:۔

> "در عہد ناپائیدار جہاندار شاہ کہ بنائے ظلم وفسق را استحکام
> تمام شد، چنانچہ بازار رود وسرود قوالان وکلاونت وڈھاڑی
> گرم شد کہ نزدیک بود کہ قاضی قرابہ کش ومفتی نوش گردد"[۱]

سلطنت اور معاشرہ دن بدن تباہی کی طرف بڑھ رہا تھا دربار کی بگڑی
ں حالت کے اثرات امراء پر مرتب ہو رہے تھے، بادشاہت شطرنج کی بساط
ی تھی بادشاہ مہروں کی طرح بدلے جا رہے تھے۔ جہاندار شاہ کے بعد

---

[۱] ٹھارہویں صدی میں ہندوستانی معاشرت، ص ۲۸۸

فرخ سیر نے تخت سلطنت کو زینت بخشی، فرخ سیر کے بعد قابلِ ذکر بادشاہ محمد شاہ
ہے جس نے قریب اٹھائیس برس حکومت کی بلکہ حکومت کرنے کا لفظ شا
مناسب نہ ہو، یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس نے اٹھائیس برس اپنے اختیارات ا
دولت کے سہارے عیش و آرام حاصل کرنے کی کوشش کی، میدانِ جنگ
کی سختی اور نظامِ سلطنت کی پیچیدگی کے مقابلہ میں اس نے محل کے عیش و آرام
ترجیح دی، کہا جاتا ہے کہ اپنے طویل عہد حکومت میں اس نے چند بار ہی محل
باہر محض سیر و تفریح کے واسطے قدم نکالا ہے[۱]۔ ایک مورخ کا بیان ہے کہ "دہ
میں دربار اکبری کی اولوالعزمی کے بجائے شیشہ و پیمانہ کی بدمستی تھی، شاہجہا
شوکت و سطوت کی جگہ حسرت و یاس کی تصویر تھی، عالمگیری جاہ و جلال کی جگ
بے بسی اور بے کسی کا عبرت ناک منظر تھا[۲]"

اورنگ زیب کی وفات کے بعد سے محمد شاہ کے تخت نشین ہونے تک تخت
و تاج کے حصول کے لئے شاہزادوں کی بغاوتیں اور امراء کی سازشیں حد سے س
سرگرم رہیں۔ اس اعتبار سے محمد شاہ کا عہد کچھ پرسکون رہا، البتہ صوبوں میں خ
مختاری کا رجحان اور اس کے لئے کوششیں ہوتی رہیں۔ ان کوششوں کو ختم کرنے
کے لیے مرکز کی طرف سے کوئی موثر اقدام نہیں کیا جا سکا بلکہ بادشاہ، اہلِ دربا
اور دہلی کے باشندے خود فریبی کے عالم میں گرفتار رہے، شہر دہلی کو باغ جنت
تصور کیا۔ شراب اور عورت آبِ کوثر اور حور کے مترادف سمجھی گئیں باہر کی دنیا
کن حالات سے دوچار تھی کسی نے جاننے کی کوشش نہ کی بادشاہ کی عیش پسند
اور رنگین مزاجی نے اہلِ شہر کو بھی رنگین طبع اور آرام پسند بنا دیا تھا۔

افکارِ سلطنت سے لاپرواہی کا نتیجہ یہ ہوا کہ نادر شاہ ایران سے دلی تک آگ
اور کوئی نہ روک سکا، جب نادر شاہ نے دلی کی جانب پیش قدمی کی تھی تو محمد شاہ
سے بار بار یہ کہا گیا کہ نادر شاہ دلی کی طرف آ رہا ہے۔ آرام پسند بادشاہ نے ہر با
یہی جواب دیا کہ ابھی دلی بہت دور ہے یہاں تک کہ نادر شاہ دلی کے قریب کرنا ل

۱؎ الفنگ، ۲؎ بحوالہ اردو شاعری کا سماجی پس منظر ص ۱۵۶،

تک آگیا۔ محمد شاہ کی اس عیش پسندی اور لاپرواہی کو "بوستان" میں اس طرح پیش کیا ہے کہ شاہزادہ اسماعیل طلسم کے شہروں کو فتح کرتا ہوا برابر آگے بڑھتا چلا جاتا ہے، حکام شہر طلسم کے بادشاہ جمشید سیاہ قبا کو لکھتے ہیں کہ اس کی کوئی فکر کیجئے دشمن دن بہ دن آگے بڑھ رہا ہے، عیش دوست جمشید جواب دیتا ہے :۔

"جمشید ہمیشہ مست و مخمور نازنیان ماہ رو سے ہم صحبت رہتا تھا
اور سعادت ایمان سے مشرف ہونا اس کے نصیب میں نہ تھی
پھر غافل ہو گیا اور کہا کہ ابھی چندیں طلسم باقی ہیں کہاں
تک ختم کرے گا" [۱]

بادشاہ اور امرا کی نااہلی کے سبب بیدار مغز اور صاحب بصیرت افراد پریشان تھے تاریک مستقبل کے اندیشوں سے خائف تھے اور نگ زیب کا زمانہ یاد کر کے خون کے آنسو روتے تھے۔ جعفر زٹلی اورنگ زیب کو اس طرح یاد کرتا ہے ؎

کہاں اب پایئے ایسا شہنشاہ   مکمل اکمل کامل دل آگاہ
رکت کے آنسوؤں دل روتا ہے   نہ میٹھی نیند کوئی سوتا ہے

جعفر جیسے صاف گوئی کے سبب قتل کر دیا گیا تھا، اورنگ زیب کے جانشینوں کے بارے میں کہتا ہے ؎

جہاں ہوئے ایسے کلچھن کپوت   لگے خلق کے منہ کو کالک بھبوت

محمد شاہ وہ آخری بادشاہ تھا جس کے دور تک شاہی خزانوں میں دولت موجود تھی۔ اس وقت تک اہلِ قلعۂ معلیٰ کو فاقوں کی نوبت نہیں آئی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ دولت کا استعمال تعمیری کاموں کے بجائے تخریبی کاموں پر ہو رہا تھا۔ دولت اور اقتدار عیاشی کا ذریعہ بنے ہوئے تھے، عیاشی کی اس فضا نے امرار سے لے کر عوام تک کی اخلاقی حالت پر اثر ڈالا۔ ڈاکٹر خلیق احمد نظامی اس عہد کے متعلق لکھتے ہیں کہ :۔

"فکر و عمل، اخلاق و عادات، کردار و اطوار سب پر انحطاطی رنگ

---

[۱] ۴۴۵ ج ۱،

چھایا ہوا تھا زندگی مسکرِ دوام میں تبدیل ہو رہی تھی ہر قوم کو سیاسی زوال سے پہلے اور اس کے بعد جو اخلاقی زوال کی منزلیں طے کرنی پڑتی ہیں وہ نہایت سرعت کے ساتھ طے کی جا رہی تھیں، اخلاقی قدروں کی گرفت ڈھیلی پڑ رہی تھی اور سماجی نظام کا سارا ڈھانچہ بکھر رہا تھا، عالمگیر اورنگ زیب نے فتاویٰ عالمگیری کی تدوین کرا کے جس گرتے ہوئے اخلاقی اور سماجی نظام کو سنبھالنے کی کوشش کی تھی وہ اس کے کمزور اور نااہل جانشینوں کے عہد میں منہدم ہو رہا تھا[۱]"

قلعہ معلیٰ کے اثرات دلی تک محدود نہیں تھے بلکہ صوبائی ریاستوں کا حال بھی ایسا ہی ہو گیا تھا، بیشتر صوبے تو خانہ جنگی کا شکار تھے۔ مثلاً دکن میں مرہٹے ہنگامہ کئے ہوئے تھے، بنگال میں انگریز اقتدار حاصل کرنے کی جستجو میں تھے، اودھ ابھی گوروں کے ظلم سے محفوظ تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نوابین اودھ عالم بے فکری میں دادِ عیش دینے لگے، سبھی کو جنسی تلذذات سے دلچسپی کے سوا دوسرا کوئی کام نہ تھا۔ طوائفوں کو جتنی ترقی اودھ میں ملی دہلی میں بھی نہ ملی تھی۔ ہر ادنیٰ و اعلیٰ ان کی زلفوں کا اسیر تھا، محل میں عورتوں کا ہجوم رہتا تھا۔ نواب راجہ اندر کی طرح ان کے بیچ زندگی گذارتا تھا۔ ڈاکٹر صفدر حسین نے چہار گلزار شجاعی کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ :۔

"ان کے (شجاع الدولہ) حرم میں دو ہزار سات سو سے زیادہ عورتیں تھیں، جن میں دو ہزار خواصیں اور سات سو ایک ان کے محلات تھے"[۲]

یہی صورت حال بقیہ نوابین اودھ کی تھی، حکومت محض عیش کرنے کا شغل بن کر رہ گئی تھی۔

"بوستان خیال" اٹھارہویں صدی کے اس ماحول میں لکھی گئی۔ مورخین کی

۱؎ تاریخ مشائخ چشت ص ۳۵۴، ۲؎ چہار گلزار شجاعی۔ بحوالہ لکھنؤ کی تہذیبی میراث، ص ۱۸۶،

تاریخوں کو اگر نظر انداز کر دیا جائے اور صرف "بوستان" کی مدد سے اس عہد کی بد حالی کا مطالعہ کیا جائے تو مکمل تصویر سامنے آجاتی ہے، "بوستان" کے شاہزادوں اور عوام میں مغلیہ بادشاہوں، نوابین اودھ اور ان کی رعایا کی محض جھلک نظر نہیں آتی بلکہ وہ مکمل طور سے خود ان کا عکس معلوم ہوتے ہیں "بوستان" کا بنیادی کردار معزالدین ہے، صاحبقران اکبر کا یہ نام خلفاء بنو فاطمہ کے ناموں میں سے ایک ہے لیکن بجائے اس کے کہ معزالدین کو تلاش کرنے کے لئے ہم تاریخ مصر کا مطالعہ کریں، ہمیں یہ کردار ہندوستان ہی کے بادشاہوں میں مل جاتا ہے اور ان کے مابین یک سر مو فرق نظر نہیں آتا، عہد سلاطین میں معزالدین کیقباد نام کا ایک عیش دوست سلطان گذرا ہے اور عہد مغلیہ میں میں معزالدین جہاندار شاہ "بوستان" کا ہیرو بننے کے لئے موجود ہے، ان بادشاہوں کی لذت کوشی کا تذکرہ گذشتہ صفحات میں کیا جا چکا ہے، جس طرح معزالدین کیقباد عیاشی کے سبب غلام خاندان کے زوال کا سبب بنا اسی طرح معزالدین جہاندار شاہ اپنی بے ہودہ اور مبتذل حرکتوں کے باعث عہد مغلیہ پر ایک بد نما داغ ہے، محمد شاہ بھی اپنے مزاج اور عیش پسندی کے اعتبار سے مذکورہ فرمانرواؤں سے مختلف نہیں تھا۔ اس لئے یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ "بوستان" کے تینوں صاحبقران خصوصاً ان تینوں بادشاہوں اور عموماً دوسرے بادشاہوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ داستان نگار کی نظر میں محمد شاہ اور اس سے پہلے کے بادشاہ تھے۔ اسے زوالِ سلطنت نظر آرہا تھا اسی لئے اس نے بعض مقامات پر اس عیش دوستی کے نتیجہ کا بھی اظہار کیا ہے مثلاً وہ لکھتا ہے:۔

> "خدائے رب العزت نے مردوں کی وہ خلقت کی ہے کہ ان کی حرکت و افعال کا کسی صورت سے بند و بست نہیں کیا جاتا اور نہ ان کے سیر دم خیالی کا انتظام ہو سکتا ہے خصوصاً فرقۂ سلاطین کا عیش و آرام یا لہو و لعب میں بدل متوجہ ہونا زوالِ سلطنت و خرابی ملک کا نشان ہے۔" لہ

لہ ج ۲ ص ۸۵ -

عہد زوال کے بادشاہوں پر عورت کا نشہ سوار تھا اور عورت کا نشہ تباہی کی طرف لے جاتا ہے :-

"اس مرد کو بدبخت ترین عالم کہتے ھیں کہ عورت کی محبت یا لذتِ نفسانی کے باعث اپنے نیک و بدانجام پر نظر نہ رکھے اور زمامِ اختیار ایک زن ناقص العقل کو سونپ دے"۔[1]

"سلاطینِ کشور گیر اور بادشاہانِ صاحب عزم کا یہ منصب ہے کہ اقصائے عالم میں کوس بلند نامی بجائیں اور سرزمین طلسم اور غیر طلسم کو آلائش کفر و ضلالت سے پاک و صاف کریں"۔[2]

لیکن یہاں معاملہ ہی کچھ اور تھا کسی کو یہ احساس ہی نہ تھا کہ سلطنت کی جڑیں کھوکھلی ہوتی جا رہی ھیں۔ ارباب حل و عقد آلائش کفر و ضلالت سے پاک و صاف کرنے کے بجائے ملک کو آلائشوں میں مبتلا کر رہے تھے، کسی طرح کی پریشانی ہو یا کوئی مصیبت عیاشانہ مزاج میں تبدیلی نہیں آتی۔ شاہزادہ مہران طلسم میں گرفتار ہے اور ایک ویرانہ میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ قیام کئے ہوئے ہے، پریشانی کا عالم ہے لیکن جب شکار کے گوشت کے کباب ملتے ھیں، تو شاہزادہ کی وہی شاہی طبیعت امنڈ آتی ہے اپنے عیار سے کہتا ہے :-

"اے شمیم اگر اس وقت کہیں سے شراب سرور افزا لائے ہم بہت خوش ہوں، شمیم نے کہا خدا حافظ ایسی شراب خوری کا، بندہ نواز حضور شراب کے متلاشی ھیں اور میرا دل بے قرار ہو رہا ہے خدا جانے دو چار ساعت میں کیا بلائے ناگہانی ہمارے سروں پر نازل ہونے والی ہے"[3]

بالآخر وہاں شراب مہیا ہوتی ہے اور وہ پیتے ہیں، پینے کے بعد بلائے سخت میں گرفتار ہو جاتے ھیں۔ یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ بلائے ناگہانی نادر شاہ

---

[1] ۴۸ ج ۶، [2] ایضاً، [3] ۳۰۳ ج ۵،

کے حملہ کی شکل میں محمد شاہ کے سر پر نازل ہوئی، صرف نادر شاہ کا حملہ ہی کیوں بلکہ مرہٹوں اور روہیلوں کی سرکشی، انگریزی طوفان اور احمد شاہ ابدالی کے حملے وغیرہ سب ہی بلائے سخت کا روپ اختیار کر کے مغلیہ سلطنت کے اوپر منڈلائیں کیونکہ زوال ان کا مقدر بن چکا تھا اس لئے باوجود تمام بلاؤں کو اپنی نظروں سے دیکھنے کے محسوس نہیں کرتے تھے، تلواروں کو غلاف زربفتی میں مغلف کر کے دیواروں پر لٹکا دیا تھا۔ اور خود شیشۂ ناب میں ڈھل گئے تھے، سپاہیوں کا حال شاکر ناجی نے یوں نظم کیا ہے ؎

لڑتے ہوئے تو برس بیس ان کو بیتے تھے
دعا کے زور سے دائی دوا کے جیتے تھے
شرابیں گھر کی نکالے مزے سے پیتے تھے
نگار و نقش میں ظاہر گویا کہ چیتے تھے

سودا ایک شہر آشوب میں لکھتے ہیں ؎

پڑے جو کام انھیں تب نکل کے کھائی سے
رکھیں جو فوج جو موتی بھرے لڑائی سے
پیادے ہیں سو ڈریں سر منڈاتے نائی سے
سوار گر پڑیں سوتے میں چارپائی سے
کرے جو گھوڑا خواب میں کسی کے نیچے الول

شاہ ولی اللہؒ کے مکتوبات میں اس دور کی جگہ جگہ تصویریں ملتی ہیں اور وہ خود بادشاہ کو اس کے فرائض کا احساس دلانے اور نتائج سے آگاہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں لکھتے ہیں :۔

"اگر حکمراں جماعت آرام و آسائش اور زینت و تفاخر کی زندگی کو اپنا شعار بنا لے تو اس کا بوجھ قوم کے دیگر طبقات پر اتنا بڑھ جائے گا کہ سوسائٹی کا اکثر حصہ حیوانوں جیسی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوگا، انسانوں کا اجتماعی اخلاق اس وقت برباد ہو جاتا ہے جب کسی جبر سے ان کو اقتصادی

تنگی پر مجبور کر دیا جائے،،[1]

بادشاہ سے لے کر امرا اور طبقہ ادنیٰ تک رنگینیوں میں مست تھے، سیاسی انتشار اور اقتصادی تنگی کا کسی کو احساس ہی نہ تھا، بلکہ سیاسی انتشار اور اقتصادی تنگی نے اس عہد کے ہر فرد کو زندگی سے فرار ہی کی راہ دکھائی۔ اور فرار کا ذریعہ سطحی تفریحات بنیں۔ ڈاکٹر محمد حسن نے لکھا ہے:۔

،، اس دور کی فرد کی مسرتیں سطحی سہی لیکن کھلی ڈلی تھی اور اس کی ذات دبی کچلی گھٹی ہوئی اور مریض نہ تھی وہ کھل کھیلنے اور دھوم میں مچانے کا رسیا تھا اسی لیے اس کا مزاج قلندرانہ، اس کی طبیعت رندانہ اور اس کا ذہن رندداری اور آزادروی سے معمور تھا، تیسری بات یہ ہے کہ اس دور کے افراد کو انفرادی طور پر ایک ایسے نشے، ایسے ذریعۂ نجات کی تلاش تھی جو ماحول کی ناخوشگواری اور ان کی بےبسی کو گوارا بنا سکے اور بےچینی اور اضطراب کے اس دور میں ان کے لئے چھوٹی چھوٹی مسرتوں اور عیش پرستیوں کے لئے گنجائش نکال سکے،،[2]

یہ بات صحیح ہے کہ اس عہد کے افراد عیاشی کا کھیل کھل کر کھیل رہے تھے، لے دے کے یہی ایک اقتدار کی نشانی رہ گئی تھی کہ کس کے حرم میں کتنی زیادہ عورتیں ہیں، کون کس قدر داد عیش دیتا ہے۔

،، بوستان،، کے شاہزادے ان سے ذرا بھی مختلف نہیں، خواہ وہ سلطان مہدی، قائم، اسمٰعیل، معزالدین ہوں یا شاہنامہ کے صاحبقران خورشید اور بدر منیر ہوں، عورت اور شراب کے سب طلب گار نظر آتے ھیں، جنگیں کسی سیاسی مقصد کے لئے نہیں لڑی جاتیں بلکہ عورت کی خاطر قتل و خونریزی کے بازار گرم ہوتے ھیں، عورت جو اہلِ دول کی عیاشی کا سب سے اہم ذریعہ ہے بادشاہوں اور شاہزادوں کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی ہے ان کا مقصد محض جنسی آسودگی

---

[1] شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات۔ ص ۱۱۱، [2] دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی اور فکری پس منظر۔ ص ۱۱۴

معلوم ہوتا ہے، مصنف ایک جگہ لکھتا ہے :-

"تمام عمر سے یہی تماشہ دیکھتی اور سنتی آئی ہوں کہ ارباب
دولت و ثروت کو ایک بی بی پر قناعت نہیں ہوتی"[1]

اس کا بنیادی سبب معاشرے کی وہ اقدار ہیں جن میں مرد اور عورت کا آزادی سے ملنا شجر ممنوعہ ہے، جنس مخالف کی خواہش ایک فطری جذبہ ہے اور جب اس جذبہ کو قید کر دیا جائے تو یہ اور ابھر جاتا ہے۔ خصوصاً مشرقی ممالک میں مرد اور عورت کے آزادانہ تعلقات پر زیادہ پابندی ہے کوئی عورت غیر مرد کے روبرو نہیں جا سکتی، غیر شادی شدہ لڑکے لڑکیوں کا ملنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ لڑکے لڑکیوں کو یہ اختیار نہیں ہوتا کہ وہ خود اپنی شادی طے کر سکیں بلکہ والدین جہاں منعقد کر دیتے، فریقین بسر و چشم تسلیم کر لیتے قبل از شادی ایک دوسرے کو دیکھ بھی نہیں سکتے۔ ایسی صورت میں قید و بند سے رہائی کا جذبہ خود بخود پیدا ہوتا ہے، اور لوگ آسودگی کے لئے دوسرے ذرائع نکال لیتے ہیں۔ صاحب ثروت افراد نے کئی کئی شادیاں کیں۔ ان کے علاوہ کنیزیں اپنے محلوں میں رکھیں اور انھیں دل بستگی اور جنسی آسودگی کا سامان بنایا۔ کمتر درجہ کے لوگوں نے جنسی تشنگی کو دور کرنے کے لئے طوائفوں کی جانب رخ کیا۔ جن کے پاس اختیار اور زر تھا انھوں نے اپنے اختیار اور زر کا بیشتر حصہ جسمانی ناآسودگی کو ختم کرنے پر ہی صرف کیا۔ تاریخ اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ اکثر و بیشتر بادشاہوں کی حرم سرا میں خوب صورت عورتوں کا ہجوم رہتا تھا، یہ بات عہد زوال کے حکمرانوں کے لئے مخصوص نہیں تھی، بلکہ زمانہ عروج میں بھی یہی صورت حال ملتی ہے، اکبر، جہانگیر اور شاہ جہاں کی محل سرا میں ان گنت کنیزیں تھیں۔ ایسے بادشاہوں کے لئے کنیزوں کی موجودگی اس لئے بھی ضروری تھی کہ میدان جنگ کی تھکن دور کرنے اور افکار سلطنت سے نجات پانے کے لئے حرم سرا ہی میں پناہ لی جاتی تھی لیکن اس پناہ لینے کی ایک حد مقرر تھی۔ اس کے برعکس

---

[1] ص ۴۴۲ ج ۳،

عہد زوال میں بادشاہوں کا شغل ہی صرف حرم سرا میں وقت گذارنا رہ گیا تھا احمد شاہ بن محمد شاہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جب وہ بادشاہ ہوا تو حرم عورتوں سے بھر گیا تھا، محل کے چاروں طرف ایک ایک کوس کے فاصلے تک حسین عورتیں ہی نظر آتی تھیں[۱] ایسے ماحول میں بے حیائی اور بے شرمی کا بڑھ جانا فطری بات ہے، محل کے مناظر کی یہ صورت ہوتی ہے :-

"شاہزادہ اسی صورت سے ان کنیزوں میں در آیا اور کسی کو بغل میں لے لیا اور کسی کے بوسے لئے، کسی کی پستان مالی کی[۲]"

"بوستان" میں بعض مقامات پر جنسی اختلاط کے مناظر قابلِ نفریں حد تک فحش نظر آتے ھیں جنھیں پڑھ کر معزالدین کیقباد، قطب الدین مبارک، مبارک شاہ جہاندار شاہ، محمد شاہ، احمد شاہ اور نوابین اودھ کے حرم کی یاد تازہ ہو جاتی ہے ایک مورخ نے مبارک شاہ کے متعلق لکھا ہے کہ خوبصورت لڑکیوں اور بے ریش لڑکوں کی طلب نے ان کو نایاب بنا دیا تھا اُن کی قیمتیں پانچ سو اور بعض اوقات تو دو ہزار تنکہ تک پہونچ گئیں[۳]۔ مغلیہ عہد زوال کے بادشاہوں کا حال شاہ عالم ثانی کی اس رباعی سے ظاہر ہو جاتا ہے ؎

صبح تو جام سے گذرتی ہے　　شب دلآرام سے گذرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے　　اب تو آرام سے گذرتی ہے[۴]

نوابین اودھ کے حرم کی کہانیاں تو ضرب المثل ھیں۔

"بوستان" میں "طلسم الفرح" "میخانہ ہوشربا" "باغ بر سیما" وغیرہ ایسے مقامات ہیں جنھیں شاہزادوں کا دار العیش کہا گیا ہے اور جہاں سوائے شراب پینے اور جنسی اختلاط کے کوئی دوسرا مشغلہ نہیں ہوتا۔ ان مقامات کی نازنینیں اس طرح کی بے باکی، بے حیائی اور بے شرمی کا مظاہرہ کرتی ھیں کہ طوائفوں کے کوٹھے کا گمان ہوتا ہے، اور بعض اوقات بات اس سے بھی کہیں آگے بڑھ جاتی ہے[۵]۔

---

[۱] دھلی میں اردو شاعری کا تہذیبی اور فکری پس منظر ص۴۷، [۲] ۴۷۵ ج ۱، [۳] خلجی خاندان ص۲۱۳
[۴] تذکرہ شعرائے اردو۔ ص۱۰۱، [۵] ۵۰۳ ج ۵،

"طلسم الفردج" کے ساتویں باغ میں جو نازنینیں ہیں ان میں آپس میں اس بات پر جھگڑا ہوتا ہے کہ ہر ایک چاہتی ہے کہ اول وہ شاہزادے کے ساتھ ہمبستر ہوئے۱؎ یہی صورتِ حال "میخانہ ہوشربا" میں پیش آتی ہے۲؎، "باغ ابر سیاہ" میں صاحبقرانِ اصغر اپنی ہوس پرستی کا بے شرمی کے ساتھ اظہار کرتا ہے۳؎۔ ان مقامات پر صاحبقرانوں کی حالت اس بھوکے شیر کی سی ہے جس کے روبرو بہت سے ہرن خود آ گئے ہوں، اور وہ کبھی اس پر جھپٹتا ہے اور کبھی اس پر، ایک اقتباس ملاحظہ ہو جس سے شاہزادوں کی ہوس پرستی کا اندازہ ہو گا:-

> "جب آدھی رات گذری یک بیک دردِ فتق ایسا عارض ہوا کہ کسی پہلو قرار نہ تھا آخر مکان سے گھبرا کر باہر تشریف لایا دیکھا کہ ایک خواص دروازہ کے پاس سوتی ہے اس کے پاس جاکر ہم خواب ہوا اس سے اور زیادہ درد ہوا اور ایک خواص اتفاقاً کسی کام کو گئی تھی اس سے زبردستی مرتکب فعلِ بد کا ہوا اس نے ایسا شور و غل مچایا کہ تمام خواصیں جاگ اٹھیں محل میں ایک ہجوم خواصوں کا ہو گیا اور شہزادے کو اس کثرت سے خواہش تھی کہ مطلق خبر نہ ہوئی، ہنوز ایک سے فارغ نہ ہوا کہ دوسری کو پکڑا اور کسی طرح سکون نہ ہوا اور نہ درد میں تخفیف ہوئی۔۔۔۔ آخر شاہزادہ ملکہ ناہید طلعت سے ہم بغل ہوا۔"۴؎

داستان نگار نے شاہزادوں کی اس کیفیت کو طلسمی اثر سے تعبیر کیا ہے کبھی کوئی خاص شراب پینے سے اس طرح کی حالت ہو جاتی ہے اور کبھی کسی قصر میں داخل ہونے سے شہوانی خواہش بڑھ جاتی ہے، غرضکہ ہر طلسم میں شاہزادوں کے لیے کئی کئی دار العیش موجود ہیں، تمام نازنینانِ طلسم اس پر حلال ہوتی ہیں۔ وہ صرف اس کی تفریح کا سامان ہیں، وہ بر سوں اس طلسم کشا کی

۱؎ ۳۱۳ ج ۱، ۲؎ ۳۵۰ ج ۲، ۳؎ ۵۷۰ ج ۵، ۴؎ ۸۴۴ ج ۲، ۱،

منتظر رہتی ہیں۔ طلسم کشا کے آتے ہی وہ خود کو اس کے حضور میں پیش کر دیتی ہیں اور اسے اپنی خوش بختی خیال کرتی ہیں۔ طلسم کشا اپنی ملکیت سمجھ کر انھیں اپنے کام میں لاتا ہے۔ بہت کم ایسا ہوا ہے کہ شاہزادے اپنی ان حرکاتِ مجنونانہ پر منفعل ہوئے ہوں۔ اگر احساس شرمندگی ہوتا بھی ہے تو داستان نگار یہ کہہ کر اس کی شرمندگی دور کر دیتا ہے کہ اس میں تمہارا قصور نہیں، یہ تو تاثیراتِ طلسم ہیں یا یہ طلسم تو محض تمہارے عیش کی خاطر تشکیل دیا گیا ہے۔ "باغ ارسیا" میں جب بے شمار نازنینیں صاحبقران کو نظر آئیں — تو صاحبقران اصغر کا دل بے اختیار ان سے صحبت کرنے کو چاہنے لگا اور پھر وہ تمام پری زادوں سے مباشرت کرتا ہے "مگر بار بار اپنی حرکات مجنونانہ"، افعال شیطانی پر نفریں کرتا تھا، صاحبقران کو جب کوئی پری منفعل دیکھتی تو کہتی "ناحق نادم ہو یہ تمام حرکات تاثیرات طلسم سے تصور فرمائیے"۔[1]

شاہزادوں کی ہوس پرستی اور شہوانی خواہش اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ وہ ادب ولحاظ بھی بھول جاتے ہیں، کنیزانِ محل کے روبرو اپنی معشوقہ دلآرام کے ساتھ بازار بوس وکنار گرم کرنا اور مختلط ہونا تو عام سی بات تھی لیکن بعض شاہزادے بزرگوں کا بھی لحاظ نہیں کرتے، مثلاً ایک شاہزادہ اپنی خوش دامن سے کہتا ہے:۔

> "اے مادر مہربان میں نے عشوۂ مشکیں مو دختر جمشید کی تم سے اور اکثر لوگوں سے بارہا تعریف سنی ہے بالفعل وہ نازنین کہاں ہے، اور اب تک اس کو میرے پاس کیوں نہ لائے، حالانکہ جمشید اپنے ناموس کو ہمراہ نہیں لے گیا اور وہ نازنین بموجب ارشاد لوح کے میرا حق ومال ہے"،

جواب میں ملکہ معاد شاہزادے سے کہتی ہے:۔

> "اے شاہزادے باوجود اس قدر نازنینان صاحب جمال کے

---

[1] ۵ ج ۵۰۲-۳-۴

ابھی ہوس باقی ہے"

ایک اور بزرگ جو وہاں موجود تھے انھوں نے کہا :۔

"اے شہریار تم کو شرم نہیں آتی کہ دختر سعاد تمہارے حبالۂ نکاح
میں ہے اور پھر تم چاہتے ہو کہ یہ دوسری نازنیں کا واسطہ ہو[1]"

لیکن خوش دامن کا کسی دوسری نازنیں کے لئے واسطہ بننا باعثِ حسد یا عیب کی بات نہیں سمجھی جاتی، محل کی بزرگ عورتیں بادشاہوں کے مزاج سے واقف ہوتی تھیں کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ بادشاہ کبھی ایک عورت پر قناعت نہیں کرتا۔ اگر کسی عورت کے دل میں یہ خیال پیدا بھی ہوتا ہے تو دوسری اسے سمجھا دیتی ہے کہ

"اے خواہر تم نے نہیں سنا کہ بادشاہ ایک کنیز پر اکتفا نہیں
کرتے، ان کو بہت سی کنیزیں چاہیئں اس صورت میں کیا
مضائقہ ہے کہ میں اور تم دونوں باہم اس کی کنیزی میں ہوئے[2]"

یہی وجہ ہے کہ جب ملکہ سحاد شاہزادہ کو اپنی بات سے منفعل ہوتے ہوئے دیکھتی ہے تو اٹھ کر اس کے تصدق ہوتی ہے اور کہتی ہے :۔

"اے شہریار قربانت شوم، تم کیوں منفعل ہوتے ہو البتہ وہ دختر
تمہارا مال وحق ہے ۔۔۔ میں نے ازراہ خوش طبعی کے یہ عرض
کیا تھا"[3]

اسی طرح جب صاحبقران اصغر یکے بعد دیگرے پندرہ کنیزوں سے ہم صحبت ہونے کے بعد اپنی خوش دامن کے پاس جاتا ہے تو شرم سے سر جھکا لیتا ہے ملکہ شاہزادہ کو شرمندہ دیکھ کر کہتی ہے :۔

"آخر ملکہ روشن نظر نے خندہ رسا کیا اور بار دگر اٹھ کے شاہزادے
کے تصدق ہوئی اور کہا اے عالی قدر قاعدہ ہے کہ اول آزمائش
کے واسطے ایک کنیز دیتے ہیں۔ جناب عالی نے مجھ سے پندرہ
کنیزیں لیں اور اپنے تصرف میں لائے[4]"

---

[1] ۴۴۶ ج۱، [2] ۴۴۳ ج۱، [3] ۴۴۶ ج۱، [4] ۵۰۷ ج۵،

صرف شاہزادے ہی دادِ عیش دیتے ہوئے نظر نہیں آتے بلکہ ان کے رفیق بھی ہوس پرستی میں ان کے پہلو بہ پہلو چلتے ھیں، ان کی وضاحت کے لیے ابوالحسن جوہر کی ایک ہی مثال کافی ہو گی، جس کے بارے میں پروفیسر گیان چند کا کہنا ھے کہ "بوستانِ خیال" میں اس سے زیادہ فحش مقام کوئی نہیں"[1]

صاحبقرانِ اکبر کے عیش و آرام کی انتہا اس مقام پر ہے جب وہ مرحلاتِ عشق طے کر لیتے ھیں، تمام مطلوبان ان کے پہلو میں آجاتی ہیں اور اس وقت بجز عیش و عشرت کے کوئی کام نہیں رہتا، دہ مہینوں تک حرم سرا سے باہر نہیں آتا۔ یہی حال ہندوستان کے بعض سلاطین کا تھا۔

بادشاہ کبھی بوڑھا نہیں ہوتا، ستر اسّی سال کا ضعیف بادشاہ بھی کمسن نازنین کی خواہش کرتا ہے اور کیونکہ وہ صاحبِ اقتدار ہے اس لیے ہر شے کو خواہ بجبر خواہ برضا حاصل کر لیتا ہے، بادشاہ کا اقتدار اور اختیار اسے ہمیشہ جوان رکھتا ہے۔ سلطان مہدی پر دادا بن جانے کے بعد بھی مے خواری اور عشق بازی سے باز نہیں آتے[2] اسی طرح سمطول نے جب مرجان شاہ کی دختر ملکہ گوہر باد کے لیے اپنا پیام بھیجا تو مرجان شاہ نے قاصد سے کہا:-

"اے مرد معلوم ہوتا ہے کہ در ہیولا سمطول شاہ کے دماغ میں خلل آگیا ہے سبحان اللہ بایں عمر پیرانہ سالی وہ ارادہ کتخدائی رکھتا ہے[3]"

یہ بوڑھے بادشاہ اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے جنگ بھی کرتے ھیں[4]۔ "بوستان" میں ایک بوڑھے عیش دوست بادشاہ کی تصویر اس طرح پیش کی گئی ہے :-

"دیکھا کہ شہ نشین میں تخت پر ایک مرد پیر محاسن سفید لباس زری پہنے، زلفوں میں خضاب کیے، دانتوں میں مسّی ملے دستار زنگین بر سر، عطر مالیدہ، سرمہ آنکھوں میں، مالائے مروارید گلے میں، انگشتر بہائے جواہر قیمتی ہاتھ میں، پاجامہ کمخواب پیش

---

[1] اردو کی نثری داستانیں، ص ۶۵۱، [2] ایضاً، ۱۴ ج ۱، [3] ایضاً ۵۲ ج ۳، [4] ایضاً ۴۲۸ ج ۴،

قیمت سرخ رنگ ہوس خیز، پاؤں میں غازہ ملے ہوئے بالباس
تنگ و چست مثل شاہد بازوں کے بیٹھا ہے اور اس کے
پہلو میں ایک محبوبہ بیٹھی ہے کہ حسن و جمال میں ۔ بے مثل ہے
ہر دم جام شراب اس پیر کو دیتی ہے ۔ وہ بجائے گزک
اس کا بوسہ لیتا ہے اور کنیزان ماہر و گرد و پیش کھڑی ہیں[۱]

گذشتہ صفحات میں عیاشی اور ہوس ناکی کے سلسلے میں جو مثالیں پیش کیگئی ہیں ان میں سے بیشتر کا تعلق اہل اسلام سے ہے، کفار کی ہوسناکیوں اور بدکاریوں کا جہاں بیان آیا ہے اسے پڑھ کر گھن آنے لگتی ہے اور ان کرداروں سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے ۔ کفار کی جماعت میں بدکاری کے معاملے میں جو نام سر فہرست ہیں وہ ضار منکوس، جنگم جادو، خناز جادو، اور جمشید کے ھیں، ان لوگوں کی ہوس ناکی کا بیان بڑے گھناؤنے انداز میں کیا گیا ہے، جنسی آسودگی کے لیئے یہ لوگ آپس ہی میں مختلط ہوتے ہوئے دکھائے گئے ھیں۔ خناز جادو اکثر جمشید سے آسودہ ہوتا ہے ۔ یہی حال ضار منکوس کا ہے، جگہ جگہ اس کی ہوس ناکی کو بڑے گھٹیا انداز میں پیش کیا گیا ہے، کفار میں ضار منکوس کا ہم پلہ جنگم جادو ہے جو سات سو برس تک غار کوہ میں لتشکل مردہ یعنی حبس نفس میں مبتلا رہا اور جب غار سے باہر نکلا تو اسے سوائے عیش و مباشرت کے دوسرا کام نہ تھا، کبھی کبھی ضار منکوس بھی اس کی آسودگی کا ذریعہ بنتا تھا[۲]

مذہب عقلا میں نفس عورت خاص مرد کی صحبت کے واسطے
خلق ہوئی ہے کچھ خالہ اور خواہر میں خصوصیت نہیں ہے[۳]

اپنے استاد کی اس بات پر عمل کرتے ہوئے جمشید نے اپنی سگی خالہ سے فعل بد کیا[۴] اور اپنی شیر شریک خواہر سے عقد کا ارادہ کیا[۵] جمشید کی طرح مظلم جادو اور اس کی خواہر تیرہ بخت فعلِ شنیع میں مشغول نظر آتے ھیں[۶]، غرض کفار کو جگہ جگہ افعالِ بدترین میں مبتلا دکھایا ہے، طرح طرح سے ان کے

---

۱ ص ۲۲۵ ج ۱، ۲ ص ۵۲۷ - ۵۲۸ ج ۵، ۳ ص ۱۸ ج ۱، ۴ ص ۱۷ ج ۳، ۵ ص ۱۸ ج ۳، ۶ ص ۱۰۶ ج ۲،

ذلت و فضیحت کی ہے بعض مقامات پر مصنف حد سے زیادہ تجاوز کر گیا ہے اور اس کے بیان پر بازاری سطح کی فحاشی کا گمان ہوتا ہے، غالباً ایسے ہی "بوستان خیال" کے حصوں نے پروفیسر گیان چند کو داستان نگار سے متنفر کر دیا ہے مثال کے طور پر مہتر وفا نے بت پرست عورتوں کے ساتھ نسر مراد بخش بت خانہ میں جو گھٹیا درجہ کا مذاق کیا[1]۔ یا کفار کے ان شہروں کا بیان جن سے معزالدین کا گذر ہوتا ہے جن میں اہل شہر کسی نہ کسی فعلِ بد میں مبتلا دکھائی دیتے ہیں، شہر مخنثان میں جنسی آسودگی کے لئے کبھی ایک مرد عورت بن جاتا ہے، اور کبھی دوسرا اور آپس میں مختلط ہوتے ہیں[2]۔ ضار منکوس کی وہ ذلت بھی قابل تنفر ہے جب ایک قبیلہ کا سردار اسے اغلام کے جرم میں سزا دیتا ہے[3]

معاشرہ کی برائیوں کے سلسلے میں جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے اس سے مختصراً اس عہد کی ایک ایسی تصویر ابھر کر سامنے آجاتی ہے جس سے لوگوں کے مزاج اور رجحان کا بہت کچھ اندازہ ہو جاتا ہے، عیش دوست اور ہوس پرست افراد سے وابستہ اس عہد میں تین بنیادی چیزیں ایسی نظر آتی ہیں جن پر تمام برائیوں کے محل تعمیر ہوئے، اور جن کا شکار تقریباً ہر ادنیٰ و اعلیٰ دکھائی دیتا ہے، شراب، طوائف یعنی عورت اور امرد۔ ان کا ضمناً ذکر اوپر آچکا ہے لیکن یہاں کچھ وضاحت کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

شراب نوشی

شراب کا استعمال قدیم زمانہ سے تقریباً تمام ممالک میں رائج ہے، خصوصاً ٹھنڈے ملکوں میں اس کا پینا ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ شراب کے پینے کا جواز کبھی زندگی کی تکالیف سے فرار حاصل کرنا ہوتا ہے اور کبھی محض سرمستی و سرور کی کیفیت طاری کرنے کے لیے اسے استعمال کرتے ہیں۔ بعض طبقوں میں مہمان کی تواضع کے لیے شراب کا پیش کرنا لازمی سمجھا جاتا ہے۔

---

[1] ۱۸۹، ج ۱، [2] ۱۳۷، ج ۲، [3] ۳۹۵ ج ۳،

شراب پینے کے بعد آدمی اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے، اس لئے اکثر مذاہب میں اس سے پرہیز کرنے کی ہدایت کی گئی ہے، مسلمانوں کو سختی سے منع کیا گیا ہے کہ شراب سے پرہیز کیا کریں۔ مسلمان ہونے سے قبل اہلِ عرب حد سے زیادہ شراب نوش تھے۔ لوگوں کے گھروں میں شراب کے گھڑے بھرے رکھے رہتے تھے۔ جب حضرت محمدؐ نے شراب سے پرہیز کے سلسلے میں حکمِ الٰہی سنایا تو مسلموں نے شراب کے گھڑوں کو توڑ دیا۔ اور شراب کو سڑکوں پر بہا دیا۔ رسول اللہؐ کی حیات میں اور ان کے وصال سے کچھ عرصہ بعد تک مسلمانوں نے سختی سے اس پر عمل کیا اور شراب کو برا سمجھتے رہے۔ لیکن جیسے جیسے اسلام کی عمر بڑھتی گئی احکاماتِ الٰہیہ پر اثر کم ہوتا گیا اور خواہشاتِ دنیاوی بڑھتی گئیں جب خلفائے اسلام نے قیصر و کسریٰ کے درباروں کی نقل شروع کر دی تو ساتھ ہی ساتھ ان کے رہن سہن کے طریقے بھی اختیار کرنے لگے، رقص و نغمہ اور شراب نوشی کا شغل بعض افراد نے شروع کیا۔ یزید بن امیر معاویہؓ کے بارے میں جو حضرت امیر معاویہؓ کے بعد مسندِ خلافت پر بیٹھا، مورخین لکھتے ہیں کہ یزید ہی کے بد نمونے نے مسلمانوں کو گانے بجانے اور شراب پینے کی بھی ترغیب دی۔ ورنہ اس سے پہلے عالمِ اسلام ان خرابیوں سے بالکل پاک [1] تھا، اور رفتہ رفتہ یہ خرابیاں سلطنت کی حدود کے ساتھ بڑھتی چلی گئیں۔ لوگوں نے بت پرستی سے توبہ تو کر لی لیکن شراب وغیرہ کو حرام نہ کہہ سکے، جنھیں یہ احساس ہوا کہ شراب مسلمان کے لئے حرام ہے، انھوں نے اسے حلال کرنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا:۔

> "چالاک ایرانی لوگوں کا اس مسئلے کے سلسلے میں اپنا ایک الگ ہی طریقہ تھا وہ شراب کو اتنا ابال لیتے تھے کہ اس کا مزہ بدل جاتا تھا اور یہ میٹھی ہو جاتی تھی لیکن اس میں نشہ باقی رہتا تھا ان کا خیال تھا کہ اس کے بعد اسلامی قانون کے مطابق یہ حرام

---

[1] تاریخ اسلام جلد دوم۔ ص ۹۶

نہیں رہتی، چوں کہ مزے کی تبدیلی کے ساتھ ہی اس کا نام بھی بدل جاتا ہے[1]

ہندوستان میں جو مسلمان آئے وہ بادہ نوشی کے عادی تھے اور پھر یہاں کا ماحول بھی ایسا نہ تھا کہ شراب سے پرہیز کرتے، یہاں پہلے ہی سے میخانے آباد تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ قرون وسطیٰ کے سلاطین کی سب سے بڑی برائی شراب نوشی بن گئی۔ بالآخر میخانوں اور مے خواروں کی کثرت اس قدر بڑھی کہ علاءالدین خلجی نے اپنے عہد حکومت میں شراب کشید کرنے والوں، شراب خوروں، قمار بازوں، بھنگ اور تاڑی فروخت کرنے والوں، شراب خوروں کو پایۂ تخت سے جلا وطن کر دیا۔ شراب کے استعمال اور فروخت پر سختی کے ساتھ پابندی لگا دی۔ محل کے تمام خوب صورت جام اور شراب کے برتن توڑ وا دئے۔ سونے اور چاندی کے برتنوں کے سکے ڈھلوا دئے، سڑکوں پر اس قدر شراب بہائی گئی کہ برسات کے موسم کی طرح کیچڑ ہو گئی[2] چوری چھپے شراب بیچنے والوں کو زمین دوز قید خانوں میں قید کر دیا اس کے باوجود بھی مکمل طور سے شراب نوشی ختم نہ ہو سکی، جو شراب پینے کے عادی تھے وہ کسی نہ کسی طرح سے شراب حاصل کر لیتے تھے، مجبوراً علاءالدین کو تھوڑی مقدار میں صرف گھروں کے اندر شراب پینے کی اجازت دینی پڑی۔ یہ پابندی صرف اسی کے عہد تک تھی۔ اس کی موت کے بعد اس کے جانشینوں نے محل کو پھر سے خانہ بنا دیا، مبارک شاہ خلجی کا شغل ہی یہ تھا۔

مغلیہ دور تک پہونچتے پہونچتے شراب نوشی عام ہو گئی تھی، اورنگ زیب کے علاوہ سبھی مغل بادشاہ غرق مے ناب نظر آتے ہیں، بابر کی بیماری کا ایک سبب شراب نوشی بھی تھی، وہ حد سے زیادہ نشہ آور چیزوں کا شوقین تھا[3]۔ اکبر شراب نوشی کے معاملہ میں اعتدال پسند تھا وہ چاہتا تھا کہ شراب کو صرف

---

[1] ہندوستانی معاشرہ عہد وسطیٰ میں۔ ص ۲۴۸، [2] خلجی خاندان۔ ص ۱۹۳،

[3] مغلیہ سلطنت کا عروج و زوال۔ ص ۱۷،

فوراً تا ایک خاص مقدار میں استعمال کیا جائے۔ اسی لئے اس نے سرکاری افسران کی نگرانی میں سرکاری شراب خانے کھلوائے، شراب کی قیمتیں مقرر کر دیں لیکن اکبر اپنی اولاد کی شراب نوشی میں کمی نہ لا سکا۔ مراد اور دانیال کی موت کثرت شراب نوشی کے سبب ہوئی۔ جہانگیر بھی بلا کا شراب نوش تھا۔ جس کا ثبوت اس کی چھوڑی ہوئی یادگاروں پر منقش جام و صراحی بھی ہیں۔ اپنی تصنیف میں جگہ جگہ شراب کا ذکر کرتا ہے، لکھتا ہے:۔

"جب میں اس تخت پر بیٹھتا ہوں تو دونوں حوضوں کو شراب سے پر کر دیا جاتا ہے"[۱]

"حوض میں شراب بھروا کر حکم دیا کہ حاضرین جتنی چاہیں پئیں"[۲]

شاہ جہاں کو جو شراب سے پرہیز کرتا تھا جہانگیر ہی نے شراب پینے کی ترغیب دی۔ خرم یعنی شاہ جہاں کے جشن سالگرہ کا بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے

"جمعہ ۲۵ ماہ دی کو خرم بیٹے کی مجلس وزن منعقد ہوئی اس وقت تک اس کی عمر ۲۴ سال کی ہوئی ہے اور خدا کے فضل و کرم سے صاحب اولاد ہے مگر اس نے آج تک شراب نہیں پی، اس محفل میں میں نے اس سے کہا کہ بیٹے تو اب صاحب اولاد ہے اور سلطنت کی رسم ہے کہ بادشاہ اور شاہزادے شراب پیتے آئے ہیں اس لئے آج اس جشن کی خوشی میں میں تجھے بھی شراب پلاتا ہوں اور اجازت دیتا ہوں کہ جشن کے موقعوں پر نوروز اور بڑی بڑی محفلوں میں شراب پی لیا کرو لیکن اعتدال کے ساتھ پیا کرو تاکہ ہوش و حواس قائم رہیں۔ الغرض اسے شراب پلائی گئی"[۳]۔

۱ے تزک جہانگیری۔ ص ۹۷، ۲ے ایضاً ۱۰۱، ۳ے تزک جہانگیری۔ ص ...

جہانگیر کی ہدایت کے باوجود شاہ جہاں شراب کا عادی نہ بن سکا بلکہ تخت نشینی کے بعد اس نے ترک بھی کر دی تھی، اورنگ زیب بھی شراب نوشی کے عیب سے پاک تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے زمانے میں امرار بھی شراب نوشی کم کرتے تھے۔ برنیر نے اس عہد کے بارے میں لکھا ہے کہ شراب جو فرنگستان میں کھانے کا بڑا جزو سمجھی جاتی ہے دہلی کی کسی دکان میں نہیں ملتی لیکن اورنگ زیب کے بعد عہد زوال کے ساتھ دور شراب بھی شروع ہو گیا اور تمام بادشاہ اور امیر ساغر و صراحی میں ڈھل گئے۔ جہاندار شاہ کے بارے میں مشہور ہے کہ جب وہ لال کنور کے ساتھ شراب پینے ایک شراب بیچنے والی کے پاس جاتا تو کبھی کبھی عالم مدہوشی میں رتھ ہی میں پڑا رہ جاتا، خدام محل تک پہنچاتے، پھر فرخ سیر، محمد شاہ وغیرہ سب ہی شراب نوشی کا حد سے زیادہ شوق رکھتے تھے امرار بھی بادشاہوں کے نقش قدم پر چلتے تھے، ان کے یہاں بھی جام کھنکتے تھے، شراب بہتی ہے، اس عہد کی حالت کا اندازہ اس دور کی اردو شاعری سے ہوتا ہے، بادشاہوں اور امرار کی اخلاقی پستی پر آنسو بہاتے ہوئے بہت سے شعرار نے شہر آشوب لکھے اور اپنے زمانہ کی تصویر پیش کی۔ میر نے یوں نظم کیا ہے ؎

لال خیمہ جو ہے سپہر اساس ۔۔۔ پالیں ہیں رنڈیوں کی اس کے پاس
ہے زنا و شراب بے وسواس ۔۔۔ رعب کر لیجئے یہیں سے قیاس

قصہ کوتاہ رئیس ہے عیاش

"بوستان" میں بھی سبھی مسلمان اور کافر بادشاہ اور شاہزادے مے خوار ہیں۔ خواہ وہ مہدی ہوں یا ان کی اولاد قائم، اسمٰعیل، یا صاحبقران اکبر معزالدین ہوں، کبھی کبھی اتنا ضرور لحاظ رکھا جاتا ہے۔ کہ شراب کو کوئی خوبصورت سا نام دے دیتے ھیں یا طلسمی شراب کہہ کر اپنے لئے حلال کر لیتے ہیں۔ لیکن اس میں بھی نشہ اسی شراب کا سا ہے بلکہ اس سے بھی تیز اور زود اثر جس کا ایک جام پینے کے بعد شہوانی خواہش پریشان کرتی ہے اور ہوس جسم نازنیں مانگنے لگتی ہے۔ شربتِ طلسم کے یہ اثرات بیشتر مقامات پر شاہزادوں کی حرکات سے

ظاہر ہوئے ہیں۔ یوں تو تمام شاہزادے شرابِ ناب بغیر کسی ہچکچاہٹ کے پیتے ہیں۔ اور بے خودی و سرشاری کے عالم میں نازنینانِ زہرہ جبینوں کے لب و رخسار کو بطور گزک استعمال کرتے ہیں۔ لیکن اگر کبھی شراب کے حرام ہونے کا خیال آجاتا ہے تو بات اس طرح بیان کر دی جاتی ہے:۔

"بمجرد اس حکمِ ملکہ فوراً کشتی و جام و صراحی لیئے ساقی سیم بدن حاضر ہوئے اور ناچ شروع ہوگیا اور اس ماہ لقا نے جام جواہر نگار خود اپنے دستِ نگاریں سے اٹھالیا اور صراحی سے لبریز کر کے شاہزادے کو نہایت ناز و انداز سے مسکرا کر دیا، صاحبقرانِ اکبر فلک قدر نے جام دستِ حق پرست میں لے لیا اور اس وقت خیال میں آیا کہ شراب ناجائز مشروع کا پینا مناسب نہیں ہے یکایک اس نازنیں نے کہا اے شاہزادہ عالی وقار حضور کو اس جام کو نوش فرمانے میں کیوں مضائقہ ہوا، یہ وہی شراب رمانی ہے جو حضور نے اکثر مقاماتِ طلسم میں نوش فرمائی ہے۔ اس باغ میں ہر وقت موجود رہتی ہے وہ شراب نہیں جس کا حضور خیال فرماتے ہیں"[1]۔

اور جب شبہ دور ہو جاتا ہے تو ساقیانِ سیمیں ساق کے دستِ حنائی سے بے غل و غش و بے اندیشہ شراب کے جام پر جام نوش کیئے جاتے ہیں، ماحول پر بیخودی اور مدہوشی چھا جاتی ہے۔ ہر شے مست و سرشار نظر آتی ہے، نہ نظامِ سلطنت کا خیال آتا ہے، نہ نماز کی فکر دل میں رہتی ہے:۔

"شاہزادہ عالی وقار مکانِ تخلیہ میں خواتین شمع رخسار و ماہرویان آفت روزگار سے بخوشی و خاطر عیش و عشرت میں مشغول تھا ہر ایک نازنیں مہ جبیں اپنے دستِ حنائی سے جامہائے شرابِ ناب پلا رہی تھی اور شاہزادہ عالی جاہ نشہ شراب

---

[1] ۶۱ ج ۹ م، [2] ۱۴۲ ج ۹ م

میں بے خود و مدہوش تھا، دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہیں تھی“[۱]

جب شراب کو اس طرح جائز قرار دے دیا گیا تو ضروری ہے کہ دوسری ممنوعات بھی جائز ہو جائیں، شراب کے ساتھ عورت کا جائز ہونا لازمی تھا۔

”القصہ تمام شب صاحبقران والا قدر نے جام یاقوت میں شراب پی اور طناز و راحت ناز وغیرہ نازنینوں سے بے غل و غش نوبت بنوبت مباشرت کی“[۲]

غرضکہ ”بوستان“ کی ہر محفل میں جامہائے شراب نازنینان گل اندام کے ہاتھوں میں گردش کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ صرف شاہزادے ہی شراب کا شوق نہیں فرماتے بلکہ شاہزادیاں بھی اپنی تشنہ لبی کو شراب سے دور کرتی ہیں، شاہزادیوں کا شراب پینا برا نہیں سمجھا جاتا، وہ بھی کبھی شاہزادوں کے ساتھ اور کبھی اپنے محل میں اپنی ہمسنوں کے ساتھ محفلِ جام و شراب آراستہ کرتی ہیں[۳]۔

”ملکہ نو بہار گلشن افروز خواتین عالی وقار کو اپنے دست نازک و رنگین سے جامِ مے ارغواں دے رہی تھیں اور شرابِ ناب خواتین کو پلا رہی تھیں“[۴]۔

شراب کا استعمال میدانِ جنگ میں بھی ہوتا تھا، فوجی نظام کے ذیل میں بیان کیا گیا ہے کہ جب کسی سے مقابلہ کے لئے کوئی پہلوان جاتا تھا تو بادشاہ بدستِ خود اسے جام شراب پیش کرتا تھا۔ کفار کے پہلوان زور و قوت بڑھانے کے لئے شراب پیتے تھے، تاکہ مستی میں مقابل سے اچھی طرح مقابلہ کر سکیں۔

”ادھر لشکر بکران شاہ خارجی سے بلقاس ایک جامِ شراب ارغوانی نوش کر کے تلخوم کے مقابلہ کو چلا“[۵]۔

شراب کے علاوہ دوسری نشہ آور منشیات بھی مستعمل ہیں لیکن ان کا استعمال شراب کے مقابلہ میں بہت کم ہے، افیون، چرس، بھانگ وغیرہ کا ذکر کیا جا چکا ہے ان کے علاوہ ایسا قہوہ بھی موجود ہے جس کے پینے سے شراب کی سی

۱ص ۱۴۲ ج ۹ م، ۲ص ۳۴۶ ج ۵، ۳ص ۱۴۲ ج ۱، ۴ص ۴۵۳ ج ۹ م، ۵ص ۲۳۰ ج ۹ م،

کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

"ملکہ نے مستی طلب کر کے ملی اور قہوہ سلطان کے واسطے تیار کیا اور کہا اس قہوہ کا پیالہ پی اور لب کا بوسہ لے کہ اس کے اثر میں نے مستی ملی ہے، اور اس قہوہ سے شراب کی سی کیفیت ہو گی ہے۔"

المختصر شراب کا استعمال مسلمان اور کفار شاہزادوں نے ہر مقام پر کیا ہے کفار کے لئے تو یہ جائز ہی ہے، مسلمانوں نے بڑی خوبصورتی سے جائز کر لیا ہے

طوائف پسندی

تخلیق انسانی کے وقت کچھ ایسی خواہشات بھی انسان کے دل میں پیدا کر دی گئیں تھیں جن کی تکمیل کے بغیر وہ سکون و فرحت محسوس نہیں کرتا، ان میں سے ایک بڑی اور اہم خواہش عورت کی چاہت حاصل کرنا رہی ہے۔ ہر مرد اس فطری جذبہ کی تسکین کے حصول کے لئے کسی نہ کسی طرح کوشاں رہتا ہے، لیکن ابتدائے زمانہ ہی میں سماج کی تشکیل کے وقت مرد اور عورت کے آزادانہ اختلاط پر پابندیاں عائد کر دی گئی۔ تاکہ حیوان اور انسان متمائز ہو سکیں۔ سماج نے قانونی اور جائز مرد، عورت کے جنسی اختلاط کو شادی کا نام دے دیا۔ یعنی ایک مرد اسی عورت سے جنسی آسودگی حاصل کر سکتا ہے جس سے اس نے شادی کی ہو یا قانونی طور پر اُسے ملی ہو۔ اس فطری جذبہ پر سماجی پابندی تھی، ایسی صورت میں آدمی کئی چیزوں سے محروم ہو گیا اور اسے اپنے جذبات پر جبر کرنا پڑا۔ یعنی شادی کے بعد جذبۂ عشق ختم ہو گیا۔ جنس مخالف کے ناز و ادا سے لطف اندوز ہونے کا دور شادی کے بعد نہ رہا، غرضکہ وہ اس پابندی سے اکتا کر گھر کی چہار دیواری سے باہر نکلا اور جائے سکون تلاش کی۔ انسان کہ جس نے خود ہی سماج کے اصول مرتب کئے تھے۔ خود ہی اپنی آسودگی کی خاطر ایک نئی راہ نکال لی اور

لے ۴۰۴ج ۱،

نتیجہ کے طور پر عورت کا ایک روپ طوائف بھی بن گیا۔

طوائف کی تشکیل کی وجہ محض لذت پرستی اور سماجی پابندی سے آزادی حاصل کرنا تھی اور طوائف کی جانب رجوع کرنے کے بعد مرد کے فطری جذبہ کو تسکین حاصل ہوئی، طوائف یا ایک غیر عورت نے جو نہ قانونی طور پر اُس کی ہے اور نہ صرف اُسی کی ہے اپنی دل داری اور دلربائی سے کچھ دیر کے لئے ہی سہی ان سماجی پابندیوں سے مرد کو نجات دلادی۔ طوائف کے یہاں نہ فکر معاش تھی نہ ذکر غم دنیا، نہ بچوں کی چیں پیں نہ بیوی کی جھک جھک، وہاں صرف رنگینی تھی، ناز و ادا تھا، جنسی آسودگی کا سامان تھا۔ پروفیسر محمد حسن نے طوائف کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :-

"طوائف افزائشِ نسل اور گھریلو زندگی کی تنظیم کا وسیلہ نہ تھی وہ گویا رومان کے اس جذبہ کی تسکین کرتی تھی جو عمرانی زندگی کی ذمہ داریوں سے آلودہ نہ تھا۔ طوائفوں کے ناز و ادا و غمزہ سے معمولاتِ زندگی کی بے کیفی اور یکسانیت میں رنگینی اور دلداری اور ہمہمہ پیدا ہو جاتا تھا۔ اور ذرا دیر کی یہ مستی، رنگینی اور دل داری رومان کے لئے ترسے ہوئے دلوں کو موہ لیتی تھی طوائفوں سے دل بستگی کی ایک خاص نوعیت ہوتی ہے کاروبارِ دل داری اس کا مشغلہ ہے اور جنسی جذبات کو مشتعل کرنا، رجھانا، پرچانا اس کے وسیلے ہیں[1]"۔

پیشتر کہا گیا کہ انسان نے اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے طرح طرح کے راستے اختیار کئے، مثلاً بادشاہوں اور دولت مند اشخاص نے اپنے محلوں میں عورتوں کو رکھ لیا، مندروں میں دیوداسیاں رکھی گئیں۔ عوام نے ایسا بازار بنا لیا جہاں سے یہ جنس خریدی جا سکے۔

گھر کی چہار دیواری سے باہر جنسی آسودگی حاصل کرنے کا رواج ہندوستان

---

[1] دھلی میں اردو شاعری کا تہذیبی اور فکری پس منظر۔ ص ۱۰۷،

میں قدیم زمانہ سے رائج ہے، قدیم زمانہ میں جنسی اختلاط کو خاص اہمیت حاصل تھی اس کا ثبوت اس عہد کی چھوڑی ہوئی نشانیوں میں موجود ہے۔ موہن جوداڑو میں ایک قدیم حمام ہے جس میں حوض کے گرد بہت سے کمرے بنے ہوئے ہیں، قدیم ترین حوالہ جات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حمام میں اپسرائیں یعنی بے پناہ حسین عورتیں رہا کرتی تھیں جو مردوں کو لبھاکر اپنے ساتھ شامل کر لیتی تھیں۔ یہ حسینائیں نغمہ ورقص میں بھی کمال رکھتی تھیں۔ ڈی۔ ڈی۔ کوسمبی نے ان اپسراؤں کے متعلق لکھا ہے کہ:۔

"اپسرائیں کسی شخص کو شادی کے ذریعہ خاوند بناکر مستقل ازدواجی زندگی بسر نہیں کر سکتی تھیں۔ اس سے اس عظیم حمام کے کمروں کی عجیب وغریب تعمیر کا راز حل ہوتا ہے یہ اس پوجا یا مذہبی رسم کا حصہ تھا کہ مرد نہ صرف یہ کہ مقدس پانی میں اشنان کرے بلکہ جس دیوی ماتا سے قلعہ منسوب تھا اس کی نمائندگی کرنے والی خادمان کے ساتھ مباشرت بھی کریں۔ یہ کوئی دور از کار بات نہیں۔ سومر اور بابل میں اشتر کے معابد اسی طرح کی رسوم رکھتے تھے جن میں سربرآوردہ خاندانوں کی لڑکیوں کو شریک ہونا پڑتا تھا۔ خود دیوی اشتر بیک وقت ایک ابدی دوشیزہ بھی تھی اور ایک فاحشہ بھی[1]"

اس حمام کی حالت بالکل طوائفوں کے بازار کی سی ہے جہاں ہر عورت بن سنور کر اپسرا نظر آتی ہے، اسی طرح مندروں میں دیوداسیاں جنسی آسودگی کا سبب بنتی تھیں۔ مندروں میں جنسی اختلاط کی آزادی ہوتی تھی۔

"مندروں میں ناچنے گانے والی دیوداسیاں رہنے لگیں، شیوجی کے مندروں میں یہ رسم عام تھی، ان آبرو باختہ عورتوں کے وجہ سے مندروں میں پجاریوں کی تعداد زیادہ سے زیادہ ہوجاتی ہے[2]"

کیونکہ مندروں میں دیوداسیوں کا رہنا اور برہنہ ناچ کرنا مذہبی رسموں سے

---

[1] قدیم ہندوستان کی ثقافت اور تہذیب۔ ص ۹۷، [2] اتر پردیش کے لوک گیت۔ ص ۲۵۱،

میں شامل تھا اس لیے مسلمانوں کی آمد کے بعد بھی یہ بالکل ختم نہیں ہو سکا۔ برنیئر نے اپنے سفرنامہ میں مندروں کے اندر ہونے والی بے حیائی کا ذکر کیا ہے۔ جگن ناتھ کے رتھ کے جلوس کے متعلق لکھا ہے کہ رتھ کے سامنے بلکہ خاص مندر میں بھی میلہ کے دنوں میں ناچ کے وقت کسبیاں اپنے بدن کی مختلف حرکات سے نہایت بے شرمی اور بے حجابی کا مظاہرہ کرتی ہیں اور برہمن ان لغویات کو بالکل اپنے ملک کے مذہب کے مطابق خیال کرتے ہیں، یہ وہ ناچ تھا جس میں بنگالی رنڈیوں کو بے تکلفانہ جلسوں میں بالکل برہنہ نچا کر خوش ہوتے تھے۔ برنیئر نے سادھوؤں اور کسبیوں کے تعلق پر مزید لکھا ہے کہ میں ایسی بہت سی خوبصورت کسبیوں کو جانتا ہوں جو باوجود پیشہ کے نہایت محتاط ہیں یعنی ہر کسی کے پاس نہیں چلی جاتیں، چنانچہ ان عورتوں کو کئی اہلِ اسلام اور عیسائی اور بعض پردیسی قوم کے بت پرستوں نے بہت کچھ دولت اور روپیہ دینا چاہا لیکن انھوں نے بایں عذر قبول نہیں کیا کہ ہم نے اپنے تئیں دیوتاؤں اور برہمنوں اور ان سادھوؤں پر جو ننگے دھونی رمائے اور جٹا دھارن کیے مندر کے چاروں طرف بیٹھے ہیں وقف کیا ہے[1]،،

مسلمان جو ہندوستان میں آکر کچھ زیادہ ہی لذت پرست اور عیش دوست ہو گئے تھے بھلا کیسے اس پیشہ پر پابندی عائد کرتے بلکہ خود انھوں نے اس میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ طوائفوں کے لیے الگ باقاعدہ بازار بننے لگا۔ طوائفوں کی رسائی دربار شاہی تک ہونے لگی۔ درباروں میں ان کا رقص ہوتا، نغمے سنے جاتے، امرا اپنے گھروں پر ان کے لئے محفلیں آراستہ کرتے، کوئی بزم یا جشن ایسا نہ ہوتا تھا جس میں طوائفیں شرکت نہ کرتی ہوں، ہر موقع پر انھیں ناچ گانے کے لئے بلایا جاتا تھا۔ باقاعدہ لوگ انھیں ملازم رکھتے تھے، بڑے شہروں میں ان کی تعداد ہزاروں تک پہونچ گئی تھی، فرانسیسی سیاح تھیونز نے اپنے زمانہ سیاحت میں گولکنڈہ کی طوائفوں کی تعداد بیس ہزار بتائی ہے[2]۔ محمد شاہ کے زمانہ میں خاصی بڑی تعداد میں طوائفیں دلی میں موجود تھیں، طوائفوں کی ایک

---

[1] سفرنامہ برنیر صا۲۹۱ – ۲۹۷، [2] بحوالہ اردو شاعری کا سماجی پس منظر۔ ص ۱۲۰،

طویل فہرست تو مرقع دہلی میں موجود ہے خود بادشاہ طوائفوں میں دلچسپی لیتا تھا نوربائی اس کے دربار کی مشہور طوائف تھی، مرقع دہلی میں اس کے متعلق لکھا ہے کہ بڑے بڑے امرا اس کے دیدار و ملاقات کی تمنا دل میں رکھتے ہیں، اس کی محبت کا نشہ تو خانہ خرابی ہے جو بھی اس کا ذوق رکھتا ہے اور اس کی آشنائی کا نشہ جس کے سر پر سوار ہوتا ہے وہ بے تابانہ اپنی دولت کو گرد باد کی طرح اڑا دیتا ہے، نہ جانے کتنے لوگوں نے اپنی ثروت کو اس کے قدموں پر نچھاور کر دیا ہے[۱]، ایک اور طوائف چمنی بھی بادشاہ کی منظورِ نظر تھی، ان کے علاوہ بھنائے فیل سوار، خوش حال رام جنی، چک مک دمانی وغیرہ اس عہد کی مشہور طوائفیں ہیں۔ محمد شاہ کے عہد کی ایک مشہور طوائف ادبیگم تھی جس کے بارے میں صاحبِ مرقع دہلی نے لکھا ہے:-

"دہلی کی مشہور بیگم ہیں جو پائجامہ نہیں پہنتیں بلکہ اپنے بدن کے نچلے حصے پر پائجامہ کی طرح گل بوٹے بنالیتی ہیں بعینہٖ ایسے گل بوٹے بناتی ہیں جو رومی کم خواب کے تھان میں ہوتے ہیں، اس طرح وہ امرا کی محفلوں میں جاتی ہیں اور کمال یہ ہے کہ پائجامہ اور اس نقاشی میں کوئی امتیاز نہیں کر پاتا۔ جب تک اس راز سے پردہ نہ اٹھے کوئی ان کی کاریگری کو نہیں بھانپ سکتا"[۲]

محمد شاہ ہی کے عہد میں کسل سنگھ نام کے ایک امیر نے رنڈیوں کی ایک بستی بسائی تھی جو کسل پورہ کے نام سے مشہور تھی، ہر قسم کی عورتوں کو لاکر وہاں آباد کیا تھا۔ عیش پسند لوگوں کو یہاں آنے کی عام دعوت تھی۔ اس کی ہوا جنسی لذت میں ہیجان پیدا کرتی تھی، اس کی فضا لذائذ نفسانی کو بے طرح برانگیختہ کرنے والی تھی لہو و لعب سے زندگی گذارنے والے بے روک ٹوک وہاں جاتے تھے[۳]

دہلی کے دور کے ختم ہونے کے بعد طوائفوں کو سب سے زیادہ عروج لکھنؤ میں حاصل ہوا، نوابین اودھ نے اس طبقہ کی بہت پذیرائی کی۔ لکھنؤ میں طوائفوں کو

---

[۱] مرقع دہلی، ص ۱۹۳، [۲] ایضاً، ص ۱۹۵، [۳] ایضاً، ص ۱۵۵،

ہر طرح کی کھلی آزادی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر طرف طوائفیں ہی طوائفیں نظر آنے لگیں، شرر لکھتے ہیں :۔

"بازاری عورتوں اور ناچنے والے طایفوں کی شہرت اس قدر ہوگئی کہ کوئی گلی کوچہ ان سے خالی نہ تھا اور نواب کے انعام واکرام سے وہ اس قدر خوش حال اور دولت مند تھیں کہ اکثر رنڈیاں ڈیرہ دار تھیں جن کے دو دو تین تین عالیشان خیمے رہا کرتے[1]"

لکھنؤ میں طوائفوں کے کوٹھے پر جانا وہاں کی تہذیب میں شامل ہو گیا تھا، بڑے بڑے امراء اور رؤساء وہاں جایا کرتے تھے بلکہ یہاں تک خیال کیا جاتا تھا کہ جو شخص طوائف کی محفل میں نہیں جاتا وہ ادب و تہذیب سے نا آشنا رہتا ہے ۔

"بوستان" میں طلسمات کے اکثر مقامات لکھنؤ کے گلی کوچوں کی طرح حسین عورتوں سے بھرے ہوئے نظر آتے ہیں، "میخانہ ہوش ربا"، مقام الامتحان"، باغ ابر سیا"، طلسم الفردج"، اور بعض دوسرے مقامات طوائفوں کے کوٹھے ہی کی نمائندگی کرتے ہیں۔ صاحبقرانوں کی شادی میں ہر منزل پر طوائفیں رقص کرتی ہیں اور نغمے سناتی ہیں، صاحبقران انھیں انعامات سے نوازتے ہیں[2]

معزالدین کیقباد اور شجاع الدولہ کی طرح "بوستان" کے شاہزادے بھی محل سے باہر جاتے وقت طوائفوں کو اپنے ہمراہ رکھتے ہیں، خواہ جنگ پر جائیں یا شکار پر۔ صاحبقران اصغر جب شکار کے لیے گیا تو رقاصائیں اور مطربان خوش گلو اس کے ساتھ تھیں :۔

"ان کے علاوہ ملک اغرک نے بھی چند طوائف خوش خوان، خوش جمال بنی نوع انسان سے بھیجدی تھیں، وہ نازنینیں رات دن صاحبقران عیش دوست کے اوقات خوش رکھتی تھیں[3]"

یوں شاہزادوں کے محل بھی طوائف کے مکانوں سے مختلف نہیں وہی ناز و غمزہ

---

[1] گذشتہ لکھنؤ۔ ص ۱۸، [2] تفصیلی مثالوں کے لیے ملاحظہ ہو جلد ہشتم اور نہم۔ [3] ج ۱۸۵۳ ص ۵۔

کے تیر اور جنسی اختلاط کی آزادی کا ماحول وہاں موجود ہے۔ پھر بھلا وہ کوٹھوں پر کیوں جانے لگے۔ یہ شاہزادے کوٹھوں پر نہ جائیں یہ دیگر بات ہے لیکن "بوستان" میں کوٹھے موجود ہیں اور دوسرے لوگ وہاں جاتے ہیں :۔

"ایک روز جمشید کوتوال طوائفِ شہر کا رقص دیکھ رہا تھا، ان میں سے ایک زن رقاصہ کی طرف اس کی طبیعت بے اختیار مائل ہوئی آخر شراب کے نشہ میں جمشید نے اس رقاصہ کو اپنے پاس بلایا۔ سرِ محفل اس کے لب و رخسار کے دو چار بوسے لئے [1]"

طوائفوں کو اپنے محلوں پر بھی بلایا جاتا تھا۔

"سولان کے ملک میں مزلفہ رقاصہ نامی ایک فاحشہ رہتی تھی، سولان نے اس کو طلب کر کے ان دونوں کی خدمت میں بھیجا، اور اس نے ان دونوں کو رقص و خواندگی کی دادہائے غیر مکرر سے ایسا مفتون کیا کہ اس سے ایک دم کی جدائی ان کو ناگوار تھی اور فاجرہ ان دونوں سے اختلاط نہانی بھی کرتی تھی [2]"

جنسی اختلاط کی آزادی "بوستان" کے اس شہر میں عروج پر نظر آتی ہے :۔

"عجب شہر دیکھا کہ ---- عورتیں اعلانیہ کوچہ و بازار میں خویش و بیگانہ سے بلا مضائقہ مباشرت کرتی تھیں اور کوئی شخص ان کا مزاحم نہ تھا [3]"

کوچہ و بازار میں عورتوں کا آزادی کے ساتھ ملنا طوائفوں کے کوٹھوں کی افراط ہی سے مراد ہے۔ یعنی طوائف معاشرہ کا ایک اہم حصہ بن گئی تھی۔ ہر سمت اسی کے نغمے گونجتے تھے اسی کے گھنگھروؤں کی آواز آتی تھی۔

معاشرہ کی اچھائیوں اور برائیوں میں عورت بھی برابر کی شریک ہوتی ہے محض مرد کو تمام برائیوں کا ذمہ دار ٹھہرانا غیر مناسب ہے مرد جتنا عیاش طبع ہوتا ہے

---

[1] ۲۸۴ ج ۳، [2] ۲۲۸ ج ۱، [3] ۴۵ ج ۱،

عورت اس سے زیادہ تعیش پسند ہوتی ہے لیکن یہ فرق ہے کہ مرد اعلانیہ سب کچھ کرتا ہے اور عورت عموماً پس پردہ اپنی محرومیوں کو دور کرتی ہے۔ عورت کی یہ بات قابلِ تعریف ہے کہ اس میں برداشت و ضبط کرنے کا مادہ مرد کی بہ نسبت زیادہ ہوتا ہے وہ اپنی خواہشات کو ضبط کرنے کا حوصلہ اور قوت بھی رکھتی ہے لیکن کبھی کبھی ان بندشوں کی سخت گرفت سے تنگ آکر بغاوت کر دیتی ہے اور کبھی چہار دیواری سے باہر جاتی ہے اور کبھی چہار دیواری کے اندر ہی اپنی آسودگی کا سامان فراہم کر لیتی ہے

"بوستان" میں اگرچہ تمام شاہزادیاں اعلانیہ عشق کرتی ہیں۔ محلوں سے نکل کر تلاشِ محبوب میں سرگرداں و پریشاں پھرتی ہیں، لیکن یہ کسی فعلِ بد کی مرتکب نہیں ہوتیں۔ جو عورتیں معاشرہ اور عورت کے کردار کو بدنام کرتی ہیں ان کا تعلق عام طور پر نچلے طبقے سے ہے مثلاً جب ایک شخص ایک شاہزادہ کے ہاتھوں قتل ہو جاتا ہے تو اس کی بیوی شوہر کے قاتل سے کہتی ہے کہ اچھا کیا تو نے اسے مار دیا میں جب سے اس گھر میں آئی ہوں سر بمہر ہوں آج تو مرد ملا تو تجھ سے پہلو گرم کردں گی[۱] ایسی عورتیں صرف جسمانی لذت کو مقصدِ حیات سمجھتی ہیں اور اسے پانے کے لئے وہ اپنے شوہر کو زہر دینے میں بھی جھجک محسوس نہیں کرتیں[۲] شوہر کی موت کا سوگ منائے بغیر دوسرے ہی دن اپنے منظورِ نظر سے مختلط ہوتی ہیں[۳] اور حسبِ منشا بات نہ بننے پر انتقام بھی لیتی ہیں[۴] ایسی عورتوں کی بدکاری پر ان کے اعزا انھیں اپنے ہاتھ سے قتل کر دیتے ہیں[۵] عدالت سنگساری کا حکم دیتی ہے[۶] اس قتل اور سنگساری کے باوجود معاشرہ برائیوں سے محفوظ نہیں۔ گذشتہ صدی تک طوائف کو معاشرہ میں انتہائی مقبولیت اور ترقی حاصل تھی۔ یہ جانتے ہوئے کہ طوائف کے کوٹھے کی راہ اخلاقی پستی کا راستہ ہے، طوائف کو معاشرہ کا ایک لازمی اور اہم جزو سمجھا جاتا تھا۔

۱؎ ۱۷۹ ج ۴، ۲؎ ۴۷۰ ج ۴، ۱۳۷ ج ۷، ۳؎ ۲۶ ج ۳، ۴؎ ۵۶۱ ج
۵؎ ۵۷۹ ج ۱، ۱۶ ج ۹م، ۶؎ ۳۵۹ ج ۹م،

امرد پرستی

میرؔ نے کہا تھا ؎

میرؔ کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

آبروؔ کا شعر ہے ؎

جو لونڈا چھوڑ کر رنڈی کو چاہے
وہ کوئی عاشق نہیں بوالہوس ہے

اردو شاعری میں اس طرح کی بہت سی مثالیں موجود ہیں، یہاں مرد کا معشوق بھی مرد ہے۔ یعنی عاشق و معشوق دونوں ہی ایک جنس سے تعلق رکھتے ہیں، ایران میں اس اخلاقی برائی کو کافی فروغ حاصل ہوا فارسی شاعری اور ادب میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ ایران ہی سے یہ برائی عرب اور ہندوستان پہونچی بقول ابو ہلال عسکری :-

"عرب مطلقاً امرد پرستی سے ناواقف تھے لیکن جب پہلی صدی میں فتوحات کا سلسلہ خراسان تک آیا اور اہلِ فوج مدت تک وطن اور اہل و عیال سے دور رہے، اس کے علاوہ لڑائیوں میں سادہ رو نوجوان گرفتار ہوکر آئے اور غلام بن کر جلوت و خلوت میں ساتھ رہنے لگے تو امرد پرستی اور شاہد بازی کا مذاق پیدا ہوا[1]"

ایران میں حسین ترک غلاموں کا رکھنا اتنا عام ہو گیا تھا کہ ہر گھر اور ہر محفل میں یہ نظر آتے تھے۔ محفل عیش میں ساقی گری اور بزم آرائی کی خدمت ان ہی کے ذمہ ہوتی تھی، کیونکہ یہ ترک نوجوان خوبصورت ہوتے تھے اس لئے عیاش طبع لوگ معشوقِ مؤنث کے بجائے انھیں سے دل بہلاتے تھے، انھیں سے عشق

---

[1] شعر العجم۔ جلد چہارم ص ۱۵۵،

کیا کرتے تھے اگرچہ یہ قطعاً غیر فطری عشق تھا لیکن نوخط کی بے نیازی و لاپرواہی، ناز، ادا اور دلربائی اس عشق کو اور بھی ہوا دیتی تھی، شاعری میں محبوب کے ظلم و ستم اور جور و جفا کے انداز انھیں امردوں کے عشق کا نتیجہ ہیں کیونکہ ایشیا میں عورت پردہ کی اتنی پابند تھی کہ اس سے آزادانہ ملنا ناممکنات میں سے تھا امرد اور طوائف سے تعلق پیدا کرنے میں کوئی دشواری اور پابندی نہیں تھی۔ انھیں دونوں کے نازو انداز نے شاعری کو محبوب دیا۔

امردوں کی طرف لوگوں کی دلچسپی اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ کنیزوں کے ساتھ انھیں ملازم رکھا جاتا تھا۔ معتصم باللہ نے نوخطوں کے عشق کے جذبہ سے مغلوب ہو کر فوج میں عربوں کی جگہ ترک نوجوان بھرتی کیئے تھے جو حسین اور خوش رو تھے ان کی چال ڈھال، رفتار و گفتار، بات چیت، ایک ایک ادا طنازی اور شوخی کے لباس میں جلوہ گر ہوتی تھی، ابوالمعالی رازی ترک نوجوان کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

یارب ایں بچۂ ترکان چہ بتان اند کہ ہست
دیدہ مردم نظارہ ازیشاں چو بہار
بگہ رزم ندانند بجز اسپ و سلاح
بگہ بزم ندانند مگر بوس و کنار

کافی ھمدانی کا کہنا ہے ؎

ایں شوخ سواران کہ دل خلق ستایند
گوئی زکہ زادند؟ و بہ خوبی بہ کہ مانند؟
ترک اند باصل اندر و شک نیست ولیکن
از خوبی و زیبائی خورشید و شانند[1]

اردو ادب نے فارسی ادب کے زیر اثر پرورش پائی اور ہندوستان کے مسلمان ایران کے راستے ہندوستان آئے، اس لیئے یہ برائی یہاں کے معاشرہ اور

---

[1] شعر العجم جلد چہارم۔ ص ۱۵۷،

ادب میں خود بخود شامل ہو گئی، مسلمانوں کی آمد سے قبل یہاں مرد کی معشوق عموماً عورت ہی تھی بقول کنور محمد اشرف "ہندو سماج اس بدفعلی سے کسی قدر محفوظ تھا[۱] اس کا مطلب ہے کہ کچھ حد تک یہ جنسی رجحان یہاں بھی رہا ہوگا لیکن جب ہندوستان کا مسلمان فاتح محمود غزنوی اپنے معشوق ایاز کے ہمراہ یہاں آیا تو یہ وبا یہاں بھی پھیل گئی، محمود اور ایاز کے تعلقات زبان زدِ خاص و عام ہیں۔ شعرا نے ایاز کی تعریف میں قصاید بھی لکھکر محمود کے سامنے پیش کئے تھے، ہندوستان کے بعد کے سلاطین کی بھی خاصی دلچسپی امردوں کی طرف تھی۔ مولانا شبلی لکھتے ہیں کہ :۔

"یہ مذاق اس قدر عام ہوا کہ سلاطین اور رؤسا تک اعلانیہ امرد پرستی کرتے تھے اور دربار میں ان کے معشوق، ان کی نظر فروزی کا کام دیتے تھے۔ شعراء سے ان معشوقوں کی تعریف و توصیف میں سر دربار اشعار لکھوائے جاتے تھے اور شعراء ممدوح کی عشق پرستی کا اعلانیہ ذکر کرتے تھے[۲]"

درباروں میں ہی نہیں بلکہ صوفیاء کی مجالس میں بھی امردوں سے عشق کے چرچے ہونے لگے تھے۔ عشقِ مجازی کو عشقِ حقیقی کی سیڑھی قرار دیا گیا۔ مولانا نے مزید لکھا ہے کہ :۔

"حقیقت یہ ہے کہ اس بے ہودہ شاہد پرستی نے تمام ملک کو برباد کر دیا، جب اکابر صوفیا اس قسم کی حسن پرستی کی تعلیم دیں، اور فرمائیں کہ عشقِ مجازی عشقِ حقیقی کا زینہ ہے تو ملک کا بلائے عام میں مبتلا ہونا یقینی تھا[۳]"

مغلیہ سلطنت کا عہدِ زوال عیاشی اور اخلاقی برائیوں کے معاملے میں عروج کا زمانہ رہا ہے بادشاہ سے لے کر امراء تک سبھی کسی نہ کسی برائی میں ملوث تھے، اسی عیاشانہ فضا میں امرد پرستی بھی عوام و خواص میں بے حد مقبول ہوئی جس کا ثبوت اس عہد کی سماجی تاریخیں اور اردو شاعری کے وہ حصے ہیں جن میں امردوں کا ذکر بڑے

---

[۱] ہندوستانی معاشرہ عہد وسطیٰ میں، ص ۲۵۶، [۲] شعر العجم جلد ۴ ص ۱۵۸، [۳] شعر العجم جلد ۴ ص ۱۴۷،

تلذذ آمیز انداز میں کیا گیا ہے، اس عہد میں امرد پرستی اتنی عام ہوگئی تھی کہ اسے معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا، ہر چھوٹی بڑی محفلوں میں، میلوں ٹھیلوں میں امرد پرست نظارہ بازی کرتے ہوئے نظر آتے تھے "مرقع دھلی" میں ایسے بہت سے میلوں کا ذکر کیا گیا ہے، "عرس خلد منزل" کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :-

"امردوں کا وہ ہجوم ہوتا ہے کہ زاہد کی توبہ ٹوٹ جائے اور تیز طرار لونڈے وہ عشق بازی کرتے ہیں کہ تقویٰ و پارسائی کی بنیادیں ہل جائیں جدھر نظر جاتی ہے کوئی خوب رو ہے اور جس طرف نگاہ اٹھتی ہے زلف و گیسو کے جلوے ہیں ـ ـ ـ ـ ـ آپ ذرا سنبھلے کہ کسی لونڈے نے آنکھ ماری اور آنکھ بھر کر دیکھا کہ کسی زنخے کا پیام آیا[1]"

یہ نظر بازیاں صرف میلوں ٹھیلوں تک ہی محدود نہیں بلکہ امراء کی نجی زندگی بھی اسی شغل کی شائق ہے اعظم خاں اس سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ اس کے متعلق درگاہ قلی خاں نے لکھا ہے کہ :-

"ان کی طبیعت امردوں کی طرف مائل ہے اور دل سادہ رویوں کی محبت میں گرفتار ہے جاگیر کی ساری آمدنی انھیں لوگوں پر خرچ ہوتی ہے جہاں کہیں بھی کسی امرد کا پتہ چلتا ہے، بہلا پھسلا کر اس پر کمند ڈال دیتے ہیں اور جہاں کہیں کسی لونڈے کا پیام آتا ہے اپنے احسان کے جال میں اسے پھانس لیتے ہیں ـ ـ جہاں کہیں کوئی نمکین لونڈا نظر آتا ہے لوگ اسے اعظم خاں سے منسوب کرتے ہیں اور جہاں نوخط ملتا ہے اعظم خاں سے وابستہ ہوتا ہے انھیں گل رخوں کے سائے میں ان کے بڑھاپے کی سیاہی باقی ہے[2]"

دوسرے امرا بھی اعظم خاں ہی کی طرح شوقین مزاج تھے، شعراء اور ادیب بھی اس سے محفوظ نہیں تھے نہ صرف ان کی تخلیقات اس بات کی نشاندہی کرتی ہا.. بعض تذکروں میں بھی ان کے اس شوق کا ذکر موجود ہے۔ تذکرہ طبقات سخن میں ولی اللہ اشتیاق

---

[1] مرقع دھلی ص ۱۲۷، [2] ایضاً۔ ص ۱۴۴،

کے بارے میں تحریر ہے کہ :۔

"شاعر عصر محمد شاہی بود فقیر مشرب صوفی مذہب و درد مند
محمد تقی نام معشوق ش بودہ"[1]

اشتیاق نے لڑکوں سے عشق کا اظہار اس شعر میں بھی کیا ہے ؎

لڑکوں کے پتھروں سے لگے کیونکر اس کے چوٹ
ہر ایک گردباد ہے مجنوں کو ڈھول کوٹ[2]

میر نے اپنے والد کی امرد پرستی اور اپنے چچا سید امان اللہ کی پسر روغن فروش پر فریفتگی کا حال بڑی بے تکلفی سے لکھا ہے[3] حدیقۃ الاقالیم میں تو یہاں تک بیان کیا گیا ہے کہ بعض شہروں میں لوگ لونڈوں سے نکاح کرنے لگے تھے۔ ڈاکٹر عمر نے حدیقۃ الاقالیم کا ایک اقتباس نقل کیا ہے :۔

"حتی کہ با امردان نوخیز خوش شکل بنکاح می کردند در سہم امت لوط تازہ شد"[4]

جب ایسے ماحول میں "بوستانِ خیال" لکھی گئی تو لازمی ہے کہ ماحول کا اثر قبول کرے۔ اسی اثر کا نتیجہ ہے کہ اس میں جگہ جگہ امرد پرستی کی مثالیں موجود ہیں[5] یہاں بھی حسین لڑکے ساقی گری کی خدمت انجام دینے پر مقرر ہیں[6] جنگ کے وقت اگر حریف کوئی نوجوان ہوتا تو پہلوانانِ صف شکن یہ کوشش کرتے تھے کہ اسے زندہ گرفتار کر لیں تاکہ اپنی محفلِ عشرت میں اسے ساقی بنا کر رکھیں :۔

"خبردار محمود وغیرہ پریزادوں کو زندہ گرفتار کر کے لے آنا میں چاہتا ہوں کہ
ان کو دیکھوں بلکہ اگر لائق ساقی گری ہوں تو ان کو اپنا ساقی کر دوں"[7]

طارق نوجوان جب کفار کے لشکر میں قاصد بن کر جاتا ہے تو اس کے لشکر کے پہلوان اس کے حسن پر عاشق ہو جاتے ہیں :۔

"دشخوار و تسخوار دونوں ملعون امرد پرست بھی تھے طارق پر بدل و جان
فریفتہ ہو گئے آخر الامر و تسخوار جو ایسی حرکتوں کا مجاز تھا اس نے

۱؎ تذکرہ طبقاتِ سخن ماخوذ ۔ ۲؎ مجموعہ نغز جلد اول ص ۶۳ ، ۳؎ میر کی آپ بیتی مترجم نثار احمد فاروقی ص ۴۴ ،
۴؎ اٹھارہویں صدی میں ہندوستانی معاشرت ص ۲۰۵ ، ۵؎ ۳۱-۱۳ ج ۱ ، ۶؎ ۲۲۵ ج ۱ ، ۷؎ ۲۲۹ ج ۱ ، ۴۷ ، ۵۹ ، ۴۰ ،

بے تکلف اور بلا خطر طارق کو کرسی پر سے اٹھاکر اپنے زانو پر بٹھالیا اور بطریق اخلاص و پیار اس کے لب و دہان سے دو چار بوسے لیے ہیں[1]

حسین عورتوں کا ملنا اگرچہ اتنا دشوار بھی نہ تھا لیکن لوگوں کی طبیعت کچھ غیر فطری عشق کی طرف ہی مائل تھی بجائے جنسِ مخالف کے اپنے ہم جنس ہی کے روبرو اظہار عشق کرنے سے سرور حاصل ہوتا تھا۔ بڑے بڑے منصب دار اس کے لئے کم عمر لونڈوں کے ناز اٹھاتے تھے:۔

"اے جوان قمر طلعت آگاہ ہو کہ دنیا کی دولت و نعمت اس قدر میرے پاس موجود ہے کہ جس کا حساب نہیں ہوسکتا لیکن ایک طفل سادہ رو و خوش جمال باریک اندام کی ہمیشہ سے آرزو رکھتا تھا تاکہ ہنگام مجلس آرائی اپنے دست نگاریں سے مجھے شراب پلائے اور میں اس کی حرکاتِ معشوقانہ اور ناز و انداز محبوبانہ سے محظوظ ہوں"[2]

امردوں سے یہ محبت اور لگاؤ اسی وقت تک رہتا تھا جب تک ان کے چہرہ پر سبزہ کی نمود نہیں ہوتی تھی:۔

"اے جوان فرخ لقا خاطر جمع رکھ، جس وقت تیرے عارض ماہ مثال پر سبزۂ خط نمود ہوگی میں تجھے نہایت سامان و جلوس سے تیرے وطن میں پہنچوادوں گا"[3]

بات صرف ساقی گری تک ہی نہیں رہتی بلکہ امردوں کے ساتھ فعلِ بد کرکے جنسی لذت بھی حاصل کی جاتی تھی، کفار کو اکثر مقامات پر داستان نگار نے اس فعلِ بد میں مبتلا دکھایا ہے، ضار منکوس جو جمشید کا استاد ہے اپنی جنسی تسکین کے لیے جمشید ہی کو استعمال کرتا ہے اسی فعلِ بد کے جرم میں ایک مرتبہ اس نے بدترین سزا پائی جب ایک قبیلہ کے سردار کے دوازدہ سالہ بیٹے آذر پارہ کو اپنی ہوس کا شکار بنایا تھا[4] خار جادو بھی جمشید ہی سے آسودہ ہوتا تھا[5]

طلسم اجرام واجسام میں معز الدین کا گذر ایک ایسے قصبہ سے ہوا جہاں عام آدمی سے

۱؎ ۱۴۱ ج۲ ، ۲؎ ۲۱۴ ج۴، ۳؎ ۲۶۸ ج۴، ۴؎ ۳۹۱ ج۳، ۵؎ ۳۲۱ ج۹م،

لے کر قاضی شہر تک اسی برائی میں مبتلا تھے معزالدین جب قاضی کے دربار میں پہونچتا ہے اور قاضی کو بیچ دربار فعل شنیع میں مشغول دیکھتا ہے تو لاحول پڑھتا ہے[۱]۔ اسی طرح ایک اور مقام پر اسے آنکھیں بند کر لینی پڑتی ہیں جب وہ تمام روسیاہوں کو باہم اغلام میں مشغول پاتا ہے[۲]۔

"بوستان" میں امرد پرستی کا ذوق کفار ہی کی حد تک ہے اہل اسلام اس سے پاک ہیں۔ لیکن "بوستان" میں موجود ان مثالوں سے اس عہد کے امرد پرستی کے رجحان پر واضح روشنی پڑتی ہے۔

غلاموں کی خرید و فروخت

گذشتہ صدی تک دنیا کے تقریباً ہر خطہ میں آدمی اور عورتوں کی خرید و فروخت کا انسانیت سوز رواج پھیلا ہوا تھا۔ آدمی جانوروں کی طرح بازار میں بکتے تھے۔ صاحب زر افراد انھیں خریدتے تھے اور اپنی جائداد کی طرح اپنی خدمت کے لئے رکھتے تھے۔ ہر خوش حال اور با عزت گھر میں لازمی تھا کہ کچھ زر خرید غلام اور کنیزیں موجود ہوں اس سے مرتبہ اور دولت مندی کا بھی اندازہ ہوتا تھا۔ یوں تو غلامی کی زندگی بد ترین زندگی کہی جاتی تھی کیونکہ عموماً مالک غلاموں پر ظلم کرتے تھے جس قدر اس سے محنت لیتے تھے اس کی مناسبت سے اس کے آرام کا سامان فراہم نہیں کرتے تھے۔ اسلام کی اشاعت کے بعد غلاموں کی حالت میں سدھار پیدا ہوا، ان کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیا جانے لگا مسلمان اپنے مسلمان غلاموں کے ساتھ ہمدردی کا برتاؤ کرتے تھے اسلام کے برابری کے تصور کو پیش نظر رکھتے ہوئے انھیں برابر اٹھنے بیٹھنے اور ساتھ عبادت کرنے کا حق بھی حاصل تھا۔ تاریخ اسلام میں حبشی غلام حضرت بلال رضؓ اور ان کے ساتھ رسول اللہؐ کی محبت و شفقت بہت مشہور ہے۔ محمود غزنوی اور اس کے غلام ایاز کے قریبی تعلقات کو مورخین نے اپنی کتابوں میں درج کیا ہے۔ غلاموں کے ساتھ رحمدلی اور برابری کے برتاؤ کی اس سے نمایاں مثال اور کیا ہوگی کہ محمد غوری نے دلی کی حکومت

---

[۱] ج ۲ ص ۳۲۶، [۲] ص ۱۲۷ ج ۲

فتح کرنے کے بعد اپنے ایک غلام قطب الدین ایبک کے سپرد کی۔ ایبک کے بعد اس کا غلام سلطان بنا اور اس طرح ہندوستان پر مسلمانوں کا پہلا حکومت کرنے والا خاندان غلام خاندان ہی کے نام سے مشہور ہوا۔

زر خرید افراد کے علاوہ ان شکست خوردہ فوج کے سپاہیوں کی حیثیت بھی غلاموں کی ہوتی تھی جو میدانِ جنگ میں گرفتار کئے جاتے تھے، ہارے ہوئے لشکر کے گرفتار شدہ افراد میں مرد اور عورتیں سبھی شامل ہوتے تھے ان کو بازاروں میں فروخت بھی کیا جاتا تھا سلاطین کے عہد میں پالم دروازے پر غلاموں کی خرید و فروخت ہوتی تھی[۱] سلطان محمد بن تغلق کا ذکر کرتے ہوئے مالک الابصار کے مصنف نے لکھا ہے کہ:

"سلطان محمد جنگ سے اس قدر قیدی گرفتار کرکے لاتا تھا کہ کوئی دن ایسا نہ جاتا کہ دہلی میں عمدہ عمدہ غلام سستی قیمت پر نہ بکتے ہوں۔ مجھ سے راویوں نے بیان کیا کہ خدمت کرنے والی لونڈی کی قیمت دہلی شہر میں آٹھ ٹنکے سے زیادہ نہیں ہے اور جو لونڈیاں خانہ داری کے مطلب کی ہوتی ہیں ان کی قیمت پندرہ ٹنکے اور بعض کی بیس ٹنکے یا اس سے بھی کچھ زیادہ ہوتی ہے"[۲]

عفیف کا بیان ہے کہ سلطان فیروز شاہ غلاموں کو جمع کرنے میں بے حد کوشش و اہتمام کرتا تھا، اس نے تمام جاگیرداروں کو یہ حکم دے دیا تھا کہ وہ حاضری کے وقت عمدہ غلام ساتھ لایا کریں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چالیس ہزار غلام روزانہ نوبت سواری خانہ میں حاضر رہتے تھے اور اس طرح قریب ایک لاکھ اسی ہزار غلام شہر میں جمع ہو گئے تھے۔ فیروز شاہ نے سب کا نہایت معقول انتظام کیا تھا ان کی دیکھ بھال کا خاص خیال رکھتا تھا، انھیں تنخواہیں بھی دیتا تھا[۳] علاء الدین خلجی نے جب بازار کی تمام اشیاء کی قیمتیں مقرر کیں تو غلاموں کی قیمتیں طے کر دی گئیں۔ کے۔ ایس۔ لال نے لکھا ہے:۔

"قرونِ وسطیٰ میں ہر جنس کی طرح مرد غلام اور عورتیں لونڈیاں بن کر بازار میں بکا کرتے تھے، سلطان نے ان کی قیمتیں مقرر کر دی تھیں،

---

[۱] اوراق مصور ص ۲۲، [۲] بحوالہ محمد شاہ بن تغلق۔ ص ۲۲، [۳] تاریخ فیروز شاہی۔ ص ۱۸۹،

ایک کام کاج والی لونڈی کی قیمت بیس سے تیس حتیٰ کہ چالیس ٹنکہ
تک تھی ۔۔۔۔۔۔ لڑکوں کی قیمتیں بیس سے تیس ٹنکہ کے درمیان
مقرر تھیں، بدشکل لڑکے تو ۷ یا ۸ ٹنکے ہی میں حاصل ہو جاتے تھے
غلام لڑکوں کی تقسیم ان کے خدوخال اور کام کرنے کی صلاحیت
کے مطابق کی جاتی تھی جیساکہ گھوڑوں کے بازاروں کا معاملہ تھا،،[1]

یعنی مویشی اور انسان ایک ہی طرح بازار میں بکتے تھے، ایک ہی طرح ان کی قیمتیں لگتی تھیں بلکہ بعض مویشیوں کی قیمتیں انسانوں سے زیادہ ہوتی تھیں۔

مغلوں کے زمانہ میں غلام اس طرح نہیں بکتے تھے لیکن غلام اور کنیزیں رکھنے کا رواج اس وقت بھی تھا۔ "بوستان" کے سوداگر بھی غلاموں اور کنیزوں کی خرید و فروخت کرتے ہیں، باقاعدہ غلاموں کا بازار لگتا ہے۔ بعض جگہ غلاموں اور کنیزوں کے بجائے ان کی تصویریں نمائش کے لئے رکھی جاتی ہیں، امراء آتے ہیں اور پسند کرکے انھیں خریدتے ہیں۔ خواجہ سعید بخت نیکورو نے تصاویر کی ایک ایسی ہی نمائش لگائی[2] یہاں پر بازار کی دوسری اشیاء کی طرح ان کا مول تول ہوتا ہے :-

،، مسلوق نے خوش ہو کے کہا اس کی کیا قیمت ہے اس نے کہا پانسو
تومان۔ مسلوق نے کہا اس قدر مبلغ خطیر بغیر اس کے کہ اس سے
کوئی خدمت ظاہر ہو نہیں دے سکتا، حمیدہ نے کہا جب اس کا
ہنر دیکھ لینا جب ہی قیمت دینا،،[3]

کنیزوں کی قیمت ہزارہا دینار تک لگ جاتی ہے۔ شاہ ابوالحسن بن اخشید بادشاہ مصر نے سوداگران فرنگ سے ایک کنیز حبشی الاصل دو ہزار دینار کو خریدی[4]، خواجہ سلیم سوداگر نے ذکا نامی کنیز کے ایک شاہزادے سے پچاس ہزار دینار لیے[5]

بادشاہ اور امراء کے محلوں میں کنیزوں کی دو حیثیتیں تھیں۔ کچھ کنیزیں محل کے کام کاج کے لئے مقرر ہوتی تھیں اور کچھ بادشاہ کا دل بہلانے کے لئے بادشاہ کے روبرو ناچتی تھیں، حکاتی تھیں بلکہ بادشاہ جس کو پسند کرتا تھا وہ اس کے حرم میں بھی شامل ہو جاتی تھی۔

---

[1] خلجی خاندان ص۲۳۱، [2] ج۲ ص۳۴۳، [3] ج۴ ص۵۱۶، [4] ج۱ ص۴۷، [5] ج۳ ص۲۴۹، ۲۵۳، ۲

خواجہ مسعود سوداگر سے ایک بادشاہ نے ایک کنیز خریدی، لیکن وہ کنیز بادشاہ کی خواہشِ وصال کے لئے راضی نہ ہوئی جس پر بادشاہ نے اسے قتل کرنے کا ارادہ کیا[۱]۔ یعنی بادشاہ عموماً اپنی تفریح کے لئے کنیزوں کو خریدتے تھے۔

غلاموں کی خرید و فروخت پر باقاعدہ کاغذ لکھے جاتے تھے۔

"آخر ملک ماہون جنی راضی ہوا اور بیع نامہ لکھا گیا کہ ملک ماہون جنی نے اپنی دختر سبز بخت کو برضا و رغبت شاہزادہ اسماعیل کے ہاتھ عوض سلطنت تارستان خفر فروخت کیا"[۲]

محلوں میں کنیز کے مرتبہ کا اندازہ اس بات سے ہو جاتا ہے کہ گوہر افروز صاحبقران اکبر کی کنیزی میں جانے سے بہتر یہ سمجھتی تھی کہ زہر کھا کر سو رہے[۳]۔ اسی طرح خسرو شاہ جنی اس بات کو گوارا نہیں کرتا کہ اپنی دختر کو شاہزادہ اسمٰعیل کی کنیزی میں دے۔ اس سے بہتر وہ اپنی دختر کو زہر دے دینا سمجھتا ہے[۴]

غرضکہ مجموعی طور پر غلامی کی زندگی بدترین زندگی تھی۔ غلاموں کی موجودگی ایک شخص کو جبر اور ظلم کی طرف اکساتی ہے اور دوسرے کو آزادانہ سوچ سے محروم کر دیتی تھی۔

قزّاقی

زندگی کو آرام و آسائش کے ساتھ گذارنے کی ہر فرد کی خواہش ہوتی ہے اور اس خواہش کی تکمیل کے لئے آدمی طرح طرح کے طریقے اختیار کرتا ہے۔ آرام و آسائش اور پُرسکون زندگی گذارنے کا ایک اہم ذریعہ دولت سمجھی جاتی ہے کیونکہ دولت سے دنیا کی ہر شے خرید سکتے ہیں۔ اسی دولت کو پانے کے لئے لوگ ایمان اور جان بھی قربان کر دیتے ہیں۔ سماج کا ایک بڑا المیہ یہ ہے کہ اس میں چند افراد دولت پر قابض ہیں اور بقیہ لوگ ان کے رحم و کرم کے محتاج ہیں۔ ان چند افراد سے دولت حاصل کرنے کی محرومین ہر ممکن کوشش کرتے ہیں ان کے سامنے دست بستہ ایستادہ ہوتے ہیں ان کی ہر خدمت انجام دیتے ہیں۔ محنت و مشقت کرتے ہیں۔ اس کے باوجود بھی وہ حسب منشا دولت حاصل نہیں کر پاتے۔

۱؎ ۴۰۸ ج ۴، ۲؎ ۴۲۱ ج ۱، ۳؎ ۱۸۰ ج ۹، ۴؎ ۴۲۸ ج ۱،

اور نتیجتاً ان میں سے کچھ لوگ باغی ہو جاتے ہیں، غیر قانونی اور ناجائز طریقہ اختیار کر کے وہ صاحب زر لوگوں سے مال و زر چھینتے ہیں اس کے لئے وہ کسی کی جان لینے میں بھی دریغ نہیں کرتے۔ ظلم کر کے دولت حاصل کرنا ان کا شعار بن جاتا ہے، ایسے ہی لوگ قزاق کہلاتے ہیں، قزاقی کی روایت ہر ملک اور ہر عہد میں زندہ رہی ہے، عرب و عجم میں قزاقوں کے بہت سے قصے مشہور ہیں۔

قزاقوں کے گروہ ہوا کرتے تھے یہ جنگلوں اور پہاڑوں میں رہتے تھے۔ اور جب کبھی کوئی قافلہ ادھر سے گذرتا تھا یہ ان کا سامان لوٹ لیتے تھے، بعض قزاق اتنی طاقت اور فوج رکھتے تھے کہ کبھی کبھی شاہی فوج کے مقابل بھی آجاتے تھے، مغلوں کے عہد میں ایسے بہت سے قزاق تھے۔ "بوستان" کے قزاق بھی اسی طرح کے ہیں، ان میں بعض اپنا قلعہ اور اپنی فوج رکھتے ہیں۔ اکثر شاہی فوجوں سے ٹکرا جاتے ہیں۔ ممالک غربستان میں سات مضبوط و مستحکم قلعے تھے۔ جن پر سات بھائیوں کا قبضہ تھا، ساتوں قزاق تھے۔ شاہی فوج کسی طرح بھی ان پر قابو حاصل نہیں کر پائی۔ داستان نگار نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ :۔

"مدت مدید سے برادر حقیقی راہزن قزاقی پیشہ الحاد وامراد وابق اور بہلول و جاروق و ہجیر و طارق نامی ہزار ہزار سوار کی جمعیت سے ان قلعوں میں حکمرانی کرتے ہیں اور دین و مذہب ان کا بت پرستی ہے بارہا فوج سلطانی باسامانِ جنگ و اسباب قلعہ شکن وہاں گئے لیکن استحکام فصائل و بروج کے سبب کچھ کار برآری نہ ہوئی ہر بار لشکر سلطانی بے حصول پھر آیا[1]

"بوستان" کے سبھی قزاق بت پرست ہیں وہ قسمیں بھی لات و منات کی کھاتے ہیں[2] لوٹ کا مال نصف آپس میں بانٹ لیا کرتے ہیں اور نصف کو بت کے نیچے دفن کر دیا کرتے ہیں[3] "بوستان" کے قزاقوں میں دیلہ بن طلحہ، شامیل، بالک تمیمی، قحطبہ بن مالک، منصور، غرقوب تکلہ زنگی وغیرہ خاص ہیں۔

دیلہ بن طلحہ کے ہاتھ سے ابوالحسن جوہر کے والد شیخ ابو صالح شہید ہوتے ہیں[4]۔ سلطان

---

[1] ۲/ ج ۴، [2] ۹۹ ج ۳، [3] ۳/ ج ۴، [4] ۲۷۳ ج ۱،

اسمٰعیل کا بھی اس سے مقابلہ ہوتا ہے[1]۔ شامیل چالیس قزاقوں کی جمعیت سے رہزنی کرتا ہے[2]
چالیس قزاقوں کی جمعیت الف لیلیٰ کی مشہور کہانی علی بابا چالیس چور کی یاد دلاتی ہے، منصور تمام
عمر رہزنی کرتا رہا لیکن ایک مرتبہ ایک پیر مرد کا سامان چھین رہا تھا کہ اس نے اسے نصیحت کی،
جس سے وہ قزاقی کو چھوڑ کر مسلمان ہو گیا تھا[3]۔ غرقوب ایک ٹھگ ہے جو فقیر کے بھیس میں
ایک تکیہ نما مکان میں رہتا ہے اور لوگوں کو مکاری سے لوٹتا ہے[4]۔ تکلہ زنگی نے اپنے گروہ
اور طاقت کو اس قدر بڑھا لیا ہے کہ اس نے ایک کوہ پر اپنے لئے قلعہ ہموار کھا ہے[5]۔

بعض قزاق سمندری قافلوں کو لوٹا کرتے تھے[6]۔ سمندر میں سفر کرنے والے جہازوں
پر حملہ کرتے اور ان کا مال و اسباب ضبط کر لیتے۔ ایسے قزاقوں میں اہلِ فرنگ بھی شامل ہیں۔

"ایک شب قزاقانِ فرنگ نے سوداگر کی کشتیوں پر شبخون مارا"[7]

یہاں فرنگی قزاقوں سے داستان نگار کا اشارہ ان اہلِ فرنگ سے بھی ہو سکتا ہے، جو آہستہ
آہستہ سمندری راستے سے آ کر ہندوستان پر قبضہ کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔
داستان نگار نے داستان میں کئی فرنگیوں کا ذکر کیا ہے۔

جن قزاقوں کے پاس فوج ہوتی تھی وہ باقاعدہ حریف کا مقابلہ کیا کرتے تھے، تکلہ
زنگی کے بارے میں لکھا ہے:۔

"اثنائے راہ میں ایک دن فوج کثیر صف بستہ نظر آئی تحقیق کیا معلوم
ہوا کہ یہ فوج تکلہ زنگی کی ہے اور تکلہ ایک مرد راہزن قزاق پیشہ ہے"[8]

سوداگروں کو لوٹنے سے پہلے یہ اپنا ایک آدمی قافلہ میں بھیجتا ہے کہ اگر اپنی جان کی سلامتی
چاہتے ہو تو اپنا مال ہمیں دے دو، انکار کی صورت میں لڑائی ہوتی ہے نتیجہ قافلہ کی بربادی
کی شکل میں سامنے آتا ہے۔

لوٹ میں آئے ہوئے غلاموں اور کنیزوں کو یہ لوگ بیچ دیا کرتے تھے۔

"فرنگیوں کے ایک سردار نے مجھے ملک بصرہ کے ایک سوداگر کے ہاتھ
بیچا اس سوداگر سے حاکم بصرہ نے مجھے خریدا"[9]

---

[1] ص ۲۷۶ ج ۱، [2] ص ۲۵۹ ج ۲، [3] ص ۸۸ ج ۶، [4] ص ۴۷۵ ج ۴، [5] ص ۵۶۰ ج ۴، [6] ص ۵۳۵ ج ۴،
[7] ص ۲۷۵ ج ۴، [8] ص ۵۶۰ ج ۴، [9] ص ۲۴۹ ج ۳،

ہندوستان میں تقریباً ہر علاقہ میں قزاق اور ٹھگ رہتے تھے اس وقت بستیاں دور دور آباد تھیں اور اطراف میں گھنے جنگلات تھے جو ان لوگوں کی پناہ گاہوں کا کام کرتے تھے۔ جنگلات کے راستے سے قافلے والوں کو دن میں بھی گذرتے ہوئے خوف محسوس ہوتا تھا، انیسویں صدی عیسوی کے ایک مصنف اکبر الٰہ آبادی نے ٹھگوں کے مقامات میں اطراف نربدا، ساگر، بندیل کھنڈ، گوالیار، مالوہ، ملک اودھ، راجپوتانہ، ارکاٹ، تلنگانہ، کرناٹک، برار، خاندیس، بہار، بنگالہ، مظفرپور، پورنیا، ترہٹ، دلی، ریواڑی وغیرہ کو شامل کیا ہے[۱]۔

جہانگیر نے جن سڑکوں پر رہزنی اور دزدی کا خوف تھا اور وہ آبادی سے دور تھیں سرائے اور پڑاؤ اور کنویں اور معابد بنوا دئے تاکہ ان موضعوں پر آبادی ہوجائے اور خوف وخطر رفع ہو[۲]۔ شاہجہاں اور اورنگ زیب نے بھی اپنے عہد میں قزاقوں پر قابو پانے کے لئے خاص انتظام کیا تھا۔ اسی عہد کے سیاح برنیر نے دورانِ سفر قزاقوں کے ہاتھوں اپنے لٹنے کا ذکر کیا ہے[۳]۔

لڑکیوں کی کم قدری

ہمارے سماج کی برائیوں میں سے ایک نفرت انگیز برائی یہ بھی ہے کہ لڑکی کی پیدائش پر مسرت کا اظہار نہیں کیا جاتا۔ اسلام کی اشاعت سے قبل عربوں میں بھی یہ برائی موجود تھی۔ وہ لوگ اپنی نوزائیدہ لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیا کرتے تھے۔ ہندوستان میں بھی بیٹی کو "نمانا" سمجھا جاتا تھا اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ لڑکی اپنے گھر پر نہیں رہ سکتی اور سماج میں اس کا کوئی درجہ نہیں تھا اس کے نام کے ساتھ دیوی لگتا اور ہندوستان میں دیویوں کی پوجا بھی ہوتی تھی مادرانہ سوسائٹی کے اثرات اس زمانہ میں بھی تھے اور آج بھی ہیں لیکن اس کی وجہ سے عورت کی قدر و منزلت میں کوئی اضافہ ہوا ہو ایسا نہیں۔ یہ اس لئے کہ وہ خاندانی معاملات میں جہاں تک ان کے حل کرنے کا سوال ہے نہ لڑکوں کی طرح شرکت کرسکتی تھی اور نہ کوئی مدد دے سکتی تھی۔

زرعی معاشرت کی محنت میں وہ بھی شریک رہتی تھی لیکن اس کے حصے سے بحیثیت

۱؎ اردوئے معلیٰ قدیم اردو نمبر ص ۲۵۱، ۲؎ تاریخ طرز معاشرت ہند و انگلینڈ ص ۲۹۴، ۳؎ برنیر ص ۳۶،

مجموعی کوئی فائدہ اٹھانا ممکن نہ تھا۔ اس کا حصہ تو اسے دے کر ہی رخصت کرنا ہوتا تھا۔ مسلم معاشرت میں لڑکیاں اپنے ہم خاندان لوگوں سے بیاہ دی جاتی تھیں لیکن ہندو معاشرت میں غیر خاندان میں شادی ہونا ضروری تھا، دیہات کی حد تک تو اب بھی گاؤں کی لڑکی کی شادی گاؤں میں نہیں ہو سکتی۔ اس کو اگر رشتہ داروں میں بھی بیاہا جائے گا تو گاؤں سے باہر۔۔۔ غیر خاندان میں شادی کرنے کی وجہ سے غیروں کے سامنے سرنگوں ہونا پڑتا تھا۔ لڑکی کو وراثت میں بھی شریک نہیں کیا جاتا تھا غرضکہ مختلف اعتبارات سے وہ سماج کی ایک ایسی فرد تھی، جسے کوئی بھی اپنے سر لینا پسند نہیں کرتا تھا۔

ماں کو اپنی اولاد سے محبت کرنا فطری بات تھی لیکن بیٹی ہونے پر کوئی خوشی کا اظہار نہیں کرتا تھا۔ دائی اور دودھ پلائی کو بھی بیٹیوں کے لئے کوئی خاص انعام کا مستحق نہیں سمجھا جاتا تھا بالعموم اسے بہت سادہ اور معمولی کپڑے پہنائے جاتے تھے۔ اسی لئے یہ کہاوت رائج ہوئی "باپ کے گھر بیٹی۔ گودڑ میں بیٹی" لڑکی کو اس کی اجازت بھی نہ ہوتی تھی کہ وہ کسی سے بات کرے۔ پردہ دار گھروں میں تو اس پر اور بھی قدغن رہتی تھی۔ حضرت امیر خسرو سے وابستہ گیتوں میں اس کی معاشرتی مجبوریوں کا ذکر جس انداز سے آیا ہے وہ بہت متاثر کرنے والا بیان ہے۔ کہیں وہ جھانڈے کی چڑیا ہے، کہیں وہ کھونٹے سے بندھی ہوئی گائے ہے وہ محل دو محلوں میں ضرور رہتی ہے لیکن انھیں چھوڑ کر جانا اس کے لئے ضروری ہے۔

بیٹی کی وجہ سے دوسرے خاندان ہماری اخلاقیات، معیشت اور معاشرتی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں جسے ہم ناپسند کرتے ہیں۔ اسی لئے جنوائی یعنی داماد اردو میں ایک طرح کی گالی ہے، سالے کی بھی وہی کیفیت ہے، بہو کے لئے ساس سے زیادہ سخت گیر اور ظالم کا کوئی اور تصور نہیں کیا جاسکتا۔ دیورانیاں، نندیں اور جیٹھانیاں دلہن کیلئے ایک محتسب بنی رہتی تھیں۔ اور ساس ان کی ایک ایک بات کی نگرانی کیا کرتی تھی۔ بہو کو اپنی مرضی سے گھر کی کسی چیز پر تصرف کا حق حاصل نہیں تھا۔ شاہی گھرانے کی بیٹیاں اپنے ہی برابری کے گھروں میں بیاہی جاتی تھیں اگر وہ نہیں ملتے تو وہ کنواری رہتی تھیں۔

عام طور پر مرد ایک کے بعد دوسری بیٹی کی پیدائش پر شدید ردعمل کا اظہار کرتے تھے اس میں ساس اور سسر کو بھی شامل سمجھئے۔ ایک اور بڑا سبب احساسِ تمرد ہے۔ آدمی کو اپنی شخصیت بیٹی کی موجودگی میں کمتر ہوتی ہوئی نظر آتی تھی۔ ہر شخص اسی بات کی تمنا رکھتا

تھا کہ پسر نرینہ سے اس کا خانۂ تاریک روشن ہوئے۔

"ایک عصائے پیری یعنی ایک پسر نرینہ کہ بعد میرے میرا وارث ہو مجھ کو عنایت ہو۔"[۱]

"الحمد للہ کہ میرے باپ سید اعزالدین شہید ثانی کا چراغ خاندان میرے بھائی رکن الملک کے نام سے روشن رہا۔"[۲]

چراغ خاندان روشن رہنے کے علاوہ اولاد نرینہ عصائے پیری یعنی بڑھاپے کا سہارا بھی تصور کیا جاتا تھا۔ اسی لئے لڑکی کی پیدائش پر رنج و ملال ہوتا تھا۔ اگرچہ اسلام نے ذہنوں پر جمے ہوئے اس غبار کو دھونا چاہا لیکن اس کے نشانات نہ مٹ سکے۔ "بوستان" کے مسلمان شاہزادے بھی اس اثر سے مبرا نہیں۔ شاہزادہ رکن الملک جو خاندانِ سادات سے ہے ملکہ ماہ افروز سے شادی کے بعد رخصت ہوتے وقت کہتا ہے۔

"اگر بعد میرے تمہارے بطن سے بیٹا پیدا ہو تو اس کی خبر سلطان ابوالقاسم اور میرے پدر سید اعزالدین سے کہلا بھیجنا اور اگر دختر ہو تو مجھ سے بھی نہ کہلانا۔ جب ملاقات ہوگی تو حال معلوم ہو جائے گا۔"[۳]

چنانچہ جب ملکہ مذکور کے دختر پیدا ہوئی تو بہ سبب شرمندگی اس نے کسی کو خبر نہ کی اور اظہار افسوس کیا[۴]

"سبحان اللہ میری خواہر شب افروز کی قسمت میں تو پسر تھا اور میری قسمت میں دختر۔ تمام خواتین نے کہا کہ اے ملکہ کفرانِ نعمت نہ کرو بلکہ ہر ساعت شکرِ الٰہی بجالاؤ کہ حق تعالیٰ نے ایسی دختر تم کو عنایت کی کہ جو ہزار بیٹوں سے افضل ہے۔"[۵]

اگرچہ داستان نگار نے خواتین سے یہ بات کہلوا کر اسلام کے نظریے کو ظاہر کر دیا ہے، اور آگے چل کر اسی دختر کو جلیل القدر سلطان کی حیثیت سے پیش کیا ہے جس نے میدانِ جنگ میں بڑے بڑے شہ زور پہلوانوں کو شکست دی۔ اور اس طرح دختر کو پسر کے برابر لا کر کھڑا کر دیا۔ لیکن وہ مردوں کے ان ذہنوں کو نہیں بدل پایا جو لڑکی کو گھر کی چہار دیواری کے باہر دیکھنا

---

[۱] ۲۸۸ ج ۱، [۲] ۳۶۳ ج ۱، [۳] ۱۹۴ ج ۱، [۴] [۵] ۳۶۳ ج ۱،

پسند نہیں کرتے یعنی جب رکن الملک کو معلوم ہوا کہ صاحبقران روزگار جس نے بیشتر پہلوانوں کو شکست دی، میری دختر ہے، نہایت برہم ہوا اور تلوار کھینچ کر اس کی طرف چلا کہ:-

"حق تعالیٰ نے عورتوں کو پردہ نشینی کا حکم دیا ہے اور اس شوخ دیدہ نے یہ جرأت کی "[1]

رکن الملک کی اس برہمی میں وہ غصہ بھی شامل معلوم ہوتا ہے جو ملکہ ماہ افروز کے بطن سے لڑکی پیدا ہونے کی خبر سننے کے ردعمل سے ظاہر ہوتا کیونکہ ملکہ سے رخصت کے وقت ہی اس نے یہ کہکر ناخوشی کا اظہار کیا تھا کہ اگر دختر ہو تو کسی کو اطلاع نہ کرنا۔

یہ اثر ہندوستانی مسلمانوں کے ذہنوں پر اہل ہنود سے آیا، جس طرح نومسلم اپنی اور رسوم کو نہ چھوڑ سکے، اسی طرح اس ذہنیت کو بھی نہ بدل سکے جس میں دختر کی ولادت پر بجائے چراغاں کے ماتمی لباس پہن کر رنج و ملال کیا جاتا ہے۔

رسم ستی

ہندوستان میں جس طرح لڑکی کی پیدائش کو نیک شگون نہیں سمجھا جاتا تھا اسی طرح ایک اور بری رسم بھی رائج تھی اور وہ یہ کہ جب کوئی عورت بیوہ ہو جاتی تو اسے شوہر کی لاش کے ساتھ زندہ جلنا ہوتا تھا اس رسم کو ستی کی رسم کہتے ہیں۔ انگریزی عہد تک اہل ہنود میں یہ رسم رائج رہی۔ مسلمانوں کے عہد حکومت میں بھی یہ وحشی رسم کم ہو گئی تھی۔ محض وہی عورتیں ستی ہوتی تھیں جن کی مرضی شامل ہوتی۔

ابن بطوطہ جو محمد بن تغلق کے عہد میں ہندوستان آیا، ستی کی رسم کا ایک چشم دید واقعہ نقل کرتا ہے:-

"جن تین بیواؤں نے ستی ہونے کا ارادہ کیا تھا وہ تین دن پہلے گانے بجانے اور کھانے میں مشغول ہو گئیں، ان کے پاس ہر طرف سے عورتیں آتی تھیں اور چوتھی صبح کو ان کے پاس ایک ایک گھوڑا لائے اور ہر بیوہ بناؤ سنگار کر کے اور خوشبو لگا کر اس پر سوار ہوئی اس کے دائیں ہاتھ میں ناریل تھا جس کو

---

[1] ص ۳۶۱ ج ۱۔

اچھالتی جاتی تھی اور بائیں ہاتھ میں آئینہ تھا اس میں منہ دیکھتی جاتی تھی،
برہمن اس کے گرد جمع تھے اور اس کے رشتہ دار ساتھ تھے آگے آگے
نوبت اور نقارے بجتے جاتے تھے ہر ایک ہندو اس سے کہتا تھا کہ میرا
سلام میرے ماں باپ یا بھائی یا دوست کو کہنا اور وہ کہتی تھی اچھا اور
ہنستی جاتی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک ایسی جگہ پہونچے جہاں پانی بکثرت
تھا اور درختوں کی کثرت سے اندھیرا ہو رہا تھا، بیچ میں چار گنبد تھے
ہر گنبد میں ایک ایک بت تھا اور گنبد کے بیچ پانی کا حوض تھا اس پر
درختوں کے سبب دھوپ نہ پڑتی تھی جب یہ عورتیں ان گنبدوں کے
پاس پہونچی تو حوض میں اتر کر انھوں نے غسل کیا اور حوض میں غوطہ لگایا
اور اپنے کپڑے اور زیورات اتار کر علیحدہ رکھ دئے اور انھیں خیرات کر دیا
پھر ان کے بجائے ایک موٹی ساڑھی باندھ لی، حوض کے پاس ایک نیچی
جگہ آگ دہکائی گئی اور جب اس پر سرسوں کا تیل ڈالا گیا تو وہ شعلے
مارنے لگی، پندرہ آدمیوں کے ہاتھ میں لکڑی کے گٹھے لگے ہوئے تھے
عورت نے ۔ ۔ ۔ آگ کی طرف ڈنڈوت کی اور اپنے تئیں ڈال دیا اس
وقت نقارے اور نفیریاں بجنی شروع ہوئیں۔ لوگوں نے پتلی لکڑیاں جو
ہاتھوں میں لئے ہوئے تھے آگ میں ڈالنا شروع کیں اور اس کے اوپر
بڑے بڑے کندے ڈال دئے تاکہ وہ عورت حرکت نہ کر سکے۔ حاضرین
نے بھی نہایت شور کیا" [1]

یہ واقعہ دیکھ کر ابن بطوطہ بے ہوش ہو گیا تھا، برنیر نے بھی اپنے سفرنامے میں بیواؤں کے ستی ہونے کے کئی واقعات درج کئے ہیں [2]، "بوستان" میں اگرچہ کسی بیوہ کو ستی ہوتے نہیں دکھایا ہے لیکن رسم ستی کا تذکرہ کیا گیا ہے یعنی مصنف کے ذہن میں اپنے عہد کی یہ رسم بھی تھی سے، لکھتا ہے کہ :-

" ملکہ تاج افروز نے کہا اے خواہر ہر گاہ زنان ہندوستان زندہ شوہر مردہ کے

---

[1] سفرنامہ ابن بطوطہ، قسط ۳، ص ۱۰۵؛ [2] برنیر، ص ۴۹۷،

ساتھ آگ میں جل جاتی ہیں اگر ہم اپنے مطلوبوں کے غلبہ عشق میں غریق بحر فنا ہوں گے تو کیا تعجب کا مقام ہے"۱ے

رشوت خوری

رشوت خوری کا بازار ہر زمانہ میں گرم رہا ہے فرق اتنا ہے کہ کبھی اس کا چلن زیادہ رہا اور کبھی کم۔ راجاؤں کے عہد میں بھی رشوت لی جاتی تھی، سلاطین کے زمانہ میں بھی رشوت سے جیبیں گرم کی گئیں اور مغلوں کا عہد بھی اس اخلاقی اور سماجی برائی سے محفوظ نہیں رہا، اٹھارہویں صدی میں تو بیشتر برائیاں نقطۂ عروج پر پہونچ گئی تھیں بادشاہ کے دربار سے لے کر قاضی کی عدالت تک ہر کام کے لیے رشوت دینی پڑتی تھی جبکہ اسلامی اصول کے مطابق رشوت لینا اور دینا دونوں ناجائز ہیں لیکن دینے والا مجبوری میں دیتا تھا اور لینے والا بخوشی لیتا تھا کیونکہ شرعی احکامات کو تہ کر کے طاق میں رکھ دیا تھا۔ حاتم نے اپنے عہد کو یوں نظم کیا ہے ؎

یہاں کے قاضی و مفتی ہوئے رشوت خور
یہاں کے دیکھ لو سب اہل کار ہیں گے چور،
یہاں کرم سے نہیں دیکھتے ہیں اور کی اور
یہاں سبھوں نے بھلائی ہے دل سے موت اور گور

یہاں نہیں ہے گذارا بغیر دار و مدار

رشوت خوری کا ایسا ہی ماحول کہیں کہیں "بوستان" میں بھی ملتا ہے، یہاں بادشاہ بھی رشوت لینے میں تکلف نہیں کرتا۔

"اس نے بادشاہ طالع شاہ کو زرِ خطیر دیا اور سرکار شاہی سے خدمت میر بحر اپنے نام نہاد کروائی"۲ے

رشوت دے کر صرف عہدے ہی حاصل نہیں کیے جاتے بلکہ سرداروں کی وفاداری بھی خریدی جاتی ہے۔

"اوّل القوم ترک کو مع دس ہزار آدمیوں کے اس کی طرف بھیجا، خونخوار قصاب نے القوم کو رشوت دے کر اپنے متفق کر لیا"۳ے

۱۔ ا، ۵، ج ۱۵، ۲ے ۳۴۸ ج ۱۳، ۳ے ۵۵۴ ج ۱۱،

ظاہر ہے جب اہل دربار رشوت کے لین دین میں خود شریک ہوں گے تو ان کی رعایا خود بخود ان کا اتباع کرے گی۔ چھوٹے طبقہ کا ہر آدمی اپنے سے بڑے طبقہ کے افراد کا تتبع کرتا ہے، مثلاً ایک مصور بھی بغیر رشوت کے تصویر نہیں دیتا ہے:۔

"میں نے سنا ہے کہ بہزاد بغیر رشوتِ معقول تصویر بادشاہ کی کسی کو نہیں دیتا۔"[۱]

یہاں تک کہ عاشق و معشوق کے وصال کا ذریعہ بننے والا تیسرا آدمی بھی رشوت چاہتا ہے:۔

"اے اسلم ہمیں یہ حال خوب تحقیق ہوگیا کہ تو مدت دراز سے ۔ ۔ ۔ شہرگ پر مفتون ہے مگر مہربان خالی خوشامد سے کام نہیں چلتا ایسے معاملات میں زرِ خطیر صرف ہوتا ہے اگر تیرے پاس کچھ زرِ نقد جمع ہے ہمیں دے ۔ ہم اسی وقت یہ کام حسبِ دل خواہ انجام دیں گے۔"[۲]

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ رشوت لینا کتنی عام سی بات تھی اور لوگ اس قدر عادی ہو گئے تھے کہ مانگنے میں بھی کسی طرح کی شرم یا جھجک محسوس نہیں کرتے تھے بلکہ اپنا حق سمجھ کر مانگتے تھے۔

غرضکہ "بوستان" میں ان تمام برائیوں کی طرف اشارے ملتے ہیں جو "بوستان" کے عہد تصنیف میں عام ہو گئی تھی۔ انھیں اخلاقی برائیوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے داستان نگار کہتا ہے:۔

"تم کو نہیں معلوم کہ نوع انسان میں ایسے شیاطین ہیں کہ شیطان اور جنیان ان کے شاگرد کو بھی نہیں پہونچ سکتے۔"[۳]

عام لوگوں میں برائی اور بدکرداری کا یہ عالم ہے کہ اپنی بیویوں کو بھی اپنا کام نکالنے کے لئے پیش کر دیتے ہیں[۴]۔ دراصل برائی بھی اس وقت پھیلتی ہے جب سرپرست برا بن جاتا ہے مثلاً جمشید کو جب شہر کی کوتوالی ملی تو اس نے اپنے اختیارات کا ناجائز فائدہ اٹھایا اس کا ہر رات کا یہ معمول تھا کہ کسی نہ کسی کے گھر میں جاتا اور ان کی مستورات سے بجبر فعلِ شنیع کرتا[۵]۔ حاکم کا اثر اس کے ماتحتوں پر پڑتا ہے وہ بھی برائی کی راہ پر چلتے ہیں۔ کبھی کوئی پہرے دار کسی مسافر کا سامان چھین لیتا ہے[۶] اور کبھی کوئی اپنی ذمہ داریوں کو یہ کہکر انجام نہیں دیتا کہ "جہاں اس جرم میں تمام نگہبان اور پاسدار ماخوذ ہوں گے ہم بھی ان کے ساتھ ہیں"[۷]۔

لے ج۲، ص۳۴۲، ۲ے ج۲، ص۳۴۴، ۳ے ج۱، ص۵۵، ۴ے ج۱، ص۹۹، ۵ے ج۲، ص۸۵، ۶ے ج۲، ص۶۷۷، ۷ے ج۴، ص۹۰، ج۴

داستان میں اگر برائیوں کو پیش کیا گیا ہے تو اس کے برے نتائج بھی ظاہر کر دیے ہیں، برے آدمی کو حقارت سے دیکھا گیا ہے، برے آدمی کو طرح طرح سے ذلیل بھی کیا ہے تاکہ آدمی برائی سے بچے داستان نگار کو اس بات کا احساس ہے کہ دنیا فانی ہے اسی لئے وہ کہانی سناتے وقت نصیحت بھی کرتا ہے :۔

لیکن اسقدر کہتا ہوں کہ دنیا محل زوال ہے اور اس میں سوائے نیکی کے کچھ باقی نہیں رہتا جس قدر ہو سکے خلقِ خدا سے نیکی کرو، کسی کے دل کو آزار نہ دو اور اپنے کو عاجز ترین مخلوقات سمجھو اور زنہار حالِ دنیا پر تکیہ نہ کرو کہ اس نے کسی سے وفا نہیں کی اور نہ کرے گا امورِ دینی کو دنیاوی پر سبقت دو۔[۱]

داستان نگار کے نزدیک دنیا ایک طلسم ہے جس کی چمک دمک صرف وقتی ہے۔ دنیا کا مال و زر بہتے ہوئے پانی کی طرح ہے جو شخص اس کے پیچھے بھاگتا ہے اسے خجالت کا سامنا کرنا پڑتا ہے جب پانی کی طرح دولت ہاتھ سے نکل جاتی ہے۔ "بوستان" میں اس بات کو اس طرح پیش کیا ہے کہ دست برعجائب میں صاحبقران اور مہتر توفیق گھومتے گھومتے ایک باغ میں پہونچتے ہیں، جہاں طاؤسوں کا مجمع ہے ہر ایک اپنی منقار سے ریزہ ہائے مرجان و یاقوت رمانی اور مروارید مثل باراں برسا رہا ہے توفیق کے دل میں یہ جواہرات دیکھ کر لالچ پیدا ہوتا ہے اور وہ انھیں اٹھانا چاہتا ہے لیکن جب وہ ان جواہرات کو ہاتھ لگاتا ہے تو وہ پانی ہو کر بہہ جاتے ہیں، طاؤس توفیق کے طمع پر خندہ زن ہوتے ہیں اور توفیق نادم ہوتا ہے[۲]۔

داستان نگار علامتی کہانی کو بیان کر کے یہ واضح کرنا چاہتا ہے کہ دنیا کے مال و زر کی چمک دمک محض فریب ہے اور جس نے خود کو اس چمک دمک سے بچائے رکھا وہی کامیاب ہے ورنہ غلطی کی سزا ہر ایک پائے گا۔ صاحبقران کی غلطی پر بھی اسے سزا ملتی ہے، مثلاً ایک مرتبہ صاحبقران پیر مرد کی نصیحت کے باوجود ایک نازنین سے مختلط ہوا نتیجہ میں اسے صحرانوردی میسر آئی ہے[۳] اسی طرح صاحبقران اکبر کے رفیق جوہر کو حکیم قسطاس الحکمت نے جب ایک طلسم کی سیر کے لئے بھیجا، وہاں غمزہ شیریں کار سے اس کا عقد ہوا لیکن ایک روز جوہر نے غمزہ کی غیر موجودگی میں بستان افروز سے مختلط ہونے کی کوشش کی۔ غیر عورت سے بوس و کنار کا نتیجہ یہ نکلا کہ نہ وہ

۱؎ ص ۶۵۵ ج ۱، ۲؎ ص ۳؎ ص ۳۰۶ ج ۴، ۴؎ ص ۷۶ ج ۹م،

باغ رہا، نہ وہ مکان اور نہ غمزہ نہ لبستان[۱]۔ غیر عورت سے صحبت کرنے کا ارادہ کرنے پر حمیرہ عیار کو منہ سیاہ کر کے گدھے پر بٹھایا گیا[۲]۔ داستان میں ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں جن کو پیش کر کے داستان نگار اخلاقی پستی کو ختم کرنا چاہتا ہے۔ طلسم بیابان میں ایک ایسا مقام ہے جہاں خوبصورت نازنینیں سخنہائے دلفریب سے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں اور جب آدمی ان کی طرف متوجہ ہوتا ہے یا جاتا ہے تو بری طرح مارا جاتا ہے اور حیوانوں کی خوراک بنتا ہے[۳]۔ یہ نازنینیں در اصل وہ طوائفیں ہیں جو مردوں کو اپنی طرف کھینچتی ہیں اور جن کے پاس جانا غریق بحر فنا ہونا ہے یعنی گناہ دیکھنے میں خوبصورت معلوم ہوتا ہے لیکن اس کا انجام بدصورتی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ داستان نگار نے "بوستان" میں اچھے اور برے دونوں پہلوؤں کو وضاحت سے پیش کر دیا ہے جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ حساس طبیعت لوگ اپنے عہد کی اخلاقی پستی کو محسوس کر رہے تھے اور بے بسی و لاچاری کی حالت میں کف افسوس مل رہے تھے۔

۱؎ ۲۷، ج ۲، ۲؎ ۳۴۴، ج ۱، ۳؎ ۲۷۴، ج ۳،

اعتقادات

توہم پرستی۔ نجومیوں پر یقین۔ فقراء سے عقیدت۔ قبر پرستی۔ نذر و نیاز۔ منّت۔ خیرات۔ بُت پرستی۔ آفتاب پرستی۔ بحر پرستی۔ درخت پرستی وغیرہ۔

دنیا کا کوئی علاقہ اور کوئی قوم توہمات سے آزاد نہیں، ہر مذہب کے ماننے والے کسی نہ کسی سطح پر اس میں ملوث نظر آتے ہیں۔ ہمیں اس سے بحث نہیں کہ عرب و مصر و یونان کے قدیم باشندوں کے اعتقادات کیا تھے اور وہ کس حد تک توہم پرست تھے ہم صرف ہندوستان ہی کو زیر بحث لاتے ہیں۔

یہ بات تو مسلّم ہے اور اسے غیر ممالک کی قومیں بھی تسلیم کرتی ہیں کہ قدیم ہندوستان علماء و علوم کا بڑا مرکز تھا یونان کے فلسفیوں نے بھی یہاں کے فلسفے سے استفادہ حاصل کیا۔ علم طب، علم نجوم، علم ریاضی وغیرہ میں یہ لوگ پیش پیش تھے۔ جاحظ (متوفی ۲۵۵ھ / ۸۶۸ء) نے لکھا ہے کہ نجومی حساب دوسری قوموں نے انھیں سے سیکھا ہے[1]۔ یعقوبی (متوفی ۲۸۴ھ / ۸۹۷ء) نے فلسفہ اور غور و خوض کو ہندوؤں کا طرۂ امتیاز کہا ہے[2]۔ طبقات الامم کے مؤلف قاضی صاعد اندلسی (متوفی ۴۶۲ھ / ۱۰۷۰ء) نے ہندوستان کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:-

"ہندوستان ہر زمانہ میں دنیا کی تمام اقوام کے نزدیک حکمت و دانائی کی کان انصاف اور حسنِ سیاست کا گہوارہ، غالب عقل اور صائب رائے داناؤں، سمجھ بوجھ سے بھرپور کہاوتوں اور عجیب و غریب علمی نتائج اور نکات کا سرچشمہ رہا ہے ـــــ ہیئت کے رموز، نجومی مسائل سارے ریاضی علوم میں انھیں غیر معمولی دستگاہ حاصل ہے اس کے علاوہ فن طب میں جتنے ماہر ہوتے ہیں اور دواؤں کی خاصیت اور موجودات کے مزاج کا ان کو جتنا گہرا اور جامع علم ہے اس میں کوئی دوسری قوم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی ہے[3]"

ان بیانات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اہلِ ہند زمانۂ قدیم ہی سے علم و ادب کے نہ صرف شائق رہے ہیں بلکہ ان میں مہارت حاصل کی ہے لیکن صاف عقل اور تیز ذہن رکھنے کے باوجود یہ لوگ توہم پرستی سے نجات حاصل نہ کر سکے اور اس میں کمی نہ لا سکے۔ گوری شنکر ہیرا چند نے اپنے ایک خطبہ میں قرونِ وسطیٰ کی ہندوستانی تہذیب کا تذکرہ اس طرح کیا ہے:-

"ادبیات اور نظریات میں انتہائی ترقی ہونے کے باوجود عوام میں توہمات

۱ء عربی لٹریچر میں قدیم ہندوستان، مرتبہ ڈاکٹر خورشید احمد فارق۔ ص ۵۰، ۲ء ایضاً ص ۵۱،
۳ء ایضاً۔ ص ۵۲-۵۳،

کی کمی نہیں تھی لوگ جادو ٹونے، بھوت پریت وغیرہ کے معتقد تھے۔ جادو
ٹونے کا رواج ہندوستان میں زمانۂ قدیم سے چلا آتا تھا۔ اتھروید میں تسخیر
تالیف، تخریف وغیرہ کا ذکر موجود ہے۔ راجہ کے پروہت اتھروید کے عالم
ہوتے تھے، دشمنوں کا خاتمہ کرنے کے لیے راجہ جادو ٹونے اور عملیات
بھی کام میں لاتا تھا۔ ہمارے زمانۂ زیرِ بحث میں ان توہمات کا بہت زور
تھا۔ بان نے پربھاکر وردھن کی موت کے وقت لوگوں کے آسیب کا
شبہ کرنے اور اس کے ردِ عمل کا ذکر کیا ہے۔ کادمبری میں بھی بان نے
لکھا ہے کہ ولاس وتی اولاد کے لیے تعویذ پہنتی تھی، گنڈے باندھتی تھی
گیدڑوں کو گوشت کھلاتی تھی، بھوتوں کو خوش کرتی تھی اور رمالوں
کی خاطر تواضع کرتی تھی۔ اسی طرح حمل کے وقت ارواحِ خبیثہ سے اس
کی حفاظت کرنے کے لیے پلنگ کے نیچے حلقے بنانے، گوروچن سے بھوج
پتر پر لکھے ہوئے منتروں کے جنتر باندھنے، چڑیل سے بچنے کے لیے
مورپنکھیوں کے ارسینے، سفید سرسوں بکھیرنے وغیرہ عملیات کا ذکر کیا ہے
بھوبوتی نے مالتی مادھو میں لکھا ہے کہ اگھور گھنٹ مالتی کو دیوی کے مندر
میں حصولِ مقصد کے لیے قربان کرنے لے گیا تھا، گوڈوھو میں بھی دیوی کو
خوش کرنے کے لیے آدمیوں اور جانوروں کے قربان کرنے کا ذکر ہے....
لوگ بھوت پریت، ڈاکنی، شاکنی وغیرہ کے معتقد تھے...... راجہ
لوگ جادو منتروں سے دشمنوں کو قتل کرانے یا زخموں کو منتروں کے
ذریعہ اچھا کرنے کا عمل کرتے تھے، دیویوں کو خوش کرنے کے لیے جانوروں
اور آدمیوں کو بلی دینے کی وحشیانہ اور شرمناک رسم اس وقت بھی
موجود تھی [۱]

اس طرح کے اعتقادات کا سبب یہ ہے کہ عام ذہن محسوسات کو تسلیم کرتا ہے ان کی قوت
اور ہیبت کے آگے سر جھکا دیتا ہے، معقولات کو اس کا ذہن، دل اور دماغ قبول نہیں کر پاتا، وہ

---

[۱] قرونِ وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب از گوری شنکر ہیرا چند۔ ص ۷۳-۷۲،

ظاہرا چیزوں پر زیادہ یقین رکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ بیشتر مذاہب کے ماننے والے اپنے دیوتاؤں اور خداؤں کی شبیہ اپنے روبرو رکھتے ہیں اور انھیں سجدہ کرتے ہیں جس سے انھیں یہ احساس رہتا ہے کہ ان کا خدا ان کے سامنے ہے خدا انھیں دیکھ رہا ہے اور وہ خدا کو دیکھ رہے ہیں۔ انسان کی اسی طبیعت نے بت پرستی کو رواج دیا۔ فطرت کی غیر معمولی قوتوں کو اس نے پوجنا شروع کردیا کیونکہ ان پر اسے اپنی زندگی کا انحصار نظر آیا۔ آفتاب ایک آگ کے گولے کی شکل میں نمودار ہوا اور کائنات روشن ہوگئی۔ دیکھنے والوں نے اس خلافِ عقل شئے کو دیکھ کر اس کے آگے سر جھکا دیا اور اسے اپنا دیوتا مان لیا۔ آگ کو اس لئے دیوتا مانا کہ وہ نہ صرف قہر بن کر سامنے آتی ہے بلکہ حضرت ابراہیمؑ کے لئے گلزار بھی بن جاتی ہے، زمین کو اس لئے ماں کہا کہ وہ کھانے کو غذا فراہم کرتی ہے غرضکہ اسی طرح محسوسات کے آگے سرنگوں ہونے کا ماحول ہندوستان میں زمانہ قدیم سے تھا، مسلمان یہاں ایک نادیدہ خدا کا تصور لائے اور انھوں نے کہا کہ سوائے خدا کے کسی سے توقع رکھنا شرک ہے، بت پرستی کی انھوں نے مذمت کی۔ اسلام میں برابری کے تصور کو دیکھ کر ہزاروں ہندو مسلمان ہوئے کیونکہ وہ ہندوؤں کی کٹر چھوت چھات سے تنگ آگئے تھے، ان نومسلموں نے باہر سے آئے ہوئے مسلمانوں پر بہت اثر ڈالا، یعنی یہ مسلمان اپنے کٹرپن پر قائم نہ رہ سکے بلکہ نومسلموں کے ساتھ ان کے عقائد اور روایات میں بھی تبدیلیاں رونما ہونے لگیں ہندوستانی مسلمانوں نے اسلام قبول کرکے خدا اور رسولؐ کے احکامات پر عمل کرنا تو شروع کردیا لیکن صدیوں سے چلی آرہی رسومات اور عقائد کو ازسر ترک نہ کرسکے۔ انھیں عقائد اور رسومات کے زیر اثر ہندوستانی مسلمانوں میں بہت سارے تیوہار منائے جانے لگے۔ جو عرب میں نہیں تھے۔ ڈاکٹر تارا چند نے مسلمانوں پر ہندوستانی اثرات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:-

"ہندوستانی زندگی کے ہر شعبہ میں مسلمانوں کے اثرات پڑے لیکن یہ اثرات رسم ورواج، گھریلو زندگی، موسیقی، پوشاک ولباس، کھانے پکانے کے طریقوں، شادی بیاہ کے مراسم، تیوہاروں، میلوں اور مرہٹہ، راجپوت اور سکھ والیانِ ریاست کے درباروں کے آداب میں زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں بابر کے زمانہ میں ہندو مسلمان اس طرح ملے جلے رہتے تھے کہ بابر مسلمانوں کے ہندوستانی طرزِ زندگی کو دیکھ کر متعجب ہوگیا تھا[۱]"

---

[۱] ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک جھلک، ص ۴۱۳

ہندو اور مسلمانوں کو یکجا کرنے اور ان کے مابین باہمی میل جول بڑھانے میں صوفیاء نے بڑا کام کیا، صوفیاء کی مجالس میں مذہب و ملت کی تفریق کے بغیر سبھی شریک ہوتے تھے، صوفیاء کی خانقاہیں سماجی زندگی کا ایک اہم حصہ بن گئی تھیں۔ ایک اندازے کے مطابق محمد بن تغلق کے زمانہ میں دھلی میں، دو ہزار خانقاہیں تھیں[1] لوگوں کو خانقاہوں کی جو بات متاثر کرتی تھی وہ وہاں کا مساوی ماحول تھا، امیر، غریب اور ہندو مسلم میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا تھا۔ صوفیاء درباری زندگی سے دور رہتے تھے، خود سلاطین ان کے معتقد تھے اور اکثر ان کی مجالس میں آکر بیٹھتے تھے پروفیسر خلیق احمد نظامی حضرت نظام الدین رح کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "صبح سے لے کر آدھی رات گئے تک آنے جانے والوں کا ہجوم رہتا تھا، سڑک پر آنے جانے والوں کی بھیڑ سے میلے کا گمان ہوتا تھا[2]۔ خانقاہوں کے ذریعہ اسلام کی بہتر تبلیغ تو ہوئی، غیر اسلام اس کے مساویانہ رویے سے متاثر ہو کر مسلمان بھی ہوئے لیکن رفتہ رفتہ مسلمان اسلام کے بنیادی ارکان کو نظر انداز کر کے محض اسی پر تکیہ کرنے لگے، یعنی بزرگوں کے مزارات پر عرس اور میلے لگانے شروع کر دیئے قبر پرستی کو رواج دیا اور بجائے خدا کے حضور میں دست دعا اٹھانے کے جبین اطاعت قبروں کے آگے جھکانے لگے، مغلوں کے دور تک آتے آتے ان اعتقادات میں اور بھی پختگی ہو گئی اور پھر ایک وقت تو یہ آیا کہ لوگوں نے عوام و خواص کا خانقاہوں کی طرف رجحان دیکھکر تصوف کو کاروبار بنالیا طرح طرح سے کمزور اعتقاد رکھنے والے افراد کو یہ لوگ لوٹنے کھسوٹنے لگے۔

اسی ماحول نے توہم پرستی کو ہندوستانی مسلمانوں سے علیحدہ نہیں ہونے دیا، بھوت پریت، جادو ٹونے سے اہل اسلام بھی نجات حاصل نہ کر سکے، علم نجوم اہل ہنود کا قدیم اور بڑا علم تھا، جس کے بارے میں البیرونی نے لکھا ہے کہ "ہندوؤں کا سب سے زیادہ مقبول اور چلتا ہوا علم نجوم ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ نجوم کا ان کے مذہبی معاملات سے خاص تعلق ہے[3]۔ ہندوستان کے مسلمان بادشاہ بھی اس پر یقین رکھتے تھے، ہر دربار سے درباری نجومی وابستہ تھے۔ بغیر ان سے دریافت کئے کوئی سفر یا کوئی جنگ نہیں کرتے تھے، حتیٰ کہ کسی سے ملاقات بھی اُس ساعت میں کرتے تھے جو نجومی بتاتا تھا۔ برنیر شہر دھلی کے ان نجومیوں کے بارے میں لکھتا ہے کہ :-

---

[1] صبح الاعشیٰ ماخوذ اوراق مصور۔ ص ۴۶ ، [2] اوراق مصور۔ ص ۴۹ ،

[3] عربی لٹریچر میں قدیم ہندوستان۔ ص ۳۱۶ ،

"ہندو اور مسلمان نجومیوں اور رمالوں کا مرجع ہے اور یہ فاضل نجومی دھوپ
میں ایک میلا سا قالین کا ٹکڑا بچھائے بیٹھے رہتے ہیں جن کے پاس علم ریاضی
کے کچھ پرانے آلات ہوتے ہیں اور سامنے ایک بڑی سی کتاب کھلی رہتی ہے
جن میں بارہ برجوں کی شکلیں بنی ہوئی ہوتی ہیں اور اس طور سے یہ راہ چلتے
لوگوں کو پھسلاتے اور فریب دیتے ہیں اور عوام الناس غیب داں سمجھ کر
ان سے رجوع کرتے ہیں اور یہ ایک پیسہ لے کر بیچارے حمقا کو بتاتے ہیں
کہ ان کی قسمت میں آیندہ کیا ہونا ہے ۔۔۔۔۔۔ خود بادشاہ اور بڑے
بڑے امیر ان فریبی غیب گویوں کو بڑی بڑی تنخواہ دیتے ہیں اور بغیر ان کی
صلاح کے کوئی ادنیٰ کام بھی شروع نہیں کرتے ۔ یہ نجومی گویا آسمان میں
لکھی ہوئی باتیں جانتے اور ہر ایک کام کے کرنے کے لیے مبارک گھڑی
تجویز کرتے اور ہر ایک شبہ کو قرآن سے فال نکال کر حل کر دیتے ہیں[1]"

ایمانی جذبے میں جب کمزوری ہوتی ہے تو جھوٹے اعتقادات اور توہمات پر یقین مضبوط ہو جاتا ہے۔ ہم نے پہلے عرض کیا کہ انسانی ذہن ظاہری اشیاء کی طرف پہلے مائل ہوتا ہے، اور جلد اس پر ایمان لے آتا ہے، اہل ہنود تو پہلے ہی سے ظاہر پرست تھے، مسلمانوں نے بھی ان کے ساتھ رہ کر ان کا اثر قبول کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں بھی توہم پرستی کو مذہبی درجہ حاصل ہو گیا اس کے ساتھ بھی ثواب اور عذاب کا تصور وابستہ کیا جانے لگا " بوستانِ خیال " میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں ۔

یہ یقین آج بھی موجود ہے کہ اگر کسی شخص کا اس کی غیر موجودگی میں ذکر کیا جائے اور اثنائے ذکر وہ آجائے تو یہ اس کی لمبی عمر ہونے کی دلیل ہے " بوستان کا ایک شاہزادہ یوں کہتا ہے کہ :۔

"شاہزادہ نے فرمایا اے برادرِ عالی قدر کیا خوب وقت پہونچا ہے ہم تیرا ہی
ذکر کر رہے تھے ، ہنگام یاد دہی آدمی کا پہونچنا درازیٔ عمر کی نشانی ہے[2]"

اس وہم پر پہلے بھی لوگوں کو یقین تھا اور آج بھی ہے کہ اگر کسی کام کے شروع کرنے سے پہلے یا کہیں جانے سے قبل جانے والے کو یا کسی اور کو چھینک آجائے تو وہ کام اچھا نہیں ہوگا یا سفر ٹھیک نہیں گذرے گا[3]

---

[1] سفرنامہ برنیر۔ ص ۵۵۴ ، [2] ۳۰۴ ج ۴ ،

"جس وقت میں لوح دیکھنے کا ارادہ کرتا تھا پے در پے تین چھینکیں آتی تھیں اور چھینک مانع الفعل مشہور ہے"[1]

"شاہزادہ وہاں سے روانہ ہوا چاہتا تھا کہ ایک گاذر نے چھینک لی، ہر گاہ عطس شاہد القول اور مانع الفعل ہے وہاں توقف کیا"[2]

دائیں اور بائیں آنکھ کے پھڑکنے کو بھی نیک اور بد شگون تصور کیا جاتا تھا۔

"میں کل ضرور شہاب الدین سے ملوں گی کیا معنی کہ آج آنکھ چپ میری پھڑکتی ہے اس کی تعبیر برادر کی ملاقات ہے یا شوہر کی"[3]

"کل سے آنکھ چپ میری پھڑکتی ہے یقین ہے کہ ایک دو دن میں جمشید سے ضرور ملوں گی"[4]

"بوستان" کی شاہزادیاں اور شاہزادے قسمیں بھی دیتے ہیں۔

"ملکہ نے فرمایا خلدانہ تجھے معزالدین اور ابوالحسن کے سر کی قسم جو حال میں تجھ سے پوچھوں بے کم و زیادہ میرے روبرو بیان کرنا"[5]

قسم کو اتارنے کے لئے کفارہ ادا کرنے کے بھی قائل ہیں۔

"اگر شہریار ارشاد کرے تو میں اس کا کفارہ دے دوں تاکہ وبالِ قسم مجھ پر نہ رہے"[6]

نظر بد سے بچانے کے لئے خواتین طرح طرح کے طریقے استعمال کرتی ہیں، کبھی ماتھے پر کالا ٹیکہ لگا دیتی ہیں، کبھی کوئی دعا پڑھ کر دم کرتی ہیں اور نظر لگ جانے پر مختلف طریقوں سے نظر اتارتی ہیں، کبھی نمک اور سرخ مرچوں کو جلاتی ہیں اور کبھی سل اور بٹے سے نظر اتاری جاتی ہے۔ شاہزادہ خورشید تاج بخش بہت خوبصورت تھا والدین کو ڈر تھا کہ کہیں کسی کی نظر نہ لگ جائے اس لئے محل میں بھی اسے نقاب افگندہ رکھتے تھے ایک مرتبہ جب اس کی مادر ملکہ نے اس کے چہرہ سے نقاب ہٹائی تو محل منور ہو گیا، نظر سے بچنے کے لئے شاہزادے پر اسمائے بزرگ دم کئے گئے :۔

"خواصوں نے حسب الحکم چار طرف مجمروں میں سپند جلایا اور اکثر اسمائے بزرگ

---

[1] ص ۳۰۲ ج ۵، [2] ص ۲۶۳ ج ۲، [3] ص ۳۳۴ ج ۲، [4] ص ۳۹۷ ج ۳، [5] ص ۴۴۳ ج ۳، [6] ص ۵۳۱ ج ۱،

سراپا پر پھونکے لے[1]

بعض اوقات آدمی کسی شے کو اپنے لئے نیک تصور کرلیتا ہے اور کبھی بد یعنی فلاں چیز میرے پاس آگئی اس لئے ایسا ہوا یا فلاں کے نصیب سے مجھے یہ سب کچھ ملا یا کسی منحوس قدم سے گھر تباہ ہو گیا جہانگیر نے تزک میں ایک جگہ لکھا ہے کہ :۔

"ہفتہ ۱۰ ذیقعد کو وزیرالملک جو میرا دیوان تھا اسہال کے مرض میں فوت ہو گیا عمر کے آخری حصے میں اس کے گھر میں ایک منحوس لڑکا ہوا جس کی وجہ سے ۴۰ دن کے اندر اندر ماں اور باپ دونوں راہی ملک عدم ہوئے"[2]

یہ محض اتفاقیہ امور تھے کہ لڑکے کی ولادت پر والدین فوت ہو گئے لیکن توہم پرست ذہن نے اسے لڑکے کی منحوسیت سمجھ لیا۔ اسی طرح بوستان میں ایک بادشاہ نے ایک سفید ہاتھی خریدا، اتفاق سے ہاتھی کے آنے کے بعد بادشاہ کی حشمت و دولت میں ترقی ہوئی، بادشاہ نے اسی وجہ سے اس کا نام فیل اقبال رکھ دیا ایک مرتبہ شکار کھیلتے وقت ایک مادہ فیل نظر آئی فیل اقبال پھر کسی سے نہ رکا اور مادہ فیل کے ساتھ چلا گیا بادشاہ کو بڑا دکھ ہوا اور کہا "اب اس طرح اس کا چلا جانا گویا میرے زوال اقبال کی علامت ہے"[3]

اسی طرح اکثر لوگ کسی کام کی ابتدا کے وقت یوں کہتے ہیں اگر فلاں چیز ہمارے آگئی تو یقیناً یہ کام بھی ہو جائے گا یعنی شگون نکالتے ہیں، شاہزادہ بدر منیر ملکہ خورشید نگار پہ عاشق ہوا تھا، ایک مرتبہ شکار کھیل رہا تھا کہ ایک گوزن دکھائی دیا اس نے کہا اگر میں اس گوزن کو مار لیتا ہوں تو ملکہ کا وصل حاصل ہو گا لیکن گوزن کے مارنے سے قبل اس کے ہاتھوں سے ایک ہرن بھی مر جاتا ہے، ہرن کے مرنے پر وہ سوچتا ہے کہ یہ کس بات کی علامت ہے اسی وقت باغ میں ایک اور شاہزادی ملکہ سرو سیمتن سے ملاقات ہوتی ہے جو پہلے سے اس پر عاشق تھی۔ اس ہرن کے علامت بھی سامنے آجاتی ہے[4]۔ صاحبقران اکبر نے بھی اسی طرح شگون کے طور پر یہ قاعدہ مقرر کیا کہ جب بذات خود بقصد جنگ و حرب میدان میں جاتا تھا، ابوالحسن جو حسب الحکم ایک ترنج ہوائے آسمانی میں پھینکتا تھا اور صاحبقران اس میں تیر [illegible] تھا۔ تیر کا نشانہ پر لگنا

لے ۱۰۱ ج ۴، ۲ے تزک جہانگیری ص ۱۰۷، ۳ے ۲ د ۴ ج ۴، ۴ے ب ۲۴ ج ۴،

رنگنا فتح و شکست سے تعبیر کیا جاتا تھا۔[۱]

ہم نے "تزک جہانگیری" کا ایک اقتباس پیچھے نقل کیا ہے جس میں جہانگیر نے اپنے دیوان اور اس کی اہلیہ کی موت کا سبب ان کے یہاں ایک بچہ کی ولادت کو دیا ہے کہ وہ منحوس تھا جبکہ یہ ایک اتفاقی امر تھا یا خدا کی کچھ مصلحت رہی ہو گی۔ مؤلف داستان نے اس کی وضاحت ایک مقام پر اس طرح کی ہے کہ صاحبقران اکبر ایک جگہ تنہا بیٹھا ہوا اپنی محبوبان کو یاد کر رہا تھا اسی اثنا میں ایک بد شکل پرندہ اس کے پاس آکر بیٹھ گیا جس کو دیکھ کر صاحبقران نے کہا کیا منحوس شکل دکھائی دی، پتہ نہیں کیوں خدا نے اسے پیدا کیا ہے اس کے بجائے اگر کوئی خوبصورت پرندہ پیدا کرتا تو بہتر تھا، صاحبقران کا یہ کہنا اس وجہ سے تھا کہ معشوقانِ دلربا کی یاد کے درمیان ایک بُری شکل نظر آئی خدا جانے اب دن کیسا گذرے۔ مؤلف اس وہم پرستی کو دور کرنے کیلئے پرندہ کی زبانی کہلواتا ہے :۔

"اے شہریار مست و بادہ کبر و غرور آگاہ ہو کہ اس حکیم مطلق نے کوئی شے اس عالم کائنات میں عبث خلق نہیں کی بلکہ ہر ایک فعل اس کا حکمت سے مملو ہے اور قدرت کا جلوہ ہر شے میں موجود ہے"[۲]

آگے چل کر وہی پرندہ صاحبقران کی تکلیف دور کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔

تقدیر پر بھروسہ کر لینا بھی ایسے اعتقادات کے ذیل میں شامل ہے عموماً انسان کسی بات کے پورا نہ ہونے پر یہ کہکر صبر کر لیتا ہے کہ تقدیر میں ایسا ہی رقم تھا، تقدیر پر شاکر ہو کر بیٹھ رہنا حوصلہ شکنی کی دلیل ہے "بوستان" کے کردار بھی تقدیر پرستی سے نجات حاصل نہیں کر پاتے، کہتے ہیں :۔

"سچ ہے کہ تقدیر کے روبرو سب تدبیریں ہیچ ہیں میں نے کیا تدبیر کی تھی اور کیا بر عکس نتیجہ نکلا"[۳]

تقدیر سے دست و گریباں ہونا اپنے بس کی بات نہیں سمجھتے۔[۴]

"غور فرماؤ کہ نوشتہ مقدر سے آج تک کسی نے جنگ و جدل نہیں کی"[۵]

۱؎ ص ۱۱ ج ۳، ۲؎ ص ۱۱۲ ج ۹، ۳؎ ص ۱۷۲ ج ۳، ۴؎ ص ۹۶ ج ۳، ۵؎ ص ۲۷۲ ج ۳،

تقدیر کا دخل زندگی کے ہر میدان میں رہتا ہے اگر کوئی شاہزادہ طلسم میں گرفتار ہو جائے اور نکلنے کی کوئی راہ نہ پائے تو وہ خود کو تقدیر کے بھروسے پر یہ کہکر چھوڑ دیتا ہے:

"خیر مرضی کردگار یہی تھی کہ اس آفت طلسم میں گرفتار ہوں بہر حال والدین کی ملاقات سے قطع نظر کرو اور دیکھو کہ مقسوم کا کیا لکھا ہے"[1]

میدانِ جنگ میں فتح و شکست مقدر کے ہاتھ سمجھی جاتی ہے[2] اور اسی مقدر کے بھروسے پر قلیل فوج لشکرِ کثیر پر غالب آجاتی ہے:

"ہنگام جنگ شمشیر آبدار سے یہ امر لازم نہیں آتا کہ لشکر کثیر فوج قلیل پر خواہی نخواہی فتحیاب ہو، قدیم الایام سے مدار فتح و ظفر محض یاوری اقبال و مدد آسمانی پر منحصر ہوتا ہے"[3]

اسی بات کو میر نے اس طرح نظم کیا ہے ؎

فتح شکست مقدر سے ہے ولے اے میر
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

"بوستان" میں اس کی اور بہت سی مثالیں موجود ہیں مثلاً:

"بکبران شاہ نے کہا تقدیر الٰہی کسی صورت سے رد نہیں ہو سکتی ہم کس خیال میں تھے اور کیا صورت پیش آئی خیر صبر کرو اور دیکھو کہ منظور الٰہی کیا ہے"[4]

یا "صاحبقران نے فرمایا بہر حال مقام شکر ہے جو کچھ پیش آیا دیکھ لیا اور جو نوشتہ مقسوم ہے پیش آئے گا"[5]

"بوستان خیال" جس عہد میں لکھی گئی دراصل وہ تقدیر پر ہی صابر و شاکر رہنے کا دور تھا، لوگ مغل سلطنت اور دلی کی تباہی کو دیکھتے تھے اور یہ کہکر بادہ نوشی اور عیش پرستی میں مصروف رہتے تھے کہ تقدیر میں جو لکھا ہے وہ پیش آرہا ہے۔ اپنی تباہیوں کو پیر فلک سے منسوب کرتے تھے۔ جب جب آدمی نے خود کو بے دست و پا اور مجبور پایا۔ تقدیر اور آسمان کو برا بھلا کہا، اکثر شعرا نے اپنی ناکامیوں اور نامرادیوں کو آسمان کی کج نگاہی کہہ کر نظم کیا ہے، چرخ

---

[1] ۶۵ ج۴، [2] ،، ج۳، [3] ۱۲۷، ج۱، [4] ۶۹۴، ج۲، [5] ۱۴۵ ج۵،

کو ستمگار کہنے کا تصور آسمان سے نازل ہونے والی بلاؤں سے وابستہ ہے مثلاً آندھی طوفان کا نزول آسمان کی سمت سے ہوتا ہے جو اپنے ساتھ تباہی لاتا ہے۔ طوفانِ نوحؑ آسمان سے برسنے والے پانی کے سبب آیا، ابرہہ کی فوج پر پتھر برسانے والے پرندوں نے آسمان کی جانب سے پتھر برسائے، ہندوستانی دیوتاؤں کا مسکن آسمان ہے جہاں سے وہ قہر اور مہر نازل کرتے ہیں۔ قرآن پاک بھی آفت سماوی کو بیان کرتا ہے:۔

"سو بدل ڈالا ان ظالموں نے ایک اور کلمہ جو خلاف تھا اس کلمہ کے جس کے کہنے کی ان سے فرمائش کی گئی تھی اس پر ہم نے نازل کی ایک آفت سماوی اس وجہ سے کہ وہ عدول حکمی کرتے تھے"[1]

شاعری میں اکثر فلک سے شکوہ ملتا ہے "بوستان" میں بھی اپنے عہد سے وابستہ فلک کے ساتھ یہ رویہ موجود ہے:۔

"سبحان اللہ تمہاری قسمت میں دختر تھی لیکن وہ بھی فلک نے نہ چھوڑی"[2]

یا "فلک کو اس قدر بھی گوارا نہ ہوا کہ میں اپنے مطلوب سے ایک روز بھی صحبت رکھتی"[3]

غرضکہ ہر پریشان حال کو فلک سے شکایت رہتی ہے۔

نجومیوں پر یقین

ہندوستان کی توہم پرستانہ تہذیب میں ایسے علوم کو ابتدا ہی سے مقبولیت حاصل رہی ہے جن سے آدمی علمِ غیب سے باخبر ہو سکے، جب آدمی کے دل میں شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں تو وہ ایسے علوم کا سہارا لیتا ہے جب اسے اپنی قوت بازو اور جدوجہد پر بھروسہ نہیں ہوتا تو حالات مستقبلہ کو جاننے کے لئے مضطرب رہتا ہے، علم نجوم، علم رمل، جفر، کہانت وغیرہ پر زمانۂ قدیم ہی میں نہیں بلکہ موجودہ دور میں بھی یقین کیا جاتا ہے اگرچہ اسلام میں ان علوم پر یقین رکھنا ایمان کی کمزوری مانا گیا ہے لیکن صدیوں کا بت پرست دل آخر کس طرح تمام توہمات و اعتقادات سے پاک ہو جاتا بقول اقبال ؎

---

[1] سورۃ البقر مترجم حضرت مولانا اشرف علی تھانوی ص۸، [2] ۳۳۲ ج۱، [3] ۵۲۹ ج۱

مسجد تو بنا لی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
دل تیرا پرانا پاپی تھا برسوں میں نمازی ہو نہ سکا

یہ علوم صرف ہندوستان ہی میں رائج نہیں تھے بلکہ پورے ایشیا کے لوگ ان پہ کامل اعتقاد رکھتے تھے بادشاہوں اور امراء کے درباروں سے ان علوم کے ماہرین وابستہ رہتے تھے۔ عہد مغلیہ کے سیاح برنیر نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ :۔

"ایشیائی لوگ اکثر احکام نجوم کے ایسے معتقد ہیں کہ ان کے نزدیک دنیا کا کوئی معاملہ ایسا نہیں ہے جو کواکب اور افلاک کی گردش پر منحصر نہ ہو اور اس لئے وہ ہر ایک کام میں نجومیوں سے مشورہ لیا کرتے ہیں یہاں تک کہ عین لڑائی کے وقت جبکہ دونوں طرف صف بندی بھی ہو چکی ہو کوئی سپہ سالار اپنے منجم سے ساعت نکلوائے بغیر لڑائی شروع نہیں کرتا تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی نامبارک لگن میں لڑائی شروع کر دی جائے بلکہ منجموں سے پوچھے بغیر کوئی شخص سپہ سالاری پر مقرر نہیں کیا جاتا"[1]

میدانِ جنگ یا فتح و شکست کے لیے ہی ساعت کی تلاش نہیں رہتی تھی بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں اس کا عمل دخل تھا کسی کے ہاں بچہ کا جنم ہوتا تھا تو جیوتشی اور نجومی کو بلایا جاتا تھا، شادی بیاہ کی تاریخیں یا رشتے طے کرنے کے لیے ان کی ضرورت پڑتی تھی۔ سفر کی ابتدا کے لیے نیک ساعت نکلوائی جاتی تھی۔ پیدائش کے وقت بچہ کا زائچہ تیار کروانا اور شادی کے لیے مہورت نکلوانا اہلِ ہنود میں اب بھی رائج ہے، اسی کے زیر اثر مسلمان بھی بچے کا نام رکھنے یا شادی کی تاریخیں طے کرنے میں ساعت کا لحاظ رکھتے ہیں بعض مہینوں میں شادی کرنا مبارک خیال نہیں کیا جاتا۔ دن رات کی بعض ساعتوں میں نکاح خوانی کو مناسب نہیں سمجھا جاتا، غرض کسی نہ کسی طرح سے ہر مذہب و ملت کے ماننے والے اس توہم میں ملوث تھے۔ برنیر نے اس پر اظہار افسوس کیا ہے :۔

"اس احمقانہ توہم نے خلایق کو عموماً ایسی دقت میں ڈال رکھا ہے اور اس سے ایسے نامرغوب نتیجے پیدا ہوتے ہیں کہ مجھے سخت تعجب ہے کہ اس قدر

---

[1] سفرنامہ برنیر۔ ص۔ ۲۴۵

مدت سے یہ اعتقاد کیونکر قائم چلا آتا ہے کیونکہ ہر ایک تجویز سے خواہ وہ
کسی سرکاری کام کے متعلق ہو یا بخ کے اور ہر ایک معاملہ سے خواہ وہ
معمولی ہو یا غیر معمولی نجومی کو واقف کرنا ضروریات سے ہے"[1]

ہندوستان کے راجہ، مہاراجاؤں کے یہاں جیوتشیوں اور نجومیوں کا رہنا لازمی ہی تھا لیکن مسلمان حکمرانوں کے دربار بھی ان سے خالی نہیں تھے مغل بادشاہوں کو ان علوم سے کچھ زیادہ ہی دلچسپی تھی۔ بابر نے علمِ فلکیات کا تزک بابری میں بڑی دلچسپی سے ذکر کیا ہے، ہمایوں خود علمِ نجوم و علم ہیئت وغیرہ کا بہت گہرا مطالعہ رکھتا تھا۔ پرانے قلعہ دہلی میں اس نے اسی علم کے واسطے ایک عمارت تعمیر کروائی تھی وہ دربار میں لباس بھی ستاروں کی مناسبت سے پہن کر آتا تھا۔ اکبر جیوتشیوں اور نجومیوں کا پکا معتقد تھا وہ ایک قدم بھی بغیر ان کے مشورے کے آگے نہ بڑھتا تھا ایک مرتبہ اکبر نے جہانگیر سے محض اس وجہ سے ملاقات نہیں کی اور اسے واپس الٰہ آباد بھیجدیا کہ اس وقت کو نجومی نے ملاقات کے لئے مبارک ساعت نہیں بتایا تھا[2] یہی حال جہانگیر کا تھا" تزکِ جہانگیری" میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں مثلاً :۔

"اس لئے نیک ساعت میں سلطان پرویز کو خلعتِ فاخرہ، مرصع خنجر۔۔۔۔
دے کر بمعہ امراء اور سرداروں کے رخصت کیا"[3]

یا " نجومیوں اور جیوتشیوں نے دارالحکومت آگرے میں داخل ہونے کی تاریخ
۲۸، ذی ماہ الٰہی سن ۱۳ جلوس بمطابق ماہ محرم ۱۰۲۸ مقرر کی تھی"[4]

عہد زوال میں ایسے ہی علوم کو ترقی حاصل ہوئی ہے جو جھوٹی تسلیاں دے دے کر جینے کی آرزو پیدا کرتے رہتے ہیں۔ مغلیہ سلطنت جب عہد زوال میں داخل ہوئی تو عوام و خواص کے دلوں میں ایک عجیب انتشار پیدا ہوا اور اس انتشار سے نجات حاصل کرنے کے لئے انھوں نے جھوٹے سہاروں کا سہارا لینا شروع کیا۔ توہم پرستی کو اس عہد میں بہت عروج حاصل ہوا، اٹھارہویں صدی عیسوی کی دلّی کے بارے میں مرقع دہلی میں جو کچھ لکھا ہے وہ اس صدی کی تہذیبی قدروں کو سمجھنے کے لئے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ زیر بحث موضوع کے بارے میں تحریر ہے کہ :۔

---

[1] سفرنامہ برنیر۔ ص ۲۳۵، [2] تزک جہانگیری۔ ص ۲۷، [3] ایضاً ص ۴۶، [4] ایضاً ص ۳۰۷،

"نجومی اور رمال بھی لوگوں کو بے وقوف بنانے میں کسی سے کم نہیں ہیں وہ بھی الگ مجمع لگائے لوگوں کے دل کا بھید بتاتے ہیں لوگ اپنی خوش قسمتی اور بدبختی کے بارے میں کرید کرید کر پوچھتے ہیں اور ان کی خوش آیند باتوں پر دل میں مگن ہو کر بقدر حیثیت زندگی گذارتے ہیں"[1]

اسی عہد کے بادشاہ محمد شاہ جس کی رنگین مزاجی کو مورخین نے بڑی دلچسپی سے تحریر کیا ہے، علم فلکیات سے بہت دلچسپی رکھتا تھا، باوجود اس کے کہ نادر شاہ کے حملے نے سخت ابتری پھیلائی تھی۔ محمد شاہ نے دہلی، جے پور، متھرا، بنارس وغیرہ میں رصدگاہیں بنوائیں، دہلی کا جنتر منتر اسی کے شوق کی یادگار ہے۔ یہ رصدگاہیں انبر کے راجہ جے سنگھ کی زیر نگرانی میں تعمیر ہوئیں، محمد شاہ کے دربار میں مبشر خاں اور منجم خاں ماہرین علم نجوم بھی موجود تھے۔

"بوستان" کے تمام بادشاہ اور شاہزادے علم نجوم پر گہرا یقین رکھتے ہیں، ہر ایک کے ساتھ نجومی موجود ہیں بغیر ان کے مشورے کے کوئی کام نہیں کرتے، سلطان مہدی جو صاحبقران اکبر کے جد ہیں کسی بھی کام کی ابتدا سے قبل ابوالخیار نجومی سے زائچہ بنواتے ہیں[2]۔ اسماعیل کی تاریخ عقد ابوالخیار ہی نے نکالی، معزالدین کی ولادت پر زائچہ بھی اسی نے تیار کیا۔ صاحبقران اعظم اور اصغر کی ولادت کے زائچے ان کی ولادت سے قبل ہی حکیم استقلینوس نے ازروئے علم نجوم تیار کر لئے تھے[3]۔ داستان کے یہ وہ کردار ہیں جو داستان کے مسلمان کرداروں کے امام ہیں، ظاہر ہے جب ان لوگوں کو علم نجوم اور اسی طرح کے دوسرے علوم پر اتنا کامل یقین ہوگا تو ان کے مقلدین یقیناً ان کی تقلید کریں گے یہاں اس بات پر یقین کرنا پڑے گا کہ داستان کے یہ عربی النسل سلاطین خطۂ عرب یا افریقہ کے باشندے نہیں بلکہ ہندوستان کے مغل بادشاہوں اور امرار کے نمائندے ہیں، مثلاً پیچھے لکھا گیا ہے کہ اکبر نے جہانگیر سے اس لئے ملاقات نہیں کی کہ نجومی نے ملاقات کی اچھی ساعت نہیں بتائی تھی۔ اتنا ہی پختہ یقین نیک اور نحس ساعت ہونے پر داستان میں موجود ہے:

"چنانچہ ازروئے علم مجھے یہ دریافت ہوا ہے کہ دو چار روز صاحبقران سے ملاقات کرنی مصلحت نہیں اے جوان بخت فاتح طلسم کی ملاقات کے

---

[1] مرقع دہلی۔ ص ۱۳۰، [2] ۱، ج ۳،

واسطے نیک ساعت کا بھی ہونا شرط ہے[۱]

نیک اور نحس ساعت کی تلاش صرف ملاقات کے لیے ہی نہیں ہوتی بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں اس کا دخل ہے۔ بادشاہ تخت سلطنت پر جلوس فرمانے سے قبل ماہرین علم نجوم سے وقت کا تعین کرواتا ہے:۔

"جس وقت ساعت سعد اصغر شروع ہوئی اور نیر اعظم بیت الشرق میں داخل ہوا یادری کا ایدروس نے عرض کی یا صاحبقران آفاق اب حضور بدولت وسعادت تخت جہانبانی و اورنگ سلطانی پر جلوس فرمائیں[۲]"

صاحبقران اکبر جشن نوروز میں جانے کے لئے اول ستاروں سے ساعت نکلواتے ہیں[۳]:۔

"القصہ روز پنجشنبہ کو کہ مشتری سے متعلق ہے ساعت زہرہ میں صاحبقران کا کوہ لوطی پر جانا قرار پایا[۴]"

دوسرے شاہزادے بھی صاحبقران کی طرح ان علوم پر یقین رکھتے ہیں:۔

"خسرو شیر دل کو علم رمل میں دخل ہے اس نے روانگی کے واسطے ساعت نیک مقرر کی[۵]"

قلعے اور دوسری عمارتوں کی بنیاد رکھوانے کے لئے بھی نیک ساعت مقرر کی جاتی تھی:۔

"آخرالامر دوسرے دن معماروں کاریگروں کو بلوایا اور ساعت نیک میں تعمیر قصر شروع کروادی[۶]"

ساعت کے نیک اور نحس ہونے کا احساس صرف انسانوں کو ہی نہیں بلکہ دیو اور جن بھی اس کا لحاظ رکھتے ہیں:۔

"اگرچہ اس روز اس آدمی نے میری شاخ اکھیڑ لی لیکن ساعت نحس میں مجھ سے اور اس سے جنگ ہوئی تھی آج البتہ اس کو قتل کرتا ہوں[۷]"

علم غیب یعنی حالات مستقبلہ معلوم کرنے کی خواہش ہر ایک دل میں ہوتی ہے۔ اگرچہ یہ ایمان کی کمزوری کی دلیل ہے لیکن اہل اسلام اور کفار سبھی اس پر یقین رکھتے ہیں، انھیں یہ احساس بھی ہے کہ:۔

۱؎ ۱۸، ج۴، ص۵۷، ۲؎ ۴۴، ج۴، ص۵۴، ۳؎ ۱۴، ج۵، ص۳، ۴؎ ۱۸، ج۱، ص۳، ۵؎ ۲۵، ج۵، ص۴۷، ۶؎ ۱۸، ج۲، ص۶، ۷؎ ۱۵، ج۶، ص۱۲،

"اگر علمِ نجوم سے ہم ابوالخدع کے نفاق و اتفاق کا حال دریافت کریں تو وہ قابلِ یقین نہ سمجھو کیا معنی کہ جزوِ ایمان میں فتور آتا ہے"[1]

اس کے باوجود اہلِ ایمان کہیں اہلِ نجوم سے حالاتِ مستقبلہ معلوم کرتے نظر آتے ہیں[2]، کہیں ازروئے علمِ کہانت حال معلوم کرنے میں مصروف ہیں[3]۔ علمِ کہانت کی مدد سے خواب کی تعبیر جاننے کی بھی کوشش کی جا رہی ہے[4]۔ بعض لوگ قرعہ پھینک رہے ہیں اور مہم پر جانے کے لئے نام تلاش کر رہے ہیں[5]۔ کہیں علمِ رمل سے مستقبل کے زائچے تیار کئے جا رہے ہیں[6]۔ بعض بزرگ علمِ مکاشفہ میں مہارت رکھتے اور لوگوں کو ان کے مستقبل سے آگاہ کرتے ہیں[7]۔

ان علوم کی ضرورت اس وقت زیادہ معلوم ہوتی ہے جب دل و دماغ پریشان ہوتے ہیں، "بوستان" کی بیشتر شاہزادیاں عالمِ بے قراری میں نجومیوں سے رابطہ قائم کرتی ہیں مثلاً ملکہ ماہ سبز پوش جب ملول ہوئی تو ابوالغیاث منجم کے پاس گئی اور باعثِ ملال دریافت کیا، منجم نے اس کا زائچہ تیار کر کے اسے حالات سے آگاہ کیا[8]۔ اسی طرح جب ملکہ سرو سیمتن نادیدہ صاحبقران اصغر پر عاشق ہو جاتی ہے اور اضطراب حد سے زیادہ بڑھتا ہے تو ایک کنیز کے ساتھ شہر کے ایک منجم کامل کے پاس جاتی ہے اور اپنی مشکل بیان کرتی ہے، منجم اسے زائچہ دیکھکر اس کا حال بتاتا ہے اور ایک تعویذ بازو پر باندھنے کے لئے دیتا ہے[9]۔ اسی طرح جب ملکہ نوشابہ کا مطلوب اس سے بچھڑ گیا اور بے قراری میں اضافہ ہوا تو اس نے ایک نجومی سے معلوم کروایا کہ اس اضطراب کا کیا انجام ہوگا[10]۔

عوام بھی اسی توہم میں ملوث ہیں اور اپنی عسرت و فلاکت زدگی کی کہانیاں نجومیوں کے روبرو بیان کرتے ہیں:-

> "ایک دن ریحانہ کے شوہر نے بچشمِ پُرآب اپنی عسرت و فلاکت زدگی کی حقیقت منجم کے روبرو بیان کی، منجم کو اس کے حالِ سقیم پر رحم آیا اور کہا اے فلاں ہم ایسا جانتے ہیں کہ اگر تو پیشہ پارچہ فروشی اختیار کرے، قلیل زمانہ میں عسرت و فلاکت تیری رفع ہو جائے عجب نہیں کہ مرتبہ

---

[1] ص ۲۲۶ ج ۳، [2] ص ۲۵-۱۲۴ ج ۳، [3] ص ۲۶۲ ج ۵، [4] ص ۶۲ ج ۴، [5] ص ۶۳ ج ۵، [6] ص ۶۰-۴۷ ج ۵، [7] ص ۶۰ ج ۵، [8] ص ۶۱۳ ج ۱، [9] ص ۱۴-۲۴ ج ۴، [10] ص ۳۶ ج ۴،

عالی کو پہونچے۔ ریحانہ کے شوہر نے موافق ارشاد منجم کے اسی دن سے پارچہ فروشی کی دوکان کھولی، فی الواقع چند ہی روز میں اس قدر نفع ہوا کہ مالامال ہو گئے[1]،،

سفرنامہ برنیر اور مرقع دہلی میں ایسے منجمین کا ذکر کیا گیا ہے جو بازاروں میں سڑکوں پر درختوں کے نیچے چٹائی بچھا کر کچھ پرانی کتابیں سامنے رکھ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ داستان میں جگہ جگہ ایسے نجومی اپنی بساط بچھائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ تمام خواص و عوام مسائل کے حل تلاش کرنے اور مستقبل کے حالات معلوم کرنے ان کے پاس جاتے ہیں مثلاً :-

"امیر خلیل عالم پریشانی میں شہر سے جو باہر نکلا رفتہ رفتہ ایسی جائے پہونچا کہ کنارہ پر چشمہ کے زیر درخت ایک مرد بیٹھا ہوا تھا اور اس کے روبرو تختی و قرعہ رکھا تھا۔ امیر خلیل نے بحکم الغریق تو یتشبث لکل حشیش رمال کے پاس جا کر اپنے گمشدہ مال کا سوال کیا، رمال نے بعد دیکھنے زائچے کے کہا اے جوان دزد نے مال تیرا ایک درخت چنار کی بیخ میں دفن کیا ہے خاطر جمع رکھ عنقریب پیدا ہو جاوے گا[2]،،

یوں تو نجومیوں سے لوگ گاہے گاہے حالات معلوم کرتے ہی رہتے تھے لیکن پریشانی اور مصیبت کے وقت خاص طور سے نجومیوں سے رابطہ قائم کیا جاتا تھا، عالم پریشانی اور الجھنوں کے وقت خانقاہوں میں بھی سکون اور پناہ کی تلاش میں لوگ جاتے تھے۔

بزرگوں سے عقیدت اور قبر پرستی

ہندوستان اور خصوصاً دلی کی سماجی زندگی میں صوفیا اور خانقاہوں کو بڑی اہمیت حاصل ہو گئی تھی، بادشاہ سے لے کر عوام تک خانقاہوں میں حاضری کے لئے جاتے تھے اور بزرگانِ دین کے قدم بوس ہوتے تھے، ہندوستان کی فضا خانقاہوں کے لئے پہلے ہی سے سازگار تھی، یہاں کے ہندو عوام جوگیوں پر یقین رکھتے تھے اپنی مشکلات ان کے سامنے پیش کرتے تھے، ان کے کٹیوں پر اپنی جبین نیاز جھکاتے تھے، جب مسلمان یہاں آئے اور اسلام کی تبلیغ کی تو ان میں علماء

---

[1] ج ۳، ص ۶۔ [2] ج ۲، ص ۹۰۔

گا ایسا طبقہ بھی تھا جو اپنے حسنِ سلوک اور اپنے اخلاق سے غیر قوم کو متاثر کر کے اپنی جماعت میں شامل کرنا چاہتا تھا۔ یہ جماعت صوفیا کی تھی۔ ان کی مجالس میں برابری اور ہم دلی کو اولیت حاصل تھی۔ ان کے یہاں امیر غریب، ہندو مسلمان، مرد عورت برابر سمجھے جاتے تھے۔ یہ لوگ درباری زندگی سے دور رہتے تھے فقیرانہ زندگی گذار کر دینِ حق کی طرف لوگوں کو بلاتے تھے۔

عہدِ سلاطین میں بکثرت مشائخ اور صلحا ہندوستان آئے جگہ جگہ خانقاہیں بنیں "صبح الاعشیٰ" کے حوالے سے "اوراق مصور" میں لکھا ہے کہ محمد بن تغلق کے زمانہ میں دو ہزار خانقاہیں دہلی میں موجود تھیں[1]۔ تمام سلاطین صوفیا کے ساتھ بڑی تعظیم و تکریم سے پیش آتے تھے، التمش خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کا مرید تھا، سلطان بلبن حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کی خدمت میں حاضر رہتا تھا تو دست بستہ کھڑا ہوتا تھا، علاء الدین خلجی حضرت نظام الدین اولیاؒ کا بڑا عقیدت مند تھا، سلطان فیروز شاہ صوفیا کا بڑا قدردان تھا اس کے عہد میں حضرت نظام الدین اولیاؒ کی خانقاہ بڑی مشہور خانقاہ تھی، ہزاروں کی تعداد میں لوگ صبح سے شام تک اس خانقاہ میں آتے تھے اور سکونِ قلب حاصل کر کے بامراد لوٹتے تھے، ان میں ہندو مسلمان کی کوئی تمیز نہ تھی۔ سب ہی ان کے عقیدتمندوں میں شامل تھے حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ بھی دہلی میں اس قدر ہر دلعزیز تھے کہ ایک مرتبہ جب خواجہ معین الدین چشتیؒ انھیں اپنے ساتھ اجمیر لے جانے لگے تو اہلِ دہلی ان کے ساتھ ہو لیے کسی کو ان سے جدائی منظور نہ تھی۔ سلطان التمش بھی خبر پاکر خواجہ غریب نواز کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ "حضور قطب صاحب کو اجمیر نہ لے جائیں یہیں رہنے دیں"۔ خواجہ غریب نواز لوگوں کی یہ عقیدت و محبت دیکھ کر انھیں اپنے ساتھ نہیں لے گئے[2]۔

سلاطین کا دور ہندوستان میں خانقاہوں کی ابتدا کا دور تھا اور دہلی کو اس وقت مرکزی حیثیت حاصل تھی لیکن عہدِ مغلیہ میں نہ صرف تمام روحانی سلسلے ہندوستان میں موجود تھے بلکہ پورے ہندوستان میں بے شمار خانقاہوں کا جال پھیل گیا تھا، خود مغل بادشاہ بھی صوفیا کے معتقد تھے۔ بابر حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ کے آستانہ پر خود حاضر ہوا تھا اور حضرت گنگوہی نے بھی اس کو ایک مکتوب کے ذریعہ نصیحت کی تھی کہ وہ عدل قائم کرے[3]، اکبر کو شیخ سلیمؒ سے بڑی

---

[1] اوراق مصور، ص ۴۶، [2] دلی کے بائیس خواجہ از ڈاکٹر ظہور الحسن شارب، ص ۴۱،

[3] ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے۔ ص ۶۲،

عقیدت تھی۔ جہانگیر کا نام سلیم اسی جوش عقیدت میں رکھا تھا۔ اکبر خواجہ معین الدین چشتی رح کی درگاہ پر مجالس میں بھی شریک ہوتا تھا۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے لکھا ہے کہ :۔

"ہر روز درگاہ میں راتوں کے وقت اہل اللہ اور صالحین کی محفل جمتی اور سماع کی مجلسیں منعقد ہوتیں جن میں بادشاہ برابر شریک رہتے، موسیقار اور قوال جو اپنے فن میں ایک سے بڑھ کر ایک تھے دل سوز نغمے گا کر سناتے تھے۔" [1]

جہانگیر نے نہ صرف ان بزرگوں کی عزت و احترام کرتا تھا بلکہ وہ سنیاسیوں کی بھی قدر کرتا تھا اپنی تزک میں کئی جگہ اس نے سنیاسی جدروپ کا بڑی عقیدت سے ذکر کیا ہے لکھتا ہے کہ :۔

"میں نے بارہا سنا تھا کہ جدروپ نامی ایک سنیاسی اوجین کے پاس جنگل میں مدت سے عبادت و ریاضت میں مشغول ہے اس لئے مجھے اس کے دیکھنے کا بہت اشتیاق تھا جن دنوں میں دارالحکومت آگرے میں قیام پذیر تھا اسے اپنے پاس بلانا چاہتا تھا مگر سنیاسی کی ناراضگی کے پیش نظر طلب نہ کیا لیکن مسافت میں جب اوجین کے قریب پہونچا تو اس سے ملنے کے لئے پاپیادہ گیا اس نے اپنی رہائش پہاڑ کے ایک غار میں بنائی ہوئی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ وہ اس غار میں بغیر کسی بستر اور چٹائی کے شدید سردی میں صرف ایک لنگوٹے میں دن بسر کرتا ہے اور نہ ہی کبھی آگ جلاتا ہے" [2]

جہانگیر نے خواجہ غریب نواز رح کی عقیدت میں حلقہ بگوش ہونے کے لئے کان میں موتی ڈالے تھے" [3]

بزرگوں سے عقیدت و محبت کا عموماً ایک ہی مقصد ہوتا تھا کہ ان کی دعائیں نجات کا ذریعہ بنیں گی۔ یا ان کی وساطت سے اپنی مشکلات و مسائل حل ہو جائیں گے ۔ اسی لئے مغلوں کے عہد زوال میں صوفیاء سے بے پناہ عقیدت کی مثالیں ملتی ہیں۔ بادشاہ بجائے تلوار کے دعاؤں اور تعویذوں پر یقین رکھنے لگے تھے اٹھارہویں صدی کے بہت سے بزرگوں اور خانقاہوں کا ذکر "مرقع دھلی" میں کیا گیا ہے، بزرگان دین کے مزارات پر عرس کی بہت سی مثالیں اس میں موجود ہیں خود محمد شاہ بادشاہ پر جو اٹھارہویں صدی عیسوی کا اہم بادشاہ ہے صوفیا کا بہت اثر تھا،

---

[1] منتخب التواریخ۔ ص ۳۲۵، [2] تزک جہانگیری۔ ص ۲۰۶، [3] ایضاً ص ۱۵۴،

عالمگیر شاہ ثانی کے قتل کی وجہ ہی ایک صوفی سے ملاقات بنی تھی۔ بادشاہ سے کہا گیا کہ فیروز شاہ کوٹلہ میں ایک خدا رسیدہ بزرگ ٹھہرے ہوئے ہیں چنانچہ بادشاہ ان سے شرف ملاقات کے لئے گیا وہاں دھوکے سے اسے قتل کر دیا گیا۔ اٹھارہویں صدی اور انیسویں صدی کی تہذیبی تاریخ میں اس طرح کی بیشمار مثالیں مل جائیں گی، صاحب "مرقع دھلی" نے ایک فقیر کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے :-

"آپ مخصوص وقت پر اپنی خلوت سے باہر آتے ہیں اور طالبانِ سلوک کو درشن دیتے ہیں بہت سے ہندو مسلمان آپ کے دیدار کی غرض سے وہاں جاتے ہیں اور انتہائی عزت واحترام سے ملاقات کرتے ہیں، جب آپ اپنی مخصوص جگہ پر تشریف فرما ہوتے ہیں تو خادم دونوں طرف سے مورپنکھی جھلتے ہیں اور آپ کے سامنے طرح طرح کے پھول، میوے اور شیرینی لاکر چن دیتے ہیں۔ آپ ہر ایک کو تھوڑا تھوڑا تقسیم کرتے ہیں۔ آپ اس تمکنت سے بیٹھتے ہیں کہ حاضرین میں گویائی کی قدرت نہیں معلوم ہوتی اور خود بھی بے ضرورت تکلم نہیں فرماتے ۔۔۔۔ قوال لگاتار قوالی گاتے رہتے ہیں ۔۔۔۔ بہت سے لوگ آپ کے طفیل میں چین کی زندگی بسر کرتے ہیں[۱]"

ہندوستان کے توہم پرستانہ ماحول میں درویشوں کو بڑی عزت و قدر ملی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ درویشی اختیار کرنا ایک پیشہ بھی بن گیا، مکار اور فریبی فقیر سیدھے سادے عوام کو بے وقوف بناکر لوٹنے لگے، غلط راہ پر ڈالنے لگے، لوگ خدا اور رسول سے زیادہ ان پیروں اور فقیروں پر یقین رکھتے تھے، انھیں سے مشکل وقت میں مدد مانگتے تھے، انھیں کے سامنے اپنا دکھ درد بیان کرتے تھے، خارق عادات باتوں اور کرامات کے آگے سر جھکاتے تھے، علماء اور علوم دین سے زیادہ باطنی اور روحانی تعلیمات کی قدر کرتے تھے، نماز، روزے سے زیادہ محفل سماع کو موجب ثواب سمجھا جاتا تھا جن ہندوستانی مسلمانوں کے اجداد پہلے بتوں کے سامنے سرنگوں ہوتے تھے وہ اب بجائے بتوں کے قبروں کے آگے ماتھا ٹیکنے لگے، جبکہ اسلام میں سوائے خدا کے کسی کو سجدہ کرنا شرک سمجھا جاتا ہے، خود حضرت محمدؐ نے فرمایا میری قبر کو صنم نہ بنانا۔ لیکن اھلِ ہند نے بزرگانِ دین کی قبروں کو صنم بنالیا۔

سبھی داستانوں میں اس ماحول کی مکمل عکاسی ملتی ہے، ہر داستان کے ہر شاہزادے کے ساتھ

---

[۱] مرقع دھلی۔ ص ۱۳۶،

ایک مرشد ضرور ہوتا ہے جس سے دیووں کے سے کرامات ظہور میں آتے ہیں بلکہ داستان میں اس کی حیثیت ولی کی طرح ہی ہوتی ہے۔ اسے علم غیب بھی ہوتا ہے وہ بلاؤں اور پریشانیوں کو دور کرتا ہے، شاہزادہ ہر مرحلہ پر اس کی مدد کا طالب ہوتا ہے بغیر اس کے مشورے کے کوئی قدم نہیں اٹھاتا، اگر کبھی بھول کر ایسا کرتا ہے تو نقصان اٹھاتا ہے۔

"بوستان" میں شاہزادہ معزالدین کی رہنمائی حکیم قسطاس الحکمت کرتے ہیں شاہزادہ خورشید تاج بخش اور بدر منیر کے مرشد حکیم استقلینوس ہیں یہ شاہزادے بغیر ان کے مشورے کے کوئی کام نہیں کرتے، ان حکما کے علاوہ اور بہت سے بزرگ ہیں جو ان کی مشکلات میں ممد و معاون ہوتے ہیں۔ داستان میں ایسے درویش اور فقیر بکثرت ہیں جو آبادی سے الگ اپنے تکیوں میں گوشہ نشیں ہیں، حاجتمند ان کے پاس جاتے ہیں اور اپنی حاجت بیان کرتے ہیں، درویشوں کے بارے میں لوگوں کا عام خیال تھا۔

"اے عالی جناب سبحان اللہ تم صاحبوں کو خدائے تعالیٰ نے کیا قدرت و دستگاہ بخشی ہے کہ باوجود بشریت تمام کام تم سے ملائکوں کی مانند ظہور میں آتے ہیں[۱]"

انھیں ملائکہ صفت تصور کر کے ان کی عزت بھی اسی قدر کی جاتی تھی، صاحبقران ہو یا کوئی عام آدمی ہر شخص ان کے روبرو دست بستہ استادہ نظر آتا تھا۔

"صاحبقران اصغر نے درویش کو سینہ سے لگالیا اور فرمایا اے بزرگ ایزد جل شانہ نے تم صاحبان مقبول درگاہ صمدیت کو لباس درویشی و مرتاضی عطا فرمایا ہے اس صورت میں ہم تم سے جس قدر بعجز و فروتنی پیش آئیں لایق ہے[۲]"

"تم خاصان درگاہ یزداں و مقبول بارگاہ رب العزت ہو اور مردانِ خدارسیدہ عارفان باللہ بہمہ وجوہ واجب التعظیم ہیں[۳]"

سلاطین ہند جس طرح صوفیا کا احترام کرتے تھے اس کا ذکر ہم کر چکے ہیں "بوستان" کے شاہزادوں اور شاہزادیوں کی تعظیم و تکریم کا بھی یہی حال ہے، درویش کو آتے دیکھ کر تعظیماً گھوڑے سے اتر جاتے ہیں[۴] ان کے استقبال کے لئے دور تک جاتے ہیں انھیں بعزت و احترام اپنے ساتھ لاتے ہیں انھیں

---

۱ ص ۳۲۲ ج ۲، ۲ ص ۳۵۵ ج ۵، ۳ ص ۱۳۵ ج ۵، ۴ ص ۶۸۲ ج ۱،

سند پیش کرتے ہیں اور خود ایستادہ رہتے ہیں[۵]۔ درویشوں کا شیوہ ہے کہ وہ کسی ایک جگہ قیام نہیں کرتے، سلطان مہدی نے بہت چاہا کہ شاہ آگاہ کو چند روز کے لیئے روک لیں لیکن جواب ملا کہ ہم فقیر ہیں سیاح۔ اب جس طرف خدا لے جائے گا جائیں گے[۶]

"ایسے صاحب دولت بلند بخت کے پاس رہنا مجھ فقیر کی سعادت ہے لیکن مجبور ہوں
کہ عبادت و بندگی آمرزگار سے کوئی لمحہ فرصت نہیں ہوتی"[۷]

سچے درویش کسی کے حمایت دار اور جانب دار نہیں ہوتے بلکہ انصاف شعار ہوتے ہیں۔

"ہم مردمان گوشہ نشین کو کسی کی ماتحتی یا تابعداری سے کیا نسبت"[۸]

گوشہ نشینی کا سبب یہی ہے کہ عبادت میں خلل واقع نہ ہو اگرچہ دنیا سے کنارہ کشی اسلام میں جائز نہیں سمجھی جاتی لیکن کچھ ہندو سادھوؤں کے اثر سے اور کچھ عشق الٰہی میں غرق ہو کر درویشوں نے گوشہ نشینی کو اپنا شعار بنایا اور ہمہ وقت تسبیح و ذکر الٰہی میں مصروف رہے خود کو خلایق کی نظروں سے پوشیدہ رکھا۔ ایسے بزرگوں کو دولت و شہرت کی ہوس نہیں ہوتی، اپنی درویشی اور گوشہ نشینی کو ہی راہِ نجات سمجھتے ہیں:۔

"شب گذشتہ عالم خواب میں میں نے اپنے پدر مغفور کو کمال مسرور و خوش حال دیکھا
اور اس بزرگ نے مجھ سے فرمایا اے دختر یہ مرتبہ عالی مجھے محض ترک خلایق
دنیا و خرقہ درویشی کے سبب نصیب ہوا"[۹]

یعنی خدا کے یہاں ان کی اس نفس کشی اور عبادت کا اجرِ عظیم ملتا ہے اسی لیئے وہ خود کو خلایق کے روبرو ظاہر نہیں کرتے:۔

"میں نے کہا قبلہ عالم وائے مرشد بنی نوع آدم میری یہ آرزو ہے کہ آپ غریب
خانہ میں قدم رنجہ فرمائیں شاہ صاحب نے فرمایا زنہار ہمیں ایسی تکلیف
شاقہ نہ دینا۔ بلکہ کسی فرد و بشر کے روبرو یہاں پہونچنے کا حال بیان نہ کرنا،
فقط اپنے روائے مطلب پر نظر رکھو"[۱۰]

یہ فقراء تمام عمر عبادت و ریاضت میں گذار دیتے ہیں، سوائے خدا کے کسی سے تعلق نہیں رکھتے درویشوں کی اس سادگی اور درباری زندگی سے دوری نے انھیں عوام میں بے حد مقبول کر دیا۔

---

۵ ص ۱۴۵ ج ۱، ۹ ص ۱۰۷، ۳ ج ۱، ۷ ص ۱۴۶ ج ۵، ۸ ص ۱۴۷ ج ۶، ۹ ص ۱۴۹ ج ۵، ۱۰ ص ۱۰۶ ج ۵،

لوگوں کے دلوں میں ان کا مرتبہ علماء سے زیادہ تھا۔ علماء ظاہری نمود و نمائش پر بھی توجہ دیتے تھے، ان کے نزدیک کافر واجب القتل تھا ان کے برعکس درویش اپنی گودڑی اور سادگی پر فخر کرتے تھے۔ ان کی مجالس میں کافر بھی شریک ہوتے تھے، اپنے کشف و کرامات کے سبب بھی، لوگوں میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔

"بوستان" میں حکمائے عالی قدر کے علاوہ بے شمار ایسے درویش اور ان کے تکیے ہیں جن کے در دولت پر مرادمند حاضری دیتے ہیں اور مراد پاتے ہیں، مثلاً درویش آگاہ[۱]، عبدالخیر جنی[۲]، عبدالحکیم[۳]، درویش منجم[۴]، شاہ آگاہ[۵]، درویش جیلی[۶]، درویش بیابانی[۷]، درویش ذاکر[۸]، شاہ سلیم[۹]، درویش مغربی[۱۰]، درویش صفا[۱۱] وغیرہ یہ وہ فقیر ہیں جن کے عوام و خواص سبھی معتقد ہیں جن کو مال و متاع کی ہوس نہیں، جنھوں نے خود کو عبادتِ الٰہی اور خدمتِ خلق کے لئے وقف کر دیا ہے جب بھی کسی پریشان حال کو کسی درویش کے بارے میں معلوم ہوتا ہے وہ اس کے پاس جاکر اپنی پریشان حالی کو بیان کرتا ہے۔

تاریخ بھی اس طرح کی ان گنت مثالیں پیش کرتی ہے، ایک مرتبہ ملتان کا حاکم ناصرالدین قباچہ حضرت قطب الدین بختیار کاکی رح کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ حضرت مغلوں کا لشکر ملتان فتح کرنے آیا ہے مجھے مقابلہ اور مجادلہ کی قوت نہیں خدا کے لیے میری مدد کیجئے۔ حضرت قطب صاحب رح نے ایک تیر اس کو دیا اور فرمایا بعد نمازِ مغرب برج حصار پر برآمد ہو کر کمان سے اس تیر کو دشمن کی جانب پھینک دینا۔ ناصرالدین نے ایسا ہی کیا تیر کا گرنا تھا کہ مغلوں کے لشکر نے راہِ فرار اختیار کی[۱۲] جہانگیر نے گجرات کے ایک درویش شاہ عالم کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ مردے کو زندہ کر دیتے تھے ایک مرتبہ ایک شخص کے یہاں ان کی دعا سے فرزند ہوا، جو ۷ سال کی عمر میں مرگیا وہ شخص روتا پیٹتا ان کے پاس گیا انھوں نے کچھ جواب نہ دیا اور اندر چلے گئے بیٹے نے اس کی سفارش کی تو انھوں نے کہا کہ تو اس کے بدلے میں اپنی جان دے گا وہ تیار ہو گیا انھوں نے خدا سے دعا کی جس کے اثر سے ان کا بیٹا مر گیا اور وہ زندہ ہو گیا[۱۳]۔ کرنل اسکنر کے یہاں کوئی اولاد نہ تھی اس نے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے دعا کی درخواست کی، آپ نے اس کے لئے دعا فرمائی اور لڑکے کی خوش خبری دی[۱۴]

۱؎ ص ۱۹۴ ج ۱، ۲؎ ص ۲۱۳ ج ۱، ۳؎ ص ۸۷ ج ۱، ۴؎ ص ۵۵ ج ۱، ۵؎ ص ۲۸۶ ج ۱، ۶؎ ص ۶۱ ج ۵، ۷؎ ص ۲۶۵ ج ۱، ۸؎ ص ۲۵۱ ج ۵، ۹؎ ص ۱۰ ج ۵، ۱۰؎ ص ۲۵۵ ج ۵، ۱۱؎ ص ۳۶ ج ۱، ۱۲؎ دلی کے بائیس خواجہ ص ۶۴، ۱۳؎ تزک جہانگیری ص ۲۴۷، ۱۴؎ دلی کے بائیس خواجہ ص ۲۸،

لوگوں کی فقراء سے اس قدر دلچسپی دیکھ کر بہت سے فریبی اور جھوٹے فقیر بھی پیدا ہو گئے تھے۔ اور لوگوں کو بہلا پھسلا کر لوٹتے تھے۔ واقعات اظفری میں ایک واقعہ درج ہے کہ مرزا جہاندار شاہ دہلی سے فرار ہو کر جب لکھنؤ پہونچے تو ان کی زوجہ جیونا بیگم بہت پریشان ہوئیں، اپنے شوہر کے پاس پہونچنے کے لئے طرح طرح کی ترکیبیں کیں، اس زمانہ میں ایک مکار فقیر دھلی میں آیا ہوا تھا انھوں نے اس کی طرف رجوع کیا اس درویش مکار نے بیگم کو یقین دلایا کہ آپ یقین رکھیں میں اپنے موکلوں کے ذریعہ آپ کو لکھنؤ پہنچا دوں گا، وہ درویش ایک سال تک انھیں تسلّی دیتا رہا اور ہزاروں لاکھوں روپے کا آدمی ہو گیا ایک دن ایک تعویذ بھیج کر کہلا بھیجا کہ آدھی رات کے وقت ایک پلنگ پر بقدر گنجائش زیورات اور قیمتی اشیا لے کر بیٹھ جائیے گا میرے موکل آپ کو منزل مقصود تک پہونچا دیں گے بیگم صاحب اس کے کہنے پر عمل کیا، رات کو انھیں محسوس ہوا کہ ان کا پلنگ گز بھر زمین سے اوپر اٹھا اور نیچے آ گیا۔ صبح کو جب یہ ماجرا بیگم نے فقیر کے روبرو بیان کیا تو اس نے کہا آپ نے میری ہدایات پر اچھی طرح عمل نہ کیا ہوگا۔ خیر میں آپ کی خاطر ایک چلہ اور کھینچوں گا اور آپ کو لکھنؤ بھیج کر رہوں گا اس کے بعد وہ فقیر دلّی میں پھر کبھی نظر نہ آیا[1]۔ ایسے فریبی فقیروں سے داستان بھی خالی نہیں بہت سے فقیر ایسے ہیں جن کا پیشہ لوٹ کھسوٹ ہے، ایک فقیر اپنے دس بارہ مریدوں کے ساتھ ایک تکیہ میں رہتا ہے جب کوئی حاجت مند اس کے پاس آتا ہے وہ اس سے روپے اور جواہرات لیتا ہے اور جھوٹے کلمات سے اسے تسلّی دیتا ہے[2]، ایک اور فقیر نے بھی سادہ لوح خلایق کو لوٹنے کا یہی پیشہ بنا رکھا ہے:-

> "روز سویم تکیہ میں ایک فقیر کے پاس پہونچا وہاں دیکھا کہ صدہا مرد و زن نذر و نیاز لئے ہوئے بیٹھے ہیں اور گویا کسی بزرگ کے منتظر ہیں ناگاہ اندر سے حجرہ کے ایک فقیر نصف ریش سیاہ نصف سفید عمامہ سر پر باندھے ہوئے باہر نکلا، خلایق فقیر کی قدمبوس ہوئی اور وہ نذر و نیاز گذرانی فقیر نے نیاز اپنے کوچک ابدالوں کے حوالہ کی[3]"

جہانگیر نے بھی ایک فریبی پیر کا ذکر کیا ہے لکھا ہے کہ سرہند میں ایک شخص شیخ احمد نے مکر و فریب کا جال بچھا کر سادہ لوح انسانوں کو ورغلانا شروع کر رکھا ہے، لوگوں کو طرح طرح کے فریبوں میں

---

[1] بحوالہ نادرات شاہی ص ۵۸، [2] ۵۸، ج ۱، [3] ۱۸۱، ج ۲،

پھانس رہا ہے، ان وجوہات کی بنا پر میں نے اسے دربار میں طلب کیا اور اس کی اصلاح کیلئے اسے انی رائے سنگھ دکن کے حوالے کیا کہ اسے قلعہ گوالیار میں قید کر دے[1]۔

جھوٹے اور مکار فقیروں کے پیدا ہونے کی وجہ لوگوں کی ضعیف الاعتقادی تھی، ہر بت کو خدا سمجھنے والے لوگ ہر فقیر کو ولی اللہ سمجھتے تھے۔ دراصل ہر آدمی کم وقت اور کم محنت خرچ کر کے بہت کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے اور اس کا ایک ہی ذریعہ ہے کہ غیب سے مدد ہو، کوئی پیر غیب اپنے کشف و کرامات سے اس کے تمام مشکل مرحلوں کو آسان کر دے۔ پیر و فقیر کی کثرت، ان کی عیش کوشیاں اور لوگوں کی ان کی طرف انتہائی درجہ رغبت دیکھ کر شاہ ولی اللہ نے کہا تھا۔

> "اس زمانے کے مشائخ کے ہاتھ میں ہاتھ نہ دینا چاہیئے اور کبھی ان کا مرید نہ ہونا چاہیئے کیونکہ آج کل یہ لوگ طرح طرح کی بدعات و رسومات میں مبتلا ہیں، شہرت، رجوع خلق اور مریدوں کی کثرت کو دیکھ کر دھوکا نہ کھانا چاہیئے"[2]

لیکن ایسی نصیحتیں بہت کم خواص و عوام کے دلوں پر اثر انداز ہوتی تھیں۔ کیونکہ فقرا کی قدر و منزلت ان کے دلوں پر نقش ہو گئی تھی، خدا کی بزرگی کے ساتھ ساتھ صوفیا کی بزرگی پر بھی انھیں کامل یقین تھا، انھیں یہ اعتقاد تھا کہ یہ درویش ہر حال میں ہمارے مددگار ہیں اور جس طرح خدا ہر جگہ ہمیں دیکھ سکتا ہے اور ہماری مدد کر سکتا ہے اسی طرح انھیں بھی یہ قدرت حاصل ہے کہ ہماری حرکات و سکنات سے باخبر رہیں۔ "بوستان" کے حکمار کو یہ قدرت حاصل ہے وہ اپنے عبادت گاہ میں رہ کر بھی شاہزادوں کے حال سے آگاہ رہتے ہیں اور جب بھی شاہزادوں کو پریشان و سرگرداں دیکھتے ہیں، مددغیبی کی طرح ان کے پاس پہونچ جاتے ہیں۔ خود یہ شاہزادے بھی عالم لاچاری و بے بسی میں انھیں کی مدد کے طالب ہوتے ہیں:-

> "اب تمام اہلِ لشکر کو ثابت ہو گیا کہ سعدان نے محض بزرگانِ دین کی تائید سے جمشید کو شکست فاش دی"[3]

صاحبقران اکبر معزالدین کے مرشد حکیم قسطاس الحکمت ہیں وہ ہمیشہ انھیں کو مدد کیلئے یاد کرتا ہے۔ صاحبقرانِ اعظم اور اصغر حکیم اسقلینوس سے مدد کے طالب ہوتے ہیں۔ ملکہ عالیہ خاتون

---

[1] تزک جہانگیری ص ۳۱۸، [2] ماخوذ از اٹھارہویں صدی میں ہندوستانی معاشرت ص ۳۰۲، [3] ج ۲۷۳،

اپنے مرشد درویش آگاہ کو مصیبت کے وقت یاد کرتی ہے اور درویش آگاہ نے اسے ایک اسم تعلیم کیا ہے کہ جب تم اسے پڑھوگی میں تمہارے پاس پہونچ جاؤں گا[1]

یہ چند مثالیں محض اشارتاً پیش کی گئی ہیں جبکہ "بوستان" کے تمام مسلمان شاہزادے اپنے مرشدین سے ہر مرحلہ پر مدد چاہتے ہیں۔

بزرگانِ دین کی مدد کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ وہ حاجت مند کیلئے دعا فرماتے تھے یا کسی اسم اعظم کے ورد کی تاکید کرتے تھے یا کوئی تعویذ وغیرہ مرحمت فرماتے تھے جس کے اثر سے مراد مند اپنی مراد حاصل کرتا تھا، صاحبقران اعظم، صاحبقران اصغر اور ملکہ ماہ جبیں کی ولادت درویش اقلینوس کی دعاؤں کا نتیجہ تھی، بادشاہ بہرام شاہ نے درویش سے اولاد کے لیئے دعا کرنے کی درخواست کی، خدا کی رحمت اور درویش کی دعا سے بادشاہ صاحب اولاد ہوا[2]

درویشوں کی خدمت و عزت کرنے سے اگر ان کی دعائیں ملتی ہیں تو ان سے بدسلوکی کا نتیجہ کبھی کبھی بد دعا بھی بن جاتا ہے۔ ملک اسلوق کا باپ ایک سپاہی تھا ایک درویش کی توجہ سے سلطنت اسلاقیہ کا حاکم بنا لیکن اس نے درویش کی اولاد کے ساتھ بد اخلاقی اور بدسلوکی برتی۔ ان کی طرف سے گردن پھیری جس کی وجہ سے ہمیشہ کے لیئے اس کی گردن ٹیڑھی ہوگئی[3] درویشوں کے یہاں اس کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں کیونکہ یہ بزرگانِ دین اپنی ذات سے کسی کو تکلیف نہیں دینا چاہتے بلکہ ہر ایک کی بھلائی چاہتے ہیں۔

ہندو اور مسلمان دونوں ہی اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ اگر خدا کا نام کسی مشکل وقت میں لیا جائے تو وہ مشکل آسان ہو جاتی ہے۔ اہلِ ہنود عموماً ایسے وقتوں میں شیو، شنکر، رام، ہنومان، کرشن وغیرہ کو یاد کرتے ہیں یا ان کا نام لے کر کسی کام کو شروع کرتے ہیں، مسلمان کلامِ الٰہی کو دہراتے ہیں، کبھی سورہ فاتحہ پڑھکر دل کی تسکین کرتے ہیں کبھی آیۃ الکرسی پڑھکر دستک دیتے ہیں کہ جہاں تک دستک کی آواز جائے گی خدا اس کی حفاظت کرے گا، بعض لوگ نادعلی پڑھکر دم کرتے ہیں[4] برکت و رحمت خداوندی کے لیئے درود شریف بار بار پڑھتے ہیں یا کسی بزرگ کے بتائے ہوئے اسماء کا ورد کرتے ہیں۔ کبھی اللہ اکبر، یا علیؑ، یا مشکل کشا وغیرہ سے کام کی ابتدا کرتے ہیں۔ کلامِ الٰہی کی برکت کے متعلق مسند حضرت ابن ابی اسامہ میں آنحضرتؐ سے روایت ہے کہ آپؐ نے سورہ یٰسین

---

[1] ۳۰۹ ج ۱، [2] ۱۱تا۱۴ ج ۴، [3] ۴۶۲ ج ۵، [4] ۴۵۴ ج ۹ م،

کی فضیلت بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

"اگر اس کو خوف زدہ شخص پڑھے گا تو اس کو امن حاصل ہو جائے گا اگر بھوکا پڑھیگا تو اس کا پیٹ بھر جائے گا ننگا پڑھے گا تو اس کو لباس حاصل ہو جائے گا، پیاسا پڑھے گا تو اس کو سیرابی حاصل ہو گی اور بیمار پڑھے گا تو اس کو شفار حاصل ہو گی"[1]

"بوستان" میں اس طرح کی بہت سی مثالیں ھیں۔ اسد تاجدار کو ایک درویش نے ایک اسم بتایا جسے چالیس دن پڑھنے سے اس کی محبوبہ کو بھی اس کی طرف رغبت ہوئی اور اس نے اسد کو خواب میں دیکھا[2] صاحبقران کے دل میں اپنی محبت پیدا کرنے کے لئے سبیلہ بانو نے ایک بزرگ سے مشورہ لیا اس نے ایک اسمِ اعظم صبح و شام پڑھنے کے لئے کہا، جسے پڑھکر وہ اپنے مطلبِ دلی کو پہونچی[3] حکیم بوریائے ولی نے چند اسمائے جلیل رفع حاجات و حل مشکلات کے واسطے بتائے تھے اور کہا تھا کہ یہ اسمائے الٰہی مخصوص عقدہ کشائی کے واسطے ہیں جب پڑھو گے طرفۃ العین میں مشکل دور ہو جائے گی[4]۔

بیماریوں سے شفا پانے کیلئے بھی اسمارِ اعظم دم کئے جاتے ہیں۔

"ناچار چند اسمائے اعظم متبرک پڑھ کے ان آبلوں پر دم کئے ان اسمائے بزرگ کی برکت و تاثیر سے سوزش آبلوں کی کسی قدر کم ہوئی"[5]

"آبِ سرد پر کوئی اسم دم کیا بعد ازاں وہ پانی مادر نابینا کی آنکھوں کو ملا فضلِ الٰہی سے اور اسمِ بزرگ کی برکت سے فوراً آنکھیں روشن ہو گئیں"[6]

ہتھیاروں اور جنگی لباسوں پر اسمائے اعظم دم کئے جاتے تھے تاکہ کوئی حربہ اثر نہ کرے، ہتھیار کارگر ہو، اکثر بادشاہ جنگوں میں جامۂ قرآنی پہنا کرتے تھے۔ جس پر قرآنی آیتیں کندہ ہوتی تھیں، صاحبقران اکبر کے پاس زرہ صد مثقال ہے جو بزرگانِ دین نے خاص صاحبقران کے لئے تیار کی تھی اور جس پر کوئی حربہ اثر نہیں کرتا[7] اسی طرح ملکہ عالیہ خاتون کو درویش آگاہ نے ایک خفتان پہنایا جس پر کوئی ہتھیار اثر انداز نہیں ہوتا[8]۔ کفار کے لشکر میں بعض پہلوان روئیں تن ہوتے ہیں، جس کی وجہ سے ان کے بدن کو ہتھیار متاثر نہیں کرتے، جمشید خود پرست، انجد پہلوان وغیرہ اپنے

---

[1] سیرت حلبیہ جلد ۲، قسط ۱، ص ۷۹، [2] ۱۰۷ ج ۵، [3] ۵۰ ج ۵، [4] ۲۳۷ ج ۴، [5] ۱۱۸ ج ۹ م، [6] ۱۸۷ ج ۱، [7] ۱۲۵ ج ۹ م، [8] ۲۹۸ ج ۱،

مرشدین کی وجہ سے روئیں تن ہیں[1]۔ تلواروں وغیرہ پر بھی دعائیں دم کرتے ہیں[2]۔

"تم کو لازم ہے وہ اسم اعظم جو لطمہ لوح پر مرقوم ہے ایک ہزار ایک سو اکہتر بار باد رود اول و آخر پڑھو اور خنجر کی باڑھ پر دم کر لو"[3]

شاہ اسرار الحق نے صاحبقران اکبر کو جمشید سے جنگ کرنے کے واسطے ایک گرز دیا تھا جس پر دفع سحر کے لئے آیات قرآنی سرتاسر منقش تھیں[4]۔ جمشید کے پاس بھی گرزِ قدرت ساختہ ساحر موجود تھا جس پر خطوط سحر کندہ تھے[5]۔

اسم اعظم کے پڑھنے کے بعد پڑھنے والا خود کو خدا کی محافظت میں محسوس کرتا تھا اور یقین کرتا تھا کہ اب کوئی آفت مجھے نقصان نہ پہونچا سکے گی[6]۔

اسم اعظم کا ورد کرنے کے لئے عموماً خلوت کی جاتی ہے یا کہیں دور جا کر اوراد خوانی کرتے ہیں[7]۔

"شاہزادہ نے فرمایا پس یہی فکر ہے کہ خیمہ عبادت استادہ کرواؤ میں آج کی شب اسی اسم بزرگ کا ورد کروں گا کہ جو وقتِ رخصت میرے باپ نے تعلیم فرمایا ہے ...... شاہزادہ فرخ زاد نے اول روزہ کی نیت کی بعد ازاں عبادت خانہ میں گیا اور بخور و عطریات وغیرہ اشیا جو ہنگام اوراد خوانی لازم ہیں پاس رکھ لیں۔ ناگاہ عالم بے خودی میں ایک ہاتف غیب نے آواز دی اے فرخ زاد بن شہاموت دانا مژدہ ہو تجھے کہ تیر التجا تیرا ہدفِ مراد پہونچا"[8]

اوراد خوانی کے وقت گوشہ نشینی اختیار کرنا اور اپنے پاس بخورات اور عطریات کا جمع کرنا ہندوستان کے سادھوؤں کی ریاضت کی طرف ذہن کو لے جاتا ہے۔ ہندوستان میں قدیم زمانہ سے دھونی رمانے کا رواج ہے دھونی رماتے وقت بھی سادھو اپنے پرماتما کا دھیان کرتا ہے اور اپنے پاس خوشبوئیات جلا کر فضا کو مہکاتا ہے۔ گوتم بدھ نے گیان حاصل کرنے کے لئے آبادی کو چھوڑ کر جنگل کی راہ لی اور ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر خدا کا دھیان کیا۔ حضرت محمدؐ نے بھی آبادی سے دور ایک غار میں خدا کا دھیان کیا۔

فقرا پر اعتقاد کا یہ عالم ہو گیا تھا کہ ان کے کلمات کو کلماتِ خدا کی مانند سمجھا جاتا تھا اور ان کے

---

[1] ص ۳۲۵ ج ۹م، [2] ص ۲۵۶ ج ۳، [3] ص ۱۲۲ ج ۹م، [4] ص ۳۴۶ ج ۹م، [5] ص ۲۸۹ ج ۹م، [6] ص ۱۱۸ ج ۱۴، [7] ص ۹۴ ج ۱۴، [8] ص ۴۷۰ ج ۵،

بتائے ہوئے احکامات پر احکاماتِ دینی کی طرح عمل کیا جاتا تھا، بچہ کی ولادت کے دن سے ہی اسے تعویذوں سے لاد دیا جاتا تھا، کوئی تعویذ نظرِ بد سے بچانے کے لئے ہوتا، کوئی امراض کو دفع کرنے کیلئے اور کسی کے اثر سے بری بلائیں بچہ سے دور ہوتیں، جس طرح بعض مشکل اوقات میں اسمِ اعظم کا ورد کیا جاتا تھا اسی طرح بعض کاموں کو آسان کرنے اور اثرات کو زائل کرنے کے لئے تعویذ گنڈوں کا استعمال ہوتا تھا۔ بادشاہ اور امرا تک یہ امید رکھتے تھے کہ اسمائے اعظم اور تعویذوں کے ذریعہ حکومت کو سنبھال لیں گے، ہر ایک کو شکست دے دیں گے، ڈاکٹر محمد حسن نے اٹھارہویں صدی عیسوی کے توہم پرست ماحول کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :۔

"ہر طرف ضعیف الاعتقادی کا زور تھا اور گنڈے تعویذ، منّتیں، مرادیں، عرس اور قوالیاں، اوراد و وظائف کا چرچہ تھا اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ غالباً انحطاط پذیر دہلی کے لوگوں میں عمل کی طاقت سلب ہوگئی تھی تعیش پسندی نے ان کے ذہنوں کو متاثر کر لیا تھا، اور ان کی شخصیتوں کو محنت اور ضابطہ بندی کی عادت سے دور کر دیا تھا، عمل سے بیگانہ ہو کر وہ اب اپنے مسائل کا حل اپنی قوتِ بازو کے ذریعہ تلاش کرنے کے بجائے کسی غیبی قوت کے سہارے، معجزے یا کرامات میں ڈھونڈ رہے تھے"[1]

غیبی قوت کا سہارا پیروں فقیروں کے واسطے سے مل سکتا تھا اور پیر فقیر مرادمندوں کو تعویذوں سے نوازتے تھے۔ تعویذ گنڈوں پر اعتقاد کے سبب ہر شہر، ہر دیہات میں ایسے بے شمار فقیر بن گئے تھے، جن کا باقاعدہ کاروبار ہی تعویذ بنانا ہوتا تھا، تعویذوں پر صرف مسلمان ہی یقین نہیں رکھتے تھے بلکہ ہندو بھی اتنا ہی اعتقاد رکھتے تھے لوگوں کو دواؤں، اور حکما سے زیادہ تعویذ گنڈوں پر بھروسہ تھا، تمام امراض جسمانی سے نجات حاصل کرنے کے لئے تعویذوں کا سہارا لیا جاتا تھا، جن، بھوت پریت، چڑیل سے بچنے کیلئے تعویذ باندھے جاتے تھے، خصوصاً طبقہ خواتین میں تعویذ گنڈوں کو زیادہ مقبولیت حاصل تھی، عورتیں اپنی ہر مشکل کو تعویذوں کی مدد سے حل کرنا چاہتی تھیں۔ مغل شاہزادہ مرزا جواں بخت کی زوجہ جیونا بیگم تعویذ ہی کی مدد سے اپنے شوہر کے پاس پہونچنا چاہتی تھیں یہی حال "بوستان" کی شاہزادیوں کا ہے :۔

---

[1] اردو شاعری کا تہذیبی اور فکری پس منظر۔ ص ۶۵

"ملکہ تاج افروز وشہر افروز وپیکر ناز اسی حالت دیوانگی و سرشاری جنون میں درویش جبلی کے پاس آئیں۔ درویش جبلی نے شاہزادیوں کی پشت پر دستِ شفقت پھیرا اور کوزۂ آب پر ایک اسمِ الٰہی دم کیا بعد ازاں وہ پانی ان کو پلایا، بر وقت پینے آبِ دم شدہ کے یہ تینوں نازنیں بے ہوش ہو گئیں جس وقت ہوش میں آئیں وہ اضطرار و کرب ان کے دل کا جاتا رہا ۔۔۔ درویش جبلی نے اور دو تعویذوں کا پانی ان کو پلایا اور ایک ایک تعویذ بازو پر باندھ دیا"[۱]

تعویذوں کو دھو کر بطور دوا پلایا بھی جاتا تھا[۲] عموماً تعویذ کو دھاگے سے باندھ کر گلے میں لٹکاتے تھے یا بازو پر باندھ لیتے تھے، انشاؔ کا شعر ہے ؎

غش ہوئے ہم تو اجی قہر تھا اس کافر کا
لال ناڑے میں بندھا ہائے وہ نیلا تعویذ[۳]

یا

دکھتی ہے اگر آنکھ تو تعویذ "ان یکاد"
بازو پہ اپنے تو پے رفع گزند باندھ[۴]

آج بھی یہ رواج ہے اور پہلے کچھ زیادہ ہی تھا کہ جب کوئی گھر سے سفر کے لیے نکلتا ہے یا دولہا بیاہ کے لئے جاتا ہے تو اس کے بازو پر امام ضامن باندھتے ہیں جو دورانِ سفر ان کا محافظ و مددگار رہتا ہے "بوستان" کے شاہزادوں کے بازوؤں پر بھی امام ضامن بندھا ہوا نظر آتا ہے :-

"ایک تعویذ میرے بازو پر باندھا اور کہا کہ یہ تعویذ جلد رفتار اور سریع السیری کے باب میں اسمِ اعظم کا حکم رکھتا ہے"[۵]

بلاؤں سے محفوظ رہنے کے لئے بعض مرید اپنے مرشد ہی کی کسی شے کو بطور تعویذ اپنے پاس رکھتے ہیں:

"میں موئے مبارک جناب حکیم صاحب کا بجائے تعویذ ہمیشہ اپنے پاس رکھوں گا تاکہ کسی بلا میں گرفتار نہ ہوں"[۶]

کہانیوں میں بالوں کی بھی بڑی اہمیت رہی ہے، بہت سے بزرگ اور دیو اپنے سر یا داڑھی کا کوئی بال کسی شاہزادے کو یہ کہکر دے دیتے ہیں کہ تم جب بھی اسے سورج یا آگ کی طرف دکھاؤ گے ہم حاضر ہو جائیں گے۔ ہندوستان میں ایک زمانہ سے حضرت محمدؐ کا موئے مبارک

---

[۱] ۵۶۸، ج ۵، [۲] ۱۸۲، ج ۶، [۳] کلیات انشا، [۴] ایضاً ص ۱۱۱، [۵] ۲۱۶، ج ۳، [۶] ۸۳، ج ۳،

موجود ہے جسے دیکھنے اور چومنے کے لئے ہزاروں لوگ جاتے ہیں۔ کشمیر میں آج بھی درگاہ حضرت بل لائقِ تعظیم ہے جہاں رسول اللہؐ کا موئے مبارک رکھا ہوا ہے۔ عقیدت مند لوگ اپنے مرشدین کے موئے مبارک کو بطور تعویذ اپنے پاس رکھتے ہیں۔

پیروں اور فقیروں سے عقیدت کی بات اوراد و وظائف یا تعویذ گنڈوں تک ہی آکر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ یہ عقیدت اور محبت قبر پرستی کی طرف رغبت دلاتی ہے، قبر پرستی ہندوستانی مسلمانوں کے خاص مذہبی اعتقادات میں شامل ہے۔ ہندوستان کے ہر شہر، ہر قصبہ اور گاؤں میں کسی نہ کسی بزرگ کا مزار موجود ہے جس پر ہر روز بالخصوص جمعرات کو مرادمند لوگ جبینِ نیاز جھکاتے ہیں ان مزاروں کے آگے گریہ و زاری کرتے ہیں اور مطلبِ دلی بیان کرتے ہیں، مزاروں پر آکر آہ و زاری کرنا اور اپنے لئے کچھ طلب کرنے کا سبب لوگوں کا یہ یقین ہے کہ بزرگانِ دین کو موت نہیں آتی بلکہ وہ پردہ کر لیتے ہیں، قبر کے اندر رہ کر بھی وہ دنیا کے حالات سے واقفیت رکھتے ہیں، خود داستان نگار نے ایک جگہ لکھا ہے کہ:۔

> "برگزیدگانِ درگاہ صمدیت کا نخلِ حیات ہمیشہ سرسبز و بارآور رہتا ہے یعنی ان کو فنا نہیں ہوتی، ان مقبولانِ جناب ایزدی کی مرگ فقط نقلِ مکان سے مراد ہے وہ خداشناس اپنا نفس لطیف بریاضت شاقہ الیسا مجرد آلائش دنیاوی سے پاک رکھتے ہیں کہ بعد از مرگ ارواح مطہران کی ہرگز منفک نہیں ہوتیں اکثر کام ان سے اس عالم میں بھی ظاہر ہوتے ہیں چنانچہ ان اولیاء اللہ لایموتون انہی خاصان بارگاہ احدیت کی شان میں نازل ہوا ہے۔"[1]

داستان میں اس کی بہت سی مثالیں ہیں کہ ہزاروں برس پہلے فوت ہونے والا اچانک حاجتمند کے روبرو حاضر ہو جاتا ہے اور اس کی مشکل حل کرنے کے بعد واپس چلا جاتا ہے، مشرقہ خاتون جن کے انتقال کو چار ہزار برس کا عرصہ گذر چکا ہے، اس وقت صاحبقران سے ملاقات کرتی ہیں جب وہ ان کے مزار پر جاتا ہے اور ملاقات کے بعد روپوش ہو جاتی ہیں، تب صاحبقران حیرانی سے کہتا ہے "فی الحقیقت اولیاء اللہ۔ برگزیدگانِ بارگاہ احدیت ہمیشہ زندہ رہتے ہیں"[2]

قبر پرستی کا رواج ہندوستان میں اس حد تک تھا کہ لوگ مندر کے دیوی دیوتاؤں کی

---

[1] ج ۵، ص ۶۲۸ ، [2] ج ۵، ص ۳۶۰ ،

طرح قبروں کے آگے سجدے کرنے لگے تھے، قبروں پر چادریں چڑھاتے، نذریں پیش کرتے تھے، منتیں مانتے تھے اور ہر سال باقاعدہ مزاروں پر عرس کرتے تھے، جس میں لاکھوں زائرین زیارت کے واسطے دور دراز علاقوں سے آتے تھے جس طرح مندروں میں ایسے موقعوں پر بھجن اور کیرتن گائے جاتے ہیں اور میلہ لگتا ہے، مزاروں پر قوالیاں ہوتی تھیں، طوائفوں کے ناچ ہوتے تھے، باقاعدہ میلہ لگتا تھا جس میں ہر شے کا بازار سجتا تھا، تفریح کا ہر سامان ہوتا تھا مرد، عورتیں بن سنور کر میلے میں جاتے تھے اور مزہ لوٹتے تھے، عرس اور میلہ کا ذکر تفریحات کے باب میں کیا گیا ہے۔

قبر پرستی کی وبا عوام و خواص سبھی میں پھیل چکی تھی، سلاطین اور امراء خود مزاروں پر حاضری دیا کرتے تھے، مزاروں پر عورتوں کی کثرت دیکھ کر سلطان فیروز شاہ تغلق نے مزاروں پر عورتوں کی حاضری کو بند کروا دیا تھا، جبکہ سلطان خود انہی اہل قبور سے مدد کا طالب رہتا تھا۔

عوام میں بعد وفات کے سلطان علاء الدین خلجی کی اس قدر بزرگی بڑھ گئی تھی کہ لوگ اس کے مزار پر عقیدتاً جاتے تھے۔ اور اس کے مزار کی جالی پر منتوں کے دھاگے باندھتے تھے۔

مغلوں کے عہد حکومت میں مسلمان اہل ہنود سے زیادہ ہی قریب ہو گئے تھے، آپس میں رشتہ داریاں ہونے لگی تھیں، شاہی حرم میں ہندو رانیاں داخل ہو گئی تھیں اس لئے عام ہندوستانی رسم و رواج قلعہ معلی سے لیکر امراء کی حویلیوں اور عام مسلمانوں کے گھروں تک میں لاشعوری طور پر رواج پا گئے تھے، یہ دور مسلمانوں میں قبر پرستی کو رواج دینے کا مروج کا دور کہا جا سکتا ہے، اکبر نے جب جہانگیر کے لئے آگرہ سے اجمیر تک پیادہ پا سفر طے کیا تو لوگوں کے دلوں میں یہ یقین پختہ ہو گیا کہ تمام مشکلات کا حل انھیں بزرگانِ دین کے مزارات سے حاصل کیا جا سکتا ہے، اکبر جس کا عقیدہ مذہب اسلام کی طرف سے ڈانوا ڈول نظر آتا تھا، لیکن بزرگانِ دین کے مزارات سے عقیدت رکھتا تھا یہی حال جہانگیر کا تھا۔ خواجہ معین الدین چشتیؒ سے اسے بے حد عقیدت تھی، تزک میں لکھتا ہے:-

"نجومیوں کی مقرر کردہ نیک ساعت میں دار الحکومت آگرہ سے اجمیر کیطرف اس غرض سے روانہ ہوا کہ اول خواجہ معین الدین چشتیؒ کے روضۂ مبارک کی زیارت کروں جو عدیم الفرصتی کی وجہ سے تخت نشینی کے بعد سے اب تک نہ کر سکا ہے"[1]

---

[1] تزک جہانگیری۔ ص ۱۴۲،

"خواجہ معین الدین چشتیؒ کے روضۂ مبارک پہ جاکر اللہ تعالیٰ سے اپنی صحت کی
دعا کی اور منت مانی کہ تندرست اور صحتیاب ہونے پہ نذر و نیاز کے علاوہ
صدقہ و خیرات بھی کروں گا[1] بارگاہ ایزدی میں میری دعا قبول اور مرض
میں آہستہ آہستہ افاقہ ہونے لگا[2]"

جہانگیر کو صرف خواجہ معین الدین چشتیؒ سے ہی عقیدت نہیں تھی بلکہ وہ اکبر کی قبر پر بھی دعا مانگتا تھا لکھتا ہے کہ :-

"والد بزرگوار کے مزار پہ پہونچ کر جو شہر سے تین کوس کے فاصلے پہ ہے ان
کی روح سے مدد کا طلبگار رہا۔۔۔۔ یہ پہلا نیک شگون تھا جو میرے والد
بزرگوار کے روحانی فیض سے حاصل ہوا[3]"

شاہ جہاں نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے مزار پر جاکر اولاد نرینہ کے لئے دعا کی۔ تب داراشکوہ پیدا ہوا[4]۔ اورنگ زیب کے بعد اگر ایک طرف سلطنتِ مغلیہ زوال کی طرف تیزی سے بڑھتی تو دوسری طرف توہم پرستی کو اسی قدر عروج حاصل ہوا۔ لوگ بغیر جد و جہد کے بلندیوں کو پانے کے خواب دیکھنے لگے، تعویذوں اور بزرگانِ دین کی دعاؤں کے سہارے زندہ رہنے کے بری طرح قائل ہو گئے۔ دہلی میں بزرگانِ دین کے مزارات کی کمی نہ تھی۔ تمام مزارات آباد ہو گئے بلکہ ہر قبر پہ جاکر مراد مانگی جانے لگی۔ اس عہد کی قبر پرستی اور زیارتوں کا حال "مرقع دہلی" میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً خاص خاص مزارات کے نام یہ ہیں جہاں مراد مند حاجت روائی کے لئے حاضر ہوتے تھے، درگاہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، درگاہ سلطان المشائخ حضرت نظام الدینؒ، درگاہ حضرت چراغ دہلیؒ، مزار مرزا بیدلؒ، مزار خلد منزل، درگاہ شاہ ترکمان بیابانیؒ، مزار شاہ عزیز اللہؒ وغیرہ۔ ان مزارات کے علاوہ ہندوستان کے ہر شہر میں کسی نہ کسی بزرگ کا مزار موجود تھا اور لوگ اپنی مرادیں لے کر وہاں حاضری دیتے تھے۔ مسلمانوں کا قبر پرستی کی طرف اس حد تک رجحان دیکھ کر شاہ ولی اللہؒ نے فرمایا تھا کہ:-

"تم مدار صاحب اور سالار صاحب کی قبروں کا حج کرتے ہو یہ تمہارے بدترین
افعال ہیں[5]"

---

[1] تزک جہانگیری۔ ص ۱۵۴، [2] ایضاً ص ۶۸، [3] ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر، از ڈاکٹر محمد عمر۔ ص ۲۸،
[5] ایضاً۔ ص ۲۸۲،

لیکن شاہ صاحب کے یہ خطبات توہم پرست ذہن پر اثر نہ کر سکے، شاہ عالم جو عہد زوال کا ایک بادشاہ ہے اپنے اشعار میں جگہ جگہ بزرگانِ دین کے مزارات سے عقیدت کا اظہار کرتا ہے ؎

تمہارے در پہ آیا آفتاب اس کی جو مشکل ہے
کرو جلدی سے آساں حضرت خواجہ معین الدین رح[1]

آسرو راکھ ہے تمہرو اب حضرت پیر رسول سیئے
جی کے منورت پورے کرو شاہ عالم کو بھو منڈل دیجیئے[2]

سلطنت اور اختیارات سے معزول شہنشاہ سب کچھ خواجہ رح ہی سے مانگتا ہے ؎

یہ عرض کروں ہوں اب خواجہ معین الدین رح
دو میری مرادیں سب اب خواجہ معین الدین رح
سر اپنا قدم کر کے میں پہونچوں زیارت کو
تم مجھ کو بلاؤ جب یا خواجہ معین الدین سے
دو ساری خدائی کی دولت مجھے اور حشمت
جلدی بطفیلِ رب یا خواجہ معین الدین رح
سن لو شہ عالم کی یہ عرض کہ تم اس کے
بر لاؤ سبھی مطلب یا خواجہ معین الدین رح[3]

مانگت تم سوں آج میں حضرت خواجہ پیر
شاہ عالم کو دیجے مال و ملک من دھیر[4]

"بوستان" کے کردار بھی ان بادشاہوں سے مختلف نہیں ہیں، مزاروں پر جانا، وہاں نذریں چڑھانا، منتیں ماننا ان لوگوں میں بھی عام ہے جب بھی کوئی شاہزادہ یا شاہزادی یا بادشاہ پریشان ہوتا ہے وہ کسی مزار یا خانقاہ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ ہم یہ بتا چکے ہیں کہ بزرگانِ دین سے عقیدت مندوں کا یہ عقیدہ ہے کہ انھیں موت نہیں آتی بلکہ دنیا سے پردہ کر لیتے ہیں، انتقال کے بعد بھی یہ سب حالات سے باخبر رہتے ہیں اور ضرورت مندوں کی مدد فرماتے ہیں۔ داستان نگار ایک بزرگ کی قبر کا حال لکھتا ہے :-

---

[1] نادرات شاہی، ص ۶۳ [2] ایضاً ص ۶۴ [3] ایضاً ص ۶۶ [4] ایضاً ص ۷۷

"چارطرف تابوت کے مجمرہائے عود و عنبر روشن ہو رہے ہیں ---- ورائے
ازیں تہ خانہ آب و جاروب سے اس قدر مصفا پایا کہ زمانہ حال میں تعمیر ہوا ہے
دل میں کہا ہے شہر سلاں درگاہ احدیت کے بعد حکمائے خدا پرست پابند
شریعت اسلام کا رتبہ ہے"[1]

صاحبقران اکبر جب اس مزار کی زیارت کے لئے گئے "راوی کا بیان ہے حکیم اشراق مغفور کے مزار مقدس سے اس قدر شوکت و ہیبت ظاہر ہوئی تھی کہ صاحبقران کا جسم مثل بید لرزنے لگا"[2] مزار کو دیکھ کر ہیبت طاری ہو جانا بزرگوں کے بعد مرنے کے زندہ رہنے کے یقین کو ظاہر کرتا ہے، اور اسی یقین کے تحت حاجت مند اپنی حاجت ان کے روبرو بیان کرتے ہیں، معزالدین کے اجداد شیخ وحیدالدین کی تربت پہ جاکر فریاد کرتے ہیں[3]۔ سلطان مہدی اور اہل سادات کے ہمراہی سید رکن الدین شہید کے مزار پر جاکر مناجات کرتے ہیں[4]۔ اور ان سے مدد چاہتے ہیں سید رکن الدین منافقین کے ہاتھوں شہید ہوئے تھے۔ اسلام میں شہید کو سب سے بلند درجہ حاصل ہے۔ شہید کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسے موت نہیں آتی۔ اسی لئے اکثر بزرگ شہیدوں کے مزاروں پر گلہائے عقیدت چڑھانے کے لئے جاتے ہیں:۔

"اس نے ملاحوں کی زبانی سنا کہ یہ مقبرۂ شہداء ہے اسی وقت کشتی سے اتر کر مقبرہ
میں گئی اور بعد مناجات بدست خود قبر پر جاروب کشی کی"[5]

"بوستان" کے مسلمان شاہزادے سید رکن الدین شہید سے بے حد عقیدت رکھتے ہیں۔ عموماً مشکل وقت میں انھیں یاد کرتے ہیں۔ سید شہید کے مزار پر ایک ایسا پھول بھی پیدا ہوا کہ اگر اسے کسی کے روبرو کیا جائے تو معلوم ہو جاتا کہ وہ مومن ہے یا کافر[6]۔ ایک اور مزار شیخ الجن کا ہے جہاں لوگ زیارت کے لئے جاتے ہیں۔

"اسی حال میں مجھ کو خیال آیا کہ چندے شیخ الجن کی قبر پر محنت کروں شاید
مطلب برآری ہو والا ہلاک ہونا تو بہت آسان ہے"[7]

ایک کوہستان میں بابا اسحاق کوہستانی کا مزار ہے جو کوئی مراد مند صفائی نیت اور خلوص عقیدت سے تین شب مزار مقدس پہ شب بیدار رہتا ہے پھر کوئی مشکل اس کی بند نہیں رہتی،

---

[1] ج۵، ۳۱۵ [2] ج۵، ۳۱۴ [3] ج۱، ۲۴۸ [4] ج۱، ۲۵۳ [5] ج۵، ۲۰۱ [6] ج۱، ۱۶ [7] ج۱، ۶۱۰

دو شیر ببر اس مزار کی روز و شب نگہبانی کرتے ہیں۔ ہزاروں کی تعداد میں زائرین زیارت کے واسطے وہاں جاتے ہیں، ہر سال عرس ہوتا ہے امیر سلطان جب اپنے برادرِ کلاں امیر خلیل کو تلاش کرتے کرتے تھک گیا تو بابا اسحاق کے مزار پر جا کر شب بیداری کی اور منزل کا پتہ پایا۔[۱]

"بوستان" کے ایک اور مزار کو بھی ایسی ہی عقیدت حاصل ہے یہ مزار زاہدہ خاتون کا ہے، ملکہ روشن گہر جب بے حد پریشان ہوئی تو یاقوت جنی نے اسے زاہدہ خاتون کے مزار پر جانے کا مشورہ دیا

"ملکہ روشن گہر نے اسی قبر پہ ایک خیمہ برپا کرایا، ..... اور نہایت تضرع وزاری کی اور اسی حالت گریہ وزاری میں درود پڑھ کے ثواب اس خاتون مرحومہ کی روح کو بخشا اور اپنے مدعائے دل کی استدعا کی"[۲]

ان مزاروں کے علاوہ داستان کا ایک شاہزادہ شہر اجمیر میں بھی مراد حاصل کرنے کے لئے آتا ہے جہاں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا مزار مقدس ہے[۳]

عموماً بادشاہ یا شاہی خاندان کا کوئی فرد جب زیارت کے لئے جاتا تھا تو وہ مزار کے نزدیک ہی خیمہ برپا کرواتا اور زیادہ سے زیادہ وقت مزار مقدس کے قریب عبادت میں گذارتا۔

"بوستان" میں جب کوئی مرادمند مزار پر جا کر گریہ وزاری کرتا ہے تو وہ بزرگ عالم خواب میں آ کر اس کی مشکل کا حل بتا جاتے ہیں ملکہ روشن گہر نے جب زاہدہ خاتون کی قبر پر آہ وزاری کی تو عالم خواب میں اسے زاہدہ خاتون کی زیارت ہوئی[۴] زہرہ لقا صاحبقران کی محبت دلی پانے کے لئے مشرقہ سلطان کے مزار پر جا کر منت وزاری کرتی ہے کہ طلسم کشا کے دل میں میری ایسی محبت پیدا ہو کہ ہم چشموں میں منفعل نہ ہونا پڑے، مزار سے لپٹ کر روتی ہے، روتے روتے آنکھ لگ جاتی ہے اور عالم خواب میں اطلاع ملتی ہے کہ تیری دعا قبول ہوئی[۵] اسی طرح صاحبقران اکبر جب ایک مزار پر جاتے ہیں :-

"صاحبقران نے مرادمندوں کی مانند حکیم بزرگ کی زیارت کی اور وہ شب اسی قصر بلند پایہ کے اندر عبادت آمرزگار اور دعا و مناجات میں گذاری کچھ شب باقی تھی کہ عالم رویا میں استقلینوس تشریف لائے"[۶] ....

صاحبقران اصغر نے حکیم اشراق کے مزار پر اسمائے جلیل کا ورد کیا تو وہ عالم واقعہ میں قبر

۱؎ ۱۰۵، ۱۱۳ ج ۲، ۲؎ ج ۱، ۹۴۷، ۳؎ ج ۲، ۸۴۸، ۴؎ ج ۱، ۹۴۷، ۱۹۰ ج ۹، ۵؎ ج ۱، ۷۴۱، ۶؎ ۳۶۴ ج ۳،

سے باہر آگئے اور صاحبقران سے ملاقات کی[1]

بزرگانِ دین کا عالم خواب میں آکر مدد کرنا صرف داستانوں ہی کا حصہ نہیں بلکہ تاریخ میں بھی اس کی بے شمار مثالیں مل جاتی ہیں، یوسف عادل شاہ جب اپنے وطن سے پوشیدہ طور پر فرار ہوا تو راہ میں ایک رات اس نے خضر علیہ السلام کو دیکھا حضرت نے فرمایا کہ تم اپنے وطن کا خیال دل سے نکال دو، ہندوستان کا سفر اختیار کرو، ہندوستان پہونچ کر تمہارے اچھے دن آئیں گے اور تم قعرِ مذلت سے نکل کر تختِ حکومت پر جلوہ افروز ہو گے۔ اسی طرح ایک مرتبہ عالم بیداری میں بھی خضرؑ نے عادل شاہ سے ملاقات کی تھی[2]

"بوستان" کے شاہزادوں کی خضرؑ سے بھی ملاقات ہوتی ہے اور وہ ان کی مدد فرماتے ہیں: صاحبقرانِ اکبر جب ایک صحرائے لق و دق میں عالمِ تشنگی اور تکلیف بدن میں مبتلا تھے تو خضرؑ ان کی رہنمائی کے لئے آئے[3]۔ خوابوں کو یوں بھی غیر اہم نہیں سمجھا جاتا اگرچہ خواب میں وہ واقعات نظر آتے ہیں جو آدمی کے لاشعور میں موجود رہتے ہیں لیکن کبھی کبھی خوابوں کے پیچھے کوئی حقیقت بھی نظر آتی ہے، مشہور ہے کہ حاکم مصر نے کوئی خواب دیکھا اور حضرت یوسفؑ نے اس کی تعبیر بیان کی جو حقیقت تھی، "بوستان" کے شاہزادے جب بھی کوئی خواب دیکھتے ہیں تو کسی بزرگ سے اس کی تعبیر ضرور پوچھتے ہیں[4]"

عموماً لوگ جمعرات کے دن مزاروں پر جاتے ہیں، وہاں فاتحہ پڑھتے ہیں اور حاجتیں بیان کرتے ہیں جمعرات کے دن کو مسلمانوں میں متبرک سمجھا جاتا ہے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعرات کے دن کے بارے میں فرمایا ہے کہ:-

> "یہ مرادیں بر آنے کا دن ہے اس لئے کہ اسی دن حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام نے بادشاہِ مصر سے ملاقات کی تھی اس نے ان کی مراد پوری کی اور حضرت ہاجرہ کو ان کے سپرد کیا تھا[5]"

"بوستان" کا مصنف بھی جمعرات کی اس اہمیت کو نظر انداز نہیں کرتا، لکھتا ہے کہ:-

> "ہر پنجشنبہ کو قبر والد پر جاتے تھے اور ثواب سورہ فاتحہ سے اپنے والد مرحوم کی روح کو خوش کرتے تھے[6]"

لے ج ۵، ۳۱۵، ۲ے تاریخ فرشتہ حصہ دوم ص ۶، ۳ے ج ۸، ۱۱۸، ۴ے ج ۹، ۷، ۶۸، ج ۱، ۱۴، ج ۳، ۱۲۶، ج ۳، ۶

۵ے سیرت حلبیہ جلد ۲، قسط اول، ص ۳۴، ۶ے ج ۸، ۱۰، ج ۹، ۴

بزرگوں کی ارواح کو ثواب فاتحہ پہونچاکر خوش کیا جاتا ہے تاکہ وہ بھی ہم سے خوش رہیں، اور ہمارے مقاصد کے حصول میں مدد فرمائیں:۔

"بسم اللہ تشریف لے چل میں تجھے حکم ابیض شاہ کے مزار متبرک پہ لیے چلتا ہوں ثواب فاتحہ سے اس خدا رسیدہ کی روح کو شاد و خرسند کرنا ہے"[1]

مزار پر فاتحہ پڑھنا ہر مسلمان کار نیک سمجھتا ہے۔ بعض تیوہاروں پر باقاعدہ لوگ قبرستان جاتے ہیں اور اپنے اعزا کی قبروں پر اور دوسرے لائق احترام بزرگوں کی قبروں پر فاتحہ پڑھتے ہیں۔ یہ بھی یقین ہے کہ اہلِ قبور منتظر رہتے ہیں کہ کوئی ثواب فاتحہ سے انھیں یاد کرے۔ زاہدہ خاتون ثواب فاتحہ سے محرومی پر افسوس کرتے ہوئے عالمِ خواب میں ایک شاہزادی سے کہتی ہیں:۔

"ایک روز تھا کہ میں عبادت اپنے پروردگار کی کرتی تھی یا اب ایک سورہ فاتحہ کو محتاج ہوں، یہ عاجزی ہے"[2]

ارواح کے نام سے فاتحہ خوانی دراصل ان کے لئے بارگاہ ایزدی میں دعائے مغفرت ہوتی ہے اور بارگاہِ خداوندی میں ان کے درجات بلند کرتی ہے اسی لئے لوگ فاتحہ کی درخواست کرتے ہیں:۔

"گاہے ماہے مجھ خاکسار ہیچ کارہ کو بھی ثواب فاتحہ سے ضرور یاد کرنا، تاکہ روز بازپرس میرا ہاتھ تیرے جدّ بزرگوار خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن تک پہونچے"[3]

خاتم الانبیاء کے دامن تک پہونچنے کا مطلب ہے کہ درجہ بلند ہو۔

صاحبقرانِ اکبر نے جب خورشید نامہ کو کھولا اول صاحبقرانِ اعظم اور اصغر کی ارواح کو ثوابِ فاتحہ پہونچایا[4] اور جب طلسم بیضا میں داخل ہوا تو پہلے سورۂ فاتحہ پڑھی اور بانی طلسم حکیم اسقلینوس الہٰی اور ان کے شاگردوں کی روح پر ثواب بخشا[5]

فاتحہ پڑھ لینے سے ان بزرگوں کی مدد شامل حال ہوجاتی ہے، بصورت دیگر پریشانی بھی اٹھانی پڑتی ہے، مثلاً صاحبقرانِ اصغر نے بغیر حکیم اشراق کی روح پر فاتحہ پڑھے لاکھ کوشش کی کہ لوحِ طلسم حاصل ہوجائے لیکن ناکام رہا جب ایک جانب سے اس کے کانوں میں یہ آواز آئی کہ پہلے فاتحہ پڑھ اور حکیم صاحب کی روح کو ثواب بخش، لوح بآسانی ہاتھ آجائے گی۔ صاحبقران

۱؎ ص ۱۵۰، ج۴، ۲؎ ص ۱۸۴، ج۱، ۹م، ۳؎ ص ۳۳۴، ج۳، ۴؎ ص ۵، ج۴، ۵؎ ص ۶۵، ج۷، ۹م،

کے ایسا کرنے پر لوح اسے مل گئی۔[1]

کسی مرحوم کے لیئے فاتحہ خوانی دعائے مغفرت کی حیثیت رکھتی ہے جس سے نہ صرف مرحوم کی روح خوش ہوتی ہے بلکہ خدا کے یہاں اس کا درجہ بھی بلند ہوتا ہے۔ اسی لیئے اکثر لوگ اپنے مردہ اعزا کے لیئے ہر روز دعا کرتے ہیں:۔

"شاہزادے نے اپنے اوپر فرض کیا کہ بعد ہر نماز ان کے واسطے دعائے مغفرت کروں گا۔"[2]

ارواح کو ثواب فاتحہ پہونچانے کا مقصد محض ان بزرگوں کی خوشنودی حاصل کرنا ہوتا تھا تاکہ ان کے واسطے سے دعائیں قبولیت کے درجہ کو پہونچ جائیں، مشکلات آسانیوں میں بدل جائیں۔ بزرگوں کو خوش کرنے کے لیئے نذریں پیش کی جاتی تھیں، نیازیں بولی جاتی تھیں، مزاروں پر نذریں پیش کرنا مسلمانوں میں ہندوستانی اثرات کا نتیجہ ہے یہاں زمانۂ قدیم ہی سے دیوی دیوتاؤں کے آگے نذریں دی جاتی ہیں۔ دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیئے انسانوں کو بھی ان کے سامنے قربان کیا جاتا تھا بلکہ یہ خونریز رسمیں مغلوں کے زمانہ تک جاری رہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں نے دیوی دیوتاؤں کے بجائے بزرگوں کے مزاروں پر نذریں چڑھانا اور منتیں ماننا شروع کر دیا، فرشتہ نے یوسف عادل شاہ کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

"خواجہ عمار نے یہ منت مانی کہ اگر وہ شاہزادہ یوسف کو لے کر صحیح و سلامت بلاد عجم کی سرحد تک پہونچ جائے گا تو اپنے مال کا پانچواں حصہ حضرت شیخ صفیؒ کے مزار اور خانقاہ کے مصارف کے لیئے نذر کر دے گا۔"[3]

اسی طرح جہانگیر لکھتا ہے کہ:۔

"میں نے منت مانی تھی کہ اگر میری چند آرزوئیں پوری ہو گئیں تو میں خواجہ معین الدین چشتیؒ کے روضۂ مبارک پر ایک طلائی مسہری چڑھاؤں گا۔"[4]

"بوستان" میں اس کی مثال یوں ملتی ہے:۔

"میں نے جناب باری میں وعدہ موثق کیا تھا کہ اگر کوئی فرزند بخت بلند صحت عمر میرے ہاں پیدا ہوگا اور وہ سن تمیز کو پہونچے گا میں اس کو بیت الحرام

---

[1] ۳۱۵ ج ۵، [2] ۳۳۱ ج ۱، [3] تاریخ فرشتہ مترجم عبدالحی حصہ دوم ص ۴۲، [4] تزک جہانگیری ص ۱۹۰،

میں مدینہ منورہ کی زیارت کے واسطے بھیجوں گا۔[۱]

منّت ماننا اور نذر چڑھانے کا رواج اس قدر بڑھ گیا تھا کہ لوگوں نے خصوصاً عورتوں نے باقاعدہ بعض بزرگوں کے نام کی نذر و نیاز کو بعض موقعوں پر لازمی خیال کر لیا تھا اور یہ اعتقاد تھا کہ اگر ان پر عمل نہ کیا گیا تو ضرور کوئی نقصان اٹھانا پڑے گا، بابا فرید کے پوڑے، شیخ سدو کا بکرا، خواجہ خضر کی پوڑیاں، پیر دیدار کا کونڈا، سید جلال کا کونڈا، بی بی کی صحنک، گیارہویں کی نیاز وغیرہ کو ارکان سے دینی سے بھی زیادہ ضروری سمجھا جاتا تھا۔

"بوستان" میں بھی کوئی حضرت مریم علیہا السلام کے نام کا روزہ رکھتا ہے[۲]، کہیں حضرت ہارون علیہ السلام کی نیاز کے واسطے شیر برنج پکائی جاتی ہے[۳]، کوئی پیغمبر صاحب کی نیاز بولتا ہے:۔

"آج میں نے نذر پیغمبر علیہ السلام کے کچھ کھانا پکوایا ہے اور متلاشی تھا کہ کوئی اہلِ اسلام میری نذر میں شریک ہو قضا را وقت شب عالمِ خواب میں مجھے یہ بشارت ہوئی کہ وقت صباح دروازہ پر شہر کے ایک مسلمان سے تیری ملاقات ہوگی تو اسے نذر و نیاز میں شریک کرنا ہے"[۴]

غیر اسلام بھی نذر و نیاز پر اعتقاد رکھتے تھے، پیغمبر صاحب اور دوسرے بزرگوں کے نام کی نیاز دیتے تھے۔ نیاز میں عموماً کوئی میٹھی چیز پکائی جاتی تھی کبھی میٹھے چاول یعنی زردہ یا مٹھائی —— جزائر دریابار کے حاکم کیلئے ضروری تھا کہ وہ ملک مرجان کے نام کا حلوہ پکوائے ورنہ نقصان ہوتا تھا۔

"اگر چار عورتیں دختران ملوک دریابار سے ہر سال بنائے تیاری طلسم سے اس قصر میں نہ آویں اور حلوہ پکا کے ملک مرجان کی روح پر فاتحہ نہ دیں، جو شخص ملوک جزائر سے دختر رکھتا ہوگا اس کو آفت پہونچے گی"[۵]

نذر و نیاز دینے والوں کا یہ عقیدہ ہے کہ اس کا ثواب ضرور ان روحوں کو پہونچے گا جن کے نام کی اس پر فاتحہ پڑھی گئی ہے بلکہ یہ بھی یقین کیا جاتا ہے جو چیز نذر کے لئے پکائی جاتی ہے وہ بھی مردے تک پہونچ جاتی ہے اور وہ اسے پاکر نذر دینے والے کے لئے کامیابی کی دعا کرتا ہے،

جب آدمی دست و پا کی طاقت استعمال کرنے سے لاچار اور بے بس ہو جاتا ہے تو وہ غیبی قوت

---

۱ ص ۳۶۴ ج ۲، ۲ ص ۱۲ ج ۴، ۳ ص ۶۷ ج ۴، ۴ ص ۱۹ ج ۲، ۵ ص ۳۲۹ — ۲۲۲ ج ۱،

کے انتظار میں شمعِ حیات کو روشن رکھتا ہے، اپنے خدا کے آگے سربسجود ہوکر آہ وزاری کرتا ہے، خدا یا دیوتا کو خوش کرنے کے لئے مختلف طریقے اپناتا ہے، کبھی آسمانی طوفان سے حفاظت کیلئے دست بہ دعا ہوتا ہے اور کبھی ابرِ رحمت کی طلب میں محتاج ہاتھوں کو آسمان کی طرف بلند کرتا ہے، مسجدوں میں اذانیں دیتا ہے، مندروں میں گھنٹیاں بجاتا ہے۔

یوں تو "بوستان" میں بھی بہت سی ایسی مثالیں موجود ہیں، جب کسی شاہزادے پر میدانِ جنگ یا عالمِ طلسم میں مصیبت کا وقت آیا اور اس نے صدقِ دل سے بارگاہ الٰہی میں مناجات کی، تو قدرت نے اس کی مدد فرمائی۔ بعض مقامات پر خواتین برہنہ سر ہوکر اپنے معبود کے سامنے اپنی پریشان حالی کا اظہار کرتی ہیں :۔

"اے ملکۂ آفاق تم سر برہنہ ہوکر امیر زادہ کی فتح وظفر کی درگاہِ کارساز بےکس نواز میں دعا اور مناجات کرو"[۱]

"تمہاری والدہ ماجدہ بعد نماز صبح سر برہنہ جناب باری میں یہی دعا کرتی ہیں کہ بارالٰہی صدقہ اپنی وحدانیت کا گل اندام کے دل سے یہ خیال بیہودہ دفع کر اور اس کا مزاج اصل پر لا"[۲]

"دل چاہا کہ سر برہنہ رفع افکار کے واسطے قاضی الحاجات سے دعا مانگو"[۳]

اس عہد کی تہذیب میں سر کا ڈھکنا صرف عورتوں کے لئے ہی نہیں بلکہ مردوں کے لئے بھی ضروری سمجھا جاتا تھا، کسی کا برہنہ سر ہونا اس کی پریشان حالی کی نشاندہی کرتا تھا اسی لئے سر برہنہ دعا مانگ کر بارگاہِ خداوندی میں اپنی پریشاں حالی کا اظہار ہوتا تھا۔

دعاؤں کے لئے بھی لوگ ساعتِ قبولیت کی تلاش میں رہتے تھے عموماً رات کی تنہائی میں دعا کی جاتی تھی، فیروز بخت نے شبِ جمعہ کو دعا کے لئے مقرر کیا[۴] بعد قبول ہونے دعا کے نمازِ شکرانہ ادا کی[۵]

خدا کے حضور میں مانگی ہوئی دعائیں اور بزرگانِ دین کے روبرو گریہ وزاری کے ساتھ بیان کی ہوئی مرادیں جب درجۂ قبولیت کو پہونچتی تھیں تو لوگ راہِ خدا میں مال وزر بطور شکرانہ لٹاتے تھے، غربا و مساکین کو صدقہ و خیرات دیتے تھے، فرشتہ نے لکھا ہے کہ بادشاہ یوسف عادل شاہ کی

۱؎ ۱۱۳ ج۳، ۲؎ ۱۱۹ ج۵، ۳؎ ۵۴۹ ج۵، ۴؎ ۴۷۴ ج۵، ۵؎ ۲۵۶ ج۳،

صحت کے لیے تمام لوگوں نے دعا کی، جب بادشاہ رو بصحت ہوگیا تو اس نے بے شمار مال و زر خیرات کیا، علماء کو بھی نذریں دیں[۱]۔ اکبر کے صدقہ و خیرات کے بارے میں ابوالفضل نے لکھا ہے کہ حاضرین بارگاہ کے معروضات کے مطابق جس قدر رقم روزانہ اہل احتیاج کو عطا ہوتی ہے وہ حدِ حساب سے باہر ہے جو تحریر میں نہیں آسکتی اور جو رقم کہ روزانہ فقراء کو بطور خیرات و نیز محتاجوں کے اخراجات طعام کے لیے دی جاتی ہے اس کو بہ تفصیل معرضِ بیان میں لانا دشوار ہے[۲] ——— یہ دورِ عروج کی بات تھی عہدِ زوال میں بھی خیرات کا یہی عالم آرایش رہا۔ آرائش محل بیگم بیمار ہوئیں تو بہت سا چاندی سونا اور سرت نجا اور گاؤ میش اور مادہ گاؤ سیاہ وغیرہ حیوانات اور اجناس واقمشہ خیرات کیا گیا[۳]۔

خیرات کرنا صرف ضرورت مندوں کی دعائیں حاصل کرنا ہی نہیں ہوتا بلکہ کارِ ثواب بھی سمجھا جاتا ہے کہ اس کا اجر عالم بالا میں ملے گا "بوستان" کے بادشاہ اور بیگمات بھی عادل شاہ ، اکبر اور آرائش محل بیگم کی طرح مال و زر بطور خیرات تقسیم کرواتے ہیں۔ شاہزادہ معزالدین جب تین روز و شب کے بعد ہوش میں آیا تو سلطان اسماعیل نے اس قدر مال و زر فقراء و مساکین کو تصدق دیا کہ وہ تونگر ہو گئے[۴]۔

"خزانہ موفور بارگاہ معلیٰ کے دروازے پر انبار کروایا اور حکم عام دی کہ جس حاجتمند کو جس قدر حاجت ہو خزانہ عامرہ سلطانی سے لے اور ہمارے حق میں دعائے خیر کرے[۵]"

سلطان رکن الدین کو جب شاہزادہ بدر منیر کی صحت و سلامتی کی خبر ملی تو بطور تصدق زرِ خطیر فقراء و مساکینِ شہر کو تقسیم کروایا[۶]۔

"درگاہ باری میں اسی امر کا سجدہ شکر بجالاؤ، مساکین و فقراء کو تصدق دو کہ خدا کریم نے گوہر تاج کی جان بچالی[۷]"

شاہزادہ خود بھی صحت پانے کیلئے خیرات کرتا ہے۔

"الغرض ایک ہفتہ کے عرصہ میں زخم سر شاہزادے کا فی الجملہ مندمل ہوا، شاہزادہ فلک شوکت نے اسی دن تمام مساکین و فقرائے ممالک اسلاقیہ کو اس قدر زرِ خطیر تصدق و انعام میں بخشا کہ تونگر ہو گئے[۸]"

۱؎ تاریخ فرشتہ جلد دوم ص۳۳، ۲؎ آئین اکبری جلد اول ص۔، ۳؎ دہلی اردو اخبار ۲۹ مئی ۱۸۴۰ء ماخوذ تذکرہ "شاہجہاں آباد" نمبر ص۸۳، ۴؎ ۲۲۲، ۵؎ ۲۹۶ ج۳، ۶؎ ۴۹۲ ج۳، ۷؎ ۳۹۰ ج۳، ۸؎ ۴۰۸ ج۳، ۹؎ ۵۲ ج۱

جب کوئی بادشاہ میدانِ جنگ سے کامران واپس لوٹتا تھا تو خیرات کی جاتی تھی[1] کوئی شاہزادہ شکار سے بھی صحیح و سلامت واپس آتا تو زر سرخ بطور تصدق فقرار کو دیا جاتا[2] فقرار کو کھانا کھلایا جاتا تھا[3] اسیرانِ زندہ کو رہا کرنے کے[4] علاوہ انھیں بدست خود کھانا تقسیم کیا جاتا تھا[5] ایام نحس کو دفع کرنے کیلئے بھی لوگ خیرات کرتے تھے[6]

اعتقادات کی بنیاد وہم و خیال سے شروع ہو کر یقین کی حد میں داخل ہو جاتی ہے، لاشعور میں شامل توہمات ہمیشہ شعور پر غالب رہتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر آدمی بے بنیاد اور خیالی باتوں کو شعوری طور پر ماننے لگتا ہے اور رفتہ رفتہ ان اعتقادات کو مذہبی یا معاشرتی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے، مثلاً کسی ضرورت مند فقیر کو کچھ دینا معاشرتی اعتبار سے اخلاقی فرائض میں شامل ہے بلکہ مذہبی نقطہ نظر سے کارِ ثواب بھی ہے، دونوں ہی خیالات کو ذہن میں رکھتے ہوئے سوال کرنے والے کو خالی ہاتھ واپس نہیں کیا جاتا[7] یا کسی شخص کو کوئی دکھ پہونچتا ہے تو یہ بات لاشعور سے شعور میں آجاتی ہے کہ ضرور میں نے کسی کو تکلیف پہونچائی ہوگی جو خدا نے مجھے تکلیف دی یہاں مذہبی یقین بیدار ہو جاتا ہے۔ ملک عنبر نے ملک زرتاج کی دختر کو حاصل کرنے کے لئے اس سے جنگ کی، اور محل سے اس کی دختر کو اٹھوا لیا دوسری طرف خود ملک[8] عنبر کی دختر حوران ملک محل سے غائب ہوگئی[9] ایسی حالت میں یہ یقین ہو جاتا ہے کہ خدا نے ایسا کیا۔ خدا پر یقین رکھنے والے یہ بھی یقین رکھتے ہیں کہ جو شے ہمیں دنیا میں نہیں ملی وہ عالم بالا میں ضرور ملے گی:۔

> "اگر میں اس شاہزادہ والا قدر عالی منزلت کے آلام مفارقت کی متحمل نہ ہوسکی
> اور جہان ناپائدار و عالم ناانصاف سے ناشاد و نامراد رحلت کر گئی، انشاءاللہ
> تعالیٰ روز جزا پروردگار عالم دادرس دردمندان مجھ سوختہ جگر آتشِ فراق کو
> اس کے وصل سے کامیاب فرمائے گا اور میری نامرادی پر ضرور رحم کریگا"[10]

توہمات پر جب یقین بڑھ جاتا ہے تو ہر سایہ سے خوف معلوم ہونے لگتا ہے ہر غیر فطری قوت کے آگے سر جھک جاتا ہے، بھوت پریت، چڑیل اور روحوں پر زمانہ قدیم ہی سے لوگ یقین کرتے آئے ہیں اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ خوبصورت لڑکے لڑکیوں کو روحیں اور چڑیلیں پریشان کرتی ہیں۔ مسلمانوں میں ایسے اثرات کے لئے کہا جاتا ہے کہ جنات کا اثر ہے یعنی جن اس پر عاشق ہے اس جن کو

---

[1] ص ۳۱۴ ج ۳، [2] ص ۳۴۴ ج ۴، [3] ص ۲۱۰ ج ۵، [4] ص ۲۹۲ ج ۹ م، [5] ص ۶۶ ج ۳، [6] ص ۳۸۸ ج ۵،
[7] ص ۱۰۲ ج ۳، ص ۴۶ ج ۴، [8] ص ۳۴۵ ج ۴، [9] ص ۱۰۴ ج ۴،

بھگانے کے لیئے مولویوں اور تعویذوں کا سہارا لیا جاتا ہے، سیانوں کو بلایا جاتا ہے[۱] جن کے عمل سے جنّات کا اثر زائل ہوتا ہے "بوستان" میں معاشرہ کا یہ وہم بھی موجود ہے ایک لڑکی پر جنات کا اثر ہوتا ہے اور پھر ایک عامل کو بلا کر جن اتارنے کا عمل کروایا جاتا ہے[۲] خود صاحبقران اعظم کی بے ہوشی کے وقت بادشاہ نے شہر کے عزیمت خوانوں کو بلایا جو جن آتارتے تھے[۳]

جنوں کے علاوہ خواتین میں پیر غیب پر بھی بہت یقین کیا جاتا ہے یعنی بغیر نظر آئے کوئی بات ظہور میں آئے یا کوئی کام ہو جائے تو لوگ کہتے ہیں کہ پیر غیب نے کر دیا۔ پیر غیب سے مراد وہ وجود ہے جو نظر نہیں آتا، شاہزادہ اسمٰعیل جب سر پر لوح باندھ کر کنیزوں سے مختلط ہوتا ہے تو سب عورتیں یعنی کنیزیں یہی کہتی ہیں کہ پیر غیب ہے[۴] ۔اسی طرح جب شاہزادہ بدر منیر لوح کو باندھ کر کنیزوں کو اپنی ہوس کا شکار بناتا ہے تو اس وقت بھی کنیزیں یہی کہتی ہیں کہ پیر غیب شاید باغ میں آگیا ہے[۵] خواتین ہی نہیں بلکہ ایک دیو بھی اس پیر غیب سے خائف ہو جاتا ہے، ہوا یوں کہ ایک مرتبہ شاہزادہ اسمٰعیل لوح سر پر باندھ کر نظروں سے غائب ہو جاتا ہے اور ایک درخت پر چڑھ کر نیچے بیٹھے ہوئے دیو کی انگلی پکڑ لیتا ہے اس پر دیو کہتا ہے کہ :۔

"ایک روز میں حسبِ اتفاق آدمیوں میں گیا تھا میں نے سنا تھا کہ وہ ایک پیر غیب کا نام لیتے تھے، شاید وہ پیر غیب یہی ہے"[۶]

توہمات پر جب یقین بڑھ جاتا ہے تو ہر سایہ خدا معلوم ہونے لگتا ہے ہر غیر فطری چیز کے سامنے سر جھکایا جاتا ہے، دنیا میں ہر طاقتور کی پرستش کیگئی ہے کبھی سورج کے آگے سر جھکا دیا کبھی تیز رفتار بہتے ہوئے دریا کو دیوتا سمجھ لیا، کبھی چاند کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے کبھی درختوں کو سجدہ کیا۔

انسانی ذہن خیال سے مادہ کی طرف راغب ہوتا ہے، ظاہر کے آگے سر جھکانا غائب کے آگے سر جھکانے سے بہتر سمجھتا ہے، انسان کی اسی فطرت نے اسے مادی چیزوں کی پرستش کے لئے مجبور کیا، اس نے مذہبی کتابوں میں تصویریں بنالیں۔ عبادت گاہوں میں مجسمے رکھ لئے، بت پرستی ہندوستان ہی کا شیوہ نہیں رہی بلکہ اسلام سے قبل اہلِ عرب بھی بتوں کی پوجا کرتے تھے، یہودی اور نصرانی بھی اپنے پیغمبروں کے مجسمے عبادت گاہوں میں نصب کرتے تھے، آج بھی ان کی عبادت گاہوں میں انبیاء کے مجسمے موجود ہیں۔

۱ـه ص۷۷۶، ج۲، ۲ـه ص۵۴۰، ج۵، ۳ـه ص۵۶۸، ج۱، ۴ـه ص۵۶۸، ج۱،

۵ـه ص۳۴۴، ج۲، ۶ـه ص۵۶۴، ج۱،

ہنود قدیم زمانہ ہی سے بتوں اور دوسری موجود چیزوں کی پرستش کرتے آئے ہیں یہاں گنگا جمنا کو پوجتے ہیں، سورج کو پرنام کرتے ہیں، بعض درختوں کو قابلِ تعظیم سمجھتے ہیں۔

عقیدت مند لوگ سونے چاندی کے بت بناکر مندروں میں رکھتے تھے، مندروں کو محلوں کی طرح سجایا جاتا تھا۔ البیرونی اور دوسرے سیاحوں نے اپنے عہد کی عبادت گاہوں کا ذکر کیا ہے۔ اس زمانہ میں ملتان، سومنات اور مانکیر کے مشہور بُت خانہ تھے۔ محمود غزنوی سومنات کے مندر ہی کی دولت حاصل کرنے کے لئے بار بار ہندوستان آیا۔

"بوستان" کے بت پرست بھی اپنے بت خانوں کو خوب سجاتے ہیں:۔

"بُت خانہ کو نہایت آراستہ دیکھا کہ کسی بادشاہ کو بھی یہ سامان میسر نہ ہوگا طاقوں میں اشیائے جواہر مثلِ شمعدان و گلابی کے چنے تھے، قندیلہائے جواہر سقف بت خانہ میں آویزاں تھیں اور تختِ بت طلائی تھا"[1]

ان بت خانوں میں بڑے بڑے بت موجود ہیں۔ بہلوم نے چالیس من وزن کا بتِ نقرہ بنوایا[2]۔ جمشید نے ایک پیکرِ سنگین بلند قامت بشکلِ ابلیس بنوا کر چار سو بازار میں رکھوایا[3]۔ ایک مقام پر بیت الصنم میں سونے کا بت رکھا ہوا ہے جس کو اول بادشاہ اور امرا سجدہ کرتے ہیں بعد میں خلایق شہر وہاں جاتی ہے[4]۔

جس طرح خانقاہوں اور مزارات پر لوگ اپنی مشکلات لے کر اور مرادیں مانگنے جاتے ہیں اسی طرح بت خانوں میں بھی آرزوؤں کی تکمیل کے لئے جایا کرتے ہیں "بوستان" کے بت پرست "منات" کو سب سے بڑا بت مانتے ہیں اور ہر کام اور مشکل کے لئے اسی کی مدد طلب کرتے ہیں[5] بادشاہ ارباق شاہ تین دن مسلسل منات کے آگے عجز و زاری کرتا رہا[6] اسی طرح:۔

"میری دعا و مناجات نے تاثیر کی کہ منات اکبر نے تجھے اس مہلک سے شفا بخشی ورنہ ہلاک ہونے میں کیا باقی رہا تھا"[7]

لات و منات نام کے دو بڑے بت زمانۂ جاہلیت میں خانہ کعبہ میں رکھے ہوئے تھے۔ اہلِ عرب ان کی پرستش کرتے تھے "بوستان" میں نسر مراد بخش نام کا ایک بت ایک بت خانہ میں نصب ہے جہاں ہزاروں مرادمند ہر روز جاتے ہیں اور مرادیں مانگتے ہیں[8]۔ مردوں اور عورتوں کے لئے الگ الگ دن مقرر ہیں[9]۔ یہاں باقاعدہ بت خانہ کے متولی بھی موجود ہیں[10]۔ مزارات کی طرح یہاں بھی لوگ

---

[1] ص ۲۵۴ ج ۱، [2] ص ۲۸۴ ج ۱، [3] ص ۳۴۵ ج ۳، [4] ص ۲۵۱ ج ۳، [5] ص ۳۳۸ ج ۴، [6] ص ۶۹۶ ج ۴، [7] ص ۱۲۱ ج ۴، [8] ص ۲۰۲ ج ۱، [9] ص ۲۵۲ ج ۱، [10] الف،

خوشبوئیں جلا کر سر برہنہ بت سے مدد مانگتے ہیں :۔

"بہرام شاہ نے تخت کے گرد وپیش عنبر فتیلہ روشن کروائے اور اول خسرو داماد نے بطریق سجدہ خوب جبیں فرسائی کی بعد ازاں سر برہنہ دعا کی اے خداوند مراد بخش فریاد رس اب یہی ہماری دعا و التجا ہے کہ سرو آزاد کو ایک بار پھر اپنی آنکھ سے دیکھ لیں یا اس گمشدہ خانہ خراب کے حال سے آگاہ ہوں [۱]"

"بوستان" کے بت پرست بادشاہ میدانِ جنگ میں بھی بت کو ساتھ لے جاتے ہیں [۲] اور اس کے روبرو مدد کے لئے دعا کرتے ہیں [۳] کیونکہ بت پرستوں کا یہ عقیدہ ہے کہ ہماری مشکلات کو حل کرنے والا یہی بت ہے اس لئے تمام منت وزاری، داد و فریاد اسی کے روبرو کرتے ہیں "بوستان" میں اہلِ اسلام کے علاوہ زیادہ تر بت پرست ہی ہیں بلکہ مسلمانوں کے فرقہ خوارج کے لوگوں کو بھی قاتلانِ اہلِ بیت کی تصویروں اور مجسموں کے آگے آہ وزاری کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ بعض بت پرستوں نے ابلیس کا خیالی بت بنا کر بت خانوں میں رکھ لیا ہے اور اس سے مدد مانگتے ہیں [۴]۔ ایک عبادت خانہ ایسا بھی ہے جہاں حضرت عیسیٰ ؑ کی سواری کے گدھے کا ایک سم دفن ہے لوگ اس کے آگے سجدہ کرتے ہیں اس کا نام رجل الحمار رکھ لیا ہے [۵]۔

"بوستان" میں ہندو بادشاہ بھی موجود ہیں جن کا مذہب ہی بت پرستی ہے، ہندو پوجا کے وقت ماتھے پر قشقہ لگاتے ہیں اس کا ذکر "بوستان" میں یوں آتا ہے :۔

"...... الغرض اکوانہ بانو نے زیر تخت بت کے اپنے ہاتھ سے صندل گھسا اور تبرکاً ملکہ کی پیشانی کو لگایا [۶]"

انسان کا سر عموماً وہی جگہ جھکتا ہے ایک اس کے روبرو جس سے عقیدت ہوتی ہے اور جسے مرشد مان لیا جاتا ہے دوسرے اپنے سے زیادہ طاقتور کے سامنے۔ بت پرستوں نے اپنے دیوتاؤں اور اوتاروں کی مورتیں بنالیں اور عقیدتاً انھیں پوجنے لگے حضرت موسیٰ ؑ کے عقیدتمندوں نے گائے کے بچھڑے کی مورتی بنالی اور اسے پوجا کے لائق سمجھنے لگے [۷] حضرت عیسیٰ ؑ کے ماننے والوں نے نہ صرف کلیساؤں میں ان کی تصویریں لگائیں [۸] بلکہ صلیب پر لٹکے ہوئے عیسیٰ ؑ اور حضرت مریم ؑ کے مجسمے تراش لیے ان کے آگے

۱؎ ۲۲۱ ج ۴، ۲؎ ۲۴۵ ج ۱، ۳؎ ۶۰ ج ۱، ۴؎ ۳۴۵ ج ۳، ۵؎ ۳۴۴ ج ۴،
۶؎ ۶۵۹ ج ۴، ۷؎ ۲۵۳ ج ۳، ۸؎ ۱۶۸ ج ۵،

عقیدت سے سر جھکانے لگے۔

آدمی نے جب محسوس کیا کہ آفتاب ایک بڑی قوت ہے اس کے بغیر زندگی ناممکن ہے تو اس نے آفتاب کی پرستش شروع کر دی اور دیوتا مان لیا[۱]۔ آفتاب کی پرستش ہندوستان میں بہت پہلے سے ہوتی آئی ہے اہلِ زردشت بھی آفتاب کو لائق تعظیم سمجھتے تھے اکبر جو تمام مذاہب کی قدر کرتا تھا ملا عبدالقادر بدایونی کے بیان کے مطابق آفتاب پرست بھی تھا۔ لکھتا ہے کہ :-

"غرض آفتاب پرستی کا بھی دربار میں خوب فروغ ہوا اور نوروز جلالی کی تعظیم بڑے اہتمام سے کی جانے لگی چنانچہ اس دن اکبر ایک بڑا جشن منعقد کرتا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
پچیسویں جلوس کے نوروز کے دنوں میں اکبر نے آفتاب اور آگ کا سجدہ اعلانیہ کیا[۲]"

"بوستان" میں آفتاب پرستوں کے ساتھ ساتھ ماہ پرست بھی موجود ہیں، ماہتاب کو حسن کا دیوتا سمجھا جاتا ہے، جزیرہ نوش کا حاکم اور رعایا ماہتاب کی پرستش کرتے ہیں[۳]۔ ملکہ شب افروز کا باپ بھی ماہ پرست ہے[۴] علم نجوم پر یقین رکھنے والے ستاروں اور سیاروں کو تقدیر سمجھتے ہیں۔ زندگی کے تمام نشیب و فراز کو سیاروں سے وابستہ کرتے ہیں اور سیاروں سے خائف رہتے ہیں بلکہ ان کی پرستش بھی کرتے ہیں[۵]۔

ہندوستان میں قدیم زمانہ میں ایک فرقہ زرخیزی کی پوجا کرتا تھا یعنی زمین اس کے نزدیک قابلِ احترام تھی کہ اس سے پیداوار ہوتی ہے، دریاؤں کو اس لئے قابلِ قدر سمجھا جاتا تھا کہ وہ زمین کو سیراب کرتے تھے، درختوں کے آگے اس لئے سجدہ کیا جاتا تھا کہ وہ پھل دیتے ہیں، عورت نسل کے فروغ کا ذریعہ ہے اس لئے لائق تعظیم دیوی سمجھی جاتی تھی۔

دریاؤں کو آج بھی ہندوستان میں مذہبی اعتبار سے متبرک اور مقدس سمجھا جاتا ہے لاکھوں لوگ گنگا جمنا میں اشنان کے لئے جاتے ہیں، دریا سیرابی کے علاوہ سیلاب کی شکل میں تباہی بھی بن سکتا ہے، اس لئے اس سے خائف بھی رہتے ہیں۔ "بوستان" کے بحر پرست بحر پرستی کے یہ دلائل پیش کرتے ہیں کہ ہر شے کی زندگی و آفرینش کا مدار خاص عنصر آب پر ہے چنانچہ دین بحر پرستی کے پیشوا ہنگام وعظ و تلقین ہر فرد و بشر کو یہ سمجھاتے ہیں کہ کل شی حی من الماء۔ اس قوم کے اصول دین و آئین یہ ہیں کہ منجملہ عناصر چارگانہ عنصر آب کو خداوند ارض و سما اور عنصر خاک کو مرسل خداوند و عنصر آتش کو فرشتہ قہر و غضب اور

۱؎ ۸۶۴ ج ۳، ۲؎ منتخب التواریخ ص ۱۴۷، ۳؎ ۲۶۰ ج ۱، ۴؎ ۲۱۳ ج ۱، ۵؎ ۵۰۱ ج ۴،

عنصر ہوا کو فرشتہ فضل و رحمت بیان کرتے ہیں اور اپنے اثبات و استحکام ارکان شریعت پر دلائل واثق لاتے ہیں۔ ایک شخص بزرگ ریش سپید ضعیف العمر اس قوم کا معلم و مجتہد ہے وہ ہر سال روز معین بادشاہ ملک جزائر یعنی ملک لہراسب شاہ کو مع تمام اراکین سلطنت و خلائق شہر دریا کے کنارے پر لے جاتا ہے۔ اور ایک کشتی میں سوار ہو کر دریا کے عین وسط حقیقی میں پہونچتا ہے اور تین روز و شب برابر بادشاہ و امراء سے دریا کی پرستش کرواتا ہے اہل شہر ادنیٰ و اعلیٰ وقت معاودت ایک ایک ظرف کلاں میں آب دریا بھر لاتے ہیں اور تمام سال اس پانی کی پرستش کرتے ہیں[۱]۔ اہل ہنود گنگا کے پانی کو اسی طرح متبرک سمجھ کر گھروں پر لے جاتے ہیں۔ آج بھی گنگا کے ساحل پر بہت سے سادھو بیٹھے رہتے ہیں۔ عقیدتمند ان سے اپنی مشکلات بیان کرتے ہیں۔ "بوستان" کے بحر پرستوں کے مسائل کو حل کرنے کے لئے پیر دریائی موجود ہے جو دریا کے کنارے رہتا ہے، بادشاہ اور وزیر بھی مصیبت کے وقت اس کے پاس جاتے ہیں[۲]۔

"بوستان" میں درخت کی پرستش کرنے والے بھی موجود ہیں۔ ہندوستان میں بعض درختوں کو قابلِ تعظیم سمجھا جاتا ہے مثلاً پیپل کا درخت۔ مندروں میں یہ درخت لگایا جاتا ہے اس کے نیچے مورتیاں رکھکر پوجا کرتے ہیں تلسی کے پیڑ کو بھی اہلِ ہنود قابلِ احترام سمجھتے ہیں۔ "بوستان" کے ایک فرقہ کا درخت کے بارے میں یہ یقین ہے کہ اگر اس کے نیچے دعا مانگی جائے تو وہ قبول ہو جاتی ہے[۳]۔ ملک شمشاد فولاد بازو کا مذہب ہی درخت پرستی ہے ایک شمشاد نام کا درخت ہے جس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ زردشت کا لگایا ہوا ہے اور ان کفار کا اعتقاد ہے کہ یہ درخت جائے نزول خداوند ہے اسی یقین کے ساتھ وہ درخت کے آگے سجدہ کرتے ہیں[۴]۔

بعض لوگ اپنی طاقت ہی کی پرستش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ:-

"میری پرستش کو میرا زور کافی ہے جو کچھ عالم میں ہے زور قوت سے ہے[۵]"

اسی نظریے کے پیش نظر ضرار منکوس نے نیا مذہب یعنی مذہب طبعی ایجاد کیا[۶]۔ جمشید نے اپنے نام کے ساتھ "خود پرست" لگایا اور خود کو خداوند اور صاحبقران فرقۂ خود پرست کہلوایا اپنی قوت کے بل پر حکومت کی اور اپنے لشکر میں یہ اعلان کروایا کہ ہر ایک انسان ہر روز صبح کے وقت آئینہ کلاں روبرو رکھکر خود اپنی ذات کو سجدہ کرے اور خاص اپنے کو معبود سمجھے، مذہب طبعی کے پیرو خدا، نبوت، قیامت وغیرہ کسی پر یقین نہیں رکھتے، عورت کو خواہ خالہ یا خواہر ہو صحبت کے لئے جائز سمجھتے ہیں[۷]۔

۱ے ۲۰۵ ج۴، ۲ے ۴۹ ج۱، ۳ے ۲۰۲ ج۱، ۴ے ۲۰۴ ج۱، ۵ے ۴۰۲ ج۱، ۶ے ۴۹۰ ج۳، ۷ے ۱۸۱—۱۸۲ ج۳

"بوستان" میں آواگون پر یقین رکھنے والے بھی موجود ہیں ان کا عقیدہ ہے اگلے جنم میں ہم کسی اور شکل میں پیدا ہوں گے :-

"خداوند ابلیس کی رضامندی سے مریں گے تو وہ ہم کو اس موت کے بدلے کسی اچھی صورت میں پیدا کر دے گا اور منصب اعلیٰ دے گا"[1]

"ہم ضابطہ کو سو برس کے بعد شیر کے جامہ میں خلق کریں گے اور وہ حیوان درندہ معزالدین اور اس کی اولاد کو ہلاک کرے گا"[2]

"بوستان" کے یہ توہمات و اعتقادات ہندوستان کی ہندو اور مسلمانوں کی مشترکہ تہذیب کا عکس ھیں۔

---

[1] ۱۴ ج ۹م ، [2] ۲۲۵ ج ۳

رسم و رواج

رسومِ ولادت، سالگرہ، دودھ بڑھائی، مکتب نشینی،
رسومِ کتخدائی، حسب نسب، منگنی، تاریخ کا تعین،
مائیوں بٹھانا، جشنِ کتخدائی، ساچق، روانگی بارات،
عقد، آئینہ و مصحف، جہیز و رخصت، چوتھی، دعوتِ ولیمہ
اور رسومِ وفات،

انسان کی پوری زندگی میں تین تقاریب ایسی ہیں جن سے قریب قریب ہر خاص و عام کو گذرنا ہوتا ہے۔ ولادت، شادی اور وفات خوشی اور غم کی یہ تقریبیں زندگی کا ایک لازمی جزو ہیں۔ بقیہ تقاریب اضافی ہیں، ہر قوم کا ہر آدمی یوں تو ایک ہی طرح سے عالمِ وجود میں آتا ہے اور ایک ہی طرح سے عالم بقا کی طرف رخصت ہوتا ہے، فرق رسم و رواج کا ہے جو ماحول اور مذہبی اعتقادات کے زیرِ اثر پیدا ہوتے ہیں ہر ملک اور قوم کی رسوبات اگرچہ ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں لیکن بعض باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو ایک دوسرے کے مابین قدرے مشترک ہوں، اس کا سبب یہ ہے کہ انسان جہاں گرد واقع ہوا ہے نقل مکان جانداروں اور پرندوں کی طرح اس کی فطرت کا ایک حصہ ہے اور اس کی ضرورتوں کا بھی۔ جس کی وجہ سے ہم اسے سفر پسند یا پھر رہ نوردِ شوق بھی کہہ سکتے ہیں۔ سفر کے ساتھ زمان و مکان کے دوسرے اثرات وغیرہ نے مل کر اس کو گوناگوں رسموں کو دیکھنے اور پھر انھیں اختیار کرنے کا موقع فراہم کیا۔

کہاں کہاں کونسی رسم ادا ہوتی ہے اس کا احاطہ کرنا مشکل ہے خاص طور پر مشرقی قوموں کی زندگی میں تو رسم و رواج کا سلسلہ بہت ہی رنگارنگ اور حلقہ در حلقہ ہے۔ از روئے قیاس یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ سب سے زیادہ رسمیں ہندوستان میں رائج ہیں جو بہت سے مذاہب اور بہت سے نسلی گروہوں کا زمانۂ قدیم سے ایک مشترک مرکز رہا ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کا مذہب عرب سے آیا ان کی تہذیب بڑی حد تک عراق و عجم اور ترک و تاتار قبائل کی تاریخ سے بھی وابستہ ہے لیکن ان کے رسم و رواج زیادہ تر ہندوستانی ہیں اور یہیں کی اقوام اور قبائل سے ماخذ ہیں، چنانچہ سید احمد دہلوی نے لکھا ہے کہ :-

> "مسلمانوں کی عورتوں اور ان کے سبب ان کے مردوں میں جس قدر رسمیں مروج ہیں وہ تقریباً سب کی سب ہندوانی رسمیں ہیں جن میں سے بہت سی توجوں کی توں ہیں[۱]"

یہ بات بڑی حد تک صحیح ہے اگرچہ بہت سی رسمیں اب متروک ہو چکی ہیں تاہم ہم خود دیکھتے

---

[۱] رسوم دہلی از سید احمد دہلوی ص ۳۷،

ہیں کہ جن رسومات پر ہمارے گھروں میں عمل کیا جاتا ہے وہ تھوڑے سے بہت اختلاف کے ساتھ اہلِ ہنود میں بھی مروج ہیں۔ شاہ جہاں کی ولادت کا واقعہ نصیر حسین خیالؔ یوں بیان کرتے ہیں:۔

"خرم کی پیدائش پر جو جشن ہوا اور حرم سرا میں جو خوشیاں منائی گئیں وہ ترکانہ نہیں ہندوانہ تھیں، یہ پیدا ہوا تو ساری راجپوتی رہت رسمیں برتی گئیں زچہ خانہ تک گایا گیا اور ہندی شعروں سے جی بہلایا گیا، دائی جی شاہزادے کو گود میں لیئے ہوئے ہیں مگر ہاتھ نہیں لگاتیں، موتیوں کے تھال سامنے ہیں مگر ان کے بھاؤ میں نہیں لگتا، ایک ادا اور بڑے ناز سے سنا سنا کر کہتی ہیں کہ ؎

لنگے جودھا جی کا راج	للا جی کا نال چھوائے
تھال بھر موتی جودھا رانی	وہ بھی نہ لیوے یہ دائے"[1]

رسومِ ولادت

اولاد خصوصاً پہلی نرینہ اولاد کی پیدائش پر تقریباً ہر قوم اور قبیلہ میں خوشیاں منائی جاتی ہیں، جشنوں کا انعقاد ہوتا ہے، دعوتیں کی جاتی ہیں، زر و جواہر تقسیم کیا جاتا ہے "بوستانِ خیال" میں دو موقعے ایسے ہیں جب ولادت اور جشنِ ولادت کو قدرے تفصیل سے پیش کیا گیا ہے ورنہ بالعموم داستان نگار یہ کہہ کر آگے بڑھ جاتا ہے کہ اس جشن کا حال قصہ خواں کے سپرد کرتا ہوں کہ وہ تفصیل سے بیان کرے۔

اول وہ جشنِ ولادت ہے جو صاحبقران اکبر معزالدین کے عالمِ وجود میں ظہور کے وقت منایا جاتا ہے اور دوسرا وہ جب شاہنامہ خرشیدی میں صاحبقرانِ اعظم خرشید تاج بخش اور صاحبقرانِ اصغر بدرِ منیر کی ولادت کا ذکر ہے، صاحبقران اکبر کی ولادت کا بیان ملاحظہ ہو:۔

"انھیں ایام میں ملکہ عالیہ خاتون کو دردِ زہ شروع تھا چنانچہ ایک روز و شب سے اسی کیفیت میں مبتلا تھی بلکہ عالم افروز وغیرہ سب خواتین جمع تھیں ہر چند تدبیریں کرتی تھیں لیکن کوئی فائدہ نہ ہوتا تھا"[2]

یہاں ایک بات اور قابلِ توجہ ہے وہ یہ کہ ہماری تہذیب میں توہم پرستی اس طرح رچ بس گئی ہے کہ ہم کسی موقع پر بھی اس سے نجات حاصل نہیں کر سکتے۔ یہاں نیک اور بد ساعت اور شگون کا

---

[1] مغل اور اردو از نصیر حسین خیالؔ۔ ص ۱۵، [2] ۳۷۵ ج ۱،

تصور پیش کیا ہے۔ مصنف نے ملکہ کو ایک روز و شب دردِ زہ کی تکلیف میں مبتلا رکھکر نیک ساعت کا انتظار کیا ہے یعنی ایک طفلِ نوزائیدہ جو سلطان آسمٰعیل کو جنگل میں ملتا ہے اور وہ اسے محل میں بھیجتے ہیں، جس وقت وہ بچہ محل میں آتا ہے ملکہ عالیہ خاتون تکلیف سے نجات پالیتی ہے اور معز الدین تولد ہوتا ہے، مصنف نے اس طرح لکھا ہے :-

"اور کنیزوں نے ملکہ عالم افروز کو فرزند نرینہ کی مبارکباد دی ۔۔۔۔۔ غرضکہ ملکہ عالم افروز نہایت خوش ہوئی اور جوہر (وہ طفل جو سلطان نے بھیجا) کے قدم کو اپنے حق میں شگون نیک سمجھی بلکہ تمام محل میں یہی غل ہوا کہ سبحان اللہ عجیب طفل فرخندہ قدم محل میں داخل ہوا کہ اس کے قدم کی برکت سے ملکہ عالیہ خاتون نے نجات پائی ہے"[1]

نیک ساعت یا شگون کا رواج مغلوں میں بہت تھا ہر کام ساعت سعید دیکھ کر کیا جاتا تھا، اکبر اور جہانگیر کی ملاقات کے سلسلے میں "تزک جہانگیری" میں تحریر ہے :-

"اور فرمایا (اکبر نے) اگرچہ جہانگیر نیک ساعت میں رخصت ہوا تھا لیکن اس وقت نجومی ملاقات کی مبارک ساعت خیال نہیں کرتے اس لئے اسے بخوشی اجازت ہے کہ الہ آباد چلا جائے اور جب مناسب سمجھے حاضر ہو جائے"[2]

اسی یقین کا نتیجہ ہے کہ بچہ کی پیدائش کے وقت ملکہ اس سے قبل ہی نجومیوں کو بلایا جاتا تھا اور اس سے نومولود کا زائچہ تیار کرواتے تھے، زائچہ تیار کرنے کی روایت اہلِ ہنود کے اثر سے آئی۔ ہندوؤں میں پیدائش کے وقت پنڈت بچہ کی جنم کنڈلی یا جنم تیری تیار کرتا ہے جس میں بچہ کے حالات مستقبلہ کو ستاروں کے حساب سے درج کرتے ہیں، صاحبقرانِ اعظم اور صاحبقران اصغر کا وقتِ ولادت جب آتا ہے تو بادشاہ شہر کے تمام نجومیوں کو بلاتا ہے جو از روئے حساب علم ہیئت بچے کا زائچہ تیار کرتے ہیں[3]۔

جب بچہ صحیح و سلامت پیدا ہو جاتا ہے تب خوشی کے طور پر پیدائش سے متعلق دوسری رسمیں شروع ہوتی ہیں، یوں تو اس موقع پر شاہی خاندان اور عوام میں اس عہد میں بہت سی رسمیں رائج تھیں لیکن خیال نے بہت کم رسموں کا ذکر کیا ہے مثلاً "بوستان" میں چھٹی کی رسم کا ذکر میری نظر سے نہیں گذرا، جبکہ دوسرے ماخذ اس بات کا ثبوت ہیں کہ اس زمانے میں یہ رسم امراء، وزراء اور بادشاہوں

---

[1] ۵، ۳ ج ۱، [2] تزک جہانگیری۔ ص ۲۸، [3] ۲۲ ج ۴،

میں مروج تھی، شاہ عالم بادشاہ کا اس رسم سے متعلق ایک شعر ہے ؎

آج چھٹی ہے پیارے للا کی ہجو ماتا کے جیہ میں مود بھیو ہے
نانی تولیت بلائیں گھنی، اب پھوپھی ممانی نے گود لیو ہے[۱]

اس کے علاوہ اس عہد کے دوسرے قصوں وغیرہ میں اس رسم کا ذکر ملتا ہے۔ مثنوی سحر البیان میں اس کا ذکر یوں ہوا ہے ؎

چھٹی تک غرض تھی خوشی ہی کی بات
کہ دن عید اور رات تھی۔ شب برات[۲]

بچے کا نام رکھتے وقت بھی باقاعدہ ایک تقریب ہوتی ہے اس رسم کا نام عقیقہ ہے۔ اس موقع پر اعزا واقارب کو دعوت دی جاتی ہے۔ اپنی حیثیت کے مطابق جشن کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ بکرے کی قربانی ہوتی ہے بچے کے بال تراشے جاتے ہیں، ان کے برابر چاندی خیرات کی جاتی ہے۔ نام رکھنے کی ذمہ داری سلاطین میں عام طور پر حکما یا ذی عزت بزرگ کی ہوتی تھی جو نام وہ تجویز کرتے خواہ اپنی زبان کا ہو یا غیر زبان کا، نومولود کا وہی نام رکھتے تھے، جہانگیر کا نام سلیم شیخ سلیم چشتی رح نے تجویز کیا تھا، شاہ جہاں نے اپنے ایک فرزند کی ولادت کے بعد جہانگیر سے درخواست کی تھی کہ وہ اس کا کوئی نام رکھ دیں[۳]۔ "بوستان" میں اس تقریب کا ذکر کئی جگہ آیا ہے۔ اس موقع پر بادشاہ پورے شہر کو آئینہ بند کرواتا ہے، فقرا اور مساکین میں زر تقسیم کرتا ہے:

"شاہزادہ قایم الملک نے خزانے کا دروازہ کھولدیا اور اس قدر داد و دہش کی کہ گدا امیر ہو گئے اور از سر نو جشن کی تیاری، ابوالخیار اور سلطان فلک اقتدار نے اس شہزادہ والا تبار کا نام اسمٰعیل رکھا"[۴]

ابوالخیار ایک عالی مرتبت بزرگ ہیں جو علم نجوم وغیرہ پر بھی دسترس رکھتے ہیں اور سلطان سے مراد شاہزادہ اسمٰعیل کے جد بزرگوار سے ہے اسی طرح صاحبقران اکبر کا نام بھی ایک درویش نے تجویز کیا تھا۔

"شاہ آگاہ نے اس کا نام شاہزادہ المعز رکھا اور لقب معز الملک و معز الدین اور کنیت ابو تمیم مقرر کی"[۵]

اس موقع پر بھی تمام شہر کو آئینہ بند کیا گیا اور نہایت ترک و زینت سے جشن منایا۔

۱۔ نادرات شاہی مرتبہ امتیاز علی عرشی۔ ص ۱۲۲، ۲۔ مثنوی سحر البیان ص ۳۷،
۳۔ تزک جہانگیری، ص ۲۹۸، ۴۔ ص ۱۸۵ ج ۱، ۵۔ ص ۳۷۸ ج ۱،

اس موقع پر جن لوگوں کو مدعو کیا جاتا ہے وہ سب نومولود کو بطور رونمائی کچھ نہ کچھ ضرور دیتے ہیں۔ جہانگیر نے جب شاہزادہ اورنگ زیب کو دیکھا تھا تو اس کی رونمائی میں جواہرات اور مرصع آلات سے بھرا ایک خوان پیش کیا اور اسّی نر اور مادہ ہاتھی مرحمت فرمائے[۱] ایک اور مقام پر جہانگیر نے لکھا ہے:۔

"یہی وہ لعل ہے جو میری ولادت کے موقع پر میری دادی مریم مکانی نے
میری منہ دکھائی میں دیا تھا"[۲]

رونمائی کے طور پر جواہرات وغیرہ دینے کا رواج "بوستان" میں بھی ہے:۔

"سلطان اور شاہزادوں نے جواہرہائے گراں بہا بطریق رونمائی اس مولود کو دیا"[۳]

اسی طرح مہتر توفیق نے بدر منیر کے فرزند کو بطور رونمائی لعل بدخشانی کا بازو بند دیا[۴]

رونمائی کے وقت تحفہ و تحائف یا نذرانہ و پیش کش کے علاوہ خاندان یا کنبہ کے بزرگ افراد دعائیں دیتے :۔

"شاہ آگاہ نے چھ ادعیہ پڑھ کے شاہزادے پر دم کیئے"[۵]

بادشاہوں کے یہاں جشن منانے کے لئے تو بہانوں کی ضرورت ہوتی تھی اور پھر جشن ولادت جو پہلی اولاد نرینہ کے سلسلے میں منایا جائے بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ ہمایوں نے عالم غریب الوطنی اور صحرانوردی کی حالت میں بھی جب اکبر کی پیدائش کی خبر سنی تو خبر لانے والے کے تمام قصور معاف کر دیئے اور حکم دیا کہ جشن منایا جائے۔ دربار سجا، مطرب و مغنّی کے نغموں اور سازوں سے فضا میں ترنم بکھیر اگیا[۶] جہانگیر نے تزک جہانگیری میں بار بار لکھا ہے کہ اس نے اپنے فرزند زادوں کی ولادت کے جشن کا اہتمام کیا۔

مغلوں کے یہاں یہ جشن بڑی شان و شوکت کے ساتھ منائے جاتے تھے۔ صباح الدین عبدالرحمٰن نے بادشاہ نامہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ "جب ۱۰۴۸ھ میں داراشکوہ کے یہاں اس کے لڑکے سپہر شکوہ کی ولادت ہوئی تو شاہ جہاں نے جشن منانے کے لیئے داراشکوہ کو دو لاکھ روپے دیئے[۷]" اس موقع پر امراء و وزراء بادشاہ کو نذریں پیش کرتے تھے بادشاہ انھیں انعام واکرام سے نوازتا تھا۔

یہاں ایک اور امر بھی تحریر طلب ہے وہ یہ کہ امیر گھرانوں کی خواتین بچوں کو دودھ نہیں پلاتی تھیں بلکہ ہر شاہزادہ یا شاہزادی کی ایک دایہ مقرر ہوتی تھی جس کا کسی شریف گھرانے سے تعلق ہوتا تھا اعلیٰ

---

[۱] تزک جہانگیری ص ۲۵۳، [۲] ایضاً ص ۲۳۹، [۳] ۳۰۸، ج ۱، [۴] ۲۹۴ ج ۴، [۵] ۳۰۸ ج ۱،
[۶] ہمایوں نامہ ص ۵۸، ۶۰، [۷] ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے۔ ص ۴۸۵،

نسب ہوتی تھی ایسی کوئی دایہ ہی نومولود کو دودھ پلاتی اور اس کی دیکھ بھال کرتی تھی، اسی کی تربیت میں شاہزادہ یا شاہزادی پرورش پاتے اور آخر دم تک اس کی عزت ماں کی طرح کرتے۔ بادشاہوں اور بیگمات کو بھی دایہ پر بڑا اعتماد ہوتا تھا۔ تزک جہانگیری میں مندرج ہے کہ :۔

"شاہ جہاں ...... سلطان مراد بخش کو جو انھیں ایام میں پیدا ہوا تھا اس کی دایاؤں کے سپرد کر کے اپنے حرم کے ساتھ پٹنہ کی طرف چلا گیا[1]"

دایاؤں پر اسی قدر اعتماد کیا جاتا تھا۔

داستان میں دایاؤں کا بڑا اہم کردار ہوتا ہے اس کا تفصیلی ذکر حرم شاہی کے سلسلے میں کیا جا چکا ہے یہاں صرف اتنا اشارہ کر دینا کافی ہوگا کہ صاحبقران اکبر اور جوہر کے لئے ایک دایہ مقرر کی گئی، اسی طرح صاحبقران اعظم اور صاحبقران اصغر کے لئے دو دایائیں مقرر ہوئیں :۔

"ان دونوں نیرین فلک حسن و دولت کے واسطے دو دائیاں شریف النسب نجیب الطرفین مقرر ہوئیں[2]"

صاحبقران اصغر کے یہاں جب ملکہ خورشید نگار کے بطن سے فرزند تولد ہوا تو اس کے واسطے چار دایائیں مقرر کی گئیں :۔

"چار دائیاں شریف قوم صحیح النسب جن کا دودھ اس نور العین کو موافق آیا تھا ساتھ کر دی گئیں[3]"

یہاں اس بات کی طرف خاص طور سے اشارہ کیا گیا ہے کہ وہ شریف النسب اور نجیب الطرفین تھیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اس بات کا بہت خیال رکھا جاتا تھا کہ جس عورت کا شیر شاہزادہ کی رگوں میں پہونچے گا وہ کوئی کم درجہ اور نچلی ذات والی عورت نہ ہونی چاہیئے کیونکہ اس دودھ پلانے والی کی شخصیت کا اثر شاہزادہ پر پڑنا لازمی ہے۔

سالگرہ

جب بچہ ایک برس کا ہو جاتا تھا تو اس کی پہلی سالگرہ منائی جاتی تھی، ہندی میں اسے برس گانٹھ کہتے ہیں۔ ابو الفضل نے آئین اکبری میں لکھا ہے کہ تاریخ ولادت کا خیال رکھ کر ہر سال اس تاریخ میں

---

[1] تزک جہانگیری ص ۲۹۰، [2] ۲۲ ج ۴، [3] ۶۶۵ ج ۸ م،

دعوت کیا کرتے ہیں اور ڈوری میں گرہ دیتے ہیں[1]،، ابوالفضل نے یہ ذکر ہندوؤں کی رسومات کو بیان کرتے ہوئے کیا ہے، اس کا مطلب ہے کہ سالگرہ کی رسم یہاں پہلے سے موجود تھی، مغلوں کے زمانے میں سالگرہ کے جشن کا بڑا اہتمام کیا جاتا تھا، شاہ عالم بادشاہ کا شعر ہے ؎

آئی ہے برس گانٹھ چھبیلے شاہ عالم کو ڈھونا مرزا اکبر پیارے کی
مردنگ بجاؤ، منگل گاؤ، دے ہو اسیس نرناری لاڈ دلارے کی[2]

یوں تو اس رسم کا طریقہ یہ تھا کہ ایک کشتی میں کلاوہ، ہری دوب، مصری کا کوزہ، پان کا بیڑہ وغیرہ رکھکر گھر کے بزرگ کے سامنے لیجاتے تھے وہ بسم اللہ پڑھکر کلاوہ میں ایک ایک گرہ لگاتا تھا، دوسرے لوگ مبارکباد دیتے تھے، اسی طرح ہر سال یہ رسم ادا ہوتی، لیکن بادشاہوں میں سالگرہ کا طریقہ کچھ اور ہی تھا، وہاں محفلِ نشاط آراستہ کی جاتی تھی، امرار و وزرار کو خلعتیں اور انعامات تقسیم ہوتے تھے، مغلوں نے ایک اور رسم راجپوتوں سے لے لی جو سلاطین کے عہد میں نہیں تھی وہ یہ کہ بوقتِ سالگرہ بادشاہ کو مختلف اجناس میں تولا جاتا تھا، ان اجناس میں سونا، چاندی، تانبا وغیرہ اشیار شامل ہوتی تھیں جنھیں بعد میں غریبوں میں تقسیم کر دیا جاتا، جہانگیر اپنی تزک میں لکھتا ہے کہ :-

،،اسی دن میری عمر کے پچاسویں سال کا آغاز ہوا تھا اس لئے میرے وزنِ شمسی کا جشن منایا گیا اور دستور کے مطابق اپنے آپ کو سونا، چاندی اور دیگر اجناس میں تلوا کر موتی اور سونے کے پھول نچھاور کئے اور رات کو حرم سرا میں چراغاں کرا کے عیش و عشرت سے بسر کی[3]،،

سالگرہ کے موقع پر دربار کی آرائش و زیبائش کی طرف بھی پوری توجہ دی جاتی تھی، بے شمار دولت خرچ کر کے جشن منایا جاتا تھا، کہا جاتا ہے کہ قدسیہ بیگم (والدہ احمد شاہ بن محمد شاہ) نے اپنی سالگرہ کے موقع پر دو کروڑ روپے صرف کئے تھے۔ اس طرح کی مجلسِ عیش منعقد ہوئی تھی کہ بادشاہوں کی سالگرہ پر بھی ایسا جشن ممکن نہ تھا[4]۔ اس جشن کا وہی عہد ہے جب ،،بوستانِ خیال،، لکھی جا رہی تھی تو تصور کرنا چاہیئے کہ داستان میں اپنے عہد ہی کا عکس ہوگا۔ صاحبقرانِ اعظم کی سالگرہ پر داستان نگار لکھتا ہے :-

،،جس وقت سالِ دوازدہم کی سالگرہ کی بزمِ عشرت منعقد ہوئی بادشاہ گردوں

۱؎ آئینِ اکبری جلد اول، ص ۲۹۰، ۲؎ نادراتِ شاہی، ص ۱۱۸، ۳؎ تزکِ جہانگیری، ص ۲۸۴،
۴؎ اٹھارہویں صدی میں ہندوستانی معاشرت از ڈاکٹر محمد عمر، ص ۱۳۴،

جاہ سیف الدولہ بہرام شاہ نے اس جشنِ عالی و محفلِ نشاط و سرور میں تمام وضیع و شریفِ شہر اور ارکینِ سلطنت و اکابرِ لشکر کو بار دگر ہر ایک کی فراخورِ قدر خلعت ہائے گراں ارزعطا فرمائی[1]

اسی طرح ایک اور مقام پر جشنِ سالگرہ کا ذکر کیا ہے :-

"اسی اثنا میں شاہزادے کے سال پانزدہم کی سالگرہ کا جشن ہوا اور ...... بدستور شہر کو آئینہ بند کروایا اور اہلِ شہر جملہ وضیع و شریف کی دعوت شاہانہ کی[2]

شاہزادہ خورشید تاج بخش کی سالگرہ کے لئے یہ قاعدہ مقرر تھا کہ :-

"یہ قاعدہ مقرر تھا کہ روزِ جشنِ سالگرہ خلایقِ شہر کو بے نقاب و بالمشافہ شاہزادہ کی صورتِ دل پذیر دیکھنی میسر آتی تھی اور ہنگام شب شہزادہ محل سرا میں تشریف لے جاتا تھا اور جب تک منظور ہوتا تھا پریزادانِ مہوش و رقاصانِ دلکش کے رقص و سرود کا تماشا دیکھتا تھا[3]"

مذکورہ اقتباسات میں شاہزادوں کی دوازدہم اور پانزدہم سالگرہوں کا ذکر ہے کیونکہ مؤلف داستان نے سالِ اوّل کے جشن کا بیان کسی جگہ نہیں کیا ہے لیکن سالگرہ اوّل یا دوم کو بھی اسی طرح تصوّر کرنا چاہیئے۔

دودھ بڑھائی

جب بچہ دو یا سوا دو برس کا ہو جاتا ہے تو اس کا دودھ چھڑایا جاتا ہے۔ اس موقع پر بھی قریبی اعزا جمع ہوتے ہیں۔ رسوم دہلی میں لکھا ہے کہ ایک غوری میں کھجوریں بھر کر بچے کے آگے رکھتے ہیں اگر بچہ ایک کھجور اٹھاتا ہے تو کہتے ہیں کہ یہ صرف ایک ہی دن دودھ کے لئے ضد کرے گا اگر ایک سے زیادہ اٹھاتا ہے تو ضدی سمجھا جاتا ہے[4]۔ دودھ بڑھائی کی رسم کے وقت انّا اور دوسرے ملازمین کو جوڑے اور انعامات دیئے جاتے ہیں۔

"بوستان" میں کہیں کہیں اس رسم کا ذکر ملتا ہے مثلاً ایک ملکہ عالم افروز کی دختر عالیہ خاتون کی دودھ بڑھائی کا ذکر ہے[5] لیکن کسی بھی جگہ اس کے بارے میں تفصیل سے بیان نہیں کیا ہے۔

---

[1] ۲۵ ج ۴، [2] ۱۳۹ ج ۴، [3] ۱۳۹ ج ۴، [4] رسوم دہلی ص ۱۰۷، [5] ۲۹۷ ج ۱،

مکتب نشینی

بالعموم جب بچّہ عمر کے چار برس کو تجاوز کر جاتا ہے یا پانچویں سال میں پہونچ جاتا ہے تو اس کی تعلیم کی ابتدا کی جاتی ہے، اسے بسم اللہ پڑھوا کر اس قابل بناتے ہیں کہ مکتب جا سکے، اس موقع پر بچّے کو دولہا بناتے ہیں، اسے نہلا دھلا کر نیا جوڑا پہناتے ہیں اکثر مہندی بھی لگاتے ہیں ؎

آج مہندی لگاؤں اکبر شاہ پیار دلایو ــــ

اتھیں رنگیلی مہدی بسم اللہ کی جنیا بیگم کے گھر رچایو [۱]

اس تقریب میں بھی تمام اعزا و اقربا جمع ہوتے ہیں، سالگرہ کی طرح جشن منایا جاتا ہے، شاہزادہ کو ایک استاد یا اتالیق کے سپرد کیا جاتا تھا، اس رسم کی ادائیگی کے وقت نیک ساعت کا خاص خیال رکھا جاتا تھا، جہانگیر کی مکتب نشینی کے سلسلے میں تزک جہانگیری میں تحریر ہے :-

"جب جہانگیر کی عمر چار سال چار مہینہ اور چار دن ہوئی تو علما اور نجومیوں کے اصولوں کے مطابق نیک ساعت میں بروز بدھ ۲۲ رجب ۹۸۱ھ میں سلطان جہانگیر کو پڑھنے کے لئے بٹھایا گیا اور اس خوشی میں بہت بڑا جشن کر کے لوگوں پر سخاوت کے دروازے کھول دیئے۔" [۲]

یہاں عمر تقریباً ساڑھے چار سال لکھی ہے، رسوم دہلی کے مؤلف نے بھی ساڑھے چار برس ہی تحریر کیا ہے [۳] لیکن عام طور پر پانچ برس کی عمر کو پہونچنے پر بچّہ کو پڑھنے کے لئے بٹھایا جاتا تھا۔ صاحبقران اعظم کی رسم بسم اللہ کے سلسلے میں لکھا ہے :-

"پانچ برس کی عمر میں معلمانِ دانش مند و کاردان اور استادانِ ذوفنون فخر مندِ جہاں کی تعلیم و تربیت میں سپرد ہوئے" [۴]

اس موقع پر آبِ طلا سے لکھی ہوئی لوح لائی جاتی تھی :-

"یہاں کسی طفل کی شادی مکتب ہے اس سبب سے لوح کو آبِ طلا سے لکھ کر لائے ہو" [۵]

---

[۱] نادرات شاہی۔ مرتبہ عرشی۔ ص ۱۰۵، [۲] تزک جہانگیری ص ۲۰، [۳] رسوم دہلی۔ ص ۷۵، [۴] ۲۲ ج ۴، [۵] ۳۲۶ ج ۱،

اس رسم کا نام رسمِ بسم اللہ اس لئے رکھا گیا ہے کہ بچے سے سب سے پہلے بسم اللہ کہلواتے یا پڑھواتے ہیں۔ جب بچہ اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان سے بسم اللہ کہتا ہے تو حاضرین مبارکباد دیتے ہیں بسم اللہ پڑھانے کے بعد اقرأ باسم ربک الذی خلق کہلواتے ہیں جو پیغمبرؐ اسلام پر نازل ہونے والی پہلی سورت ہے۔ اہلِ ہنود میں بھی یہ رسم ہوتی ہے۔ سب سے پہلے بچہ سے رام کہلواتے ہیں۔

رسومِ کتخدائی

دورِ حیات کی دوسری اہم تقریب رسمِ کتخدائی ہے۔ یہ زندگی کی ایک فطری ضرورت بھی ہے اور مذہب کی طرف سے بھی اسے ضروری قرار دیا گیا ہے خود اسلام میں کہا گیا ہے کہ ہر مسلمان مرد اور عورت کے لئے ضروری ہے کہ وہ عقد کرے۔ اس کا ایک مقصد بقائے نسل بھی ہے۔ پیغمبر اسلام نے تو یہاں تک فرمایا ہے کہ "نکاح کرنا میری سنّت ہے پس جو شخص اس سے پھرا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔" اسی طرح ہر مذہب اور قوم میں شادی زندگی کا ایک لازمی جزو قرار دی گئی ہے۔ شادی کا مطلب ہے ایک مرد اور ایک عورت کو باہم ازدواجی رشتے میں منسلک کر دینا۔ جس کے لئے مرد اور عورت کی باہمی رضامندی بھی ضروری ہے۔ لیکن اس رسم کو ادا کرنے کے لئے ہر ملک اور ہر قوم میں الگ الگ طریقے رائج ہیں، عرب میں یہ تقریب کسی اور ڈھنگ سے منائی جاتی ہے تو ایران میں کوئی اور طریقہ رائج ہے اور ہندوستان میں اس موقع پر کچھ مختلف انداز اختیار کیا جاتا ہے۔

یوں اسلام میں اس رسم کی ادائیگی کے لئے اتنا کافی ہے کہ طرفین کی رضامندی ہو اور کچھ مہر مقرر کیا جائے بس! لیکن رفتہ رفتہ اس ایک ہی رسم کو ادا کرنے کے لئے اتنی رسومات اور تکلفات اس میں شامل ہوتے چلے گئے جن کا شمار کرنا بھی مشکل ہے اس کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ غیر عرب مسلمان تو ہو گئے لیکن انھوں نے بیشتر اُن رسومات کو قائم رکھا جن پر برسوں سے عمل کرتے آ رہے تھے، ہندی الاصل مسلمانوں کے ساتھ ایسا ہی ہوا، بلکہ وہ رسومات جو اہلِ ہنود میں رائج تھیں مسلمان ہونے کے بعد ان میں اور اضافہ ہو گیا۔ مرزا قتیل جو نو مسلم تھے، لکھتے ہیں:۔

"ہندوستان کے مسلمان بیٹے اور بیٹی کی شادی میں چند رسموں کو چھوڑ کر جیسے آگ کے گرد چکر لگانا باقی سب رسمیں ہندوؤں کی طرح کرتے ہیں۔"[1]

---

[1] ہفت تماشا از مرزا قتیل۔ ص ۱۳۹،

اہل ہند میں کم عمری میں شادی کر دینا ثواب میں داخل سمجھا جاتا تھا، دیہات میں آج بھی چھوٹی عمروں میں شادیاں ہو جاتی ہیں، مسلمانوں میں بھی کم عمری کی شادیوں کا رواج ہوا، اس طرح کی شادی عام طور پر بچپن ہی میں طے ہو جاتی تھی اور ذرا بڑے ہونے پر تمام رسومات شادی ادا کر دی جاتیں۔ دکن کے بہمن خاندان کے شہزادوں میں ایک شاہزادہ کی شادی اس وقت ہوئی جب اس کی عمر صرف چار سال تھی:۔

"۹۰۳ھ ہجری (۱۴۹۷ء) کے ابتدائی مہینوں میں کمسن شہزادہ احمد کی منگنی یوسف عادل کی لڑکی بی بی ستی سے گلبرگہ میں انجام پائی اس رسم کو قاضی عسکر قاضی عبدالسمیع نے انجام دیا۔۔۔۔ چونکہ دولہا صرف چار سال کا تھا اور دولہن صرف تین سال کی اس لئے رخصتی چھ سال کے لئے ملتوی رکھی گئی"[۱]

کم سنی کی شادیوں میں ایک لطف یہ بھی رہتا تھا کہ دولہا دلہن کو یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ ان کے ساتھ کیا کیا جا رہا ہے اکثر دیکھا گیا ہے کہ دولہا دلہن کھیلتے ہوئے تمام رسومات شادی ادا کر دیتے ہیں، روشن جان بن صاحبقران اصغر اور روشن دل اور صبیحہ دل افروز اور صالحہ جان افروز کی شادیاں ہوتی ہیں تو ایسا ہی منظر دیکھنے کو ملتا ہے:۔

"چونکہ کمسن تھے لہذا دونوں دلہنیں اور دونوں دولہا خوب کھیلے اور تماشے کرتے تھے، تماشائی ہنستے تھے"[۲]

اسی طرح کا تماشا اس وقت دیکھنے کو ملتا ہے جب نو سالہ لیث بن طاقان کا عقد سات سالہ ملکہ روشن جبیں سے کیا جاتا ہے، جس وقت آرسی و مصحف کی رسم ادا کرنے کے لئے دولہا دلہن کو پاس بلاتے ہیں، اس وقت دونوں بار بار اپنی صورت آئینے میں دیکھتے ہیں اور دیکھنے والے ان کی اس بچکانہ حرکت پر ہنستے ہیں۔[۳]

اکبر نے اپنے عہد میں یہ حکم جاری کیا تھا کہ بہت کم عمری میں شادیاں نہ کی جائیں۔

ہندوستان کے مسلم حکمرانوں کے حرم میں ابتدا ہی سے ہندو رانیاں شامل ہونے لگی تھیں۔ خضر خاں اور دیول رانی کا قصہ تاریخ کا مشہور قصہ ہے، مغلوں کے زمانہ میں تو یہ بات عام ہو گئی تھی، تقریباً سبھی مغل بادشاہوں کے حرم میں ہندو رانیاں تھیں۔ "بوستان" کے شاہزادے بھی ان بادشاہوں کے اثر سے نہیں بچ سکے ہیں۔ کئی ہندو رانیوں کا ذکر داستان میں بھی کیا گیا ہے، مشتری ستارہ طلعت کی شادی مہارائے ارجن بان حاکم ہندوستان کی دختر روپ سنگھار سے ہوتی ہے جو صاحبقران اصغر

---

[۱] دکن کے بہمنی سلاطین از ہارون خاں شیروانی۔ ص ۲۸۷، [۲] ص ۶۱۷ ج ۸، [۳] ص ۱۴۱ ج ۸،

کار فیق ہے اسی طرح ادریس نوجوان کا عقد رانی چندر مان سے ہوا ہے[۱]۔ نہ صرف شادی بلکہ بعض مقامات پر ہندوانہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ ہندو راجاؤں کے یہاں یہ طریقہ رائج تھا کہ جب ان کی دختر بالغ ہو جاتی تو ایک بڑے جشن کا وہ اہتمام کرتے۔ تمام راجاؤں اور راجکماروں کو اس محفل میں دعوت دیتے، راجکماری ایک پھولوں کی مالا لے کر محفل میں آتی اور جو اسے پسند آتا اس کے گلے میں وہ مالا پہنا دیتی تھی، داستان میں ایک مقام پر اس طریقہ کو اس طرح بیان کیا ہے :۔

"حاکم شہر عورت نے اپنی شادی کے لئے شہر میں منادی کرائی کہ تمام سردار اکٹھے ہوں جو مجھے پسند آئے گا اس کے گلے میں مالائے مروارید ڈالوں گی[۲]"

اسلام میں اس بات کی طرف واضح اشارہ ہے کہ لڑکا اور لڑکی کی رضامندی حاصل کرنا ضروری ہے لیکن ہندوستانی مسلمانوں کا معاملہ کچھ اور ہی ہے یہاں نسبت طے کرنے کی تمام ذمہ داری والدین یا گھر کے بزرگوں پر ہوتی ہے، وہ جہاں چاہتے ہیں رشتہ طے کر دیتے ہیں اس کے لئے لڑکی سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ لڑکے سے بھی صرف یہ کہا جاتا ہے کہ تمہاری شادی فلاں صاحب کی دختر سے طے کر دی گئی ہے اگر لڑکا اس پر کوئی نکتہ چینی کرتا ہے تو اسے بے ادب خیال کیا جاتا ہے، صاحبقران اکبر کے دادا قائم الملک کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا :۔

"مہتر خرام نے کہا اے شاہزادے ایسی بات نہ کہہ، رضائے والدین ہر امر پر مقدم اور واجب ہے چاہے مادر و پدر فرزند کی ایک کنیز سے شادی کر دیں مگر فرزند اُن کے حکم کو رد نہیں کر سکتا[۳]"

خود اولاد بھی ان کے حکم اور خواہش کی تابع نظر آتی ہے، برزخ شاہ حاکم شہر برزخیہ نے مصورہ بانو کو اپنے عیار کے ذریعہ اس کے محل سے اغوا تو کرا لیا لیکن عقد نہیں کیا اور کہا :۔

"باوجود بایں قوت دبازو اور کثرت سپاہ جو خدائے تعالیٰ نے مجھے عطا فرمائی ہے حیف کہ میں بغیر رضامندی پدر و مادر مصورہ بانو سے عقد کروں[۴]"

جب لڑکوں کے اختیارات کا یہ عالم ہے تو لڑکیوں سے رشتہ کے بارے میں کہنا یا پوچھنا اور بھی زیادہ عیب کی بات سمجھی جاتی تھی، اگر کبھی دختر کے روبرو اس طرح کی بات بھی کی جاتی تو ضروری تھا کہ لڑکی سر نگوں رہے اور لڑکی کی اسی خاموشی کو رضامندی تصور کیا جاتا تھا :۔

---

۱ ۱۷۴ ج ۴، ۲ ۸۰ ۳ ج ۹م، ۳ ۱۸۰ ج ۱، ۴ ۸۰ ج ۲،

"ملکہ کی خموشی اور سرنگونی موجب رضامندی تصور فرمایئے، فرزند کی کیا مجال کہ والدین کے حکم سے سرتابی کرے[1]"

اگر کبھی کوئی لڑکی ہاں یا نہیں میں جواب دیتی تو اُسے اس کی بے شرمی سے تعبیر کیا جاتا تھا بلکہ یہ امر خاندان کی رسوائی کا سبب بھی ہوتا تھا کہ فلاں شخص کی دختر بڑی بے شرم اور بے حیا ہے اس لئے عام طور پر دختر سے معلوم کیئے بغیر تمام معاملات طے ہو جاتے تھے لیکن بعض لوگ لڑکی کی رضامندی حاصل کرنا بھی ضروری سمجھتے تھے :-

"اب مجھے بجز اس کے اور کوئی عذر شرعی نہیں کہ ایک بار صاحب معاملہ یعنی دختر غیور کا بھی استمزاج لے لوں[2]"

داستانوں میں بیشتر شادیاں شاہزادوں اور شاہزادیوں کی رضامندی پر ہوتی ہیں کیونکہ دونوں پہلے ہی سے ایک دوسرے کے عشق میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اختتام پر والدین بھی ان کی خوشی میں شریک ہو جاتے ہیں، اختلاف کا کوئی مسئلہ ہی نہیں اٹھتا اور اگر کبھی اختلاف پیدا ہوتا ہے تو لڑکی یعنی شاہزادی بھی بغاوت پر آمادہ ہو جاتی ہے :-

"غابر شاہ نے چند بار اپنی دختر رشک قمر کے عقد نکاح کا قصد کیا مگر ماہ خوباں کو منظور نہ ہوا بلکہ دایہ کے ہاتھ کہلا بھیجا 'میری کتخدائی خاص میری مرضی پر موقوف رکھو، مجھے جس مرد سے منظور ہوگا عقد کروں گی[3]"

یہاں بھی لڑکی والدین کے روبرو اپنی بات نہیں کہتی بلکہ دایہ کو واسطہ بناتی ہے۔

اگرچہ یہ امر جائز قرار دیا گیا ہے کہ سن بلوغ کو تجاوز کرنے کے بعد لڑکی یا لڑکا صاحب اختیار ہو جاتے ہیں، والدین کی رضامندی ان کے لئے شرط نہیں۔ داستان نگار لکھتا ہے :-

"عورت بالغہ اور عاقلہ کے معاملے میں پدر و مادر کو کچھ اختیار نہیں ہوتا[4]"

"شمسہ فضل الٰہی سے خود بالغہ و عاقلہ ہے اور زن بالغہ کا بے رضائے والدین بھی نکاح ہونا جائز آیا ہے[5]"

لیکن اس طرح کی آزاد خیالی یا لڑکی کا انکار ہندوستانی تہذیب میں نہ صرف معیوب ہے بلکہ قابل مذمت اور نفرین خیال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ اسی بات کو اس انداز سے کہا گیا ہے جب ایک شاہزادہ

---

[1] ۱۲۱ ج ۵، [2] ۲۴۵ ج ۴، [3] ۲۴۶ ج ۳، [4] ۴۶۴ ج ۲، [5] ۴۵۷ ج ۳،

اپنے رفیقوں سے کہتا ہے کہ تم دو آدمی شاہدی کے واسطے کافی ہو۔ یہ اطلاع حکیم صاحب کے اسی وقت عقد میر اسمن آرا سے کردو توان کی جانب سے جواب ملتا ہے " دیوانہ ہوا ہے کہیں شرفا رزادیوں کا اس بے کسی اور ناچاری سے نکاح بھی ہوتا ہے[1]

اب سے کچھ عرصہ پہلے تک کی تہذیب میں رشتہ قایم کرتے وقت ان امور پر بہت شدت سے پابند رہا جاتا تھا۔

ہندو معاشرے میں زمانۂ قدیم ہی سے دوسری شادی کو معیوب بلکہ پاپ سمجھا جاتا ہے لیکن مسلمانوں میں اس طرح کی کوئی پابندی عاید نہیں۔ ایک مسلمان شخص بیک وقت چار بیویاں رکھ سکتا ہے مغلیہ دورِ حکومت میں تقریباً سبھی بادشاہوں نے چار سے زیادہ نکاح کیے۔ ان بیگمات کے علاوہ بے شمار کنیزوں کو حرمِ شاہی میں داخل کیا۔ اس میں کسی حد تک اہلِ ہند کا اثر بھی کہا جا سکتا ہے۔ اگرچہ ہندوؤں میں دوسری شادی کو برا سمجھا جاتا تھا لیکن یہ بات راجاؤں پر عاید نہیں ہوتی تھی۔ ان کے محل میں بہت ساری رانیاں ہوا کرتی تھیں۔ مسلمان بادشاہوں نے بھی کچھ ایران و ہند کے ان حکمرانوں کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے اور کچھ مذہب کا سہارا لے کر محل میں عورتوں کا جمگھٹ لگایا۔

" صاحبقرانِ اصغر نے فرمایا طریقۂ اسلام و شریعت نبوی میں خدا تعالیٰ نے ایک مرد کو چند بیویاں جائز و مباح کی ہیں بلکہ اس فعل سے معذور رہنا خداوندِ عالم کی نافرمانی کا موجب ہے"[2]

اسی قانونِ شریعت پر چلتے ہوئے صاحبقرانِ اصغر اس طرح نظر آتے ہیں کہ ملکہ روشن جمال سے شادی ہوتی ہے، شادی کے دوسرے ہی دن ملکہ خورشید نگار پر عاشق ہو جاتے ہیں اور اسی عشق کے دوران التاق شاہ کی دختر سرو سیمیں سے بھی عقد کر لیتے ہیں[3] گویا یہ کوئی عیب کی بات نہیں کہ ہنوز ایک شادی سے فارغ نہیں ہوئے کہ دوسری اور تیسری کر لی، بلکہ فرقۂ سلاطین کے لئے یہ ادر قابلِ عزت ہی ہوتا ہے۔ داستان کے اختتام پر صاحبقرانِ اکبر اور ابوالحسن جوہر اور ان کے رفقا کے ایک ہی ساتھ کئی کئی نازنینوں سے عقد ہوئے ہیں اور اگر پانچویں بیوی کا مسئلہ پیدا بھی ہوتا ہے تو اسے متعہ کے نام پر تسلیم کر لیا جاتا ہے۔[4]

" مناسب اور صلاحِ وقت یہی ہے کہ ملکہ روشن گہر سے متعہ ہو جائے اس سے

---

[1] ۳۰۸ ج ۴، [2] ۲۴۶ ج ۴، [3] ۲۶۷ ج ۴،

بہتر کوئی اور نہیں، کس واسطے کہ داخلِ شریعتِ نبوی ہے اور کتبِ الہیہ کی بنا پر اس میں بہت فضیلت ہے[1]"

ہندو اور مسلمان دونوں کے یہاں اس بات کو اچھی طرح سے نہیں دیکھا جاتا تھا کہ کوئی بوڑھا آدمی کسی جوان عورت سے شادی کرے، لیکن بادشاہوں کے لئے کیونکہ کوئی پابندی نہیں ہوتی اس لئے آخر عمر میں بھی وہ شادیاں کرتے تھے۔ صاحبقرانِ اکبر نے خود اپنے کئی بوڑھے رفقا کے عقد جوان نازنینوں سے کرائے لیکن عموماً اسے اچھا خیال نہیں کیا جاتا تھا بالخصوص خواتین اسے پسند نہیں کرتی تھیں۔

"روشن نظر دل میں نہایت آزردہ ہوئی کہ میری دختر باوجود اس خوبی اور جوانی کے اس پیر مرد کے پہلو میں بیٹھے گی اور اس اندیشے سے آثارِ ملال اس کے چہرے سے ظاہر ہوئے اور آہِ سرد کھینچ کر کہا کہ نور البصر ازل سے بدنصیب تھی کہ قید و بند سے نجات پا کے ان حضرت خضر کے پہلو میں بیٹھے گی[2]"

اور یہ بات آج بھی معیوب ہے کہ عام حالات میں کسی جوان العمر دختر کو کسی زیادہ عمر کے شخص سے بیاہ دیا جائے۔

حسب نسب

اب آئیے ان رسومات کا جائزہ لیں جو زندگی کے اس نئے باب میں داخل ہونے کے لئے ادا کیجاتی ہیں۔ اسلام میں ذات پات کا کوئی تصور نہیں، ایمان لے آنے کے بعد ہر شخص برابری کا درجہ رکھتا ہے خواہ وہ کسی نسل یا قبیلہ سے تعلق رکھتا ہو، حضرت محمدؐ نے مساوات کو قایم رکھنے کے لئے مختلف قبائل کی عورتوں سے شادیاں کیں تاکہ قبیلوں کا اختلاف اور بڑی چھوٹی ذات کا تصور ختم ہو جائے لیکن اس کا ختم ہونا ایک کارِ ناممکنات میں سے تھا خصوصاً جب اسلام ہندوستان میں آیا تو یہ تصور اور بھی پختہ ہوگیا، ہندوستان میں پہلے ہی سے طبقاتی تقسیم موجود تھی۔ ہندو چار ذاتوں میں تقسیم تھے، برہمن، چھتری، ویش، شودر۔ ان ذاتوں میں آپس میں شادی بیاہ تو دور کی بات ایک دوسرے کے یہاں کھانے پینے سے بھی دھرم بھرشٹ ہونے کا خوف رہتا تھا یہاں تک کہ شہر کی چہار دیواری کے اندر صرف اعلیٰ ذات کے لوگوں کو رہنے کی اجازت تھی نچلے طبقے کے افراد شہر کی فصیل کے باہر رہتے تھے[3] مسلمانوں کی آمد کے بعد اتنا تو ہوا کہ شہر کے دروازے ہر اعلیٰ و ادنیٰ کے لئے کھول دیئے گئے اور سب

---

[1] ۱۸۹ ج دوم، [2] ۵۶۹ ج ۲، [3] ادراق مصور۔ ص۔ ۱۹،

قریب قریب رہنے لگے، لیکن اب خود مسلمانوں کے ذہنوں میں ذاتوں کی تقسیم پیدا ہوگئی، ہندوستانی نومسلم اور باہر سے آئے ہوئے مسلمانوں میں فرق کیا جانے لگا۔ خسرو شاہ جسے خلجیوں کے عہد میں اقتدار حاصل ہوگیا تھا اور جس کا تعلق گجرات کی ایک برواری ذات سے تھا جو بچپن میں مسلمان ہوگیا تھا جب تخت نشین ہوا تو مسلمان امرا اس کے مخالف ہوگئے۔ مسلمان مورخین نے اسے برا بھلا لکھا ہے ضیاالدین برنی نے تو اسے نافرمانبردار اور مکار، ناہنجار اور بداصل، بدذات، کمینہ قسم کی لعن طعن سے یاد کیا ہے[۱]

ذات پات کی یہ تقسیم عقد و مناکحت میں بھی حائل رہی۔ شادی کی سب سے پہلی رسم یہی ہے کہ فریقین کے حسب و نسب کو اچھی طرح دیکھا جائے۔ ڈاکٹر راہی معصوم رضا نے اسے "ہڈی کی دیکھ بھال" کہا ہے[۲]۔ اس کام کے لئے عام طور پر عورتیں مقرر ہوتی تھیں جن کو "مشاطہ" کہا جاتا تھا اور جو دولہا دلہن کے خاندان کے بارے میں بڑی باریکی اور گہرائی سے معلومات فراہم کرتی تھیں۔ اکبر نے باقاعدہ اس کام کے لئے اشخاص مقرر کرائے تھے جن کو دریافتِ حال کا معاوضہ دیا جاتا تھا[۳]۔ ابوالفضل نے لکھا ہے کہ۔

"قبلۂ عالم رشتہ عقد و مناکحت فریقین کے حسب و نسب میں سادات اور ان کی ہمسری وغیرہ کا بے حد لحاظ فرماتے ہیں اور اس رشتے کے مساوی تعلقات کا کوئی پہلو فروگذاشت نہیں فرماتے ہیں[۴]"

یہی ہندوستانی تہذیب کا عکس داستان میں نظر آتا ہے، شادی سے قبل شاہزادہ اور شاہزادی کے حسب و نسب کو دیکھا جاتا ہے کہ آیا یہ ایک دوسرے کے ہمسر بھی ہیں یا نہیں۔ ہمسری کے یقین کے بعد ہی نسبت قایم کی جاتی ہے۔

"شاہزادہ بدر منیر کی خود تمنائے دلی تھی اسی وقت ملکہ کی خواستگاری کا رقعہ سرفراز خاتون کو لکھا اور حسب و نسب رقعہ میں ظاہر کیا[۵]"

غیر قوم یا غیر ملت میں شادی کرنا باعثِ ننگ خیال کیا جاتا ہے۔

"ان گاذروں کے خاندان میں یہ رسم قدیم ہے کہ بجز اپنی قوم کے غیر فرقہ میں قرابت و رشتہ داری نہیں کرتے ہیں[۶]"

"اس امر کے قبول کرنے میں کچھ تامل نہیں یہ عذر ضروری ہے کہ فرخ زاد بن

۱؎ بحوالہ خلجی خاندان۔ ص ۲۳۳، ۲؎ طلسم ہوش ربا ایک مطالعہ۔ ص ۲۹۰، ۳؎ آئین اکبری جلد (۱)۔ ص ۴۱۵، ۴؎ ایضاً۔ ص ۴۱۴، ۵؎ ۴۸ ج ۴، ۶؎ ۲۷۸ ج ۳،

اخلاق شاہ تیرے فیض صحبت سے اپنے باپ کے ساتھ مسلمان ہو گیا ہے ....
اس صورت میں ایک مرد غیر ملت سے دختر کو منسوب کرنا کمال ننگ سمجھتے ہیں[۱]"
طبقۂ سلاطین کی ایک الگ ہی ذات بن جاتی ہے وہ کسی کو اپنا ہم کفو نہیں سمجھتے :-

" یہ جوان خواجہ اسد بحیثیت نسب تاجر زادہ ہے اور تجار کسی صورت سے بادشاہوں کے ہم کفو نہیں ہو سکتے[۲]"

اسی طرح ایک فقیر بھی بادشاہ سے قرابت کو باعثِ فخر نہیں سمجھتا :-

" قدیم الایام سے یہ رسم معین چلی آتی ہے کہ معاملہ میں نسبت و قرابت کے غیر قوم کو نہایت ذلیل و نالایق سمجھتے ہیں حتی کہ فقیر بادشاہ کو بھی حقیر جانتے ہیں اسی وجہ سے صیغہ عقد و مناکحت غیر کفو میں ناجائز مطلق ہے[۳]"

جب حسب و نسب کے بارے میں تمام تفصیلات معلوم ہو جاتی ہیں اور مکمل اطمینان ہو جاتا ہے تو رشتہ کی بات چھیڑی جاتی ہے مسلمانوں میں رشتے کی ابتدا لڑکے والوں کی طرف سے ہوتی ہے یعنی لڑکے والے پیغام بھیجتے ہیں بلکہ لڑکی والوں کی طرف سے پیغام کا آنا اچھا نہیں سمجھا جاتا خیال کیا جاتا ہے کہ ضرور لڑکی میں کوئی عیب ہو گا، الطاق شاہ اپنی دختر ملکہ سرو سیمتن کی شادی صاحبقران اصغر سے کرنا چاہتا ہے لیکن :-

" دختر کے معاملہ میں بزبان خود گفتگو کرنی اصحاب شرم کے طریقے سے بعید جانتا تھا[۴]"

اس مرحلے کو طے کرنے کے لئے کسی رشتہ دار یا دوست کا سہارا لینا پڑتا ہے جو طرفین کے ارادوں کو ایک دوسرے پر ظاہر کرتا ہے، کچھ عرصہ پہلے تک اور بعض جگہ آج بھی کچھ عورتیں اس کام کے لئے مقرر ہوتی تھیں۔ دونوں جانب سے زبانی رضامندی کے بعد لڑکے والے رقعہ بھیجتے ہیں جس میں لڑکے کی لیاقت اور حسب و نسب کے ساتھ رشتہ قایم کرنے کی خواہش ظاہر کی جاتی ہے[۵]۔ رقعہ کے ساتھ تحایف اور شیرینی وغیرہ جاتی ہے۔ "بوستان" میں بعض جگہ تقریب نسبت کے لئے لڑکے اور لڑکی کی تصویریں بھی ایک دوسرے کو بھیجی گئی ہیں[۶] جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آج کے جدید مغربی دور میں رائج تصویر بھیجنے کی روایت قدیم زمانہ سے ہے۔

۱؎ ۶۳۰ ج ۴، ۲؎ ۱۱۷ ج ۵، ۳؎ ۳۷۹ ج ۲،

۴؎ ۲۴۷ ج ۴، ۵؎ ۱۰۲ ج ۵، ۶؎ ۸۲ ج ۳،

منگنی

طرفین کی رضامندی کے بعد تقریب نسبت یا منگنی کی رسم ادا ہوتی ہے اس رسم میں دولہا کے گھر والے مٹھائیاں اور تحایف لے کر اپنے کچھ عزیز و اقارب کے ہمراہ دلہن کے یہاں جاتے ہیں۔ بادشاہوں اور امرا کے یہاں منگنی کا بھی ایک جلوس سا نکلتا ہے جس میں مزدوروں کے سروں پر تحایف کے خوان ہوتے تھے جن میں خوردنی اشیا بھی شامل ہوتیں۔ جب دولہا کے یہاں سے جانے والی خواتین دولہن کے گھر پہونچتی تھیں[۱] تو وہاں ان کا بڑا پُرجوش خیر مقدم کیا جاتا تھا، ہر ایک کے ماتھے پر انگلی سے صندل لگایا جاتا اور ایک ایک ہار ان کے گلے میں ڈالا جاتا۔ دولہا کی ماں کے روبرو دلہن کو بنا سنوار کر لاتے اور وہ دلہن کو منگنی کی انگشتری کے ساتھ اور زیورات بھی پہناتی تھی۔

"بوستان" میں صاحبقران اکبر کی تقریبِ نسبت کا بیان یوں کیا گیا ہے:

"ملکہ عالیہ خاتون (والدہ صاحبقرانِ اکبر) و زنانِ پری زاد عالی وقار و زنانِ آدم زاد یعنی والدہ امیر محمد و امیر سیف الدین وغیرہ بشوکت و حشمت و تجمل و حشم و بجلو تمام تر بنوبت و نقارہ داخلِ قصر اخضر ہوئیں۔ خواتین قصر اخضر نے ملکہ عالیہ خاتون کا استقبال بآئین شائستہ کیا اور بصد اعزاز و احترام ایک مقام پر قصر اخضر میں بٹھایا اور مراسم و مراتب تہنیت و مبارکبادی بحسن و خوبی ادا کیے غرضکہ بعد شربت نوشی و مراسم معمولی زنانِ قصر اخضر ملکہ شمسہ تاجدار کو حجلہ عروسی سے مثل خورشید تاباں باہر لائیں اور ایک مسند جواہر نگار پر رونق افروز کیا.....
ملکہ عالیہ خاتون نے ...... اپنے ہاتھ سے انگشتری انگشتِ نازک ملکہ شمسہ تاجدار میں پہنائی ...... اربابِ نشاط و طرب یعنی زنانِ رقاصہ و خوش گلو نے رقص کر کے مبارکباد گانا شروع کیا۔"[۲]

اس موقع پر دلہن پر سے زر و جواہر نثار کیا جاتا تھا۔ دوسری طرف دولہا کو بھی منگنی کی انگشتری پہنائی جاتی۔

مندرجہ بالا اقتباس میں مہمان نوازی کی ایک رسم شربت نوشی کا ذکر آیا ہے۔ یہ شادی کی رسموں میں سے ایک رسم سمجھی جاتی تھی۔ مولانا سید احمد دہلوی نے اس کو "شربت پلائی" کے نام سے لکھا ہے[۳]

۱؎ رسوم دہلی میں لکھا ہے کہ ... میں بتوسط صرف عورتوں کے جانے کا ہے۔ ص ۸۸، ۲؎ ۳۹۴ ج دوم، ۳؎ رسوم دہلی۔ ص ۱۰۷،

قلعہ معلیٰ میں بھی یہ رسم رائج تھی ۔اس کا طریقہ یہ تھا کہ دلہن کی غیر موجودگی میں دولہا کے یہاں سے آئی ہوئی خواتین کے پاس کچھ میزبان عورتیں آتیں جن میں سے کسی کے ہاتھ میں شربت کا برتن ہوتا کوئی پیالیاں لئے ہوئے ہوتی ۔ ایک ہاتھ میں رومال یعنی تولیہ ہوتا اور ماما ساتھ میں آفتابہ لئے ہوتی ۔ شربت پلانے کے بعد کلی کرائی جاتی اور رومال سے منہ صاف کیا جاتا۔ شربت پینے والیاں شربت پینے کے بعد تھالی میں روپے وغیرہ ڈالتیں ۔

منگنی کی رسم ادا ہو جانے کے بعد رشتہ بالکل طے سمجھا جاتا ہے اور کچھ عرصہ بعد ہی شادی کر دی جاتی ہے منگنی کو توڑنا بہت برا خیال کیا جاتا ہے مغلوں میں بھی یہ رسم جاری تھی ۔ جہانگیر نے تزک جہانگیری میں مظفر حسین مرزا صفوی کی دختر سے خرم کی منگنی کا ذکر کیا ہے[1]۔

"بوستان" میں تقریباً سبھی شاہزادوں نے تقریری نسبت کی انگشتری پہنی ہے اس موقع پر بھی ایک بڑے جشن کا اہتمام کیا جاتا ہے کئی روز تک محفل نشاط آراستہ و پیراستہ رہتی ہے۔

"ایک جشن عظیم فقط تقریری نسبت کا برپا ہوا"[2]

اس جشن کے دوران شاہزادی کا پدر یا کوئی اور بزرگ شاہزادہ کی انگلی میں انگوٹھی پہناتا ہے۔

"سلطان شرفنوس ملک الجن نے بدست خود انگشتری دامادی صاحبقران اصغر سپہر قدر کی انگشت کوچک میں پہنائی"[3]

انگوٹھی پہنانے کے ساتھ دولہا کے سینے پر صندل ملا جاتا ہے[4]، زعفران چھڑکا جاتا ہے[5]۔

"مجلس رقص و سرود برپا ہو رہی تھی کہ جمشان وزیر ایک جام زعفرانی لایا اور اس نے سر سے پا تک شاہزادہ کے لباس پر زعفران چھڑکا ------ یہ رسم قدیم الایام سے تقریری نسبت کی علامت ہے"[6]

صندل یا زعفران یا ترنج[7] کو بطریق شگون استعمال کرتے ہیں ۔

یوں تو مسلمانوں میں لڑکے اور لڑکی کو نکاح سے قبل روبرو نہیں لاتے لیکن اگر پہلے سے دونوں کے درمیان پردہ نہ ہو اور ایک دوسرے کے سامنے آتے ہوں تب بھی منگنی کے بعد پردہ کر دیا جاتا ہے۔

---

[1] تزک جہانگیری۔ ص ١١٦، [2] ٦٢٦ ج ٤، [3] ١١٧ ج ٦، [4] ٢،٢ ج ٤، [5] ١٢٢ ج ٥، [6] ٦٧١ ج ٤، [7] ٤٥٩ ج ٢

"تو توفیق سے نامزد ہوگی اور نامزد کا تا وقوع صیغۂ عقد شوہر کے روبرو ہونا
جائز نہیں ہے"[1]

ہندوؤں میں یہ رسم ہے کہ شادی سے قبل لڑکا اور لڑکی کو ایک دوسرے کے روبرو کرتے ہیں۔
اور بات چیت کرنے کا موقع دیتے ہیں۔ داستان میں کہیں کہیں ایسا بھی ہوا کہ تقریب نسبت کے وقت
عروس و داماد کو ایک مقام پر لایا گیا ہے:۔

"قدیم سے ملک احراقیہ میں یہ رسم مقرر چلی آتی ہے کہ تقریب نسبت میں خلوت
مستقیمہ عروس و داماد کو ایک ہی مسند پر پہلو بہ پہلو بٹھا دیتے ہیں تاکہ بالمشافہ
ایک دوسرے کی صورت دیکھے اس وقت بجز چند کنیزان خاص محرم راز اور
کوئی آدمی نہیں ہوتا عروس و داماد میں کچھ کلمات ناز و نیاز واقع ہوتے ہیں"[2]

یہاں ایک اور تاریخی رسم کا ذکر کر دینا مناسب ہوگا، یہ رسم بھی شادی یعنی نکاح سے پہلے کی ہے
تاریخی نوعیت اس کی یہ ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام نے جب اپنی دختر کا نکاح حضرت موسیٰ علیہ السلام
سے کیا تو بعوض مہر آٹھ برس کی خدمت شبانی مقرر کی جسے حضرت موسیٰؑ نے انجام دیا۔ داستان میں بھی
ایک قبیلہ ایسا ہے جو شادی سے قبل داماد سے یہ خدمت لیتا ہے:۔

"ہمارے قبیلے میں بھی اول داماد سے شبانی کرواتے ہیں بلکہ یہی امر عروس کا مہر
مقرر ہے ۔۔۔۔ یعنی داماد بے مدد غیرے گلہ گوسپندان ہر روز جنگل میں
لے جاتا ہے اور شب و روز وہی غذا کھاتا ہے کہ جو چرواہے کھاتے ہیں اور تمام
دن جنگل میں بز و گوسپند کے ساتھ پھرتا ہے اور شام کے وقت ان کو
گھر لے آتا ہے بلکہ روز اول داماد سے اس بات کا اقرار نامہ لکھواتے ہیں کہ
لباس بھی چرواہوں کا پہنے اور کسی غلام یا ملازم کو اس کام میں اپنے ساتھ
شریک نہ کرے اور نہ جنگل میں درخت کے زیر سایہ آرام لے"[3]

بہر حال شاہزادہ اس رسم کو ادا کرتا ہے اور مطلوبہ کو نکاح میں لاتا ہے یہ صرف ایک تاریخی
یا ایک قبیلے کی رسم تھی، ہندوستان کے کسی قبیلہ یا علاقہ میں یہ رسم کتخدائی کی رسوم میں
شامل نہیں ہے۔

---

[1] ۵۹۸ ج ۴، [2] ۲۲۶ ج ۴، [3] ۱۳۸ ج ۴،

تاریخ کا تعیّن

منگنی کے بعد عقد کم از کم چھ ماہ بعد کیا جاتا ہے، کبھی کبھی سالوں بعد بھی ہوتا ہے، تقریب عقد سے تقریباً کچھ عرصہ پہلے پھر ایک رقعہ لکھا جاتا ہے جس میں عقد کا دن، تاریخ اور ساعت تحریر ہوتی ہے، یہ رقعہ لڑکی والوں کی جانب سے لڑکے والوں کے یہاں بھیجا جاتا ہے رقعہ کے ساتھ شیرینی وغیرہ بھی بھیجتے ہیں رقعہ کا کاغذ عام طور پر لال ہوتا ہے۔ اس موقع پر لڑکی والے بھی اپنے خاص خاص عزیزوں کو اکٹھا کرتے ہیں سب کے سامنے وہ خط پڑھا جاتا ہے اگر کوئی بات تبدیل کرنی ہوتی ہے تو جواب میں وہ لکھ دی جاتی ہے، ورنہ عموماً وہی تاریخیں تسلیم کر لیتے ہیں۔ اس موقع پر شیرینی تقسیم ہوتی ہے۔

جس طرح ہندوؤں میں تاریخ و دن کے تعین کے لئے پنڈت مہورت نکالتے ہیں، اسی طرح ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں میں نجومیوں سے دن اور ساعت معلوم کر کے دن اور ساعت کا تعین کیا جاتا تھا۔ خورشید نامہ کی تمام شادیوں میں تاریخ کا تعین اسی طور سے کیا گیا ہے۔ صاحبقران اکبر معزالدین نے بھی اپنے رفقاء اور اپنی شادیوں میں اسی بات کا لحاظ رکھا ہے مثلاً :-

"صاحبقران اکبر نے ...... سعید لوح دار کو پیام بھیجا کہ بہت جلد عروس کے عقد و نکاح کی تیاری تم کو کرنی چاہیئے ...... فلاں روز ہمایوں اور فلاں ساعت سعید ہم نے برائے عقد قرار دی ہے"[1]

تاریخ و دن کے تعین کے بعد دونوں جانب شادی کی تیاریاں زور و شور سے شروع ہو جاتی ہیں، خصوصاً لڑکی والوں کو زیادہ انتظام و اہتمام کرنا ہوتا ہے۔ سعید لوح دار کی دختر کی تاریخ مقرر ہو گئی تو اس نے شادی کے لئے تیاری کرنا شروع کی :-

"اسی وقت سے آراستگی اور فراہمی سامان و اسباب عیش و عشرت کتخدائی میں ہمہ تن مشغول ہوا، رفیع کرسی نشین نے تمام و کمال شہر کو آئینہ بند کیا تھا"[2]

مایوں بٹھانا

روزِ عقد سے قریب سات یا گیارہ روز قبل دلہن کو گھر کے کسی گوشے میں بٹھا دیا جاتا ہے اس

---

[1] ۱۷۱ ج ۳ م ، [2] ایضاً ،

موقع پر بھی عورتیں جمع ہوتی ہیں، اس رسم کو مائیوں بٹھانا کہتے ہیں۔ مائیوں بیٹھ جانے کے بعد دلہن کسی مرد کے سامنے نہیں آتی چاہے وہ باپ یا بھائی ہی کیوں نہ ہو۔ "بوستان" میں مائیوں بٹھانے کی مثالیں موجود ہیں: مائیوں بیٹھی ہوئی لڑکی صرف مردوں ہی کے سامنے آنے میں شرم محسوس نہیں کرتی بلکہ وہ شرم وحجاب کی وجہ سے عورتوں کی بھی کسی محفل میں شریک نہیں ہوتی ہے۔

"ملکہ نوبہار گلشن افروز بوجہ شرم وحجاب کے شریک نہ ہوئی تھی کیونکہ وہ سرور رعنائے گلشن محبوبی و گل رنگین چمن خوبی چندروز سے حجلۂ عروسی میں مقیم ہے، موافق دستور روز عقد تک باہر نہیں آسکتی"[1]

گوشۂ عروسی میں جب لڑکی بیٹھ جاتی ہے تو اس کا دل بہلانے کے لئے ہر وقت اس کی سہیلیاں اسے گھیرے رہتی ہیں اور طرح طرح کے اس سے مذاق کرتی ہیں، اسے چھیڑتی ہیں۔ لڑکی بے چاری شرم وحیا کی وجہ سے کسی کا معقول جواب نہیں دے پاتی ہے[2]

"نازنینان ہم سن پہلو میں بیٹھی ہیں مصورہ بانو سے باتیں چپکے چپکے ہو رہی ہیں کہ لو لو! مبارک ہو خدا نے وہ دن دکھایا کہ تمہارا سسرا برات لیکر آیا، اب کیا ہے حسرت دل نکالو، اچھی طرح سے پہلو میں بیٹھو، لطف زندگانی اٹھاؤ، عقد ہو جائے تو اپنے عاشق کے ساتھ جاؤ، مصورہ بانو یہ تقریر ہم نشیناں سن کر حجاب سے سر حجلۂ عروسی میں جھکا لیتی ہے ۔۔۔۔ کبھی نظر تند وتیز سے جانب ہم جلیساں دیکھکر کہتی ہے تم یہاں سے جاؤ، بھئی ہم کو نہ ستاؤ، ایسی باتیں ہم کو اچھی نہیں معلوم ہوتیں کیا تم نے میری چڑ مقرر کی ہے سوائے اس تذکرہ کے اور کوئی ذکر نہیں کرتی ہو، تمہارے منھ میں کیوں پانی بھر آتا ہے"[3]

جشنِ کتخدائی

ان رسومات کے بعد تاریخ مقررہ کے آنے پر بارات کا جلوس دلہن کے گھر کی طرف روانہ ہوتا ہے لیکن اس سے قبل کہ بارات کی روانگی کا ذکر کریں، مناسب ہوگا کہ تقریبِ شادی کے موقع پر دولہا اور دلہن کے یہاں جس جشن کا اہتمام کیا جاتا ہے اس کا بیان کر دیں۔

---

[1] ۳۱۴ ج ۹م، [2] ۳۶۷ ج ۹م، [3] ۱۰۴ ج ۹،

شادی کا جشن بالعموم عقد سے کئی کئی روز پہلے سے شروع ہوتا تھا بعض مقامات پر کئی کئی مہینے پہلے شروع کر دیتے تھے۔ داستان میں صاحبقرانِ اکبر، صاحبقرانِ اعظم اور صاحبقران اصغر اور ان کے رفقا کی اتنی شادیاں ہوئیں ہیں کہ اگر داستان نگاران کا تفصیلی ذکر کرتا تو "بوستانِ خیال" کی ضخامت اس تفصیل کے لیئے ہی کافی ہوتی اس لیئے داستان نگار نے تفصیل سے پہلو بچا کر بیانِ جشنِ شادی قصہ خواں کے حوالے کر دیا ہے لیکن اس کے باوجود تینوں صاحبقرانوں کی بزمِ کتخدائی کا بیان لطف سے خالی نہیں۔

اس جشن میں پورے شہر کو دلہن کی طرح سجایا جاتا تھا۔ ہر طرف چراغاں ہوتا تھا، محفلِ رقص و سرود آراستہ کی جاتی تھی، بزمِ عیش و نشاط منعقد ہوتی تھی، گلابی چھلکتی تھی، شہر کا ہر پیر و جواں خوش و خرّم نظر آتا تھا، ناچتا گاتا تھا، بادشاہ کے یہاں ہر ادنیٰ و اعلیٰ کے کھانے کا روزانہ دو وقت اہتمام کیا جاتا تھا۔

ابن بطوطہ جو محمد بن تغلق کے زمانہ میں ہندوستان آیا ایک شادی کا بیان اس طرح کرتا ہے:-

"ملک فتح اللہ بڑے بڑے سائبان لایا، دونوں صحنوں میں سائبان لگائے، ایک صحن میں بڑا خیمہ لگایا، طرح طرح کے فرش بچھائے، شمس الدین تبریزی طوائفیں اور گانے والے لایا ---- پندرہ دن تک سب لوگوں کو کھانا کھلایا گیا اور امیر اور پردیسی دو وقت کھانے میں شریک ہوتے تھے"[1]

ابن بطوطہ کا یہ بیان اس سے مختلف نظر نہیں آتا:-

"باغ افریقیہ میں داخل ہو کے جشن عروسی میں مشغول ہوئے اور یکسالہ محاصل ملک رعایا کو معاف کیا اور یہ مقرر ہوا کہ ہر ذی حیات آخر کتخدائی تک سرکار سے طعام پائے"[2]

آرائشِ شہر کا منظر امیر خسروؔ نے مثنوی دول رانی اور خضر خاں میں تفصیل سے لکھا ہے ؎

اشارت کرد تا در گردشِ دہر	بیارایند یکسر کہ نور و شہر
کمر بربست در کارش زمانہ	بخرج آمد خزانہ در خزانہ
چناں در نغمہ و شادی شد آفاق	کہ در رقص آمد ایں بہ سقف و شش طاق
بگرد اگرد قصرِ بادشاہی	بر آمد قبہ از مہ تا بماہی

[1] سفرنامہ ابن بطوطہ، قسط ۳، ص ۱۵۷، [2] ۳۶۴ ج ۱،

جہاں از قبہ ہائے کار ادارالے   شدہ چوں روئے در پا روز باراں
بہر جانب کہ مردم برزہ میں رفت   ہمہ برفرش دیباہائے چین رفت
زلبس شارع کہ نفت اندر خز ناب   زمیں را کس نہ دیدالا کہ در خواب[1]

مغلوں کے عہد میں شاہزادوں کی شادیوں کے کچھ اور ہی رنگ تھے، عیش و نشاط میں اور بھی اضافہ ہوگیا تھا۔ شاہزادہ خرم کے جشنِ شادی کا بیان ڈاکٹر بنارسی پرساد سکسینہ ان الفاظ میں کرتے ہیں :-

"۔۔۔۔۔۔ دن کو شاہانہ جلوس اور شب کو قیمتی آتش بازی نے جشن کی دلکشی بے پناہ بڑھا دی آگرہ کا پورا شہر جشن میں شامل تھا۔ یہ جشنِ شادی قریب قریب ایک مہینہ تک منایا گیا، ایک مہینے کے بعد جہانگیر اپنے لڑکے کے گھر شادی میں حصہ لینے کے لئے گیا۔ شاہزادہ نے باپ کو نذریں گذرانیں، بیگمات کو جواہرات دیئے اور امرار کو خلعت و اعزاز عطا کیا"[2]

مغلوں کے دورِ زوال میں بھی یہ جشن کی شان و شوکت کم نہ ہوئی اور یہ صرف بادشاہوں تک ہی محدود نہ رہی بلکہ ان کے اثر سے ہندو اور مسلمان امرار بھی اپنے یہاں شادیوں میں نمود و نمائش پر بے پناہ خرچ کرنے لگے۔ ذکرِ میر میں میر نے ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ راجہ جگل کشور نے اپنے بڑے بیٹے آنند کشور کی شادی پر سارے شہر کو کھانے کی دعوت دی اور جس کے متعلق یہ خیال ہوا کہ وہ دعوتِ عام کو باعثِ ننگ سمجھ کر نہ آئے گا اس کے پاس گیا اور کہا آپ کے بھتیجے کی شادی ہے اگر آپ شریک نہ ہوں گے تو محفل بے رونق رہے گی، بلا سے بعد میں پریشاں حالی یہاں تک پہونچی کہ میر کو بجز ایک پرانی شال کے کچھ نہ دے سکا[3]

مرکز کی روایت صوبوں میں پھیلی۔ دکن میں علاء الدین بہمن شاہ کے لڑکے کی شادی کا جشن پورے ایک سال تک منایا گیا۔ ہزاروں مخمل اور زربفت و ریشم کے تھان اور ہزاروں عربی و عراقی گھوڑے امرار میں تقسیم کیئے گیئے۔ دارالسلطنت کے غربار اور محتاجوں کو کھانا کھلایا گیا[4] بنگال میں سراج الدولہ کی شادی بھی مثالی کہی جاتی ہے، سراج الدولہ کے مصنف نے لکھا ہے :-

"سراج الدولہ کی شادی ہوئی جس میں دو ہزار خلعت دیئے گئے، ہر خلعت

---

[1] ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں۔ ص ۸۱-۸۰، [2] تاریخ شاہ جہاں۔ ص ۹۴، [3] ذکر میر ص ۸۷، [4] دکن کے بہمنی سلاطین۔ ص ۵۷،

کی قیمت ایک ہزار روپے تھی، امراء کو خلعتوں کے علاوہ جواہرات بھی ملے ایک ماہ
تک دونوں وقت مرشد آباد کے ہر باشندے کو پر تکلف کھانا ملتا رہا اور محلات
میں رقص و سرود کی مجلسیں ہر روز منعقد ہوتی رہیں، جہاں ہر شخص کو جانے کی
اجازت تھی ـ ـ ـ ـ ـ ہر روز شہر میں چراغاں کیا جاتا تھا اور آتش بازی چھوٹتی
تھی سارا شہر ایک بقعہ نور بن گیا"[1]

ان شادیوں کا بیان بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے جیسے کسی داستان کے شاہزادے کی شادی کا ذکر ہو، سراج الدولہ کی شادی اگر شان و شکوہ کے ساتھ منائی جائے گی تو "بوستان خیال" کا مصنف جواسی دربار میں بیٹھ کر داستان لکھ رہا ہے کیوں نا صاحبقران اکبر کی شادی میں وہ منظر پیش کریگا، جو اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، ملاحظہ ہو صاحبقران اکبر کی شادی کا ایک منظر :-

"اس جشنِ خجستہ میں تا آخر ہنگام عروسی جملہ اشخاص لشکری اور شاہزادہ
نامور اور سلاطین ذی وقار چھوٹے اور بڑے مع عملہ اور فعلہ بلکہ حیوان
بھی صاحبقران کے مہمان تھے، اور ہر ایک کی ضیافت کا اسباب و سامان
موافق اس کی قدر و منزلت کے سرکار صاحبقران سے دیا جاتا تھا، ـ ـ ـ علاوہ
قصور و ایوان کے لاکھوں خیمے استادہ ہیں فرش معقول ہے جا بجا مسندہائے
زریں ہیں علی قدر مراتب دلیاقت مردم بیٹھے ہیں یہاں بھی ساقیان گلفام
صدر نشینان بزم کو دوڑ دوڑ کے جام بے نظیر بنا زوادا پلاتے ہیں اور
مہ جبینان بے عدیل یہاں بھی نغمہ کر رہی ہیں غرض جس طرف دیکھئے سوائے
محفل عشرت و بزم طرب کے کچھ اور نظر نہیں آتا"[2]

غرض روانگی برات سے قبل کا یہ جشن خاصی اہمیت رکھتا ہے، مسرت و خوشی کا اظہار اسی وقت کیا جاتا ہے۔ امراء اور رعایا کو اسی موقع پر انعامات سے نوازا جاتا ہے۔

ساچق

اب وہ ساعتِ نیک آتی ہے کہ جس میں بارات کے جلوس کو دلہن کے گھر کی طرف روانہ ہونا ہے

---

[1] سراج الدولہ از محمد عمر۔ ص ۹۶، [2] ۲۱۱ ج ۹ م،

نیک اور بد ساعت کا تو ہر کام میں لحاظ رکھا جاتا تھا۔ روانگی سے قبل لڑکے کو دولہا بنایا جاتا ہے، قاعدہ یہ ہے کہ دولہا کے لئے جوڑا دلہن کے گھر سے آتا ہے اور دلہن کے لئے جوڑا دولہا کے گھر سے جاتا ہے جسے "مانجھا" کہتے ہیں لیکن "بوستان" میں بعض رسوم کا ذکر نہیں کیا گیا ہے البتہ ایک مقام پر اتنا ضرور ہے کہ جب منطقہ زریں کمر کی شادی ہوتی ہے تو ملکہ نوبہار گلشن افروز جوڑا لے کر جاتی ہے اور خود اسے دلہن بناتی ہے:-

"جواہرات بیش قیمت مع ملبوس زرتار و لباس شاہانہ شب عروسی منطقہ زریں کمر کو عنایت فرمایا کہ ویسا جواہر گران بہا اب معدن کو بھی دستیاب نہیں"[1]

دولہا کے یہاں سے جانے والے جوڑے کے ساتھ اور بھی سامان جاتا ہے اس رسم کو "بری" یا ساچق کہتے ہیں رسم ساچق برات کے جانے سے پہلے ہی ادا کی جاتی ہے اور اس میں لوگ خوانوں میں سامان رکھکر جلوس کی شکل میں دلہن کے گھر لے جاتے ہیں۔ رسوم دہلی میں رسم "حنابندی" کا ایک نام ہی ساچق بتایا ہے[2]۔ حنابندی کے نام کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ جوڑے کے ساتھ مہندی بھی جاتی ہے جو دلہن کے ہاتھوں اور پاؤں میں لگتی ہے اگرچہ یہ صحیح ہے کہ ساچق کے سامان میں مہندی بھی شامل ہوتی ہے لیکن "حنابندی" ایک الگ رسم ہے اور وہ یہ کہ دولہا کے یہاں سے بری جاتی ہے اسی طرح دلہن کے یہاں سے نوشاہ کے لئے مہندی آتی ہے "رسم ساچق" شام کے وقت ادا کیجاتی ہے اور "حنابندی" کی رسم رات کو کسی وقت ہوتی ہے اس لئے اسے "شب حنابندی" کہتے ہیں۔ مرزا قتیل نے ساچق اور حنابندی کا الگ الگ ذکر کیا ہے[3]،

جہانگیر شہریار کی شادی کی رسوم کے سلسلے میں لکھتا ہے:-

"حنابندی کی رسم تو مریم الزمانی کے گھر پر ہوئی ہے"[4]

"بوستان" میں اس رسم کا ذکر کئی جگہ آیا ہے۔ صاحبقران اعظم کی کتخدائی کے وقت لکھا ہے:-

"اس شب کو رسم حنابندی ہوئی"[5]

صاحبقران اکبر کا عقد جب طلسم "اجرام و اجسام" میں ملکہ نوبہار سے ہوتا ہے تو دلہن کے یہاں کی خواتین آکر صاحبقران کے دست و پا پر حنا لگاتی ہیں[6] اسی طرح جب ناطقہ روشن بیان سے اسی

---

[1] ۲،۳ ج ۵ م، [2] رسوم دہلی۔ ص ۱۰۱، [3] ہفت تماشا۔ ص ۱۴۴، [4] تزک جہانگیری۔ ص ۳۵۷، [5] ۳،۶ ج ۸ م، [6] ۶۰، ۴۶ ج ۲،

طلسم میں نکاح ہوتا ہے تو یہ رسم ادا کی جاتی ہے :۔

"شب حنابندی دست دیا کو شاہزادہ کے خواتینِ محل نے حنا لگائی ہے"[1]

داستان نگار اتنا ہی کہکر آگے بڑھ جاتا ہے یہ نہیں بتاتا کہ یہ رسم کس طرح ادا کیگئی، کیا کیا تکلفات اس میں برتے گئے۔

"ساچق" کی رسم کا ذکر جہانگیر کے عہد میں بھی ملتا ہے۔ جہانگیر تزک میں ایک جگہ لکھتا ہے :۔

"بہاری کی لڑکی جس کی نسبت پرویز سے قرار پاچکی تھی ایک لاکھ اور تیس ہزار روپے بطور ساچق روانہ کیے ہے"[2]

شجاع الدولہ کی شادی پر صفدر جنگ نے ساچق کے دن ایک ہزار اور کئی سو چاندی کے گھڑے تیار کرا کے عروس کے گھر بھجوائے۔[3]

اس سے پیشتر ہم لکھ چکے ہیں کہ دلہن کے یہاں سے دولہا کے لئے جوڑا آتا ہے۔ جوڑا آنے کے بعد اور بارات کی روانگی کے وقت دولہے کے عزیز و اقارب اسے بناتے سنوارتے ہیں۔ دلہن کے گھر سے آیا ہوا جوڑا پہنایا جاتا ہے، پھولوں سے گندھا ہوا سہرا سر پر باندھتے ہیں شہزادوں کے سہروں میں پھولوں کی جگہ جواہرات اور موتی وغیرہ بھی لگتے تھے۔ سہرا باندھنے کی رسم ہندوستان ہی کی دین ہے، عربی مسلمان اس سے ناواقف تھے، یہی وجہ ہے کہ امیر سیف الدین عربی کا نکاح جب محمد تغلق کی بہن سے ہوا اور اس سے سہرا باندھنے کیلیئے کہا گیا تو اس نے انکار کر دیا، ابن بطوطہ نے لکھا ہے :۔

"پھر ایک چیز لائے جو تاج کے مشابہ تھی اور چمیلی اور نسرین اور رائے بیل کے پھولوں کی بنی ہوئی تھی اور جس کی جھالر منھ اور سینے پر لٹکتی تھی امیر کو کہا کہ اس کو سر پر رکھے اس نے انکار کیا کیونکہ وہ عرب کا صحرائی تھا میں نے کہا میرا کہنا مان اور اس کو قسم دلائی تو اس نے سر پر رکھا"[4]

اس اقتباس سے یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ ابن بطوطہ سہرے سے قطعًا ناواقف تھا وہ سہرے کو ایک چیز کہکر پکارتا ہے، تاج سے مشابہ ہونا بھی اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ یہ ہندوستان کی دین ہے

---

[1] ۳۶۰ ج ۲، [2] تزک جہانگیری، ص ۸۵، [3] تاریخ اودھ، جلد اول، ص ۱۳۰،
[4] سفرنامہ ابن بطوطہ، قسط ۳، ص ۱۵۸،

کیونکہ عربی مسلمانوں میں تاج کا رواج نہیں تھا بلکہ ہندو راجہ تاج پہنا کرتے تھے۔

مغل شاہزادوں کے بھی سہرا باندھا جاتا تھا، اورنگ زیب جیسا متشرع بادشاہ کی شادی کے موقع پر اس کے سہرا باندھا گیا:۔

"شاہ جہاں نے اپنے ہاتھ سے اس کے (اورنگ زیب) کے سر پر سہرا باندھا جس میں قیمتی لعل اور زمرد تھے"[۱]

صاحبقران اکبر اور ان کے رفقاء کے سروں پر بھی سہرے باندھے جاتے ہیں۔ سہرا باندھنے کا کام کسی بزرگ یا بلند مرتبہ شخص کے ذمہ ہوتا ہے۔ خود صاحبقران اکبر اپنے رفقاء کے سہرا باندھتے ہیں:۔

"صاحبقران اکبر نے اصغر بن طائی شاہ کو روز مسعود اور ساعت ہمایوں میں دولہ بنایا، سر پر سہرا زرتار باندھا رخ نوشاہ یعنی اصغر بن طائی شاہ پر سہرے کی لڑیاں یوں نظر آتی تھیں جیسے چہرۂ آفتاب پر تار شعاع"[۲]

صاحبقران اکبر جب خود دولہا بنتے ہیں تو سلطان اسمٰعیل پدر صاحبقران ان کے سہرا باندھتے ہیں[۳] حکیم قسطاس الحکمت وغیرہ پوشاک کتخدائی پہناتے ہیں۔

"آخر حکمائے عالی وقار والا تبار نے ساعت دوم ــــ سعد اصغر میں کہ شب پنج شنبہ سیزدہم ربیع الاول تھی صاحبقران عالی وقار کو پوشاک کتخدائی سے مزین کیا یعنی صاحبقران اکبر بلند اقبال کو خلعت فاخرہ جو تمام و کمال جواہر بیش بہا میں غرق تھا پہنایا اور خنجر یاقوت جبل الصفا زیب کمر کیا"[۴]

بعض لوگوں میں آج بھی کمر میں تلوار یا ہاتھ میں چھوٹا سا چاقو باندھتے ہیں۔

روانگی بارات

نوشاہ کو تیار کرنے کے بعد روانگی کا وقت آتا ہے تمام مہمان بارات کے جلوس میں چلنے کیلئے تیار ہوتے ہیں۔ دولہا کو گھوڑے یا ہاتھی پر سوار کرایا جاتا ہے۔ صاحبقران جب ملکہ نوبہار سے عقد کرنے کے لئے جاتے ہیں تو ہاتھی پر سوار ہوتے ہیں:۔

"حکماء نے ایک فیل کوہ پیکر پر کہ جس کی جھول زرتار تھی اور ہودہ بھی بے مثل

---

[۱] ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی جلوے ص ۵۰۳، [۲] ۲۷۶ ج ۹ م، [۳] ۱۴۷ ج ۹، [۴] ۲۵۰ ج ۹

وبے نظیر تھا ہمراہ سلطان اسمعیل پدر صاحبقران اکبر کو سوار کیا[۱]

اور جب ملکہ شمسہ تاجدار کے عقد کے قصد سے جلوسِ بارات کیا تو صاحبقران اکبر گھوڑے پر سوار ہوئے[۲]

صاحبقران اعظم اور اصغر بھی شادی کے وقت گھوڑوں پر سوار ہوتے ہیں :-

"الحاصل برات تیار ہوئی دونوں صاحبقران اسپان پری نژاد پر سوار ہوئے[۳]"

صرف دولہا سوار ہوتا تھا بارات کے باقی افراد پیدل ہی چلتے ہیں۔ پیدل چلنے والے افراد میں بادشاہ اور شاہزادے بھی شامل ہوتے ہیں :-

"بادشاہان جن وانس بفور خوشی سے پیادہ پا تھے مگر ان شاہزادوں کے والد کو بہزار دشوار سوار کیا تھا ورنہ وہ بھی نہیں مانتے تھے[۴]"

باراتیوں کا پیدل چلنا شاید روایت میں شامل ہے۔ دکنی کلچر میں یہ تحریر ہے :-

"دولہے کا نکاح کے لئے دلہن کے مکان پر جانے کا جلوس ہوتا اس میں فوج، نوبت، طوائفیں، سمدھی والے وغیرہ سب ہوتے اور عربوں کے غول کے بعد دولہے کی سواری گھوڑے پر ہوتی، دولہے کے دوست، احباب واقارب پیدل چلتے تھے[۵]"

جب بارات روانہ ہوتی ہے تو آتش بازیاں چھوٹنا شروع ہو جاتی ہیں بارات کے ساتھ عیش و نشاط اور تفریح طبع کے لئے تمام لوازمات ہوتے ہیں، ناچنے گانے کے لئے طوائفیں، ڈومنیاں، تفریح کے لئے بازی گر، نقال، بھانڈ، گویئے وغیرہ سب ساتھ ساتھ اپنے اپنے تماشے دکھاتے ہوئے چلتے ہیں، دولہے کے گھر سے لے کر دلہن کے گھر تک آرام وآسائش کا ایسا انتظام کیا جاتا ہے کہ کسی کو کوئی تکلیف نہ ہو، کیونکہ اس زمانہ میں دلہن کے گھر تک پہونچنے میں کئی کئی روز تک لگ جاتے تھے بلکہ مہینہ بھر بھی گذر جاتا تھا اس لئے تمام انتظامات پہلے ہی سے کر دئے جاتے تھے۔ راستوں کو صاف کر کے چراغاں کیا جاتا تھا دن کو بارات ٹھہرتی تھی اور رات کو سفر کرتی تھی۔ جب آتشبازی کی رنگینیاں چاندرات کا سماں پیدا کرتی تھیں۔ شاہزادہ اسمعیل کی شادی کے وقت مہدیہ سے افریقیہ تک آئینہ بندی کی گئی ہے۔

"اور یہ حکم دیا کہ مہدیہ سے افریقیہ تک دو طرف آئینہ بندی ہو کیونکہ ہر منزل

۱۔ ۹۳ ج ۵، ۲۔ ۵۶ ج ۵، ۳۔ ۱۸ ج ۸، ۴۔ ایضاً، ۵۔ دکنی کلچر از نصیر الدین ہاشمی۔ لاہور ۱۹۶۳ء ص ۳۳،

میں دونوں طرف سرائے اور باغ تھے اور آئینہ بندی اس طرح ہو کہ ہر منزل میں
جہاں تک سرائے اور باغ ہوں وہاں دونوں طرف آئینہ بندی اور روشنی
ہو اور اس قدر کھانا پکے کہ جمیع لشکرِ داماد کو مع فقراء و مساکین کفایت کرے
اور تمام راہ میں جابجا طائفے موجود رہیں ہے[1]

"افریقیہ سے مہدیہ تک کہ بارہ منزل تھی دو طرفہ امراء کے خیمے برپا ہوئے اور
دونوں شہروں کے حد وسط میں یمین و یسار دو باغ بنائے تھے ایک کا
جانفزا اور ایک کا دلکشا نام تھا افریقیہ سے باغ دلکشا تک دونوں طرف داماد
کے لوگ مقیم تھے اور باغ جانفزا سے مہدیہ تک دو جانب عروس کے لوگوں
کے خیمے تھے افریقیہ سے مہدیہ تک پچاس فرسخ ہوگا دونوں طرف بازار تھے"[2]

یہی انتظامات مغل شاہزادوں کی شادیوں میں کیئے جاتے تھے۔ درختوں پر زربفت اور زرین سے
تھان لپیٹ دیسے جاتے، سڑکوں اور عام شاہراہوں پر رومی مخمل بچھادی جاتی، نوشاہ کی آمد و رفت
کے لئے جو راستہ مقرر ہوتا اس کے دونوں جانب دور دور تک فوجیں کھڑی کر دی جاتیں جن کے شالوں
پر زریں پھول، دامنوں اور آستینوں پر کلابتو کی تحریریں اور کمر میں آبدار شمشیریں لٹکی رہتیں جن سے
بڑی شان و شوکت ظاہر ہوتی تھی[3] مغلوں کی یہی شادی کے جلوس کی آراستگی داستان میں نظر
آتی ہے اگر تمام شادیوں کے جلوس کا یہاں بیان کیا جائے تو بات بہت دور اور دیر تک چلے گی۔
اس لئے یہاں صرف صاحبقران اکبر جو داستان کا بنیادی کردار ہے، کی بارات کا ہی ذکر کرتے ہیں۔

صاحبقران اکبر کی شادی کا جلوس بھی تین بار نکلتا ہے اول ملکہ منطقہ روشن بیان کے یہاں
جاتا ہے اس کے بعد ملکہ نوبہار گلشن افروز سے عقد کے لئے جاتے ہیں اور سب سے آخر میں ملکہ شمسہ
تاجدار کہ جس کے عشق میں گھر بار چھوڑا تھا کے قصر اخضر پر بارات جاتی ہے، بارات کے ان تینوں جلوسوں
کا بیان کچھ تفصیل سے کیا گیا ہے۔ یہاں ہم ملکہ شمسہ تاجدار کی بارات کا ذکر کرتے ہیں۔ اس طرح
بقیہ جلوس شادی بھی تصور کرنے چاہئیں۔ صاحبقران اعظم اور اصغر کی شادی کا جلوس بھی ایسی ہی
شان و شوکت سے نکلتا ہے۔

اگر دلہن کا گھر دور ہوتا ہے تو باراتی بھی گھوڑوں اور ہاتھیوں پر سوار ہو کر جاتے ہیں، امراء

---

[1] ص ۲۶۳، ج ۱، [2] ص ۲۶۵ ج ۱، [3] ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے، ص ۵۰۰،

اور سردار نہ صرف خود نفیس اور مکلف پوشاک سے مزین ہوتے ہیں بلکہ اسپانِ ابلق و سرنگ کو بھی آراستہ کرتے ہیں۔ زریں جھولیں ان کے اوپر ڈالتے ہیں صاحبقران کے جلوس میں باراتیوں کی تعداد اس قدر تھی کہ بقول مصنف پیر فلک نے بھی کبھی ایسا جلوس نہ دیکھا ہوگا کیونکہ صاحبقران مع جملہ مطیع و فرمانبردار پری زاد اور آدم زاد ہمراہ رکاب تھے، مصنف لکھتا ہے :۔

"منزلوں تک جلوس ہی جلوس نظر آتا تھا، کثرت مردم اس درجہ تھی کہ بارِ مردم پشتِ گاؤ زمیں خم ہوگئی تھی، قدم ماہی پر کانپتی تھی۔ زمین کو زلزلہ تھا، ماہی بھی کثرتِ بار سے نہایت بے قرار تھی" [1]

بارات جب سفر شروع کرتی ہے تو باجوں کی آوازیں فضا میں گونجتی ہیں، ہر طرح کے آلات موسیقی بجاتے ہوئے ساز نواز جلوس کے آگے چلتے ہیں :۔

"آواز نقارہ و دہل و قرنا وغیرہ سے پردہ گوش ساکنانِ سمٰوات پھٹے جاتے تھے" [2]

شادی کے جلوس میں سازوں کا بجنا بڑی اہمیت رکھتا ہے بلکہ بغیر سازوں کے جلوس کا تصور ہی نہیں کیا جاتا اگرچہ اسلامی نقطۂ نظر سے یہ جائز نہیں ہے لیکن ہندوستان میں زمانۂ قدیم سے اس کا رواج ہے۔ ہندوؤں کی شادیوں میں بڑی دھوم دھام ہوتی ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے یہاں بھی یہ لازمی حصہ بن گیا۔ مغلوں میں کیونکہ ہندوستانی تہذیب زیادہ تیزی سے داخل ہوگئی تھی، اس لئے ان کی شادیوں میں بھی اہلِ ہنود کا سا ہی منظر نظر آتا ہے۔ اسی کے زیر اثر داستانوں کی شادیوں میں نقارہ کی آوازیں گونجتی ہیں۔ قصہ مہر افروز دلبر میں تو تمام سازوں کے نام گنا دیئے ہیں :۔

"کوئی پتلی مردنگ بجاتی ہیں کوئی ڈھولک بجاتی ہیں، کوئی دائرہ، کوئی دمدمہ، کوئی امرت کنڈے، کوئی مجیرہ، کوئی زنگ، کوئی طنبورہ، کوئی رباب، کوئی بین، کوئی قانون، کوئی جل ترنگ، کوئی نیہہ ترنگ، کوئی سازنگی، کوئی سازندا، کوئی نے، کوئی مہچنگ، کوئی ہتھ پال، کوئی پناک، کوئی گوکا، کوئی چنگ، کوئی عود، کوئی بربط اور طرح طرح کے باجے بجادیں ہیں" [3]

شادی کا جلوس ہو، باجے بجیں، ناچ گانا اور آتشبازی نہ ہو، یہ بھلا کیسے ہوسکتا ہے، بغیر آتشبازی

لے ۵۶۴ ج ۹ م، ۲ے الیضاً، ۳ے قصہ مہر افروز دلبر، مرتبۂ ڈاکٹر مسعود حسین خاں ص ۱۶۸،

کے جلوس ہی کیا، سازوں کی آوازوں کے ساتھ چہار طرف آتش بازی چھوٹتی ہے، قسم قسم کی آتشبازی ہیں، کہیں انار چھوٹتے ہیں، کہیں مہتابی، کہیں پھلجڑیاں روشن ہوتی ہیں تو کہیں ترنج، بھنچپنے اور سوپور یہ چھوٹتے ہیں۔ زمین سے لے کر آسمان تک ستاروں کا جال اور نور کا پہاڑ نظر آتا ہے[1]۔

یہ باجے اور آتشبازی اورنگ زیب کی شادی کے جلوس میں بھی شریک تھے :۔

"یہ جلوس خاص خاص راستوں سے گذرا، ساتھ ساتھ باجے بھی تھے نغمہ و سرود کی آواز بھی بلند ہو رہی تھی آتشبازی بھی چھوٹ رہی تھی"[2]

نغمہ و سرود اورنگ زیب کی شادی کے جلوس میں ہی نہیں جاتا بلکہ اس کے بعد بھی جشن کا یہی منظر رہتا ہے[3]، فرخ سیر کی بارات میں رقاصاؤں کے طائفے بھی ساتھ چلتے تھیں :۔

"فرخ سیر محل سے دہلی دروازہ کی طرف نکلا تو بعض مغنیہ اس کے جلوس میں گا رہی تھیں، جا بجا آتشبازی چھوٹ رہی تھی"[3]

بارات کے جلوس میں یوں تو تمام راستے مطربائیں گاتی ہوئی اور رقاصائیں رقص کرتی ہوئی جاتی تھیں لیکن جب باراتی کسی مقام پر قیام کرتے تھے تو محفلِ نشاط اور بھی شباب پر آجاتی تھی، شراب کا استعمال پانی کی طرح ہوتا تھا۔ ساقیانِ سیمیں ساعد بناز و ادا شراب پلاتیں، ہر خیمے میں الگ الگ رقص و سرود کا انتظام کیا جاتا، مطربان خوش آواز غزل سرا ہوتیں، حاضرین خوش ہو ہو کر انعامات دیتے ۔

رقص کی محفلوں کے علاوہ نقال اور بازیگر وغیرہ بھی تماشے اور کرتب دکھاتے ہوئے ساتھ ساتھ چلتے تھے، شادی کے جلوس میں نقالوں، بازی گروں اور قلابازوں کا ذکر عثمانیہ سلطنت میں بھی ملتا ہے، البتہ یہ لوگ غیر مسلم ارمنی ہوا کرتے تھے[4] امیر خسروؒ نے بھی مثنوی دول رانی اور خضر خاں کی شادی کے موقع پر بازی گروں کا ذکر کیا ہے ۔

بارات کے جلوس کو دیکھنے کے لئے اطراف و جوانب کے لوگ اکٹھے ہو جایا کرتے تھے، خواتین بام قصر سے بارات کا جلوس دیکھتی تھیں اور ان پر پھول برساتی تھیں[5] جب بارات دلہن کے محل کے قریب پہونچتی تھی تو وہاں کی خواتین چھتوں پر آجاتیں اور دولہا کو دیکھتیں ۔

"بالائے قصرِ اخضر سے خواتین ذی وقار سواریٔ صاحبقران نامدار کو بصد و بہزار شوق دیکھتی تھیں"[6]

---

[1] ص ۵۴ ج ۹م، [2] ہندوستانی مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے، ص ۵۰۳، [3] ایضاً ص ۵۰۶
[4] رسالہ "اردو" کراچی شمارہ ۱، ۱۹۷۷ء ص ۳۵، [5] ۵۷۷، ۵۷ ج ۵، [6] ص ۱۴۱ ج ۹ م،

اس شان و شکوہ کے ساتھ یہ جلوس تمام راستوں سے گذرتا ہوا دلہن کے یہاں پہونچتا۔ تمام راستے نوشہ کے اوپر سے زر و جواہر نثار کیا جاتا، راستوں کو خوشبو سے معطر کیا جاتا ؀۔

"اثنائے راہ میں زر و جواہر سر صاحبقران اکبر پر بے شمار نثار کیا جاتا تھا نقیبان خوش آواز ہر قدم پر بو لتے جاتے تھے، ہزار ہا سقے زمین پر گلاب اور کیوڑے سے چھڑکاؤ کرتے جاتے تھے، گرد و غبار کو بٹھاتے جاتے تھے، تمام راہ خوشبو سے معطر تھی، مردمانِ ہمراہی کے دماغ خوشبو سے معطر ہوتے تھے ہوائے سرد کثرت خوشبو سے ایسی عطر بار ہوگئی تھی کہ اتراتی ہوئی چلتی تھی"[1]

بارات میں بیگمات بھی جایا کرتی تھیں ان کے پردے کا پورا انتظام ہوتا تھا[2]

اب آیئے دیکھیں کہ بارات کے استقبال کے لئے دلہن کے یہاں کیا کیا تیاریاں کی جاتی ھیں۔ یہاں اور بھی دونی رونق دکھائی دیتی ہے، پورے شہر کو آئینہ بند کیا گیا ہے، جگہ جگہ قنادیل و قمقمہ زریں و فانوس و کنول و گلاس آویزاں و روشن ہیں، کئی فرسخ تک خیام زربفتی اور مخمل کاشانی استادہ کیئے گئے ہیں۔ ان خیموں میں باراتیوں کا دل بہلانے کے لئے نازنیان خوش جمال موجود ھیں، جو رقص و موسیقی میں بے مثل ہیں، جس راستے سے بارات کو آنا ہے اس پر دور تک مخملی فرش بچھائے گئے ہیں[3]، باراتیوں اور دولہے کے استقبال کے لئے راستوں میں میزبان کھڑے ہیں، تمام ساکنان شہر خوش ہو ہو کر طرح طرح کے پھول صاحبقران یعنی دولہا کی سواری پر برساتے ہیں۔ پھر تمام باراتیوں کو خیموں میں ٹھہرایا جاتا ہے، ارباب نشاط تار موسیقی چھیڑتے ہیں، رقاصائیں پائل چھنکاتی ھیں۔

عقد

اس تواضع کے بعد نیک ساعت دیکھکر مجلس عقد منعقد ہوتی ہے اور عقد پڑھایا جاتا ہے:۔

"حکمائے ذی وقار و عالی تبار نے ساعت سعید میں محفل عقد بعد زیب و زینت آراستہ کی --- اشعار --- بعد آراستہ ہونے محفل عقد کے اور بزم نشاط کے سلطان اسمٰعیل ذی وقار و پادری ایدروس و ہر چہار حکمائے عالیقدر ذی وقار یعنی حکیم قسطاس الحکمت و حکیم ابو المحاسن و حکیم اخنش جان و حکیم

---

[1] ۴۵۷ ج ۹ م، [2] ۴۱۵ ج ۹ م، [3] ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۶۱، ۴۱۳ ج ۹ م،

عیقر طوس حبشی محفل عقد میں تشریف لائے چونکہ پادری ایدروس ملکہ شمسہ تاجدار کیجانب
سے وکیل مطلق تھا اس وجہ سے اس استرضائے ملکہ شمسہ تاجدار درمیان بزم ظاہر
کیا بعد اس کے شیخ احمد عرب نے بشہادت ابوالمکارم وحمید زرافشاں ہر دو گوہر
دریائے حسن وخوبی کو سلک عقد میں بصد مسرت منسلک کیا [1] "

عقد ہو جانے کے بعد چاروں طرف سے مبارکی وتہنیت کی صدائیں آتی ہیں، دولہا کے سر پر
سے زر وجواہر نثار کیا جاتا ہے، مطربائیں مبارکی کے نغمے گانا شروع کر دیتی ہیں :-

" ابو عامر پدر ملکہ شمسہ تاجدار نے بھی ہزار در ہزار خوان وطبق زر وجواہر کے فرقِ داماد پر کئے [2] "

زر وجواہر کے ساتھ ساتھ چھوارے اور شیرینی بھی حاضرین کو پیش کیئے جاتے ہیں -

عقد کے سلسلے میں ایک اور بات قابلِ بیان ہے وہ یہ کہ وقتِ نکاح دلہن کا کچھ " مہر " باندھا جاتا ہے
مہر کا مطلب ہے وہ رقم جو نکاح کے عوض خاوند بیوی کو دیتا ہے، شرع میں مہر کی رقم بہت کم بتائی گئی ہے
اس قدر کہ دولہا وقتِ نکاح ہی ادا کر سکے، لیکن نہ صرف بادشاہوں میں بلکہ عام لوگوں میں بھی یہ رقم
بہت زیادہ مقرر کی جانے لگی ہے - " بوستان " کے شاہزادہ اسمٰعیل اور ملکہ عالیہ خاتون کی شادی پر
ستر ہزار شتر براز زرِ سرخ وجواہر مہر مقرر ہوا [3] - شاہزادہ طاقان زریں کمر کا عقد ملکہ گل افروز کے ساتھ
ہوتا ہے تو ممالک الطاقیہ ومہراقیہ کا خراج ہفت سالہ مہر طے ہوتا ہے اور عروس کے خاندان کی رسم
کے مطابق یہ مہر طاقان کو مجلسِ عقد ہی میں حاضرین کے روبرو ادا کرنا پڑتا ہے [4] - تاریخ میں بھی اس
طرح کی مثالیں ملتی ہیں جہانگیر کا مہر دو کروڑ تنکہ مقرر ہوا [5] - اورنگ زیب کا مہر چار لاکھ مقرر ہوا [6]

" بادشاہ نامہ " کے حوالے سے صباح الدین عبدالرحمٰن نے وقتِ نکاح کی ایک اور رسم کا ذکر کیا ہے
اورنگ زیب کی شادی کے بیان میں لکھا ہے :-

" نکاح کے وقت شاہ نواز خاں خود موجود نہیں تھا کیونکہ یہ رسم تھی کہ لڑکی کا باپ
نکاح کے وقت موجود نہ ہو [7] "

یہ داستان میں بھی بعض شادیوں میں دیکھنے کو ملتی ہے :-

" ہر گاہ قاعدہ کلیہ ہے کہ پدرِ عروس محفل عقد میں موجود نہیں ہوتا اسی وجہ سے

---

[1] ۴۶۳ ج ۹ م، [2] ایضاً، [3] ۳۴۶ ج ۱، [4] ۱۸۴ ج ۴، [5] تزکِ جہانگیری، ص ۳۶، [6] ہندوستانی
مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے ص ۹۳، [7] ایضاً

ملک التجار بھی ہنگام عقد مجلس میں نہ آیا اور اپنے ایک سردار لشکر کے ہاتھ پیامًا
صاحبقرانِ اصغر اور الطاق شاہ کو کہلا بھیجا کہ نکاح خوانی کے واسطے ہماری طرف سے
قاضی صاحب تشریف لائیں گے۔[۱]

قاضی کو ٹوٹو لڑکی والے ہی بلواتے ہیں اور قاضی کو نکاح خوانی کے عوض کچھ دیا جاتا ہے۔[۲] قاضی کو قضائیت کی خدمت پر بادشاہ ہی مقرر کرتا تھا۔

"صاحبقران نے اسی عبدالباری کو شہر الطاقیہ و مہراقیہ کی خدمت قضائیت دی تھی"[۳]

عقد کے بعد عروس کے یہاں سے تمام سرداروں اور لشکریوں کو خلعت وزر دیا جاتا ہے۔[۴]

جب نکاح پڑھا دیا جاتا ہے تو دولہا کو محلسرا میں بلاتے ہیں، خواتین محل اس کا استقبال کرتی ہیں، محل کے اندر بھی بہت سی رسومات ادا ہوتی ہیں، بلکہ کہنا چاہیئے کہ بیشتر رسوم شادی خواتین ہی کے درمیان ادا کیجاتی ہیں۔ جب صاحبقرانِ اکبر کا عقد پڑھایا جا چکا تو :۔

"اس اثنا میں چند خواجہ سرا زریں کمر بلباس مکلّف و عصاہائے مرصع کار حاضر ہوئے
اور صاحبقران فلک احتشام کو باعزاز و احترام محلسرا میں لے گئے"[۵]

اس وقت کی ایک رسم یہ ہے کہ عروس کی بہنیں یا سہیلیاں دروازہ پر دولہا کا راستہ روک لیتی ہیں۔ اور جب تک وہ منھ مانگا انعام نہیں پالیتیں، دولہا کو اندر نہیں جانے دیتیں :۔

"جس وقت صاحبقرانِ اکبر در قصر اخضر پر پہونچے خلدانہ ماہر و زوجہ سلطانے
ابوالحسن جوہر نے بصد مسرت در قصر اخضر کو جلد تر بند کر لیا۔ جب تک اپنی
اولاد کے نام تاقیام حکومت عہدہ وزارت کا فرمان صاحبقرانِ اکبر سے نہ لکھوایا
اس وقت تک دروازہ نہ کھولا"[۶]

اس موقع پر باقاعدہ زور و قوت آزمایا جاتا ہے یعنی دلہن والے روکنا چاہتے ہیں اور دولہا کے ساتھی اندر داخل ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ ابن بطوطہ نے امیر سیف الدین کی شادی کا بیان کرتے ہوئے لکھا ہے :۔

"یہاں کا دستور ہے کہ جس مکان سے دولہا — دلہن کو اپنے ساتھ لاتا ہے اس
مکان کے دروازے پر دلہن کی جماعت کھڑی ہو جاتی ہے اور جب دولہا

---

[۱] ۲۴۸ ج۴، [۲] ۲۷۶ ج۴، [۳] ۲۶۶ ج۴، [۴] ۳۶۶ ج۱، [۵] ۷۷ ج۵، [۶] ۴۶۴ ج۴ ۹م،

کی جماعت آتی ہے تو ان کو داخل ہونے سے روکتے ہیں، اگر وہ غالب ہو جاتے ہیں تو
چلے جاتے ہیں اگر مغلوب ہوتے ہیں تو ان کو ہزاروں روپے انعام دینے پڑتے ہیں[۱]
خواتین کی طرح طرفین کے مرد بھی آپس میں مذاق کرتے ھیں :-

"محفل عروسی ہے سمدھیوں میں باہم آج مذاق ہوتے ھیں"[۲]

جب دولہا محل میں داخل ہوتا ہے تو تمام خواتین زر و جواہر اس پر سے نثار کرتی ہیں[۳] — ساز و نوا کرتی ہیں یعنی گیت گاتی ہیں[۴] محل میں نوشاہ کی سلامی بھی ہوتی ہے۔ عروس کی والدہ دولہا کی منھ دکھائی دیتی ہے۔

"ملکہ ناہید افروز ملکہ زہرہ جبیں کی مادر بزرگوار بھی رونق افروز ہیں انھوں نے اپنا
ملک ختن داماد کو سلامی میں دیا"[۵]

اس موقع پر محل سرا میں موجود لڑکیاں جن میں دلہن کی بہنیں اور سہیلیاں شامل ہوتی ہیں اور جو رشتہ میں دولہا کی سالیاں کہلاتی ہیں نوشاہ سے طرح طرح کے مذاق کرتی ہیں، دولہا بڑے نرم انداز میں جواب دیتا ہے[۶]

دولہا کو تخت زریں پر بٹھایا جاتا ہے، دلہن کو بھی اسی تخت پر بٹھاتے ھیں۔ اس وقت عروس زیورات و جواہرات اور لباس سرخ سے آراستہ سرنگوں و خاموش بیٹھی رہتی ہے۔ دولہا کے بار بار کہنے پر بھی بات کرنا تو شے دیگر نگاہ بھی اونچی نہیں کرتی[۷]

دلہن کے بناؤ سنگھار میں بھی ہندوستانی دلہنوں کا عکس نظر آتا ہے، دلہن کو سرخ لباس ہندوؤں میں زمانہ قدیم سے پہناتے آئے ہیں۔ ملاحظہ ہو داستان کی ایک عروس کی آرایش :-

"...... رنگینی حنائے دست و پا سر دست خونریزی پر آمادہ ہے، آنکھوں
میں ایسا سرمہ دنبالہ دار لگا ہوا ہے کہ دیکھنے والے کو شمشیر اصفہانی کھنچی ہوئی
نظر آتی ہے پان کی سرخی سے لب نازک رشک عقیق یمن معلوم ہوتے ھیں،
لباس سرخ میں رُخ پُر نور ملکہ نوبہار گلشن افروز یوں نظر آتا ہے جیسے شفق
میں مہر تاباں اور ملبوس ملکہ نوبہار گلشن افروز عطر سہاگ سے ایسا معطر و معنبر
ہے بوئے مشک و عنبر بھی غیرت سے محجوب ہے نظر نہیں آتی اور پیشانی انور پر
ملکہ نوبہار کے ایسی افشاں چنی ہے کہ پیر فلک دیکھکر زر انجم ملکہ نوبہار کے

۱؎ سفرنامہ ابن بطوطہ قسط ۳ ص ۱۵۶، ۲؎ ۴۱۲ ج ۸ م، ۳؎ ۳۴۸ ج ۱، ، ۵۷۷ ج ۵، ۴۴۶ ج ۹ م، ۴؎ ۴۸۲ ج ۴،
۴۴۴ ج ۹ م، ۵؎ ۴۲۱ ج ۸ م، ۶؎ ۱۱۶ ج ۱۶، ۷؎ ۲۱۹ ج ۵،

فرق پر نثار کرتا ہے [۱]

آئینہ و مصحف

جب نوشاہ اور عروس ایک ہی تخت عروسی پر بٹھا دیئے جاتے ہیں تو محل کی ایک خاص رسم ادا ہوتی ہے جسے آئینہ و مصحف کہتے ہیں اس کا طریقہ یہ ہے کہ دولہا دلہن سر جوڑ کر آمنے سامنے بیٹھتے ہیں درمیان میں تکیہ پر قرآن شریف رکھا جاتا ہے دولہے سے کہا جاتا ہے کہ وہ سورہ اخلاص پڑھکر دلہن کے منہ پر پھونکے اس کے بعد قرآن شریف پر آئینہ رکھا جاتا ہے اور دونوں کے اوپر ایک چادر ڈال دیتے ہیں، آئینہ میں دونوں ایک دوسرے کی صورتیں دیکھتے ہیں۔ آرسی مصحف کی رسم داستان کی سبھی شادیوں میں ادا کیگئی ہے۔ صاحبقران اعظم اور صاحبقران اصغر کی شادی پر انجیل شریف اور آئینہ رکھا گیا۔ بعض جگہ یہ رسم دولہا کے گھر پہونچنے پر ادا کی جاتی ہے [۲]۔ صاحبقران اکبر کے ہر عقد کے بعد یہ رسم ادا کی گئی [۳]

جہیز و رخصت

ان رسومات کے بعد رخصت کا وقت آتا ہے یعنی نوشاہ دلہن کو اپنے یہاں لے جاتا ہے، عروس کا باپ اپنی حیثیت کے مطابق جہیز دیتا ہے، اسلامی شرع کے مطابق جہیز صرف چند ایسی اشیا پر مشتمل ہوتا ہے، جو ضروریات زندگی میں سے ہوں، پیغمبر اسلام نے اپنی بیٹی کے جہیز میں ایک چکی اور مشک دی تھی جس سے آٹا پیسا جا سکے اور پانی بھر کر لایا جا سکے لیکن ہندوستان میں خواہ ہندو ہو یا مسلمان اپنی حیثیت سے کہیں زیادہ دیتا ہے آرام و آسایش اور نمایش کی تمام اشیا بیٹی اور داماد کے لیئے اکٹھی کر دیتا ہے۔ محمد شاہ بادشاہ نے اپنی بیٹی حضرت بیگم کا عقد جب احمد شاہ ابدالی سے کیا تھا تو بادشاہ دہلی نے جہیز میں اتنا سامان دیا کہ کہا جاتا ہے کہ چشم فلک نے بھی اس جیسا نہ دیکھا ہوگا [۴]۔ سامان کے علاوہ چار سو کنیزیں جہیز میں شامل تھیں [۵]۔ یہ اس دور کی شان ہے جب مغلیہ سلطنت زوال کی طرف بڑھ چکی تھی اور نادر شاہ دلی لوٹ چکا تھا۔ دور عروج کے جہیز کی مقدار کا اندازہ بھگوان داس کے جہیز سے لگایا جا سکتا ہے جو جہانگیر کی شادی پر دیا گیا۔ بینی پرساد نے تاریخ جہانگیر میں لکھا ہے کہ :-

---

[۱] ج ۳، ص ۲۹۰ [۲] ج ۵، ص ۱۶۳ [۳] ج ۴، ص ۳۴۲، ص ۴۴ [۴] نادرات شاہی۔ ص ۶۰، [۵] ہندوستانی مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے۔ ص ۵۰۶،

"بھگوان داس نے جو جہیز دیا اس میں ایک سو ایک ہاتھی، قطار در قطار گھوڑے، بکثرت جواہرات، مختلف قسم کے برتن اور قسم قسم کی دوسری چیزیں شامل تھیں جن کی تعداد کا شمار نہیں ہو سکتا تھا"[۱]

جہیز کے ساتھ شاہی امرار کو بھی خلعت وانعام سے نوازا جاتا تھا :-

"شاہی امرار کو سنہری کاٹھیوں سے مزین ایرانی، عربی، ترکی گھوڑے دیئے گئے"[۲]

جہیز دینے کی یہ روایت "بوستان" میں بھی موجود ہے، ہر شاہزادہ کی شادی پر بے شمار سامان ملتا ہے، ملکہ عالیہ خاتون کے جہیز کے بارے میں یوں بیان کیا ہے :-

"چھتیس کارخانہائے اساسۂ سلطنت ملکہ کے جہیز میں دیئے، شاہزادہ کو مع مال ومتاع ایک قصر دلکشا میں مقیم کیا"[۳]

صاحبقرانوں کو تو کئی طلسموں کا اکٹھا کیا ہوا خزانہ ملتا ہے، بے شمار کنیزیں جہیز میں شامل ہوتی ہیں۔ امرار کو بھی یہاں عروس کی جانب سے خلعت وانعام سے نوازا جاتا ہے[۴]۔

"سعد گوہر پوش نے اس کتخدائی میں ہزار خلعت وجواہر ہمراہیان شاہزادہ کو عنایت کیے"[۵]

"محفوظ قلمدار نے موافق اپنی قدر ولیاقت وشان کے ہر امرائے صاحبقرانے و سردارانِ صاحبقران ذی شان کو خلعت زر وجواہر گراں بہا نذر دیا"[۶]

رخصت کے وقت دولہا عروس کو گود میں اٹھا کر پالکی میں بٹھاتا ہے یہ رسم قدیم زمانہ سے رائج ہے[۷] رسوم دہلی میں یہی لکھا ہے کہ دولہا نے روتی ہوئی دلہن کو گود میں اٹھایا اور پالکی میں بٹھا دیا[۷]۔ جہانگیر کی شادی پر محل کے اندر سے اکبر اور جہانگیر دونوں پالکی اٹھا کر باہر لائے[۸] میر حسن نے بھی دلہن کو نوشاہ ہی سے اٹھوایا ہے

وہ دلہا کا دلہن کو گودی اٹھا　　بٹھانا محافہ میں آخر کو لا[۹]

"بوستان" میں بھی دولہا ہی عروس کو اٹھا کر محافہ میں بٹھاتا ہے :-

"پھر دولہا نے دلہن کو محافہ زرنگار میں سوار کیا"[۱۰]

"حفیظ ثریا مکان نے عروس کو آغوش میں مثلِ دل لے کر سکھپال زریں میں سوار کیا"[۱۱]

۱؎ تاریخ جہانگیر ص ۳۶، ۲؎ ایضاً، ۳؎ ۵۴۵ ج ۱، ۴؎ ۲۴۹ ج ۴، ۵؎ ۵۰ ج ۱، ۶؎ ۳۷۱ ج ۹م؛ ۷؎ رسومِ دہلی ص ۱۳۱،
۸؎ مآثر الامراء جلد دوم ص ۱۳۰، ۹؎ سحر البیان ص ۱۴۴، ۱۰؎ ۶۱۳ ج ۸م، ۱۱؎ ۳۷۳ ج ۹م،

"امیر زادہ سیف الدین محلسرا میں داخل ہوا اور ملکہ عقیلہ سیم اندام کو لبصد آرزو آغوش میں لے کر سکھپال زریں میں سوار کیا" [۱]

جب دلہن نوشاہ کے گھر پہونچ جاتی ہے تو "رونمائی" کی رسم ادا ہوتی ہے، دلہن کو زر و جواہر دیتے ہیں اور اس کا منھ دیکھتے ہیں :-

"اکثر بزرگوں نے ملکہ کو رونمائی میں زر و جواہر دیا" [۲]

خود دولہا بھی رونمائی کے وقت کچھ دیتا ہے :-

"صاحبقران نے رونمائی میں عروس کو اپنی سلطنت موروثی ملکہ زہرہ جبیں کی اولاد کو بخش دی" [۳]

جو لوگ کسی وجہ سے خود نہیں آسکتے وہ تحایف بھیجتے ہیں :-

"ملکہ شرف افزا کی شادی ملکہ خاتون الملک نے بطریق تحفہ ایک گوہر شب چراغ بھیجا" [۴]

رونمائی وغیرہ کے بعد سب خواتین ادھر ادھر منتشر ہو جاتی ہیں اور عروس کو ایوان خلوت میں پہونچا دیا جاتا ہے، ایوانِ خلوت میں پہونچانے کا کام گھر کی بڑی بوڑھیاں کرتی ہیں کنیزوں کا دروازہ پر پہرہ لگایا جاتا ہے :-

"ملکہ عالیہ خاتون والدہ صاحبقران اکبر عروس کو لبصد الفت و بہزار مسرت اٹھاکر ایوان خلوت میں لائیں اور آیۃ الکرسی اور نادِ علی و دیگر ادعیہ جلیلہ اپنے فرزند دلبند اور عروس پر پڑھکر ایوان خلوت سے چلی آئیں۔" [۵]

"کنیزان رومیہ اور حبشیہ و ترکیہ باعصائے مرصع دروازے پر مقرر ہوئیں۔" [۶]

چوتھی

اتنی رسوم گذر جانے کے بعد بھی رسموں کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا بلکہ دوسرے یا تیسرے دن سے عروس کے گھر والے آتے ہیں اور عروس کو لے جاتے ہیں پھر داماد اور اس کے مادر و پدر، رشتہ داروں وغیرہ کو اپنے یہاں بلاتے ہیں یہاں پہلے سے ہی میوہ و فواکہ مثل انار و بہی اور امرود و سنگترے علیٰ ہٰذالقیاس

۱؎ ۴۴۴ ج ۹م، ۲؎ ۳۴۲ ج ۱، ۳؎ ۱۲۶ ج ۸م، ۴؎ ۵۷۷ ج ۵، ۵؎ ۴۴۶ ج ۹م، ۶؎ ۳۶۸ ج ۱،

اور خوشبو و خوش رنگ پھولوں کی گیندیں وغیرہ تمام سامان موجود رہتا ہے، اول عروس و داماد میں باہم بطریق شگون گل بازی ہوتی ہے، بعدازاں خواتین میزبان و مہمان میں بھی ہنگامہ آرائی شروع ہوتی ہے اس رسم کو "چوتھی" کہتے ہیں۔ یہ ہندوستانی نام ہے، خیالؔ نے اسے چوتھی کے نام سے ہی لکھا ہے، صاحبقران اصغر جن کا تعلق فرقہ عیسائی سے ہے، کی شادی میں بھی یہ رسم ادا کی گئی ہے۔

"ملکہ روشن جمال اور صاحبقران بلند اقبال کو مسند سروارید نگار پر بٹھایا بعدازاں چار طرف سے گل بازی شروع ہوئی صاحبقران نامدار اس انبوہ و مجمع میں ہر ایک عورت کو بنظر غور و التفات دیکھتا تھا اور خوش طبعی کر مذاق و لطیفہ بازی کرتا تھا خواتین بھی مذاق و خوش طبعی کرنے میں قصور نہ کرتی تھیں۔"[1]

دعوتِ ولیمہ

اب ایک آخری رسم رہ جاتی ہے کہ جس کو اسلام میں شرعی حیثیت بھی حاصل ہے اور اس کو ادا کرنا سنتِ نبوی ہے۔ وہ ہے دعوت ولیمہ۔ عموماً شادی کے دوسرے دن دلہن سسرال میں آجاتی ہے تو دولہا کے گھر والے اپنے اعزا و اقربا کی ایک بڑی دعوت کا اہتمام کرتے ہیں اس میں عروس کے یہاں کے لوگ بھی شرکت کرتے تھیں۔ "بوستان" میں صاحبقران اعظم کی کتخدائی کے موقع پر صرف اتنا ذکر کیا گیا ہے:۔

"آج دعوت ولیمہ ضرور قبول فرمائیے"[2]

یہ تھیں شادی کی وہ رسومات جو داستان کی سبھی شادیوں میں اختیار کی گئی ہیں، یہ اور بات ہے کہ کہیں ان کا ذکر تفصیل سے کیا گیا ہے اور کہیں مصنف ان پر نظر ڈالتا ہوا گذر گیا ہے، بعض جگہ تو معذرت کر دیتا ہے:۔

"اگر خامہ اعجاز رقم سامانِ عروسی و آرائش طوی ہر ایک کا رقم کرے۔ اپنے اصل مطلب سے باز رہے، کیا معنی کہ اس تمہید میں نظم نثر لکھنی ضرور ہے اور یہ امر مصنف کو منظور نہیں۔ ۔ ۔ ۔ ناحق قصہ کو طول ہوگا۔"[3]

ان رسومات کے مطالعہ سے ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ وہ تمام رسومات جو اس وقت شادیوں میں رائج تھیں، داستان میں موجود ہیں۔

---

[1] ج ۳، ص ۸۴ [2] ج ۴، ص ۱۳۸ [3] ج ۲، ص ۵۶

رسوم وفات

دنیا کی ہر شے اپنا مقام بدل سکتی ہے، ہر عمل تبدیل ہو سکتا ہے لیکن قدرت کا یہ فیصلہ تاقیامت منسوخ نہیں ہو سکتا کہ انسان کو ہر حال میں فنا ہونا ہے بلکہ ہر جاندار شے فنا ہونے کے لئے پیدا ہوئی ہے، موت کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہے، پیغمبروں سے لیکر ولیوں تک اور بادشاہوں سے لے کر غریبوں تک کوئی بھی دستِ قضا سے محفوظ نہیں رہ سکتا، ہر جاندار کی موت کا ایک دن معین ہے اور جب انسان نے یہ جان لیا کہ موت بہر حال ہر ایک کو آنی ہے تو اس نے اس موقع کے لئے بھی کچھ معاشرتی قواعد و ضوابط یعنی رسوم مرتب کرلیں تاکہ اسے جو مر گیا ہے خراجِ عقیدت پیش کر سکیں۔

دنیا کا پہلا آدمی جب مرا تو جو زندہ تھا اسے سوچنا پڑا کہ اب اس لاش کا کیا کرے، اسی وقت اس نے دیکھا کہ ایک پرندہ زمین کھود کر دوسرے مردہ پرندے کو دفن کر رہا ہے اور اس طرح قابیل نے بھی مقتول ہابیل کو دفن کر دیا اور جب زمین پر بہت سی قوموں اور مذہبوں نے جنم لیا تو ہر قوم اور ہر مذہب میں موت کے وقت الگ الگ رسومات رائج ہو گئیں۔ کچھ لوگ مردے کو جلانے لگے اور کچھ دفن کرنے لگے ہندو اپنے مردے کو نذرِ آتش کرتے ہیں اور مسلمان سپردِ خاک کر دیتے ہیں، مقصد خاکی آدمی کو خاک کے حوالے کرنا ہی ہے۔

جب کوئی بیمار ہوتا ہے اور یہ یقین ہو جاتا ہے کہ یہ مرض الموت ہے تو قریبی رشتہ داروں کو اطلاع کر دی جاتی ہے سب اکٹھے ہو جاتے ہیں، مرنے والا بھی چاہتا ہے کہ آخری وقت میں اپنے سب عزیزوں کو دیکھ لے، اولاد کو نصیحت کر دے، عام آدمیوں میں عموماً سب قریب ہوتے ہیں لیکن بادشاہوں کے یہاں ایسا نہیں ہوتا تھا، شاہزادوں کو مختلف صوبوں کی صوبیداری دے کر ان صوبوں میں بھیج دیا جاتا تھا، عام طور پر بادشاہ کے مرنے کی خبر بھی شاہزادوں تک کئی کئی روز میں پہنچتی تھی اور اگر بیماری کی اطلاع پہونچ بھی جاتی تب بھی آنے میں کئی روز لگ جاتے تھے آج کل کی طرح تیز رفتار سواریاں نہیں تھیں۔ ہمایوں نامہ میں گلبدن بیگم نے لکھا ہے کہ جس وقت بادشاہ بابام یعنی بابر کا آخری وقت قریب آیا تو اس وقت وہ بار بار مرزا ہندال کو یاد کر رہے تھے، ہندال لاہور سے آرہا تھا۔

"ہر زماں اور ہر ساعت آپ یہی کہتے تھے کہ ہزار افسوس ہندال کو نہیں دیکھا اور جو کوئی سامنے آتا تھا اس سے پوچھتے تھے کہ ہندال کب آئے گا"[1]

---

[1] ہمایوں نامہ۔ ص ۲۸

بالآخر بابر مرگیا اور ہمایوں اس کی موت کے بعد پہونچا، اسی طرح سلطان اسمٰعیل کی موت کا وقت جب قریب آیا تو اس وقت اپنے بیٹے معزالدین کو یاد کرنے لگے جو ان سے دور تھا، بارگاہِ خداوندی میں وہ دعا کرتے ھیں :۔

"اے پروردگار عالم مجھ کو آرزو ہے کہ اس وقتِ آخر میں اپنے نورِ نظر لختِ جگر شاہزادہ معزالدین کو دیکھ لوں اور اس سے وداع ہولوں اور جو کچھ کہ اس سے کہنا ہے کہہ لوں"[۱]

اور جب صاحبقران آجاتا ہے :۔

"یکایک سلطان اسمٰعیل نے آنکھیں کھولیں اور ہر طرف دیکھا، جب شاہزادہ معزالدین اپنے فرزند کو دیکھا بے اختیار اشارے سے طلب کیا اور سینہ سے لگالیا اور رونے لگے، صاحبقران اکبر بھی اپنے والد کے سینے سے لپٹ کر رونے لگے"[۲]

اس وقت فقرا اور مساکین کو زر و جواہر تقسیم کرتے ہیں، مسلمانوں میں بیمار کے پاس بیٹھ کر قرآن شریف کی تلاوت کرتے ہیں خصوصاً سورۂ یٰسین پڑھی جاتی ہے، قبر و قیامت کی باتیں کرتے ہیں[۳] زور زور سے کلمہ پڑھتے ہیں تاکہ مرنے والا بھی پڑھے :۔

"سلطان بیمار ہوئے اور یقین کامل ہوگیا کہ یہ مرض موت ہے، حالت مرض میں ہر روز زر و جواہر تقسیم کرتے تھے اور ان سے دعائے مغفرت کے خواستگار تھے شیخ محمد عرب سے ہر وقت احوال قبر و قیامت سن کر گریہ و زاری کرتے تھے"[۴]

مرنے سے قبل اگر مرنے والا طاقت گفتار رکھتا ہو تو وصیت کرتا ہے اور وصیت سن کر لوگ رونے لگتے ہیں کیونکہ یقین ہو جاتا ہے کہ موت قریب ہے، بابر نے وقت مرگ وصیت کی تھی :۔

"میں یہ وصیت کرتا ہوں کہ سب لوگ ہمایوں کو میری جگہ تصور کریں اور اس کی وفاداری میں کوتاہی نہ کریں اور ہمیشہ اس سے موافقت اور دوستی رکھیں حق سبحانہٗ سے امیدوار ہوں کہ ہمایوں بھی سب آدمیوں سے نیک سلوک کرے گا، یہ سن کر سب لوگ جو وہاں موجود تھے رونے لگے اور آپ کی

۱؎ ص ۴۷۴ ج ۹م ، ۲؎ ایضاً ، ۳؎ ص ۶۸۸ ج ۱ ،

آنکھوں میں آنسو بھر آئے"[1]

جب "بوستان" میں صاحبقران اکبر کی موت کا وقت قریب آتا ہے تو وہ بھی کوئی ایسی وصیت نہیں کرتا جو غیر مانوس ہو بلکہ اس کی زبان سے بھی یہی الفاظ نکلتے ہیں جو بابر نے کہے یا کوئی اور مرنے والا کہتا ہے۔

"اے برادران سعادت نشان اب میں جدا ہوتا ہوں اور جانب ملک بقا جاتا ہوں ...... میں اپنے نور نظر پارہ جگر عزیز الدین اپنے جانشین کو بعد خدا تمہارے حوالہ کرتا ہوں، تم سب اس کم سن کے معین اور مددگار رہنا شاید بعد میرے دشمن ہر جانب سے لشکر کشی کریں ..... جو اس وقت موجود تھے صاحبقران اکبر کی وصیت کو سن کے بے اختیار اشکبار ہوئے"[2]

بستر مرگ پر موت کے انتظار میں بیمار ہر ایک پر حسرت و یاس و بے بسی کی نظر ڈالتا ہے اپنے عزیز و اقربا سے معافی طلب کرتا ہے ؎۔

"بعد دیر ابو الخیار نے آنکھ کھول کے سلطان کو دیکھا اور کہا کہ یا سلطان عالیقدر میں نے اپنی عمر تمہاری خدمت میں بسر کی اور کوئی آرزو میرے دل میں باقی نہ رہی، امیدوار ہوں کہ جو کچھ تقصیر تمہاری خدمت میں ہوئی معاف کرو کہ میری عمر سے اب چند نفس باقی ھیں"[3]

وصیت ہو چکی، معافی مانگی جا چکی یعنی ایک طرح آخری ملاقات کا وقت ختم ہو گیا اگر بیمار ہوش میں ہوتا ہے تو آہستہ آہستہ کلمہ پڑھتا ہے اور اسی عالم میں روح پرواز کر جاتی ہے، اسلامی شریعت کے مطابق موت پر چیخ کر یا بیان کر کے رونا جائز نہیں کیونکہ زندگی خدا ہی نے دی اور اسی نے واپس لے لی، آنکھوں سے آنسو بہہ جانا کوئی گناہ نہیں لیکن ہندوستان میں مسلمانوں کے یہاں ایسا نہیں بلکہ مرنے سے قبل ہی رونا پیٹنا شروع ہو جاتا ہے اور جب آخری سانس ختم ہو جاتی ہے تب تو بہت چیخ چیخ کر، پچھاڑیں کھا کھا کر روتے ہیں۔ میت کے قریب بیٹھ کر بیان کرتے ہیں۔ شہنشاہ اکبر نے تو اپنی ماں کی موت پر ہندوؤں کی طرح داڑھی مونچھ اور سر منڈا کر ماتمی لباس پہنا[4]۔ اس موقع پر بھی داستان میں ہندوستانی تہذیب نظر آتی ہے، اگرچہ سلطان مہدی کا انتقال افریقہ میں ۳۲۲ ہجری میں ہوتا ہے لیکن موت پر بھی مغلوں کا ہندوستان نظر آتا ہے ؎۔

---

[1] ہمایوں نامہ۔ ص ۲۹، [2] ص ۹۰، ج ۹م، [3] ص ۱۲:۶۸۷، [4] تزک جہانگیری۔ ص ۳۱،

"القصہ بارہویں ربیع الاول سنہ ۳۲۲ھ میں سلطان کا حال متغیر ہوا اور شب جمعہ کو آخر شب دعائے عدیلہ و دعائے ماثورہ وغیرہ پڑھ کے اور خواتین اور فرزندوں کو گواہ کر کے کلمہ طیبہ پڑھا اور عالم وصال کو رحلت کی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ——— شاہزادوں اور پہلوانوں نے گریباں چاک کیے اور سر پر خاک ڈالی، خواتین نے گیسوان مشکیں پریشان کیے اور گھوڑوں کی دم و یال کاٹی اور نقاروں کو چاک ——— کیا غرضکہ لشکر سلطان اور شہر مہدیہ میں عجب قیامت آشکارہ ہوئی ہے[1]"

یہی کیفیت صاحبقران اکبر معزالدین کے انتقال پر ہوتی ہے تمام شہر میں ماتم برپا ہوتا ہے، رونے کی آوازیں فلک تک جاتی تھیں[2] بلکہ سب کی موت پر کچھ کم کچھ زیادہ یہی حال ہوتا ہے۔

کچھ دیر بعد میت کو غسل کرایا جاتا ہے، کفن وغیرہ پہنا کر قبرستان لے جاتے ہیں اور نماز جنازہ کے بعد میت کو قبر کے اندر دفن کر دیتے ہیں۔ حاضرین میں سے سبھی قبر پر مٹی ڈالتے ہیں، پھر فاتحہ پڑھتے ہیں، اور اپنے اپنے گھروں کو لوٹ آتے ہیں جنازے کے ساتھ ساتھ تقریباً سبھی اعزا و اقربا، قبرستان تک جاتے ہیں۔

بادشاہوں میں عام طور پر میت کو تابوت میں رکھکر دفن کرتے تھے۔ شاہزادہ معزالدین کی میت بھی تابوت میں رکھکر روضۂ عالیہ میں دفن کی گئی[3]۔ اگر جنازے کو کہیں دور جانا ہوتا ہے تو بادشاہ جنازے کے ساتھ خود قبرستان تک نہیں جاتا بلکہ کچھ دور ساتھ چل کر جلوس جنازہ کو رخصت کر دیتا ہے، شہنشاہ اکبر نے کچھ دور تک اپنی ماں کے جنازے کو کاندھا دیا :۔

"جب جنازہ لے جانے لگے تو شہنشاہ نے بذات خود کچھ دور کاندھا یا حتی کہ مرحومہ کے جنازے کو دہلی کی طرف روانہ کر کے شہنشاہ واپس اپنے محل میں تشریف لے آئے"[4]

داستان میں جب سیدہ خاتون کا انتقال ہوتا ہے تو ایسا ہی کیا جاتا ہے :۔

"آخر یہ مقرر ہوا کہ سیدہ خاتون کو روشن آباد میں اس کے مادر و پدر کے حوالی میں دفن کریں، مہتر شہرہ کو اس خدمت پر مامور کیا اور فوج ہمراہ کر کے سیدہ خاتون کا تابوت روانہ کیا"[5]

جس طرح تعزیت کے لئے تمام احباب مرنے والے کے وارثوں کے پاس آتے ہیں اسی طرح بادشاہ

۱؎ ۹۸۱ ج۲، ۲؎ ۱۰۹۴ ج۴، ۳؎ ایضاً، ۴؎ تزک جہانگیری ص ۳۱، ۵؎ ۶۸۸ ج۱،

کی موت پر دوسرے بادشاہ تعزیتی پیغام بھیجتے ہیں یا خود آتے ھیں[۱]۔

وفات کے تیسرے دن سویم کی فاتحہ ہوتی ہے "اسی دن صبح سویرے قبر پر جاتے ہیں قبر کے گرد ریشمی کپڑے بچھاتے ہیں پھول چڑھاتے ہیں قبر کے قریب قرآن پڑھتے ہیں، جب قرآن ختم ہو جاتا ہے تو لوگوں پر گلاب چھڑکا جاتا ہے پان پیش کئے جاتے ہیں[۲]۔ کھانا پکتا ہے مہمانوں کو کھلایا جاتا ہے، فقرا میں تقسیم ہوتا ہے، سوا لاکھ چنوں پر کلمہ پڑھا جاتا ہے" بوستان" میں ایک مقام پر اس طرح ذکر کیا ہے:۔

"نصیر بن منصور نے اپنے پدر مرحوم کے پہلو میں مہتر ضیا کو دفن کروایا اور رسوم کی فاتحہ میں زر خطیر فقرا اور مساکین کو دیا[۳]"

"بوستان" میں چالیسواں یا دسواں نہیں منایا گیا عام طور پر تین روز تک غم منایا جاتا ہے اسی کو سویم کا نام دیا جاسکتا ہے سلطان مہدی کی موت پر لکھا ہے:۔

"تین روز تک شہر مہدیہ میں بسبب ماتم کسی کو ہوش نہ تھا چالیس روز تک شاہزادے نے سلطان کا ماتم کیا[۴]"

اس بیان میں تین روز کو سویم کی فاتحہ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے اور چالیس روز کو چالیسواں کہا جاسکتا ہے یا ایک اور مقام پر ہے کہ شہر افروز تین روز و شب برادر مقتول کے رنج و ماتم میں گرفتار رہی[۵]۔ خورشید نامہ میں قرآن شریف کی جگہ انجیل پڑھی جاتی ہے:۔

"ہر سہ روز انجیل خوانی قبر پر رہی[۶]"

موت کے وقت کی صرف انہی رسومات کا ذکر داستان میں ملتا ہے ان میں بھی تفصیل کم ہی بیان کی گئی ہے، بادشاہ عموماً اپنی زندگی ہی میں اپنے لئے مقبرہ بنوا لیتے تھے یا ان کے جانشین ان کی قبر پر مقبرہ بنوا دیتے تھے:۔

"سلطان نے ایک فرسخ پر اپنے واسطے مقبرہ بنوایا تھا[۷]"

یا "سلطان کے حکم سے ایک گنبد بزرگ اس کی قبر پر تیار کیا[۸]"

معزالدین نے اپنی زندگی میں اپنی ماں کی قبر کے قریب اپنی قبر کھدوائی تھی[۹] اور اپنے والد سلطان اسمٰعیل کی تربت پر نہایت بلند و وسیع و خوشنما سنگ مرمر کا سفید گنبد بنوایا[۱۰]۔ اکبر نے ہمایوں کا مقبرہ تعمیر کروایا۔

۱؎ ۴۴، ۴ ج ۸م، ۵۴۷ ج ۹م، ۲؎ سفرنامہ ابن بطوطہ ص ۔ قسط ۲، ۳؎ ۹۰ ج ۶، ۴؎ ۶۸۹ ج ۱، ۵؎ ۴۷۷ ج ۵، ۶؎ ۶۸۲ ج ۸م، ۷؎ ۶۸۸ ج ۱، ۸؎ ایضاً، ۹؎ ۴۱۹ ج ۹م، ۱۰؎ ۱۸۰ ج ۹م،

تاج محل شاہ جہاں نے اپنی زندگی میں ممتاز محل کے لئے بنوایا۔ خود اس کی قبر بھی وہیں ہے۔

ہندوؤں میں یہ رسم تھی کہ جب کسی عورت کا شوہر مرجاتا تھا تو وہ عورت بھی اپنے شوہر کے ساتھ آگ میں زندہ جلتی تھی۔ "بوستان" میں ایک جگہ اس رسم کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے :-

"ملکہ تاج افروز نے کہا اے خواہر ہرگاہ زنان ہندوستان زندہ شوہر مردہ کے ساتھ آگ میں جل جاتی ہیں اگر ہم اپنے مطلوبوں کے غلبۂ عشق میں الم مہاجرت میں غریق بحر فنا ہوں گے کیا تعجب کا مقام ہے"[1]

ایک اور رسم رائج تھی کہ اگر شوہر میدان جنگ میں مارا جاتا تو بیوی بھی زہر سے یا خنجر سے خود کو ہلاک کر لیتی تھی اس کو جوہر ہونا کہتے تھے داستان میں ایک قوم ایسی بھی ہے جو اس پر عمل کرتی ہے :-

"ہماری قوم میں یہ رسم قدیم زمانہ سے چلی آئی ہے کہ اگر بیوی کو شوہر کی ہلاکت کی صحت کامل ہو جائے پھر وہ بھی بہ زہر خواہ بہ خنجر ضرور ہلاک ہوگی۔ اسی طرح شوہر بھی بعد مرگ خاتونِ خانہ اسی وقت تمام علایق دنیاوی سے دامن کش ہو جاتا ہے یہاں تک کہ ترک لذات کر دیتا ہے مگر مرگ حرام کا مرتکب نہیں ہوتا"[2]

یہ رسم عام طور پر شوہر کے میدان جنگ میں مارے جانے پر ہندوؤں میں ادا کی جاتی تھی۔ میدان جنگ میں جانے سے قبل شوہر بیوی کو یہ نصیحت کر کے جاتا تھا کہ اگر میں مارا جاؤں تو بھی خود کو ہلاک کر لینا۔[3]

---

[1] ۱۷۵ ج ۵، [2] ۱۴۳ ج ۵، [3] ۱۱۳ ج ۵،

(ج)

فنونِ لطیفہ

فنِ تعمیر۔ موسیقی۔ مصوّری۔ فنِ باغ بانی۔

فنِ تعمیر

فنونِ لطیفہ میں فنِ تعمیر بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ابتدائے زمانہ سے اب تک اس فن میں نئے نئے تجربات ہوئے ہیں۔ معماروں نے کارگیری کے جوہر دکھائے ہیں اور بادشاہوں نے اپنے ذوقِ فنِ تعمیر کا اظہار کیا ہے۔ عمارتیں بادشاہوں کی عظمت و جلال کی نشاندہی کرتی ہیں۔ عالی شان عمارتوں کو دیکھ کر ہر شخص مسحور اور مرعوب ہو جاتا ہے۔ ابوالفضل نے لکھا ہے کہ "اگر بلند عمارتیں نہ ہوں تو ملک میں کسی طرح کی ترقی ورونق نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ بادشاہ بے حد شاندار عمارتیں تعمیر کرانے میں اپنے دل ودماغ کی عظیم الشان قوت کو عملی جامہ پہنا کر دنیا میں رونما کرتا ہے"[1]

اونچی، مستحکم اور خوبصورت عمارتیں شہر اور ملک کے حسن اور دلکشی میں اضافہ کرتی ہیں۔ غیر ملکی سیاح اول انھیں سے متاثر ہوتے ہیں۔ برنیر نے تاج محل کو دیکھکر اس کے بارے میں لکھا تھا کہ :-

"کوئی جگہ اس میں ایسی نہیں جو بدنما ہو ہر ایک مقام نہایت خوشنما اور ایسا ہے کہ آنکھیں دیکھنے سے سیر نہیں ہوتیں"[2]

عمارتوں کو دیکھ کر اس قوم اور اس عہد کے تہذیب وتمدن کا پتہ چلتا ہے جس میں وہ عمارت بنی تھی، ہر ملک اور ہر قوم کی عمارتیں اپنی انفرادی خصوصیات رکھتی ہیں۔ مسلمان ہندوستان آئے اور یہاں عمارتیں بنوائیں۔ لیکن یہاں تعمیر ہونے والے قلعے تو دیگر مسجدیں بھی اس طرز کی نہیں بنیں جس انداز سے اسلام کی پہلی مسجد یعنی مسجد نبوی بنی ہوئی تھی بلکہ یہاں کے مسلمانوں کی عمارتوں میں ہندوستان اور ایران کے فنِ تعمیر کے اثرات شامل رہے اور ان پر مقامی اثرات مزید اثرانداز ہوئے۔ دلّی میں مسلمانوں کی پہلی مسجد قوت الاسلام مندر ہی میں ترمیم وتوسیع کر کے بنائی گئی۔ یہاں کی مسجدوں میں ایک ہی بنیادی بات کو مدنظر رکھا گیا کہ ان کا رخ کعبہ کی جانب ہو اسی طرح دوسری عمارتوں میں بھی ہندوستانیت کو ختم نہیں ہونے دیا۔

مسلمانوں کی آمد سے قبل بھی یہاں کے راجاؤں کے بنوائے ہوئے بڑے بڑے قلعے موجود تھے، جب قطب الدین ایبک دہلی کا سلطان ہوا تو اس وقت دھلی میں پرتھوی راج کا بہت عالی شان، طویل وعریض قلعہ موجود تھا۔ قطب الدین، التمش، رضیہ سلطان وغیرہ اسی قلعہ میں رہے۔ بعد میں دوسرے سلاطین نے نئے نئے محلات تعمیر کروائے۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے فنِ تعمیر کی آمیزش سے اس فن میں ایک نیا اسکول قائم ہوا،

---

[1] آئین اکبری جلد اول ص ۳۱۳ ، [2] برنیر ص ۲۰۲ ،

جس میں نہ پوری طرح سے ہندوستانی نقوش تھے اور نہ تمام تر ایرانی اور عربی طرز تھا، کچھ محاسن یہاں کے فن تعمیر سے اخذ کئے گئے اور کچھ تصورات مسلمان اپنے ساتھ لیکر آئے تھے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے فن تعمیر کے فرق کو مولانا عبدالمجید سالک نے یوں ظاہر کیا ہے:۔

> "ہندوؤں کی آرائش اور مسلمانوں کی آرائش میں بڑا فرق ہے، ہندو باریک تفصیلات میں۔۔۔۔ سوہی پھولوں کی پتوں کی باریکیاں پیدا کرتے ہیں لیکن مسلمان اپنی عمارتوں کو رنگ و خط، ابھرواں نقاشی، کاشی کاری اور خطاطی سے آراستہ کرتے ہیں اور کسی حالت میں بھی توازن و اعتدال کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے"[1]

ہندوؤں کی عمارتوں میں جلال کی طرف زیادہ توجہ ہوتی تھی بڑے بڑے قلعے جن کی فصیلیں بہت چوڑی ہوتی تھیں، تعمیر کئے جاتے تھے لیکن ان میں معماروں کی فنکارانہ صلاحیتوں کا اظہار کم ہوتا تھا اس کے مقابلے میں سنگتراش اور بت گری کے فن میں مہارت رکھنے والے اپنے فن کا مظاہرہ زیادہ کامیابی سے کر سکتے تھے۔ کم از کم قدیم مندروں کی حد تک یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے اور ایک تاریخی حقیقت رکھتی ہے۔ مسلمانوں کے آنے کے بعد ان عمارتوں میں جمالیاتی عنصر داخل ہوا۔ پرسی براؤن ہندوستانی عمارتوں میں ترقی کی عدم موجودگی کا سبب یہ بتاتا ہے "کہ ہندو معمار بیرونی دنیا سے الگ تھلگ رہا صدیوں سے ایک ہی طرز کی بھاری بھر کم عمارت تعمیر کرتا رہا اور سنگ تراشی میں اپنے فن کا کمال دکھانے کے باوجود طرز تعمیر کوئی واضح نکھار پیدا نہ کر سکا۔ وہ تعمیر کے سائنسی اصولوں سے بھی واقف نہیں تھا"[2] اس سے کلیتاً اتفاق مشکل ہے اس لئے کہ ایسی عظیم الشان عمارتیں بغیر سائنسی اصولوں کے تعمیر کرنا ناممکن تھا، براؤن دوسرے ممالک کے جدید اصولوں کا سہرا فاتحین کے سر باندھتا ہے، بہر حال یہ سہرا ہندوؤں کے سر رہے یا مسلمانوں کے، اس سے بحث نہیں بلکہ ہم جب مسلمان بادشاہوں کے فن تعمیر پر بات کریں گے تو یہ سوچ کر کہ یہ ہندوستانی فن تعمیر ہے کیونکہ فاتحین نے بھی نہ من و عن ایران کی نقل کی اور نہ ہندوستان کے طرز پر ہی اکتفا کیا۔

بادشاہوں میں یہ روایت رہی ہے کہ ہر بادشاہ نے اپنے لئے الگ محل تعمیر کروایا، وہ غلام خاندان کے سلطان ہوں یا پھر خلجی اور تغلق خاندان کے حکمراں ہوں۔ غیاث الدین تغلق نے تغلق آباد بسایا۔ محمد تغلق نے محمد آباد (عادل آباد) کی بنیاد رکھی، فیروز شاہ تغلق نے فیروز آباد کو آباد کیا۔ اسی طرح سید اور لودھی خاندان کے فرمانرواؤں نے اپنے اپنے محلات تعمیر کروائے مغل خاندان تک پہونچتے پہونچتے تمام فنون لطیفہ ارتقا

---

[1] مسلم ثقافت ہندوستان میں ص ۲۵۶، [2] ماہنامہ "ماہ نو" ثقافت نمبر مئی ۱۹۸۰ء، ص ۱۱۱،

کے نقطہ عروج پر پہونچ گئے۔ مغلوں میں عمارتیں بنوانے کا شوق سلاطینِ ماضیہ کے مقابلہ میں کچھ زیادہ ہی تھا۔ ان کی عمارتوں میں جو جمال اور جلال کا امتزاج نظر آتا ہے وہ ہندوستان کی گذشتہ عمارتوں میں نہیں تھا اس کا سبب یہ بھی تھا کہ مغل اپنے ساتھ ایک ترقی یافتہ تہذیب لے کر آئے، ہندوستان کی خوشگوار اور خوش رنگ آب و ہوا نے اس تہذیب کو اور بھی صیقل کیا جس کے نتائج بڑی لطافت و نفاست کے ساتھ رونما ہوئے، اگر قلعہ آگرہ مغلوں کے جلال کی مثال ہے تو تاج محل ذوقِ جمال کی لاثانی یادگار ہے۔

یوں تو ہندوستان کے مغل بادشاہوں کے شوقِ تعمیر کا اظہار ہمایوں کے بنوائے ہوئے دہلی کے قلعے سے شروع ہو جاتا ہے لیکن ہمایوں کا زمانہ پریشاں حالی اور دشت نوردی میں زیادہ گذرا۔ اس لئے باقاعدہ اس کی ابتدا عہدِ اکبری میں ہوئی۔ اکبر نے بہت سی پر شکوہ عمارتیں آگرہ، فتح پور سیکری وغیرہ میں یادگار چھوڑی ہیں جہانگیر کے دور میں اکبر اور اعتماد الدولہ کے مقبرے تعمیر ہوئے جو فنِ تعمیر کے بے مثال نمونے ہیں۔ شاہ جہاں کو عالی شان عمارتیں بنوانے کا بے پناہ شوق تھا۔ اس کی بنوائی ہوئی عمارتوں میں اکبر کا سا جلال نہیں، بلکہ نزاکت اور لطافت غالب نظر آتی ہے، شاہجہاں حسن پرست تھا، تاج محل جیسی حسین و عظیم عمارت اس کا واضح ثبوت ہے، قلعہ دہلی کے پتھروں کا خاص طرح کا رنگ ہی اس کے ذوقِ جمال کا احساس دلاتا ہے شاہ جہاں کی تعمیرات کے سلسلے میں ایک مورخ نے لکھا ہے :۔

"اگر جملہ تاریخی مواد کا ذخیرہ تلف ہو جاتا اور صرف یہی عمارتیں شاہ جہاں کے عہدِ حکومت کی داستان بیان کرنے کو باقی رہ جاتیں تو بھی ہم کو شبہ نہیں رہ جاتا کہ تاریخ کا سب سے شاندار دور تھا[1]"

مغلوں کے فنِ تعمیر کا عروج اورنگ زیب تک رہا جو مغل خاندان کے عہدِ عروج کا آخری بادشاہ تھا۔ اورنگ زیب کی تعمیرات میں لاہور کی شاہی مسجد اور اورنگ آباد وغیرہ کی تعمیرات شامل ہیں۔ اورنگ زیب کے بعد مغل خاندان کے بادشاہوں کی بنوائی ہوئی عمارتوں میں کوئی قابلِ ذکر نہیں۔ البتہ آزاد صوبوں میں فنِ تعمیر کے کچھ نمونے سامنے آئے۔

انگریزوں کے ہندوستان میں آجانے کے بعد یہاں کی عمارتوں میں یورپین اثرات شامل ہو گئے، "بوستان" میں بھی کہیں کہیں اس کی چھاپ نظر آتی ہے مثلاً :۔

"اور زیرِ مکان اہلِ فرنگ کی صنعت و کاریگری سے چار چرخ کلاں نصب کئے

---

[1] تاریخ شاہ جہاں۔ ڈاکٹر بنارسی پرساد سکسینہ، ص ۲۲۹،

گویا بنیاد مکان خاص ان چرخوں پر رکھی ہے[1]

"بوستان" کی عمارتوں میں صرف اہلِ فرنگ ہی کے اثرات نہیں بلکہ صناعانِ چین کے بنائے بڑے مکانات بھی ہیں:۔

"سمراج دلاور صاحبقران اکبر کو اپنے مکانِ خاص میں کہ نہایت قطع دار تھا کیونکہ
صناعانِ چین کے ہاتھ کا بنا ہوا تھا"[2]

چینی برتنوں کی نقاشی اور آرایش، نقوش میں رنگ آمیزی آج بھی پرکشش اور جاذب توجہ ہے لیکن اس زمانہ میں نگارخانہ چین بہت مشہور تھا، مانی کو چینی نقاش تصور کیا جاتا تھا، اس عہد کے لوگوں کا خیال تھا کہ سب سے زیادہ بہتر نقاش اور صناع اہلِ چین ہیں۔

جس طرح ہر بادشاہ اپنے عہدِ حکومت میں نیا شہر بساتا تھا، اپنے لئے قلعہ تعمیر کرواتا تھا اسی طرح "بوستان" کے سلاطین بھی شہر آباد کرتے ہیں اور قلعے تعمیر کرواتے ہیں۔ سلطان مہدی نے مہدیہ نام کا شہر بسایا اور اسی کو اپنا دار السلطنت قرار دیا[3]۔ قلعہ بنانے کا مقصد خود کو غنیم کے حملوں سے محفوظ رکھنا بھی ہوتا تھا اور شاہانہ شکوہ و جلال کا اظہار بھی۔ مضبوط اور مستحکم قلعے اسی لئے بنائے جاتے تھے، داستان نگار خود لکھتا ہے:۔

"زمانۂ قدیم سے سلاطین عالیجاہ اپنے سرحدی ممالک میں قلعہ ہائے مستحکم اسی واسطے
بناتے ہیں کہ بیکایک فوجِ غنیم مسلط نہ ہو"[4]

یہ مستحکم قلعے عموماً پہاڑیوں پر بنائے جاتے تھے اس سے یہ فائدہ ہوتا تھا کہ دور تک کے لوگ نظر آسکتے تھے اگر کوئی فوج آتی تو وہ دکھائی دے جاتی تھی اور پھر اپنی انفرادیت کو برقرار رکھنے کے لئے بادشاہ سب سے بلندی پر پُر جلال اور پُرشکوہ قلعہ اپنی رہائش کے لئے بنواتا تھا۔ آگرہ کے پاس فتح پور سیکری پہاڑی پر ہی بسا ہوا ہے، شاہ جہاں آباد (موجودہ پرانی دلی) بھی اونچائی پر آباد کیا گیا۔ "بوستان" میں بھی پہاڑیوں پر قلعے تعمیر کروانے کی مثالیں موجود ہیں[5]۔

قلعہ تعمیر کرتے وقت اس بات کا بھی لحاظ رکھا جاتا تھا کہ قلعے کے نزدیک کوئی دریا ہو تاکہ پانی کی پریشانی نہ ہو اور فطری مناظر سے بھی لطف اندوز ہو سکیں، مغلوں کی بہت سی عمارتیں دریائے جمنا کے کنارے بنی ہوئی ہیں۔ آگرہ، فتح پور سیکری اور دھلی کے قلعے اسی دریا کے ساحل پر ہیں۔ "بوستان" کے ایک قلعہ کا ذکر کرتے ہوئے داستان گو کہتا ہے:۔

"قلعہ کے اس طرف دریا ہے"[6]

---

[1] ۲۱۶ ج ۴، [2] ۱۲۷ ج ۹م، [3] ۱۲ ج ۱، [4] ۵۹۷ ج ۴، [5] ۲۹۷ ج ۱، [6] ۲۰۴ ج ۱،

قلعہ کی وسعت اور اس کے اندر بنے محلات کی تعداد اتنی ہوتی تھی کہ اس پر پورے شہر کا گمان ہوتا تھا۔
"بوستان" کے تمام قلعوں کو داستان نگار عالی شان اور عظیم بتاتا ہے لیکن کئی قصرات کا خصوصاً ذکر کیا گیا ہے مثلاً قصر اخضر جو شہر فردوسیہ میں واقع ہے اور ملکہ شمسہ تاجدار زوج صاحبقران اکبر کا مسکن ہے، قصر احمر، قصر النیّرین، قصر زمردنگار، قصر یاقوت نگار، قصر عقیق وغیرہ۔ قصر النیرین کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ پیک خیال تیز رو کسی طرح اس کے انتہائے وسعت کی خبر نہیں لا سکتا اور بلندی اس قدر ہے کہ مرغ تیز پرواز بھی بقوت شہپر منتہائے اوج قصر تک ہرگز نہیں جا سکتا، فراخی صحن کے مقابلہ میں دامنِ حرص بھی کوتاہ ہے، داستان نگار لکھتا ہے :۔

"دروازے اس قصر عالی بنیاد کے غیرت دربائے قصر ارم ہیں اور محرابیں اسی قصر عالی منزلت کی رشک خم ابروئے صنم ہیں، ہر طاق اسی قصر کا طاق ایوان فریدون سے زیادہ تر خوشنما ہے ۔۔۔۔۔ ملایک کو اسی قصر ھمایوں کی دربانی کی آرزو ہے اور حور جناں کو اسی قصر میں مژگان سے جاروب کشی کی روز ازل سے جستجو ہے، فرش اس قصر کا اطلس گردوں سے بہتر ہے ۔۔۔۔"[۱]

قلعۂ دہلی اور قلعۂ آگرہ کو دیکھ کر ایسے ہی خیالات ذہن میں آتے ھیں کہ دور عروج میں ان قلعوں کا بھی یہی عالم رہا ہوگا۔ "بوستان" کے قلعوں کے دروازوں کی اونچائی فتح پور سیکری کے بلند دروازہ کی یاد دلاتی ہے۔

قلعوں کی فصیل کے باہر اور بعض قلعوں میں اندر بھی خندقیں بنی ہوئی تھیں اور ان میں ہمیشہ پانی بھرا رہتا تھا تاکہ کوئی بآسانی قلعہ میں داخل نہ ہو سکے۔ "بوستان" کے قلعوں میں اس بات کا لحاظ رکھا گیا ہے[۲]۔ کافور اخشیدی والی مصر نے جب ابوالحسن کو مع لشکر قلعہ کی جانب آتے دیکھا تو خندق پانی سے بھروا دیا[۳]۔

قلعوں میں خفیہ طور سے نکلنے کے لیے سرنگیں بھی بنائی جاتی تھیں، اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ وقتِ ضرورت بادشاہ شاہی خاندان کے افراد کے ساتھ راہِ فرار اختیار کر سکے۔ "بوستان" کے قلعوں میں بھی سرنگیں موجود ھیں[۴]۔ بادری ایدروس اور ابوعامر طلسم سبج سباع میں سرنگ کی راہ سے جاتے ہیں، ایک غلام شمع مومی لیکر آگے آگے چلتا ہے[۵]۔

مولانا عبدالمجید سالک نے مغلوں کے فنِ تعمیر کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :۔

"دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ان عمارتوں کے گرد باغات لگائے جاتے ہیں۔ مغلوں کے نزدیک اس قسم کی عمارتیں سرو و شمشاد کی قطاروں اور اچھلتے فواروں اور

---

[۱] ۳۶۵ ج ۹م، [۲] ۵۰۵ ج ۱، ۱۹ ج ۳، [۳] ۸۶ ج ۹م، [۴] ۳۴۴ ج ۴، [۵] ۵۸ ج ۳،

گھنے درختوں کے بغیر کچھ معنی نہیں رکھتی تھیں[۱]۔

مولانا نے اسی سلسلے میں فرگوس کا یہ بیان نقل کیا ہے :-

"یہ عمارتیں پکار پکار کر کہتی ہیں کہ جہاں یہ ہوں وہاں لچک، نزاکت، چمک، دمک، فواروں کی پھوار اور مرغانِ خوش الحان کا ہونا لازمی ہے[۲]۔"

"بوستان" کے قلعوں میں بھی گل و ریحان اور شقایق وارغواں سے کوئی قطعہ زمین خالی نظر نہیں آتا درختوں میں اس قدر گلہائے رنگا رنگ اور خوشبودار لگے ہوئے ہیں کہ شاخ و برگ میں ہرگز تمیز نہیں ہوتی[۳]۔ درختوں کی بلندی اور سرکشی کا یہ عالم ہے کہ ان کی شاخیں قلعہ کے باہر سے نظر آتی ہیں[۴]۔ یہاں پائیں باغ بھی ہیں[۵] اور مہتابیاں بھی، جہاں بیٹھ کر بادشاہ اور شاہزادے چاندنی سے لطف اندوز ہوتے ہیں[۶]۔

بعض قلعے ایسے بھی ہیں جو طلا و نقرہ سے بنائے گئے ہیں جن کے اوپر نگاہ نہیں ٹھہر سکتی :-

"کوئی شہر و قلعہ اس کیفیت کا نہ تھا تمام دیواریں خشتِ نقرہ سے اور جواہر بیش بہا کی تحریر، برج دبارہ زمرد و یاقوت یعنی اس سنگ سے بنایا تھا کہ جن کا رنگ مثل یاقوت و زمرد کے تھا[۷]۔"

"شاہزادہ دیکھتا ہے کہ ایک قصر زرنگار وسیع و رفیع ہے اور اس میں چار طرف متعدد حجرے بنے ہوئے ہیں اور ہر حجرہ کی زنجیر و حلقے طلائی ہیں اور وسط میں مکان کے ایک گنبد زرنگار اس قدر مجلاّ و مصیقل واقع ہے کہ نظر قائم نہیں ہو سکتی[۸]۔"

قصر کا مطلاّ اور مجلاّ ہونے کا تصور داستان ہی کی باتیں نہیں ہیں نہ اس کی بنیاد مبالغہ پر ہے بلکہ ہندوستان ہی کے سلاطین کے محل ایسے تھے کہ جن پر نظر نہیں ٹھہرتی تھی، ابن بطوطہ نے تغلق آباد کے محل کے بارے میں لکھا ہے کہ :-

"اس کی اینٹوں پر سونا چڑھا ہوا تھا جس وقت سورج طلوع ہوتا تھا اس کی دمک سے کوئی شخص محل کی طرف نظر جما کر نہیں دیکھ سکتا تھا[۹]۔"

دہلی کے قلعہ معلّیٰ کے دروازہ پر پتھر کے دو ہاتھی کھڑے تھے اس لئے یہ دروازہ ہتیاپول بھی کہلاتا تھا۔ اسی طرح آگرہ کے قلعہ کے دروازے پر ہاتھیوں کے بت بنے ہوئے تھے۔ "بوستان" میں بھی بعض قلعوں کے دروازوں پر پتھر کے ہاتھی موجود ہیں :-

---

۱ مسلم ثقافت ہندوستان میں، ص ۳۷۹، ۲ ایضاً، ۳ ص ۳۶۵ ج ۹م، ۴ ص ۲۵۵ ج ۵، ۵ ص ۱۲۸ ج ۹م، ۶ ص ۲۵۵ ج ۵، ۷ ص ۱۴۶ ج ۱، ۸ ص ۱۲۲ ج ۲، ۹ سفرنامہ ابن بطوطہ، قسط ۳، ص ۱۳۶

"دروازے کے دونوں بازوؤں پر دو فیلانِ مست کی تصویریں بنی ہوئی تھیں"[1]

مسلمانوں کی آمد سے یہاں کی عمارتوں میں محراب، گنبد، لداؤ چھتیں، نصف گنبد والے دوہرے پھاٹک، نقاشی، کاشی کاری، پچیکاری اور خطاطی وغیرہ کا اضافہ ہوا۔ تاج محل اور قلعوں میں نقش و نگار کی بے شمار مثالیں ہیں۔ "بوستان کی عمارتیں بھی منقش نظر آتی ھیں:-

"ہر ایک قصر میں نقش و نگار مینا کار اور مطلا اور مذہب ایسے ہیں کہ عقل کام نہیں کرتی اور یاقوت و زمرد کی وہ پچیکاری ہے کہ گویا قلم سے لکھا ہوا ہے اور بوٹیاں اور پتیاں اور رگیں ایسی ابھری ہوئی ہیں کہ جیسے قدرتی ہوں"[2]

قلعوں کے اندر حوض بھی ہیں[3]۔ نہریں بھی ہیں اور یہ نہریں شہر کے بازاروں سے ہو کر گذرتی ہیں[4]۔ شاہ جہاں آباد میں بھی ایک نہر چاندنی چوک سے گذرتی ہوئی قلعۂ معلّٰی میں جاتی تھی۔

مسلمانوں نے سب سے زیادہ تعداد میں دو طرح کی عمارتیں بنوائیں ایک مقبرے اور دوسرے مساجد۔ مسلمان جہاں بھی گئے اول وہاں مسجدیں تعمیر کروائیں، دہلی میں بڑی بڑی بے شمار مسجدیں بنیں۔ اسی طرح دوسرے شہروں میں بھی مسجدیں تعمیر کی گئیں۔ "بوستان" کے مسلمان شاہزادے بھی جب کسی ملک کو فتح کرتے ہیں، تو سب سے پہلے مساجد و مدارس بنوانے کا حکم دیتے ھیں:-

"روز دویم بہ میمنت و اقبال اور بحشمت و اجلال سواری ہمایوں خاص شہر مہر اقیہ میں داخل ہوئی، صاحبقران نے اسی وقت بت خانوں کے انہدام کا حکم دیا۔ اور مساجد و مدارس تعمیر کروائے"[5]

یہ مساجد قلعوں کی طرح عالی شان اور عظیم بنائی جاتی تھیں۔ دہلی کی جامع مسجد، لاہور کی شاہی مسجد وغیرہ مساجد کے بے مثال نمونے ہیں۔

بلند اور مستحکم عمارتیں بادشاہ کے جلال اور قوت کو بھی ظاہر کرتی ہیں اور شخصی حکومت کا تو مقصد ہی قوت و جلال کا اظہار تھا، اس لئے بادشاہ چاہتا تھا کہ اس کی موت کے بعد بھی لوگ اس کی عظمت کو یاد کرتے رھیں۔ اپنی عظمت کا نشان قایم رکھنے کے لئے اکثر بادشاہوں نے اپنی زندگی ہی میں اپنے لئے عالی شان مقبرے تعمیر کروائے۔ یہاں ضرورت نہیں کہ تاج محل یا ہمایوں اور اکبر کے مقبروں کی مثالوں کو دہرایا جائے۔ "بوستان" میں جس سلطان یا اعلیٰ مرتبت امیر کا انتقال ہوتا ہے اس کی گور پر مقبرہ تعمیر کروایا جاتا ہے، مہر شمیم کے مزار پر بھی

۱؎ ۱۴۲ ج ۹م، ۲؎ ۱۴۹ ج ۹م، ۳؎ ۳۴۴ ج ۲، ۴؎ ۳۲۳ ج ۲، ۵؎ ۲۱۱ ج ۴،

گنبدِ عالیشان بنوایا گیا[1]۔ جب سلطان اسمٰعیل کا انتقال ہوا تو شاہزادہ معزالدین نے سنگِ مرمر کا نہایت وسیع و بلند و خوشنما گنبد تعمیر کروایا[2]۔

ایک قصہ مشہور ہے کہ جب تاج محل بن چکا تو اس معمار سے شاہجہاں نے دریافت کیا کہ کیا اس سے اچھا بھی بن سکتا ہے جب جواب ہاں میں ملا تو معمار کے ہاتھ قلم کروا دیئے گئے تاکہ دوبارہ نہ بنا سکے۔ بہرحال یہ قصہ صحیح ہے یا غلط اس سے بحث نہیں لیکن "بوستان" میں یہ قصہ ایک جگہ ضرور آگیا ہے جب عمارت بن کر مکمل ہو جاتی ہے تو بادشاہ معمار سے کہتا ہے کہ :-

"اس کیفیت کا یہ مکان جنت نشاں تو نے بنایا ہے کہ دونوں ہاتھ تیرے قلم کروانے کے لائق ہیں"[3]

غرضیکہ اس مطالعہ سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ "بوستان" کی عمارتیں ان عمارتوں سے مختلف نہیں، جو بادشاہانِ ہند بنوا چکے ہیں بلکہ انھیں کا پرتو ہیں۔

موسیقی

موسیقی فنونِ لطیفہ اور سوسائٹی کا بڑا اہم حصہ رہی ہے، ہندوستان میں موسیقی کی تاریخ ہندوستان کی تاریخ کی طرح قدیم ہے۔ یہاں کے دیوی دیوتاؤں کا موسیقی سے بڑا گہرا تعلق تھا، یہاں کے مندروں میں رقص ہوتا تھا، بھجن گائے جاتے تھے، رقص و نغمے سے دیوتاؤں کو خوش کیا جاتا تھا، مسلمان جب ہندوستان آئے تو ہندوستان کی کلاسیکل موسیقی کو اور بھی ترقی ہوئی۔ ہمیں اس بات سے بحث نہیں کہ اسلام میں رقص و سرود کو جائز سمجھا جاتا تھا یا نہیں لیکن اس بات کی وضاحت لازمی ہے کہ موسیقی کو مسلمانوں کے عہد میں بڑے ہموار اور نئے راستے ملے، خلفائے بغداد کو خواہ دولت و عظمت نے رقص و سرود کی طرف رغبت دلائی ہو یا عجمی اثرات کے نتائج ہوں، لیکن اس میں دو رائے نہیں کہ وہ بھی ہندوستان کے بادشاہوں اور راجاؤں کی طرح رقص و موسیقی کے شائق تھے۔ ہارون رشید کے دربار سے ابراہیم اور اسحاق جیسے گانے والے وابستہ تھے، خلیفہ عبدالرحمٰن نے باقاعدہ موسیقی کے لئے ایک مدرسہ کھلوایا تھا۔

ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں اور عوام میں ہر زمانہ میں موسیقی کا شوق رہا ہے، بلکہ یہاں کی موسیقی کو نیا انداز اور نئے ساز دینے والے مسلمان ہی تھے۔ سلاطینِ دہلی کے زمانہ میں امیر خسروؒ نے موسیقی میں خاص مہارت

---

[1] ۵۰ ج ۴، [2] ۸۰ ج ۹م، [3] ۳۴۸ ج ۲۔

حاصل کی۔ بہت سے راگ اور آلاتِ موسیقی انھیں کے ایجاد کیے ہوئے ہیں کئی سلطانوں کے دربار سے ان کا تعلق رہا۔ حضرت نظام الدینؒ کی خانقاہ سے حضرت امیرؒ کی وابستگی مشہور ہے انھوں نے قوالی کو بھی فروغ دیا، قوالی خانقاہوں کا حصہ باقاعدہ طور سے انھیں کے زمانہ سے بنی صوفیا اور فقراء کی محفل قوالی کے بغیر بے رونق سمجھی جاتی تھی۔ حضرت بختیار کاکیؒ کا وصال ایک قوال کی زبان سے شعر سننے کے بعد وجد کی کیفیت میں ہوا۔ قوالی سے متعلق علامہ اقبالؒ نے کہا تھا "ہندی موسیقی نے مشرف باسلام ہو کر قوالی کی صورت اختیار کی ہے۔ قوالی ہماری موسیقی کا نہایت نادر، دلکش اور قابلِ فخر اسلوب ہے"[۱]۔ صوفیا میں قوالی کی طرف اس قدر رغبت دیکھ کر ہندوستان کے مسلم سلاطین نے قوالی کے ساتھ ساتھ دوسری طرح کی موسیقی میں بھی دلچسپی لینا شروع کی اور علماء کی مخالفت کے باوجود درباروں میں موسیقاروں کو ملازم رکھنے لگے، رکن الدین، بلبن، علاؤالدین خلجی وغیرہ کے دربار میں موسیقی کے سینکڑوں فنکار تھے، محمد بن تغلق کے دربار میں دو ہزار سے زیادہ قوال موجود تھے[۲]۔ اسی طرح اور سلاطین موسیقی میں دلچسپی رکھتے تھے۔

مغلوں کے عہد میں جہاں اور فنون کو ترقی حاصل ہوئی، وہاں موسیقی نے بھی بہت زیادہ مقبولیت اور عروج حاصل کیا۔ بابر سے لیکر بہادر شاہ ظفر تک سبھی بادشاہ رقص و نغمہ کے دلدادہ تھے اور ماہرین فن کی قدر کرتے تھے، ابوالفضل اکبر کے شوق موسیقی کے بارے میں لکھتا ہے کہ:۔

"قبلہ عالم اس فن پر خاص توجہ فرماتے ہیں اور ہر موسیقی داں کے سرپرست ہیں مربی ہیں۔ بے شمار ہندی و ایرانی و تورانی و کشمیری نغمہ پرداز بارگاہ عالی میں جمع ہیں"[۳]۔

تان سین، بابا رام داس، سبحان خاں، میاں چاند، باز بہادر وغیرہ جیسے ماہرین موسیقی اس کے دربار سے وابستہ تھے، میاں تان سین کے بارے میں ابوالفضل کی رائے ہے کہ گزشتہ ایک ہزار سال سے ہندوستان میں ایسا باکمال گویا پیدا نہیں ہوا، اکبر جب بیمار ہوا تو اس نے تان سین کو بلوا کر اس سے گانا سنا[۴]۔

جہانگیر بھی اکبر ہی کی طرح بلکہ اکبر سے زیادہ موسیقی کا عاشق تھا، اس کے دربار میں حافظ ناد علی، کیب فتحا، جہانگیر دار، چتر خاں، پرواز دار، خرم دار، ماکھو اور حمزہ جیسے موسیقار موجود تھے[۵] موسیقاروں کی قدر دانی کی مثالیں اس کی تزک میں بھی ملتی ہیں، ایک جگہ لکھتا ہے :۔

۱۔ بحوالہ مسلم ثقافت ہندوستان میں ص ۴۱۲، ۲۔ محمد شاہ بن تغلق ص ۲۲۸، ۳۔ آئین اکبری جلد اول ص ۵۳۷
۴۔ تزک جہانگیری ص ۳۱۰، ۵۔ مغل تہذیب، ص ۷۴۔

"چند روز پیشتر میرے طلب کرنے پر خرم نے ایک فنکار استاد محمد نامی کو میری خدمت میں بھیجا تھا میں نے کئی محفلوں میں اس سے گانا سنا تھا اس نے میرے نام پر ایک غزل بھی بنائی تھی ۱۲ ماہ مذکور کو میں نے اسے روپیوں سے تلوایا اور تلی ہوئی رقم چھ ہزار تین سو روپے ہوئی میں نے اسے ایک ہاتھی بمعہ ہودہ عنایت کرتے ہوئے حکم دیا کہ وہ اس ہاتھی پر سوار ہو کر روپیہ اپنے گھر لے جائے"[1]

شاہ جہاں نہ صرف خود اچھا گا لیتا تھا بلکہ ماہرین فن موسیقی کی بے حد قدر کرتا تھا، اس نے ایک مرتبہ موسیقار جگنناتھ اور لال کو چاندی میں تلوا کر وہ چاندی انھیں عطا کی[2]

مغلوں کے آخری صاحب شان و شوکت بادشاہ محمد شاہ کا زمانہ موسیقی کے لئے اہم دور رہا ہے، اس کے دربار میں بڑے بڑے باکمال استادان فن موسیقی موجود تھے۔ مرقع دہلی میں ان کے کچھ نام ملتے ہیں، مثلاً نعمت خاں، تاج خاں، گھاسی رام پکھاوجی، غلام محمد سارنگی نواز، رحیم تان سین، استاد رحیم خاں ڈھولک نواز، حسین خاں ڈھولک نواز، شہباز دھمدھی نواز، شاہ درویش سبوچہ نواز وغیرہ ان کے علاوہ سدا رنگ اور ادا رنگ دو بین نواز تھے، انھوں نے خیال کی گائیکی کو اس قدر مرغوب بنا دیا کہ دھرپد کا رنگ پھیکا پڑ گیا ان کے راگ اب تک مستند مانے جاتے ہیں۔

"بوستان خیال" کا زمانہ محمد شاہ موسیقی نواز ہی کا زمانہ تھا اس لئے اس میں جگہ جگہ رقص و سرود کی محفلیں آراستہ نظر آتی ہیں۔ یہاں بھی ارباب نشاط کو بلا کر ساز بجانے اور سُر ملانے کا حکم دیا جاتا ہے[3] اور جب محفل طرب آراستہ ہو جاتی تو کہیں سے دف[4] اور دائرہ[5] کی آوازیں آتی ہیں کوئی دہل[6] اور طبل[7] بجاتا ہے، ایک طرف قانون[8]، نقارہ[9]، نوبت[10] اور قرنا[11] بجتا ہے۔ دوسری جانب نے[12]، ناہی[13] اور سرنائی[14] بجتی ہوئی سنائی دیتی ہے، بعض سازندے طبلہ[15]، شہنا[16]، کوس[17] اور ساز ہندی[18] بجانے میں مصروف ہیں، کچھ ساز نواز رباب[19]، چنگ[20]، بین[21] اور ارغنون[22] بجا کر سامعین کو محظوظ کرتے ہیں اور کچھ طنبورہ[23]، ستار[24]، بربط[25] اور بوق[26] سے سننے والوں کو مسحور کر رہے ہیں، کوئی چوتارا[27] ہاتھ میں لے کر غزل گاتا ہے اور کوئی ڈھول[28]، سارنگی[29]، مردنگ[30] اور تبنک[31] بجاتا ہے۔

---

[1] تزک جہانگیری، ص ۲۱۹، [2] مسلم ثقافت ہندوستان میں، ص ۴۲۱، [3] ۲۴۲ ج ۴، [4] ۹۳ ج ۲، [5] ایضاً، [6] ۱۰۹ ج ۲، [7] ۵۹ ج ۲، [8] ۹۳ ج ۲، [9] و [10] ۱۰۹ ج ۲، [11] ۲۳۸ ج ۲، [12] ۶۷ ج ۴، [13] ۳۸ ج ۲، [14] ۲۳۸ ج ۲، [15] ۱۷۵ ج ۲، [16] ۴۰۰ ج ۴م، [17] ۳۸ ج ۲، [18] ۲۶۰ ج ۲، [19] ۳۲۳ ج ۲، [20] و [21] ۹۳ ج ۲، [22] ۹۳ ج ۲، [23] ۳۷۷ ج ۳، [24] ۲۲۸ ج ۴، [25] ۹۳ ج ۲، [26] ۹۰ ج ۴م، [27] ۹۸۲ ج ۶م، [28] ۹۸۵ ج ۶م، [29] ۹۸۴ ج ۶م، [30] ایضاً، [31] ۹۸۵ ج ۶م،

محفلِ موسیقی میں بادشاہ، شاہزادے، امرا اور اہلِ حرم اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھتے ہیں :-

"ایک طرف ملک ظفر نوش اور اس کے امرا اور ایک طرف اقوال کوہ کن اور ایک
طرف شاہزادہ وابرق جنی وغیرہ اور ایک جانب پردۂ زنبوری میں ملکہ روح
بخش اور اس کی مادر وبرق نگاہ پری وغیرہ بیٹھیں"[1]

محفل میں مغنیان خوش آواز کے علاوہ استادانِ فن یعنی استاد ارغنون نے نواز[2]، استاد ضبوط[3]، استاد بربط نواز[4]، استاد قانون[5]، استاد موسیقار[6]، استاد بے مثل[7]، استاد غیر مکرر[8]، استاد بے مانند قانون نواز[9]، استاد دل نواز[10] اور کلاونت بھی اپنے فنی جوہر دکھانے کے لئے موجود ہیں اور جب موسیقی کے تار چھیڑے جاتے ہیں تو کوئی سرود سے محفل کو مست بناتا ہے[12]، کوئی دیپک راگ گاتا ہے[13]، کوئی جنگلا اور بھیرویں سے سامعین کو عالم سرور وانبساط میں پہونچاتا ہے[14]۔ راگوں کی تاثیر سے ابر اٹھکر برسنے لگتا ہے، مرغانِ چمن اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ پتھروں سے پانی ٹپکنے لگتا ہے، صاحبقرانِ اکبر کی شادی کے موقع پر ماہرین علم موسیقی نے ایسا راگ گایا کہ ابر اٹھا اور پانی برسنے لگا[15]۔ ملکہ روح بخش نے جب چنگ بجایا اور گایا تو تمام مرغانِ باغ اس کے گرد اکٹھے ہو گئے[16] اور جب شاہزادہ اسمعیل نے نغمہ سازی شروع کی تو بلور سے پانی ٹپکنے لگا[17]۔

پیشتر ہم نے ہندوستان کے بادشاہوں کی موسیقی سے دلچسپی کی چند مثالیں پیش کی ہیں اسی طرح "بوستان" کے بادشاہ، شاہزادے اور شاہزادیاں موسیقی میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ ہر بادشاہ کی سرکار میں سینکڑوں کی تعداد میں ناچنے اور گانے والے موجود ہیں، ہر محفل نشاط میں رقاصاؤں کے گھنگھروؤں کی جھنکار سنائی دیتی ہے، مغنیانِ خوش گلو کے نغموں سے فضا نغمہ زار ہوتی ہے تقاریب کے موقعوں پر ارباب نشاط کے طائفوں کا کوئی شمار نہیں ہوتا[18]۔ صاحبقرانِ اکبر کی کتخدائی کے وقت مطربانِ خوش آواز ہر طرف پھیلے ہوئے تھے، ہر شخص رقص و نغمے سے لطف اندوز ہو رہا تھا[19]۔ نہ صرف مرد بلکہ حرم سرا کی خواتین بھی رقص و نغمہ سے محظوظ ہو رہی تھیں:-

"خواتینِ بزمِ رقص دیکھکر اور گانا سن کر ایسی محو تھیں کہ گویا بالکل ہوش نہ تھا مثل
بادہ خواروں کے جھوم رہی تھیں ہر ساز کی آواز دلِ ناساز کو ایسی مسرت و فرحت
دیتی تھیں کہ اثر ناسازی زائل ہو جاتا تھا ۔۔۔۔ آوازِ نغمہ نازنینانِ پری زاد
سے ہر دلِ اہلِ بزم کو سرور حاصل تھا"[20]

---

[1] ۵۲۹ ج ۱، [2] ۵۲۱ ج ۱، [3] ۵۲۲ ج ۱، [4] و [5] ایضاً، [6] ایضاً، [7] و [8] ۲۲۸ ج ۴، [9] ۲۳۲ ج ۴، [10] ۱۸۹ ج ۴، [11] ۳۲۰ ج ۴، [12] ۲۳۵ ج ۱، [13] ۴۰۰ ج ۴، [14] ایضاً، [15] ایضاً، [16] ۵۲ ج ۴، [17] ۵۳۰ ج ۴، [18] ۵۹۰ ج ۴، [19] ۴۰۰ ج ۴، [20] ۳۹۶ ج ۴، ۹۴ م

"چند شب خواتین محل کے روبرو گائی تھی اور وہاں انعام معقول ملا تھا۔"[۱]

ملکہ روح بخش نے تو اپنی شادی کے لئے شرط ہی یہ رکھی تھی کہ جو کوئی اس سے اچھا گائے گا وہ اسی سے شادی کرے گی[۲]

داستانوں کی طوالت کا دارومدار ہی بزم اور رزم کے بیان پر ہوتا ہے یعنی رزم سے ہٹ کر جو ذکر ہوتا ہے اس میں شراب چھلکتی ہے، پائلیں بجتی ہیں، ساز جھنجھناتے ہیں، نغمے لہراتے ہیں، ماحول مست و سرشار ہوتا ہے اور سامعین ماحول کو مست و سرشار بنانے کے صلے میں انعام واکرام سے فنکاروں کو نوازتے ہیں۔ موسیقی کا شوق اور اس پر بے شمار انعام یعنی دولت لٹانے کی مثال "بوستان" میں اس جگہ ملتی ہے جہاں مہتر توفیق بفنِ عیاری استاد بے مانند قانون نواز بن کر صاحبقران اصغر اور امرا کی محفل میں آتا ہے، ہر تعریف پر زر نقد وصول کرتا ہے یہاں تک کہ ان کے بدن کے کپڑے بھی انعام میں حاصل کر لیتا ہے[۳]۔

رقص اور موسیقی کا بہت قریبی تعلق رہا ہے طبلہ کی تھاپ اور تاروں کی جھنکار پر رقاصہ کے بدن کے اعضا تھرکتے ہیں ہندوستان کے کلاسیکل رقص میں مرد اور عورت دونوں ہی رقص کرتے رہے ہیں بلکہ اس میں مہارت رکھنے والے عموماً مرد ہی ہوتے تھے۔ "بوستان" میں کہیں کوئی عیار تو زنانہ لباس پہن کر رقص کرتا ہوا نظر آتا ہے باقاعدہ کوئی مرد کسی محفلِ نشاط میں رقص نہیں کرتا۔ صرف رقاصائیں ہی ہر بزم میں رقص کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ موسیقی میں مہارت رکھنے والے ہندوستان اور ایران ہی کے لوگ تھے، انھیں ممالک میں یہ فن پروان چڑھا اور عروج پر پہونچا اور یہاں کے لوگ بھی اس فن کی قدر کرتے تھے اسی لئے اس نے ایک جگہ لکھا ہے کہ :۔

"مہتر ضیا نصیر کا استاد معلم فنِ موسیقی میں سرآمد روزگار تھا اس نے زمانہ دراز تک استادانِ ہندوستان و ایران وغیرہ ممالک و بلاد میں اس علم ذخار کی تعلیم پائی تھی"[۴]

ہندوستان میں رائج بہت سے آلاتِ موسیقی مسلمانوں کی ایجاد ہیں کچھ وہ اپنے ساتھ لائے اور کچھ یہاں کی موسیقی سے متاثر ہو کر بنا لیے ہندوستان میں صوفیا کی محفل میں بھی موسیقی کو فروغ حاصل ہوا۔ قوالی ہندوستان کے ہر شہر میں گائی جاتی تھی اور آج بھی گائی جاتی ہے۔ "بوستان" میں بھی درویشوں کی خانقاہوں میں ایسے قوال موجود ہیں[۵] جن کی غزل سرائی کے اثر سے درویشوں پر عالمِ وجد طاری ہو جاتا ہے۔

جن مجالس میں فنِ موسیقی سے دلچسپی رکھنے والے موجود ہوتے ہیں وہاں مرد موسیقار ہی اپنے فن کا

---

[۱] ص ۳۴۶ ج ۴، [۲] ص ۵۲۷ ج ۱، [۳] ص ۳۴۳ — ۲۲۸ ج ۴، [۴] ص ۹۲ ج ۶، [۵] ص ۴۰۲ ج ۲،

مظاہرہ کرتے ہیں اور جہاں موسیقی تفریح و انبساط، عیش و نشاط کے لیئے سنی جاتی ہے، وہاں عموماً گانے والی عورتیں ہیں جو رقص میں بھی مہارت رکھتی ہیں۔ جشن وغیرہ کے موقعوں پر رقاصاؤں کے ہی گھنگھرو اور نغمے محفل میں قوس و قزح کے رنگ بھرتے ہیں۔ صاحبقران اکبر کی کتخدائی کے موقع پر اس درجہ مغنیان خوش آواز و مطربان خوش گلو معین ہیں۔۔۔۔ مردمانِ بازاری وغیرہ بخوشی خاطر گانا سنتے ہیں اور ناچ دیکھتے ہیں"[1]

ناچ کا یہ مشغلہ طوائفوں کا بھی ہوتا تھا لیکن داستان نگار نے شاہزادوں کی بزم میں رقص و نغمہ کرنے والوں کو اربابِ نشاط[2] کا نام دیا ہے، یہ نام بھی محض تخیل کی اُپج نہیں بلکہ دلی اور لکھنؤ وغیرہ کے درباروں سے وابستہ اہلِ طرب کو بھی ارباب نشاط ہی کہا جاتا تھا۔

غرضکہ رقص و نغمہ کے جو جلوے ایرانی دربار، ہندوستانی راجاؤں اور مغل بادشاہوں کے دربار میں نظر آتے تھے وہی "بوستانِ خیال" میں بکھرے ہوئے ہیں بلکہ کہنا چاہیئے کہ ان محفلوں کا کچھ آنکھوں دیکھا اور کچھ کانوں سنا حال داستان میں شامل کر دیا۔

مُصوّری

"بوستان خیال" میں مصوری کے نہ کسی اسکول کا ذکر ہے اور نہ ہی باقاعدہ کہیں فنِ مصوّری کا تذکرہ۔ البتہ کہیں کہیں شاہزادوں اور شاہزادیوں کی تصویریں دکھائی دیتی ہیں یا کوئی سوداگر تصویر فروش۔ تصویروں کی نمائش کرتا ہوا نظر آتا ہے لیکن ان چند مثالوں سے ہی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ماضی میں مصوری یا شبیہ نگاری سے کس قدر دلچسپی تھی، ہندوستان میں موسیقی کی طرح تصویر نگاری کی روایت بھی زمانۂ قدیم سے وابستہ ہے۔ بت پرستی کی بنیاد ہی مصوری پر ہے، دیوی یا دیوتاؤں کی تصویر بنانے کے بعد ہی ان کی پرستش کی جاتی تھی۔

مسلمانوں کی آمد سے قبل ہندوستان میں جانوروں کی کھالوں، بھوج پتروں اور دیواروں پر تصویریں بنائی جاتی تھیں۔ دیواروں پر تصویر کشی کی مثالیں اجنتا اور ایلورا کی گپھاؤں میں موجود ہیں۔ مسلمانوں کے دور میں بھی دیواروں پر تصویریں بنانے کا رواج رہا۔ انھوں نے محلوں کی دیواروں پر تصویریں بنوائیں۔ اسلام میں کیونکہ تصویر کشی کو جائز قرار نہیں دیا گیا ہے اس لئے فیروز شاہ تغلق نے محلوں کی

---

[1] ۱۳۴ ج ۹ م، [2] ۳۶۳ ج ۹ م،

دیواروں پر جانداروں کی تصاویر بنانے کو ممنوع قرار دیا اور حکم دیا کہ ان کی جگہ باغات وغیرہ کی تصویریں بنائی جائیں۔[1] اس دور میں پھول پتیوں کی تصاویر زیادہ بنائی گئیں۔ مصوری میں باغات وغیرہ کو رواج دینے کے علاوہ مسلمانوں نے ہندوستانی مصوروں کو کاغذ سے روشناس کرایا، ہندوستان میں کاغذ کی درآمد مسلمانوں ہی نے شروع کی۔ پرسی براؤن نے لکھا ہے کہ :-

"ہندوستان میں پندرہویں صدی تک لوگ کاغذ کے استعمال سے ناواقف تھے۔ بجز ان گجراتی تاجروں کے جو مغربی ساحل پر آباد تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مغلوں کے دور حکومت میں جب باضابطہ سرکاری اور بعد میں عام استعمال میں آیا، تو پھر ہر طبقے میں مقبول ہو گیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کاغذ پر تصویریں کثرت سے بنائی جانے لگیں"[2]

کاغذ اور مغلوں کے ساتھ آئے فنِ مصوری کے ایرانی تصورات نے ہندوستانی مصوری میں ایک انقلاب لا دیا اور یہاں ایک مصوری کے نئے اسکول نے جنم لیا، جو مغل اسکول کے نام سے مشہور ہوا جس میں اجنتا اور ایلورا کی شبیہہ سازی کو ایرانی تزئین کاری سے آراستہ کیا اور یہاں بھی Maniature paintings یا میناتور مصوری کو رواج دیا۔ اس سے قبل عموماً دیواروں اور کھجور کے پتوں ہی پر تصویریں بنائی جاتی تھیں۔ بقول پرسی براؤن ہمایوں اور اکبر نے میناتور مصوری کو ایران سے لاکر ہندوستان میں روشناس کرایا۔[3]

ہندوستانی مغلیہ خاندان کو علوم و فنون سے دلچسپی اپنے اجداد سے ورثہ میں ملی تھی، تیمور تمام فنون کے فنکاروں کی قدر کرتا تھا، مصوری میں دبستان سمرقند کی بنیاد اسی کے عہد میں پڑی اس کے بیٹے شاہ رخ کو مصوری سے بہت زیادہ لگاؤ تھا اس نے اپنے عہد کے بیشتر مشہور مصوروں کو اپنے دربار میں بلا رکھا تھا، سلطان حسین مرزا کا نام مصوری کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتا ہے، اس کے عہد میں بہزاد جیسا ایشیا کا باکمال مصور پیدا ہوا جس کے فن کی خوبصورتی کو اہلِ مغرب و مشرق سبھی نے تسلیم کیا ہے۔ پرسی براؤن لکھتا ہے کہ :-

"یورپی مصوری میں جو درجہ رفائل کا تھا ایشیا کی مصوری میں وہی درجہ بہزاد کا ہے"[4]

بابر نے اپنی تزک میں بہزاد کے فن کی بڑی تعریف کی ہے، بہزاد نے ایرانی علم مصوری میں شبیہہ سازی

---

[1] مسلم ثقافت ہندوستان میں۔ ص ۳۸۲ [2] ہندوستانی مصوری از پرسی براؤن ص ۳۱ [3] ایضاً ص ۲۸،
[4] ہندوستانی مصوری۔ ص ۵۱،

کے بے مثال نمونے پیش کئے اور بعد کے مصورین کے لئے شبیہہ سازی کے اصول مرتب کئے۔

ایشیا کی مصوری میں شبیہہ سازی کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے اور اس کے عروج کا دور ہندوستانی مغلوں کا دور کہا جا سکتا ہے مغلوں کو اپنی تصویریں بنوانے کا بے حد شوق تھا۔ اکبر نے نہ صرف اپنی تصویریں بنوائیں بلکہ اقلیم کی عظیم المرتبت شخصیتوں کو تصویروں میں محفوظ کرنے کے لئے سب کی تصویریں تیار کروائیں اسے مصوری سے بیحد دلچسپی تھی مصوری کے سلسلے میں ابو الفضل نے اکبر کا یہ قول نقل کیا ہے :-

"ایک روز قبلہ عالم نے خلوت کدے میں جہاں مریدانِ سعادت مند کا مجمع تھا فرمایا کہ ایک گروہ فنِ تصویر کا دشمن ہے اور اس پیشے کو معائب بیان کرتا ہے لیکن ان اقوال و دلائل کو دل قبول نہیں کرتا بلکہ قرین قیاس عقل یہ ہے کہ مصور اکثر طبقات انسانی سے زیادہ خدا شناس ہو سکتا ہے اس لئے کہ یہ شخص جانور کی تصویر اتارنے میں اس کے ہر عضو کی شبیہہ کھینچتا ہے اور تصویر کو تمام کر کے جب یہ دیکھتا ہے کہ باوجود اس ظاہری سحر نگاری کے وہ اس میں روح پھونکنے سے عاجز ہے تو اس کو خالق مطلق کی قدرت کاملہ کا اندازہ ہوتا ہے اور صانع باکمال کے آگے سر بسجدہ ہو جاتا ہے [۱۵]"

جہانگیر اکبر سے بھی زیادہ مصوری کا دلدادہ تھا اسے تصویریں بنوانے کا بہت شوق تھا وہ لوگوں کو اپنی تصویریں بطور تحفہ پیش کیا کرتا تھا۔ اس کے زمانہ میں شبیہہ سازی بہت مقبول ہوئی مغل بادشاہوں میں سب سے زیادہ تصویریں جہانگیر ہی کی ملتی ہیں۔ شاہ جہاں کا دور جہاں اور فنون لطیفہ کے لئے زریں دور رہا اسی طرح فنِ مصوری نے بھی اس کے دور میں انتہائی ترقی کی، بادشاہ خود اس فن میں دلچسپی لیتا تھا اور اس فن کے ماہرین کی ہمت افزائی کرتا تھا، فقیر اللہ خاں اور ہاشم اس دور کے مشہور مصور تھے۔ اس عہد تک آتے آتے مغل اسکول سے ایرانی اثرات کا غلبہ کم ہوتا چلا گیا اس میں ہندوستانی مصوری کے اثرات کی آمیزش سے ایک منفرد اسکول بن گیا۔

مغل دبستانِ مصوری کی اہم خصوصیت شبیہہ سازی کی مثالیں "بوستان" میں نظر آتی ہیں۔ صاحبقران اکبر کی داستان کی ابتدا ہی ملکہ شمسہ تاجدار کے ورقِ تصویر کو دیکھنے کے بعد شروع ہوتی ہے اور جب طلسم اجرام و اجسام میں ملکہ نوبہار گلشن افروز سے شاہزادہ معزالدین کی ملاقات ہوتی ہے تو وہ بطور یادگار

---

۱۵ آئین اکبری جلد اول۔ ص ۱۹۵

اپنی ایک تصویر شاہزادہ کو دیتی ہے :-

"روز اول ہنگام ملاقات ملکہ نوبہار نے ایک ورق تصویر اپنا بطور یادگار شاہزادہ کو
دیا تھا شاہزادہ مثل حرز جاں وہ ورق شب و روز اپنے بازو پر بند ھا رکھتا تھا۔[۱]"

ملکہ کی تصویر صرف شاہزادہ ہی اپنے پاس نہیں رکھتا بلکہ دربار میں بجائے ملکہ اس کی تصویر ہی رکھی جاتی ہے اور خلایق اسی تصویر کو سلام کرتی ہے اسی شہر میں بہزاد نام کا ایک مصور بھی ہے جو بادشاہ کی تصویر بناتا ہے :-

"اس شہر میں ایک مصور بہزاد نام بادشاہ کی طرف سے میری مانند رکن اعظم
ہے جو کوئی شخص بہزاد کو رضامند کرتا ہے بہزاد ایک ورق بادشاہ کی تصویر کا
اس کو تیار کر دیتا ہے پھر وہ صبح و شام بجائے بادشاہ اسی کی زیارت کرتا ہے۔[۲]"

یہاں یہ بات واضح کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ مصنف کے ذہن میں "بہزاد" نام کہاں سے آیا، ظاہر ہے کہ اس کے شعور پر مغلیہ دور کے مصور بہزاد کے فن کی چھاپ موجود ہے اور وہ اس کی قدر کرتا ہے اسی لئے اس نے ضرب المثل کے طور پر جگہ جگہ مانی و بہزاد کا نام لیا ہے۔

"بوستان" میں کئی جگہ ایسے سوداگر ملتے ہیں جو تصویروں کو فروخت کرتے ہیں[۳] اور خود بھی باکمال مصور ہیں :-

"شاہزادے نے متعجب ہو کر کہا اے ملک خورشید یہ کون شخص ہے ملک خورشید یہ
نے کہا کہ اے فلک شوکت ایک سوداگر ہے تصویر دوست بلکہ خود بھی مصور بے
بدل ہے اور ساکنان جزیرۂ نیرنگ سے ہے مبالغ خطیر خرچ کر کے علم مصوری
حاصل کیا ...... قریب بارہ ہزار تصویریں اس کے ہمراہ تھیں لیکن ان تصویروں
کو بقیمت معقول فروخت کرتا ہے ..... اس کو خواجہ تصویر کہتے ہیں۔[۴]"

"بوستان" میں شبیہ سازی داستان عشق کی ابتدا کرنے کے کام ہی نہیں آتی بلکہ بعض سوداگر کنیزوں کی فروخت کے لئے بجائے کنیزوں کے ان کی تصویریں نمایش کے لئے رکھتے ہیں[۵]۔ تصویر سازی تلاش گمشدہ میں مدد دیتی ہے جیسے شاہزادہ ملک شاہ اور اس کی بہن کے گم ہو جانے پر بادشاہ نے ان کی تصویریں دیوار پر لگوا دیں تاکہ لوگ انھیں پہچان کر تلاش کریں۔[۶]

بعض بادشاہ دوسرے ممالک کے بادشاہوں اور مشہور عالم لوگوں کی تصاویر اپنے کتب خانوں میں رکھتے تھے، داراشکوہ کا چالیس تصویروں کا ترتیب دیا ہوا مرقع انڈیا آفس لائبریری لندن میں آج

---

[۱] ص ۳۴۳ ج ۲، [۲] ص ۳۸۰ ج ۲، [۳] ص ۳۹۷ ج ۴، [۴] ص ۵۴۳ ج ۱، [۵] ص ۲۴۳ ج ۴، [۶] ص ۹۰ ج ۲،

تک محفوظ ہے[1] "بوستان" میں بھی ایسی مثالیں مل جاتی ہیں :-

"کتب خانہ شاہی سے سلاطینِ عالم کا مرقع تصاویر منگواؤ اور بادشاہ اہواز کی تصویر اس نظر سے دیکھو کہ آیا صورت اس کی اس جوان صاحب خواب سے مشابہ ہے یا نہیں"[2]

غرضکہ "بوستان" میں مصوری سے متعلق اسی طرح کی کچھ مثالیں ملتی ہیں جن سے اس فن کا کوئی معیار تو قایم نہیں کیا جاسکتا البتہ بادشاہانِ داستان کی تصویروں سے دلچسپی اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ یہ وہی مغل بادشاہ ہیں جن کی توجہ سے مغل دبستانِ مصوری کو انفرادی مقام حاصل ہوا۔

باغبانی

امیر خسروؔ نے ہندوستان کی آب وہوا کے بارے میں کہا تھا کہ :-

ہر کہ دریں ملک دمے آب خورد	گشت دل از آب خراسانش مرد
بسکہ خنک دید خراساں سپہر	گشت ہمہ سال بر و سرد مہر
گرچہ دریں ملک ہوا ہست گرم	از خنکیہائے خراساں چہ شرم
مہر فلک گرم شد اندر فاش	گرم از آں گشت جہاں را ہواش
گل ہمہ سال بچمن خوش نسیم	خاک زگلہا شدہ پر زر و سیم
تری صد گونہ بصد برگِ تر	کوزۂ ہر خاک پُر آبے دگر
خط تر سبزہ بصحرا و کشت	نسخہ گرفتہ ز سوادِ بہشت
میوز ہند و ز خراساں بسے	زانچہ نخوردہ بخراساں کسے[3]

یقیناً یہاں کی آب وہوا باغ و بہار ہے، یہاں نہ زیادہ گرمی پڑتی ہے، اور نہ موسم سرما کی شدت ہوتی ہے یہاں چہار طرف دریاؤں کا جال بچھا ہوا ہے' اس لئے ہر خطہ سر سبز و شاداب نظر آتا ہے، ہر سمت پھولوں اور پھلوں سے بار آور درخت پھیلے ہوئے ہیں، یہاں کے صحراؤں میں بہار رنگ بھرتی ہے، پہاڑوں پر آب شیریں کے چشمے جاری ہیں:

"اور دامنہ کوہ میں ایک صحرائے پُر بہار اور جابجا چشمہائے آب شیریں جاری تھے، غرضکہ جس طرف نظر جاتی تھی بجز گلہائے رنگارنگ اور آب کے کچھ نظر نہ آتا تھا"[4]

---

[1] ہندوستانی مصوری ص ۱۰۶، [2] ص ۱۰۹ ج ۵، [3] قران السعدین از امیر خسرو ماخوذ بحوالہ ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں ص ۴۶، [4] ص ۱۵۶ ج ۲،

"وہ کوہ گلستاں نظر سبزۂ نوخیز و گلہائے رنگا رنگ سے اس قدر باکیفیت و بہار افزا تھا کہ اس کی نظارت سے طبیعت سیر نہ ہوتی تھی۔"[۱]

جہاں کے صحراؤں اور پہاڑوں کی رنگینیوں کا یہ عالم ہے وہاں کے باغات کتنے دلکش و فرحت بخش ہوں گے ـــــ باغات کی ترتیب و آرائش نے باغبانی کو باقاعدہ ایک فن بنا دیا اور اس فن کی لطافت و نفاست کے پیشِ نظر ہم اسے فنونِ لطیفہ میں شامل کر سکتے ہیں۔

"بوستان خیال" شاہزادوں اور شاہزادیوں کے رزم و بزم کی داستان ہے اور کوئی بزم باغ کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوتی، عشق و محبت کے عہد و پیماں کے وقت گلہائے چمن اور بلبلہائے خوش نوا کی موجودگی لازمی ہوتی ہے جام و صراحی کی کھنکھناہٹ میں ناز و نیاز کی باتوں کے دوران بادِ نسیم خوشبوئیں بکھیرتی ہیں شمیمِ عنبریں ترانہ سمبار کباد گاتی ہے۔

"بوستان" کی ہر شاہزادی اپنا ایک الگ باغ رکھتی ہے جس میں سوائے اس کے اور اس کی کنیزوں کے کوئی نہیں آسکتا۔ یہاں تک کہ بادشاہ بھی بغیر شاہزادی کی دعوت کے وہاں نہیں جاسکتا۔ باغ عام طور پر شہر کے باہر بنائے جاتے ہیں جہاں دنیاوی افکار اور شہری ہنگاموں سے ہٹ کر پُر بہار ماحول ہوتا ہے، خود بادشاہ بھی کبھی کبھی افکار سلطنت سے نجات حاصل کرنے اور سکون پانے کے لئے باغوں میں قیام کرتے تھے۔

"حیات بخش اور مہتاب باغ اس لئے بنائے تھے کہ افکار سلطنت کی بو تک وہاں نہ آئے۔"[۲]

کوئی شاہزادی جب اپنے باغ میں جاتی تو اوّل باغ کو زنانہ کروایا جاتا[۳] یعنی کنیزیں باغ کو اچھی طرح دیکھتیں کہ کوئی مرد تو نہیں، کنیزیں ہی مردانہ لباس پہن کر پہرہ دیتی تھیں[۴]۔ پھر جاروب کش آکر باغ کو پاک و صاف کرتے۔

"بعد جاروب کشی و آبپاشی فراشان چابک دست زریں کمر باغ میں آئے اور انھوں نے تمام باغ کو فرش شاہانہ و سامان ملوکانہ سے آراستہ و مرتب کیا اور تمام فواروں کے خزانے کھول دیئے جن نہروں میں کہ پانی کا قطرہ نہ تھا چشمک زدنے میں آب لطیف و مصفا سے لبریز ہوگئیں اور تمام اشجار پست و بلند پر ہزار در ہزار قنادیل و فانوس ہائے زمردی و یاقوتی نہایت قرینہ سے آویزاں کیں، قصہ کوتاہ اس باغ فردوس نظر کو ایسی آرائش ہوئی کہ فلکِ ثوابت بھی جس کی رونق و

---

[۱] ج ۵ ص ۴، [۲] تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت۔ ص ۲۸۹، [۳] ج ۵ ص ۲، ج ۲ ص ۴، [۴] ج ۵ ص ۳۰، ج ۵ ص ۵،

زینت سے مخمل ہوتا تھا چند ساعت کے بعد گروہ گروہ نازنینان مہ پیکر سنبل مو اور
جوق جوق مہوشان خرسند طلعت ماہ رو مرصع پوش بشکل انسانی باغ میں آئیں[1]۔

داستان کی شاہزادیوں نوبہار، ناہید، شمسہ تاجدار، روشن گہر کے بجائے یہ مغل بیگمات اور شاہزادیاں، نورجہاں، جہاں آرا، روشن آرا، قدسیہ بیگم ہو سکتی ہیں جن کے ناموں سے منسوب باغات بھی دلی اور دوسرے مقامات پر موجود ہیں۔

باغات لگانے اور پھولوں سے لطف اندوز ہونے کی روایت ہندوستان میں بہت قدیم ہے، ہندوؤں کی قدیم ترین کتابوں میں پھولوں اور باغوں کا ذکر ملتا ہے، ہندوؤں کی بہت سی مذہبی اور معاشرتی رسموں میں پھولوں کا استعمال ضروری سمجھا جاتا ہے، دلہن کی سیج سے لیکر مردے کی ارتھی تک پھولوں سے سجائی جاتی ہے، مندروں میں دیوی دیوتاؤں کو نذرانے کے طور پر پھول پیش کئے جاتے ہیں۔ غرضکہ ہندو تہذیب میں پھول کو خاص اہمیت حاصل ہے لیکن ہندوستان کے قدیم باغوں میں وہ تزئین و آرائش نہیں تھی جو مسلمانوں کی آمد کے بعد ایرانی اثر سے آئی۔ ہندوستان کی قدیم تہذیب کا جھکاؤ جنگل کی طرف زیادہ تھا، ہندوؤں کے مذہبی پیشوا یعنی سادھو عموماً جنگل ہی کو اپنی قیام گاہ بناتے تھے اس لئے ان کے باغ میں جنگل کی سی بے ترتیبی تھی، نہروں، فواروں اور محلوں کا باغ میں کوئی تصور نہیں تھا، مسلمانوں نے آکر ہندوستانی باغوں میں ان کا اضافہ کیا، باغبانی کو ایک فن نفیس بنا دیا، بے ترتیبی اور جنگلاتی اثر کو ختم کر کے اس میں حسن اور دلکشی پیدا کر دی، محلوں کے اطراف و جوانب میں باغات لگائے، انھیں تفریح و عیش گاہ بنایا۔ غلام خاندان کا سلطان معزالدین کیقباد ایک ناکام اور عیش دوست فرمانروا ضرور تھا لیکن اس حسن پرست سلطان نے کیلوگرھی کے مقام پر اتنا خوشنما اور خوش دل باغ لگوایا تھا کہ جسے دیکھکر بقول محمد بہادر خانی مصر اور بغداد کے باغوں کو شرم آجائے[2]۔ فیروز شاہ تغلق نے اس قدر باغ لگوائے کہ دلی کا موسم ہی بدل گیا۔ گرمی کے موسم میں لو کی تیزی اور تندی کم ہو گئی[3]۔ فیروز آباد سے لیکر دہلی تک (مہرولی) باغات کی لمبی قطار تھی۔ ان کی تعداد ہزار سے زیادہ تھی۔ عفیف نے ان باغات سے ہونے والی آمدنی کی رقم ایک لاکھ اسی ہزار تنکہ لکھی ہے[4]۔ ان باغوں میں پھلوں اور پھولوں دونوں ہی طرح کے درخت تھے۔

مغلوں کے آنے کے بعد یہاں کثرت سے باغ لگائے گئے۔ اس عہد کے باغات میں جو حسن اور دل آویزی تھی وہ پہلے مفقود تھی۔ مغلوں نے ایرانی انداز پر باغوں کو آراستہ کیا، انھوں نے یہاں کے قدیم انداز کو بالکل

---

[1] ۶۱۱ ج ۲، [2] ماخذ اوراق مصور ص ۱۵، [3] ایضاً ص ۲۴، [4] تاریخ فیروز شاہی از عفیف۔ ص ۲۰۸،

بدل دیا۔ باغوں کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ لگایا گیا۔ ان کے چاروں طرف اونچی اونچی دیواریں تعمیر کی گئیں اور اندر بالترتیب چنار و صنوبر وغیرہ کے گھنے درخت لگائے گئے۔ مصنوعی آبشاروں سے پانی چھڑکایا گیا۔ حوض بنا کر ان میں مچھلیاں چھوڑی گئیں، پانی کی آمد و رفت کیلئے باغوں کے بیچ سے نہریں گذاری گئیں اور وسطِ باغ مکانِ آرام بنایا گیا۔ "بوستانِ خیال" کا یہ باغ مغلوں کے ترتیب کردہ باغ کا ہی پرتو ہے :۔

"ایسی رونق و زینت کا باغ دیکھا کہ ہر چمن اس کا بجائے خود بہشت شدّادی کا حکم رکھتا تھا، عماراتِ جانفزا اور مکاناتِ دلکشا کے علاوہ چار طرف سے انہار خوشگوار چشمہ حیواں کے مانند جاری تھیں، ہر فوّارہ سے بجائے آبِ گلاب خالص جوش مارتا تھا...... باغ کے وسط میں ایک سیل سنگ بشکل برج پچاس گز بلند دیکھا اور اس پر ایک مکان بھی مختصر بنا ہوا تھا اور مکان کے غرفوں میں پردہائے زربفتی و مخمل کاشانی فتادہ تھے۔"[۱]

مغلیہ خاندان کے سبھی بادشاہوں کو باغ لگوانے کا شوق تھا اس کا سبب تفریح و عیش کے علاوہ یہ بھی تھا کہ یہ لوگ ٹھنڈے ملک کے باشندے تھے، یہاں کی گرمی انھیں پریشان بھی کرتی تھی اس گرمی سے بچنے کے لیے اور سرد ہواؤں سے لطف اندوز ہونے کے لئے انھوں نے بے شمار ایسے باغات لگوائے جن میں پُر آب نہریں، حوض، اور فوارے موجود تھے تاکہ لُو کے تھپیڑوں اور گرم ہواؤں سے پناہ مل سکے، اسی پناہ کی تلاش میں بادشاہانِ مغل بار بار کشمیر جایا کرتے تھے جو ہندوستان کا سرد علاقہ ہے، مغلوں کے لگوائے ہوئے زیادہ تر باغ کشمیر ہی میں ہیں۔

مغل بادشاہوں میں سب سے زیادہ باغ جہانگیر اور نورجہاں نے لگوائے، بابر اور ہمایوں کی زندگی اگرچہ سیاسی انتشار اور سفر میں گذری لیکن انھوں نے بھی خاندانی ذوقِ علوم و فنون اور فطرت پسندی سے دامن نہیں بچایا، بابر نے آگرہ میں آرام باغ، زہرہ باغ اور کابل میں باغ وفا اور باغ کلاں لگوائے، ہمایوں نے دریائے جمنا میں ایک تیرتا ہوا باغ لگوایا جو لکڑیوں کے تختوں پر لگایا گیا تھا، ہمایوں کے جانشیں اور مغل خاندان کے عظیم بادشاہ اکبر نے فتح پور سیکری کو بسایا تو چہار جانب ایسے خوشنما اور دلکش باغ لگوائے کہ پورا شہر چمن معلوم ہونے لگا، تاریخ فتح پور سیکری کے حوالے سے صباح الدین عبدالرحمٰن نے جو عبارت نقل کی ہے وہ داستان ہی کا حصہ معلوم ہوتی ہے یا دوسرے الفاظ میں داستان کے باغ تاریخ کا حصہ نظر آتے ہیں ملاحظہ ہو :۔

"اکبری عہد میں اس باغ کے اندر گلزارِ ارم کا جلوہ نظر آتا تھا پختہ سنگین روشوں پر

لے ۳۳۰ ج ۴،

سب رنگ کے پھول عطر پاشی کرتے تھے، ضیا بالوں میں ہر قسم کے نایاب، نفیس اور
لذیذ میوے شاخوں میں جھوما کرتے تھے ہمیشہ صاف وشفاف پانی، مؤدبانہ خرام
سے خوشنما نالیوں میں گل گشت کرتا رہتا تھا جس وقت موسم بہار میں خاتونانِ عفت
مآب اپنے اپنے عشرت کدوں سے نکل کر باغ کی روشوں پر خراماں خراماں سیر کرتی ہوں گی
اس وقت قسم قسم کے پھولوں کی مہک، سنبل کا بال بکھیرنا، ریحان کا چشم دلفریب سے
تکنا، معطر ہوا کا چلنا ۔۔۔ طائران خوش الحان کا نغمہ سرائی کرنا، فرش زمردیں کا
لہلہانا کیا عجیب و غریب اور دلچسپ منظر پیدا کرتا ہوگا۔[۱]

باغوں کی بالکل یہی کیفیت "بوستان" میں دکھائی دیتی ہے یہاں کے باغ بھی فردوس نشان ھیں۔ ان کا کانٹا بھی غیرت گل ہے اور سبزۂ پژمردہ سبزہ خط گل رخاں سے بہتر ہے، ہر غنچہ معشوق کے دہن تنگ سے تنگ تر ہے، ہر گل رنگینی و نزاکت و شادابی میں رخسار خوباں سے بڑھ کر ہے، ان کی ہوا باغ ارم سے زیادہ فرحت بخش ہے۔ سوائے باد بہاری کے ہوائے خزاں ان باغوں میں نہیں آتی، انھیں دیکھکر ہر موسم میں فصل بہار کا گمان ہوتا ہے۔ عندلیب خوش الحان اور بلبل خوشنوا سیر کرنے والوں کو مست کرتے ہیں، کثرتِ اثمار سے شاخیں روئے زمین چومتی ہیں۔ داستان نگار قصر زمردنگار کے باغ کا بیان ان الفاظ میں کرتا ہے :۔

"دو گلہائے رنگا رنگ بوقلمون کھلے ہوئے، حوض گلاب اور عرق کیوڑہ سے لبریز ھیں
ہزارہا درخت کثرت بار اثمار سے مثل ہر دمان منکسر کے جھکے ہوئے ہیں بلبلانِ خوش تقریر
نغمہ سرائی کر رہے ہیں، غنچے شگفتہ ہو رہے ہیں، نسیم عنبر شمیم چل رہی ہے سرو لب جو
بسبب تازگی اور خوشی کے اکڑ رہے ہیں، مرغانِ خوشنوا چہچہے کر رہے ہیں، قمریوں کا
شور ہے طاؤس ہر جانب مانند معشوقان خوش خرام ٹہل رہے ہیں، فوارے چھوٹ
رہے ہیں ۔۔۔ غنچے مسکرا رہے ہیں، سبزۂ باغ ایسا لہک رہا ہے کہ دلوں
کو پامال کئے ڈالتا ہے"[۲]

یہ بلبلوں کی چہچہاہٹ اور غنچوں کی مسکراہٹ جہانگیر اور شاہ جہاں کے لگوائے ہوئے باغات میں سننے اور دیکھنے کو ملتی ہیں ان دونوں بادشاہوں کے عہد میں علوم وفنون نے جس قدر ترقی کی، وہ کسی اور زمانہ میں نہیں ہوئی شاہ جہاں نے جلیل وجمیل عمارتیں تعمیر کروائیں، جہانگیر نے فطرت کے مناظر کو سنوارنے کے لئے بے شمار باغات

---

[۱] ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے، ص ۱۲۶، [۲] ۳،۴۰۳ ج ۶،

لگوائے وہ قدرت کی رنگینیوں کا عاشق تھا، کشمیر کے فطری جلووں سے لطف اندوز ہوتا تھا، کشمیر میں اس نے جو باغات لگوائے ان میں باغ ویرناگ، باغ نشاط، شالامار باغ وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ اودے پور میں شاہی اور لاہور میں باغ دلکشا اور بادامی باغ اسی نے لگوائے تھے۔

شاہ جہاں کے لگوائے ہوئے مشہور باغوں میں کشمیر اور لاہور کے شالامار باغ ہیں۔ اورنگ زیب کے عہد میں لگا ہوا روشن آرا باغ آج بھی دلی میں اپنی ماضی کی یادوں کو دبائے ہوئے موجود ہے، محمد شاہ کے عہد کا قدسیہ باغ اپنے دور کی تہذیبی و تمدنی حالت کو بیان کرتا ہے، ان بادشاہوں کو مناظرِ قدرت سے اس قدر لگاؤ تھا کہ مقبروں میں بھی باغات لگواتے تھے، مقبرہ ہمایوں، تاج محل، مقبرہ اعتمادالدولہ، مقبرہ صفدر جنگ وغیرہ کے اطراف میں خوبصورت باغات لگے ہوئے ہیں "بوستان" کے مقبروں کے گرد بھی باغات موجود ہیں :۔

"اور ایک گنبد عالی شان بطور مقبرہ بنوایا اور ایک باغ نمونہ جنت درختاں گل وثمر سے آراستہ وہاں لگایا اور اس باغ کا نام بھی باغِ فردوس نشاں رکھا"[1]

باغات داستان کا ایک اہم حصہ ہیں، شاہزادی اور شاہزادے کی ملاقات کا ذریعہ اکثر یہی باغ بنتے ہیں کیونکہ جس وقت شاہزادیاں باغ میں آتی ہیں سوائے اپنی خاص کنیزوں کے کسی کو ہمراہ نہیں لاتیں، بادشاہ وغیرہ ان کی تفریحات میں مخل نہیں ہوتے :۔

"ملکہ زہرہ روشن بدن کا چار فرسخ شہر سے ایک باغ فردوس نشاں نہایت وسیع الفضا تھا بلکہ لقب بھی باغ دلکشا مشہور کرتی تھی ملکہ زہرہ روشن بدن اکثر اوقات باغ میں آتی تھی اور دو چار روز وہاں کا سیر و تماشا دیکھتی تھی"[2]

باغ دلکشا نام کا ایک باغ لاہور میں لگوایا گیا تھا لیکن وہاں جانے کی ضرورت نہیں بلکہ روشن بدن کے نام کی مناسبت سے فصیل دلی سے باہر روشن آرا بیگم کا باغِ روشن آرا آج بھی موجود ہے۔ جہاں مغل خاندان کی شاہزادیاں تفریح کے لئے جاتی تھیں، ویسے پچھلی صدی تک دلی کے اطراف میں بے شمار باغات تھے۔ "بوستان" میں ایک جگہ ایسی بھی ہے جہاں باغ ہی باغ ہیں اس جگہ کو "باغستان" کہا گیا ہے، باغستان میں چالیس باغ ہیں، سب ایک دوسرے سے متصل ہیں، ہر باغ میں قصر اور قصر میں باغیچے موجود ہیں۔[3] ان باغوں میں ہر طرح کے پھول موجود تھیں، ہر قسم کے میوے اور فواکہ درختوں پر جھول رہے ہیں۔ چار

لے ۱۳۶ ج ۴، ۲ے ۱۰۰ ج ۲، ۳ے ۷۰، ۱۲۰،

طرف متعدد نہریں آبِ شیریں کی جاری ہیں اور نہروں میں لیشب و بلور کے فوارے آب افشانی کر رہے ہیں۔
غرضکہ یہ باغات تہذیبی ارتقا کی ایک اہم کڑی ہیں، ان سے ان کے عہد کی نفاست پسندی اور ذوقِ جمال کا اندازہ ہوتا ہے "بوستانِ خیال" کے باغات مغل عہد کے ان باغات کی قلمی تصویریں ہیں جو اب خزاں کے تھپیڑوں سے ویران ہو چکے ہیں۔

کتابیات

اوّل	مہدی نامہ	مرزا عسکری	مطبع نولکشور دھلی	۱۲۹۹ھ
دوم	حدایق انظار	خواجہ امان دہلوی	اکمل المطابع دہلی	۱۲۸۲ھ
سوم	ریاض الابصار	ایضاً	مطبع یوسفی دہلی	۱۲۸۴ھ
چہارم	شمس الانوار	ایضاً	مطبع بدرالدجی دہلی	۱۲۸۶ھ
پنجم	بدرالآثار	ایضاً	ایضاً	۱۲۹۱ھ
ششم	نجم الاسرار	ایضاً	ایضاً	۱۲۹۵ھ
ہفتم	نورالانوار	محسن علی خاں	مطبع نولکشور لکھنؤ	۱۳۲۵ھ
ہشتم	مشرق الآثار	ایضاً	ایضاً	۱۳۲۵ھ
نہم	تفریح الاحرار	ایضاً	ایضاً	۱۳۰۹ھ

"بوستان خیال" کی مندرجہ بالا جلدوں سے کتاب میں حوالے نقل کئے گئے ہیں۔ داستان کی حسب ذیل جلدیں بھی زیر مطالعہ رہیں۔

جلد ہفتم	مصباح النہار	خواجہ امان دہلوی	مطبع دارالعلوم میرٹھ	۱۲۹۸ھ
جلد ہشتم	ضیاءالانوار	خواجہ قمرالدین	ایضاً	۱۳۰۰ھ
جلد نہم	مرات الاضمار	ایضاً	ایضاً	۱۳۰۰ھ
جلد ششم	خزینۃ الاسرار	مرزا محسن علی خاں	مطبع نول کشور لکھنؤ	۱۹۱۵ھ
جلد ہفتم	کاشف الاسرار	مقرب حسین خاں	مطبع دارالعلوم میرٹھ	۱۳۰۰ھ
جلد نہم	خاتم الاسمار	ایضاً	ایضاً	۱۳۰۲ھ

"مصباح النہار"، "مرات الاضمار" اور "کاشف الاسرار" مولانا آزاد لائبریری علی گڈھ میں موجود ہیں، بقیہ تمام جلدیں دہلی یونیورسٹی کی لائبریری میں محفوظ ہیں۔

۱۔ اترپردیش کے لوگ — اظہر علی فاروقی — ترقی اردو بورڈ نئی دہلی — ۱۹۸۱ء

۲۔ اٹھارہویں صدی میں ہندوستانی معاشرت — ڈاکٹر محمد عمر، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی — ۱۹۷۳ء

۳۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۹ — دانش گاہ پنجاب۔ لاہور

۴۔ اردو شاعری کا سماجی پس منظر — ڈاکٹر سید اعجاز حسین، کارواں پبلشرز الہ آباد — ۱۹۶۸ء

۵۔ اسلام اور عربی تمدن — شاہ معین الدین احمد ندوی، دارالمصنفین اعظم گڈھ — ۱۹۵۲ء

کتاب	مصنف / ناشر	سنہ
۶۔ اوراق مصوّر	خلیق احمد نظامی شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی دہلی	۱۹۷۲ء
۷۔ بزم تیموریہ	صباح الدین عبدالرحمٰن دار المصنفین۔ اعظم گڈھ	
۸۔ بہار میں اُردو زبان و ادب	اختر اورینوی پٹنہ	۱۹۵۷ء
۹۔ تاریخ تمدن ہند	محمد مجیب ترقی اردو بورڈ۔ نئی دہلی	۱۹۸۲ء
۱۰۔ تاریخ طرز معاشرت ہند و انگلستان	تراب علی مطبع عالی جاہ لشکر گوالیار	۱۸۹۳ء
۱۱۔ تاریخ النوایط	نواب عزیز جنگ ولاؔ، ولا اکیڈمی۔ حیدر آباد	۱۹۷۶ء
۱۲۔ تاریخ تہذیب عالم	اے۔ اے۔ ہاشمی ایجوکیشنل بک ہاؤس۔ علی گڈھ	۱۹۷۷ء
۱۳۔ تمدن ہند پر اسلامی اثرات	ڈاکٹر تارا چند مترجم مسعود احمد مجلس ترقی ادب۔ لاہور	۱۹۶۴ء
۱۴۔ تمدن اسلام اوّل و دوم	جرجی زیدان مترجم محمد سلیم انصاری امرتسر	
۱۵۔ جوامع الحکایات ولوامع الروایات	محمد عوفی مترجم اختر شیرانی انجمن ترقی اُردو ہند دہلی	۱۹۴۳ء
۱۶۔ دکنی کلچر	محمد نصیر الدین ہاشمی مجلس ترقی ادب۔ لاہور	۱۹۶۲ء
۱۷۔ دکنی کلچر	پروفیسر ہارون خاں شیروانی شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی دہلی	۱۹۷۱ء
۱۸۔ دلّی کی بیگماتی زبان	محی الدین حسن نئی آواز جامعہ نگر نئی دہلی	۱۹۷۶ء
۱۹۔ دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی اور فکری پس منظر	ڈاکٹر محمد حسن ادارہ تصنیف، علی گڈھ	۱۹۶۴ء
۲۰۔ رسوم دہلی	سیّد احمد دہلوی کتاب کار پبلی کیشنز۔ رامپور	۱۹۶۵ء
۲۱۔ زبان اور کلچر	ڈاکٹر شکیل الرحمان شاہین بکسٹال سری نگر کشمیر	۱۹۶۸ء
۲۲۔ سیر المنازل	مرزا سنگین بیگ مرتب ڈاکٹر شریف حسین قاسمی غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی	۱۹۸۲ء
۲۳۔ صولت شیر شاہی	احمد مرتضیٰ نظر	۱۹۳۲ء
۲۴۔ عربی لٹریچر میں قدیم ہندوستان	مرتب خورشید احمد فاروقی ندوۃ المصنفین دہلی	۱۹۷۳ء
۲۵۔ عرس اور میلے	امان اللہ خاں امان سرحدی کتاب منزل لاہور	۱۹۵۹ء
۲۶۔ غالب اور صفیر بلگرامی	مشفق خواجہ کراچی	۱۹۸۱ء
۲۷۔ قانون النسار	شعبۂ اُردو دہلی یونیورسٹی دہلی	۱۹۷۲ء
۲۸۔ قرونِ وسطیٰ میں ہندوستان	گوری شنکر ہیرا چند مترجم پریم چند ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد	۱۹۳۱ء
۲۹۔ قدیم ہندوستان کی ثقافت و تہذیب	ڈی۔ ڈی۔ کوسمبی مترجم عرش ملسیانی ترقی اردو بورڈ نئی دہلی	۱۹۷۹ء
۳۰۔ قدیم لکھنؤ کی آخری بہار	مرزا جعفر حسین ترقی اردو بورڈ نئی دہلی	۱۹۸۱ء

۳۱ - قومی تہذیب کا مسئلہ — سید عابد حسین ترقی اردو بورڈ نئی دہلی ۱۹۸۰ء

۳۲ - گجرات کی تمدنی تاریخ — سید ابوظفر ندوی دارالمصنفین - اعظم گڈھ

۳۳ - گذشتہ لکھنؤ — عبدالحلیم شرر نسیم بک ڈپو - لکھنؤ ۱۹۷۴ء

۳۴ - لکھنؤ کی تہذیبی میراث — ڈاکٹر سید صفدر حسین اردو پبلشرز لکھنؤ ۱۹۷۸ء

۳۵ - مرقع دہلی درگاہ قلی خاں — مترجم نورالحسن انصاری شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی - دہلی ۱۹۸۲ء

۳۶ - مرحوم دلّی کی ایک جھلک — شمیم احمد ادارہ ادبیات دلّی - دہلی پہلا ایڈیشن

۳۷ - مسلم ثقافت ہندوستان میں — عبدالمجید سالک ادارۂ ثقافت اسلامیہ - لاہور طبع دوم

۳۸ - مثنوی سحرالبیان کا تہذیبی مطالعہ — رضیہ سلطانہ اردو پبلشرز - لکھنؤ ۱۹۸۰ء

۳۹ - مغل تہذیب — محبوب اللہ مجیب کتابستان - الہ آباد ۱۹۶۵ء

۴۰ - ہندوستان کا قدیم تمدن — ڈاکٹر بینی پرشاد مترجم اصغر حسین ہندوستانی اکیڈمی - الہ آباد ۱۹۵۰ء

۴۱ - ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام — صباح الدین عبدالرحمٰن دارالمصنفین - اعظم گڈھ ۱۹۶۰ء

۴۲ - ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے، صباح الدین عبدالرحمٰن دارالمصنفین - اعظم گڈھ ۱۹۶۲ء

۴۳ - ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک جھلک — مرتبہ صباح الدین عبدالرحمان دارالمصنفین اعظم گڈھ ۱۹۵۸ء

۴۴ - ہندوستان امیر خسروؒ کی نظر میں — مرتبہ صباح الدین عبدالرحمٰن دارالمصنفین - اعظم گڈھ ۱۹۶۶ء

۴۵ - ہندوستانی کلچر کا ارتقا — ڈاکٹر تارا چند شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی - دہلی ۱۹۶۷ء

۴۶ - ہندوستانی گاؤں — شیاما چرن دوبے مترجم محمد عبدالقادر عمادی ترقی اردو بورڈ نئی دہلی ۱۹۸۰ء

۴۷ - ہندوستانی معاشرہ عہد وسطیٰ میں — کنور محمد اشرف مترجم قمرالدین نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا - نئی دہلی ۱۹۷۴ء

۴۸ - ہندوستانی مصوری — پرسی براؤن مترجم عبیدالحق نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا - نئی دہلی ۱۹۸۱ء

۴۹ - ہندوستانی مسلمان — سید ابوالحسن علی ندوی مجلس تحقیقات ونشریات اسلام - لکھنؤ - ۱۹۶۱ء

۵۰ - ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر — ڈاکٹر محمد عمر پبلی کیشنز ڈویژن - نئی دہلی ۱۹۷۵ء

۵۱ - ہماری تہذیبی میراث — سفارش حسین رضوی نیشنل پرنٹرز جامعہ نگر نئی دہلی ۱۹۷۰ء

تاریخی مآخذ

۵۲ - آئین اکبری اوّل و دوم — ابوالفضل مترجم مولوی فدا علی طالب دارالطبع جامعہ عثمانیہ - حیدر آباد ۱۹۳۹ء

۵۳ - اہل ہند کی مختصر تاریخ — ڈاکٹر تارا چند اردو اکیڈمی دلّی ۱۹۶۸ء

۵۴۔ انسائیکلوپیڈیا تاریخ عالم جلد اوّل ولیم ایل لینگر مترجم غلام رسول مہر لاہور ۱۹۵۸ء

۵۵۔ بابرنامہ بابر مترجم نصیر الدین حیدر بک لینڈ۔ کراچی ۱۹۶۲ء

۵۶۔ تاریخ اسلام جلد اول و دوم مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی، مکتبہ رحمت دیوبند

۵۷۔ تاریخ اسلام سیّد امیر علی آزاد بک ڈپو امرتسر

۵۸۔ تاریخ جہانگیر بینی پرساد مترجم رحم علی الہاشمی ترقی اردو بورڈ۔ نئی دہلی ۱۹۷۹ء

۵۹۔ تاریخ شاہ جہاں بناری پرساد سکسینہ مترجم ڈاکٹر اعجاز حسین ترقی اردو بورڈ۔ نئی دہلی ۱۹۷۸ء

۶۰۔ تاریخ اودھ جلد اول محمد نجم الغنی خاں مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۹۱۹ء

۶۱۔ تاریخ اودھ (تلخیص) ذکی کاکوردی مرکز ادب اردو لکھنؤ ۱۹۷۶ء

۶۲۔ تاریخ ہند جلد دوم و سوم مولوی سیّد ہاشمی فرید آبادی دارالطبع جامعہ عثمانیہ حیدرآباد ۱۹۳۹ء

۶۳۔ تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت مولوی سیّد ہاشمی فرید آبادی انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی ۱۹۵۳ء

۶۴۔ تاریخ فرشتہ حصہ دوم محمد قاسم فرشتہ مترجم عبدالحیٔ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز۔ لاہور

۶۵۔ تاریخ فیروز شاہی شمس سراج عفیف مترجم مولوی فدا علی طالب نفیس اکیڈمی۔ کراچی مئی ۱۹۶۲

۶۶۔ تاریخ فاطمین مصر اوّل و دوم ڈاکٹر زاہد علی نفیس اکیڈمی۔ کراچی ۱۹۶۳ء

۶۷۔ تزک جہانگیری نور الدین جہانگیر مترجم مولوی احمد علی رامپوری سنگ میل پبلی کیشنز۔ لاہور ۱۹۷۷ء

۶۸۔ جنوبی ہند کی تاریخ کے۔ اے نیل کنتھ شاستری مترجم آر۔ کے بھٹناگر ترقی اردو بورڈ نئی دہلی ۱۹۸۰ء

۶۹۔ حیدر علی نریندر کرشن سنہا مترجم اقتدار حسین صدیقی نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا نئی دہلی ۱۹۷۴ء

۷۰۔ خلجی خاندان کے۔ ایس۔ لال مترجم ڈاکٹر محمد یسین ترقی اردو بورڈ نئی دہلی ۱۹۸۰ء

۷۱۔ دربار اکبری محمد حسین آزاد محمدی پریس لاہور ۱۹۴۷ء

۷۲۔ دکن کے بہمنی سلاطین ہارون خاں شیروانی مترجم رحم علی الہاشمی نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا نئی دہلی ۱۹۷۸ء

۷۳۔ دلّی کے بائیس خواجہ ڈاکٹر ظہور الحسن شارب تاج پبلشرز دہلی ۱۹۷۷ء

۷۴۔ سراج الدولہ محمد عمر انجمن ترقی اردو ہند دہلی ۱۹۴۶ء

۷۵۔ سفرنامہ ابن بطوطہ مترجم رئیس احمد جعفری ادارہ درس اسلام۔ دیوبند ۱۹۸۰ء

۷۶۔ سلطان الہند محمد شاہ بن تغلق پروفیسر آغا مہدی حسین ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد ۱۹۳۷ء

۷۷۔ سیر المتاخرین غلام حسین طباطبائی مترجم یونس احمد نفیس اکاڈمی کراچی طبع اوّل ۱۹۶۸ء

۷۸۔ شاہ جہاں کے ایام اسیری اور عہد اورنگ زیب (سفرنامہ برنیر) از برنیر، مترجم سید محمد حسین، نفیس اکاڈمی کراچی ۱۹۶۹ء

۷۹۔ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات مرتبہ خلیق احمد نظامی ندوۃ المصنفین۔ دہلی ۱۹۶۹ء

۸۰۔ ظہیر الدین بابر ایف۔ ال۔ رس بروک مترجم رفعت بلگرامی ترقی اردو بورڈ۔ نئی دہلی طبع اوّل

۸۱۔ قدیم ہندوستان کی تاریخ رماشنکر ترپاٹھی مترجم سخی حسن نقوی ترقی اردو بورڈ نئی دہلی ۱۹۸۱ء

۸۲ قصص ہند محمد حسین آزاد مجلس ترقی ادب لاہور

۸۳۔ قصص الانبیاء کتب خانہ اشاعت الاسلام دہلی

۸۴۔ مآثر الامرا جلد اول و دوم شاہنواز خاں مترجم ایوب قادری مرکزی اردو بورڈ لاہور ۱۹۶۸ء

۸۵۔ مغلیہ سلطنت کا عروج و زوال آر۔ پی۔ ترپاٹھی مترجم ریاض احمد خاں ترقی اردو بورڈ نئی دہلی ۱۹۸۰ء

۸۶۔ منتخب التواریخ ملا عبد القادر بدایونی مترجم محمود احمد فاروقی غلام علی اینڈ سنز پبلشرز لاہور ۱۹۶۲ء

۸۷۔ وقائع نادری مولوی محمد معصوم علی مختشر مطبع نول کشور۔ لکھنؤ

۸۸۔ ہمایوں نامہ گلبدن بیگم مترجم عثمان حیدر مرزا ترقی اردو نئی دہلی ۱۹۸۱ء

ادبی ماخذ

۸۹۔ ادب اور ادیب ڈاکٹر اعجاز حسین ادارہ انیس اردو الہ آباد ۱۹۶۰ء

۹۰۔ ادب الجاہلی طٰہٰ حسین المصری مترجم محمد ضیا انصاری انجمن ترقی اردو ہند دہلی ۱۹۴۶ء

۹۱۔ ادبی تنقید ڈاکٹر محمد حسن ادارہ فروغ اردو لکھنؤ ۱۹۷۳ء

۹۲۔ ادب کا مطالعہ اطہر پرویز اردو گھر علی گڑھ ۱۹۶۶ء

۹۳۔ اردو زبان اور فن داستان گوئی کلیم الدین احمد ادارہ فروغ اردو، علی گڑھ ۱۹۷۷ء

۹۴۔ اردو کی نثری داستانیں ڈاکٹر گیان چند جین انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی ۱۹۶۹ء

۹۵۔ اردو کی منظوم داستانیں ڈاکٹر فرمان فتحپوری انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی ۱۹۷۱ء

۹۶۔ اردو میں تمثیل نگاری ڈاکٹر منظر اعظمی انجمن ترقی اردو ہند دہلی ۱۹۷۷ء

۹۷۔ اردو کے اسالیب بیان ڈاکٹر محی الدین قادری زور اعظم اسٹیم پریس حیدر آباد ۱۹۴۰ء

۹۸۔ اردو میں لسانیاتی تحقیق مرتبہ ڈاکٹر عبد الستار دلوی کوکل اینڈ کمپنی بمبئی ۱۹۷۱ء

۹۹۔ اردو کی ادبی تاریخ پروفیسر عبد القادر سروری سری نگر کشمیر ۱۹۷۵ء

۱۰۰۔ اردو کے افسانوی ادب میں عوامی زندگی کی عکاسی (قلمی) ڈاکٹر اجمل اجملی (مصنف کے پاس محفوظ ہے)

۱۰۱۔ افسانہ اور اس کی غایت مجنوں گورکھپوری ایوان اشاعت، گورکھپور

۱۰۲ - اصولِ انتقادِ ادبیات — عابد علی عابد — مجلس ترقی ادب - لاہور — طبع اوّل — ۱۹۶۰ء

۱۰۳ - بیسویں صدی میں اردو ناول — ڈاکٹر یوسف سرمست — نیشنل بک ڈپو حیدرآباد — ۱۹۷۳ء

۱۰۴ - پھول بن — ابن نشاطی — مرتبہ اکبر الدین صدیقی ترقی اردو بورڈ نئی دہلی — ۱۹۷۸ء

۱۰۵ - تاریخ ادب اردو — رام بابو سکسینہ — مترجم مرزا محمد عسکری راجہ رام پریس لکھنؤ — ۱۹۵۲ء

۱۰۶ - تاریخ ادب اردو حصہ اوّل — ڈاکٹر جمیل جالبی — ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی — ۱۹۷۷ء

۱۰۷ - تصوف کیا ہے — مولانا محمد منظور نعمانی — الفرقان بک ڈپو لکھنؤ — ۱۹۷۸ء

۱۰۸ - حقایق — ڈاکٹر گیان چند — مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی — ۱۹۷۸ء

۱۰۹ - خطوط غالب — مرتبہ غلام رسول مہر

۱۱۰ - داستان سے افسانے تک — وقار عظیم — اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی — ۱۹۸۰ء

۱۱۱ - داستان تاریخ اردو — حامد حسن قادری — لکشمی نرائن اگروال تاجر کتب آگرہ — ۱۹۵۷ء

۱۱۲ - دلّی کا دبستان شاعری — نور الحسن ہاشمی — انجمن ترقی اردو ہند دہلی — ۱۹۴۹ء

۱۱۳ - رجب علی بیگ سرور — ڈاکٹر نیر مسعود — شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی الہ آباد — ۱۹۶۷ء

۱۱۴ - سحر البیان — مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی — ۱۹۶۶ء

۱۱۵ - سعادت یار خاں رنگین — ڈاکٹر صابر علی خاں — انجمن ترقی اردو کراچی — ۱۹۵۶ء

۱۱۶ - سیرت حلبیہ — علامہ علی ابن برہان الدین حلبی مترجم محمد اسلم رمزی ادارۂ قاسمیہ - دیوبند

۱۱۷ - شعر العجم جلد چہارم — مولانا شبلی نعمانی — معارف پریس اعظم گڑھ — ۱۹۵۱ء

۱۱۸ - طلسم ہوشربا ایک مطالعہ — ڈاکٹر راہی معصوم رضا — خیابان پبلی کیشنز بمبئی — ۱۹۷۹ء

۱۱۹ - فسانۂ عجائب — رجب علی بیگ سرور — مرتبہ اطہر پرویز — سنگم پبلشرز الہ آباد — ۱۹۶۹ء

۱۲۰ - قصۂ مہر افروز و دلبر — عیسوی خاں مرتبہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد — ۱۹۶۶ء

۱۲۱ - قصۂ حاتم طائی — حیدر بخش حیدری مرتبہ اطہر پرویز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی — ۱۹۷۲ء

۱۲۲ - قواعد اردو — مولوی عبدالحق — انجمن ترقی اردو ہند دہلی — ۱۹۷۵ء

۱۲۳ - لسانی مطالعے — ڈاکٹر گیان چند — ترقی اردو بورڈ نئی دہلی — ۱۹۷۳ء

۱۲۴ - مثنوی گلزار نسیم — مرتبہ رشید حسن خاں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی — ۱۹۷۱ء

۱۲۵ - مجموعہ نغز — میر قدرت اللہ قاسم مرتبہ محمود شیرانی ترقی اردو بورڈ نئی دہلی — ۱۹۷۳ء

۱۲۶ - مغل اور اردو — نصیر حسین خیال — شائق احمد عثمانی اینڈ سنز - کلکتہ — ۱۹۳۳ء

۱۲۷ - مقامات ناصر　میر ناصر علی دہلوی　مرتبہ سید انصار ناصری　انجمن ترقی اردو کراچی　۱۹۶۹ء

۱۲۸ - میر تقی حیات اور شاعری　ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی　انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ　۱۹۵۴ء

۱۲۹ - مرزا مظہر جان جاناں اور ان کا اردو کلام　عبدالرزاق قریشی　ادبی پبلشرز　۱۹۶۱ء

۱۳۰ - نادرات شاہی　شاہ عالم　مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی　ہندوستانی پریس رامپور　۱۹۴۴ء

۱۳۱ - نذیر احمد　ڈاکٹر اشفاق احمد خاں　مکتبہ شاہراہ دہلی　۱۹۷۴ء

۱۳۲ - نوطرز مرصع　عطا حسین تحسین　مرتبہ نورالحسن ہاشمی　ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد　۱۹۵۸ء

۱۳۳ - ہماری داستانیں　وقار عظیم　اعتقاد پبلشنگ ہاوس دہلی　۱۹۸۰ء

رسائل

۱ - "آجکل" ہندوستانی مصوری نمبر　نئی دہلی　اگست　۱۹۶۰ء

۲ - "اردو" (مضمون خواجہ امان از فرحت اللہ بیگ) اپریل　۱۹۳۱ء

۳ - "اردو"　کراچی　جلد ۵۲　شمارہ ۱　۱۹۷۷ء

۴ - "اردو"　کراچی　جلد ۵۳　شمارہ ۲　۱۹۷۷ء

۵ - "اردو"　کراچی　جلد ۵۳　شمارہ ۳　۱۹۷۷ء

۶ - "دلی کالج میگزین" "دلی کا دبستان شاعری" مرتبہ ظہیر احمد صدیقی　۱۹۶۱ء

۷ - "فکر نو" "شاہ جہاں آباد نمبر میگزین دلی کالج　۱۹۷۸ء

۸ - "ماہ نو" "مسلم فن و ثقافت نمبر"　لاہور　مئی　۱۹۸۰ء

۹ - "ماہ نو" ۱۸۵۷ نمبر　کراچی　مئی　۱۹۵۷ء

۱۰ - "سائنس کی دنیا" "اوہام شکن"　نئی دہلی　جولائی دسمبر　۱۹۷۷ء

HINDUSTANI TAHZEEB
BOSTAN-E-KHAYAL
KE
TANAZUR MEIN
BY
DR. IBNE KANWAL